بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

اکتوبر 2014

عید نمبر

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ محمود ریاض

مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر منتظم ——— آذر ریاض

مدیرِ اعزازی ——— امت الصبور

فلم ٹیلی وژن ——— شاہین رشید

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے



مستقل سلسلے

اکتوبر 2014

جلد 29 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام ۲۰/بی ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



شعاع کا اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

عیدالاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔

کچھ لوگ تو عید قرباں سے پہلے ہی کسی قربانی کی نوید سُنا رہے تھے۔ فی الحال اس کے آثار تو نہیں ہیں البتہ آگے کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر کی دُعا ہے۔ یہ قوم اب مزید تجربوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

عیدالاضحیٰ جسے عید قرباں بھی کہا جاتا ہے۔ قربانی کے ایک عظیم واقعہ سے منسوب ہے۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی عزیز ترین شے کی قربانی۔ آنکھیں بند کرکے اس کے حکم کی تعمیل اور رضائے الٰہی کا حصول اس مذہبی تہوار کی روح ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے عزیز فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو اللہ کے حضور قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ تسلیم و رضا کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی محبوب ہوئی کہ قیامت تک کے لیے اسے زندہ کر دیا۔ مسلمان ہر سال قربانی کرکے اس عظیم واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اگر قربانی کی روح کو سمجھیں تو یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، اس کی رضا، اس کے مجبور، دُکھی اور ضرورت مند بندوں کی مدد اور حاجت روائی بھی ہے۔ پاکستان کو اس وقت ایک بڑی آفت ناگہانی کا سامنا ہے۔ ملک کا ایک بڑا حصّہ سیلاب کی زد میں آچکا ہے۔ بے شمار لوگ بے گھر ہوگئے ہیں۔ ان کے مال مویشی بہہ گئے ہیں۔ ان کی تیار فصلیں زیرِآب ہیں۔ اپنی خوشیوں میں ان کو بھی یاد رکھیں۔ ان کی مدد ہمارا فرض ہی نہیں — اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

قارئین کو عید کی مبارک باد۔

اللہ تعالیٰ سے آپ سب کی خوشیوں کے لیے دُعاگو ہیں۔

محمود بابر فیصل،

محمود بابر فیصل ایک روشن چراغ تھے۔ ایک طویل عرصہ بیت جانے کے باوجود اُن کو بھول نہیں پائے ہیں۔ جو لوگ خوشیاں بانٹتے ہیں، محبت پھیلاتے ہیں، وہ ہمیشہ دلوں کے مکین رہتے ہیں۔ محمود بابر فیصل ایسی ہی ہستی تھے۔

25 اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا ہنستا مسکراتا ناول "آہ!"، سمیرا حمید کا مکمل ناول "یادم"
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول "گرد کے پار"، عائشہ نصیر احمد کا ناولٹ "ایک ذرا ہاتھ بڑھا"
- حیا بخاری، ایمان علی، فرحین اظفر اور معصومہ اقبال کے افسانے،
- عیدالاضحیٰ کا خصوصی سروے "عید قرباں کی روایتیں"
- شیف گلزار سے ملاقات، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جھروکوں سے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔



تیرے در کا جو ہوا سب در اسی کے ہو گئے
راستے اُس کے ہوئے منظر اُسی کے ہو گئے

تیری خاطر جو ہوا کرتا تھا یوں ہی در بدر
ایک دن ایسا ہوا سب گھر اُسی کے ہو گئے

معرفت کے جو سمندر میں سدا ڈوبا رہا
موج بھی اُس کی ہوئی گوہر اُسی کے ہو گئے

جو بھی تیری ذات کا جوگی بنا اِس دشت میں
شہر اُس کے ہو گئے بنجر اُسی کے ہو گئے

جس کو بھی نعمان اُس کی ذات کا عرفاں ہوا
یہ زمیں اُس کی ہوئی امبر اُسی کے ہو گئے

نعمان فاروق



دُشمنوں کے بھی دلوں میں آ کے گھر آپؐ نے کیا
پیار بھی تو ہر کسی سے ٹوٹ کر آپؐ نے کیا

ریگزاروں میں جو تھے بھٹکے ہوئے خانہ بدوش
علم و حکمت دے کے ان کو مقتدر آپؐ نے کیا

کیوں نہ مانیں لوگ آپؐ کو محسنِ انسانیت
جاں بلب قوموں کو آ کر جانبر آپؐ نے کیا

وہ سراپا رحم تھے سارے زمانے کے لیے
ابرِ رحمت بن کے سب کو بارور آپؐ نے کیا

دُنیا کی تاریخ میں ان سے بڑا کوئی نہیں
آسمانوں کی بلندی کو بھی سر آپؐ نے کیا

وسیم احمد مغل

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ذبح کی لغوی و اصطلاحی تعریف' اس کی حکمت اور چند ضروری احکام و مسائل

لغوی معنی : ذبح کے لغوی معنی کاٹنا اور جانور کی روح نکالنا ہیں۔

"جو جانور انسان کی دسترس میں ہیں اور جن کا کھانا حلال ہے ان کا حلق اور رگیں کاٹنا ذبح کہلاتا ہے۔"

ذبح اور نحر میں فرق : ذبح سے مراد حلق اور نرخرے کی رگیں کاٹنا ہے جبکہ نحر سینے کے بالائی حصے لبہ میں چھرا گھونپنے کو کہتے ہیں۔ اونٹ کو نحر اور دوسرے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔

ذبح کی حکمت : انسانی صحت کی حفاظت کے لیے ذبح کو شریعت میں لازم کیا گیا ہے۔ چونکہ خون کے اندر بے شمار مضر صحت جراثیم ہوتے ہیں' اس لیے اس خون کو ذبح کے ذریعے سے بہا دیا جاتا ہے تاکہ یہ مضر صحت جراثیم گوشت کے ساتھ مل کر نقصان نہ پہنچائیں۔

مشینی ذبیحہ : یہی وجہ ہے کہ مشینی ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ جس میں جھٹکے سے جانور کو ہلاک کر دیا جاتا ہے' اس میں اس کا خون اندر ہی رہتا ہے' باہر نہیں نکلتا۔ بنا بریں ذبح کا یہ طریقہ ناجائز اور اس قسم کا ذبیحہ کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔

ذبح کرنے کا شرعی طریقہ : کوئی بھی جانور ذبح کرنے کے لیے حسب ذیل شرائط مد نظر رکھنا ضروری ہیں۔

1- ذبح کرنے والے کی اہلیت' یعنی وہ عاقل (باشعور) مسلم ہو یا کتابی' یعنی اس کے والدین اہل کتاب میں سے ہوں۔

2- دوسری شرط آلہ ہے کہ اس آلے کے ساتھ جانور کو ذبح کرنا جائز ہے۔ جو اپنی دھار کے ساتھ خون بہا دے لیکن دانت اور ناخن کے ساتھ ذبح کرنا جائز نہیں۔

3- تیسری شرط گلا کاٹنا ہے' گلے سے مراد سانس اور کھانے کی رگیں ہیں' نیز ذبح کرنے کی جگہ حلق اور لبہ ہے۔ لبہ سے مراد وہ گڑھا ہے۔ جو گردن کی جڑ اور سینے کے درمیان ہوتا ہے' اس کے علاوہ کسی اور جگہ سے ذبح کرنا جائز نہیں۔

4- چوتھی شرط اللہ کا نام لینا ہے' یعنی ذبح کرنے والا ذبح کرنے کے لیے جب اپنے ہاتھ کو حرکت دے تو وہ بسم اللہ واللہ اکبر پڑھے۔

نحر کرنے کا شرعی طریقہ : اونٹ ذبح کرنے کا قرآن و سنت سے ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ اسے کھڑا کر کے ذبح کیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' یعنی کھڑے ہونے کی حالت میں اونٹ کو نحر کیا جائے۔ علاوہ ازیں اونٹ کی بائیں ٹانگ کو باندھ لیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قربانی کے موقع پر اونٹوں کو اسی طرح ذبح کرتے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اونٹ کو اس حالت میں ذبح کرتے تھے کہ اس کا بایاں پاؤں بندھا ہوتا اور وہ باقی ماندہ تین پاؤں پر کھڑا ہوتا۔

حضرت زیاد بن جبیر رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایک شخص کے پاس تشریف لائے جس نے ذبح کرنے کے لیے اپنی اونٹنی کو بٹھایا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا۔
''اسے کھڑا کر کے باندھ لو' یہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔'' صحیح بخاری باب نمبر حدیث 1713

ذبح کے متعلق چند ضروری احکام :

1۔ اگر مادہ جانور کے پیٹ سے ایسا بچہ نمودار ہو جس کی خلقت مکمل ہو چکی تھی تو اس کی ماں کو ذبح کرنے سے وہ بھی حلال ہو جائے گا۔
2۔ اگر ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو ایسا جانور کھانا حلال ہے کیونکہ امت محمدیہ کو بھول چوک معاف ہے۔
3۔ اگر چھری کی تیزی کی وجہ سے جانور کی گردن علیحدہ ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔
ایسا جانور جو چوٹ لگنے' پہاڑ سے گرنے' گلا گھٹنے یا بیماری کی حالت میں مل جائے اور اسے ذبح کر لیا جائے تو اسے کھانا حلال ہے لیکن اگر اس کی روح نکل چکی ہو تو پھر حرام ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چتکبرے اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔(بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکری' مینڈھا' گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔
2۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔
3۔ گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے' تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔
4۔ قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا چاہیے۔
5۔ قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت درج ذیل حدیث میں دعا پڑھنا مسنون ہے۔
6۔ ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے' اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

قربانی کی مسنون دعا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا۔
ترجمہ ''میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس اللہ کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے' اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور تجھ ہی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کی طرف سے۔''

امت کے لیے محبت

حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو وہ بڑے بڑے' موٹے تازے' سینگوں والے' چتکبرے اور خصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی

امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو اور دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔(ابوداؤد)

فوائد و مسائل : 1۔ قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔

2۔ جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔

3۔ خصی جانور کی قربانی درست ہے۔اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔

4۔ گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔

5۔ کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔" (احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استنان معلوم ہوتا ہے، اس لیے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے، یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے فرض نہیں، تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2۔ قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3۔ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے نر مینڈھے کی قربانی دی۔وہ سیاہی میں کھاتا، سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔

فوائد و مسائل :

1۔ قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا چاہیے۔

2۔ "نر" سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔

3۔ نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز ہے۔

4۔ سیاہی میں کھانے، چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا، اس کے پاؤں بھی کالے تھے اور اس کی آنکھوں کے اردگرد کی جگہ بھی سیاہ تھی۔اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

بہترین قربانی

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔" (ابوداؤد)

اونٹ اور گائے (کی قربانی) کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عیدالاضحیٰ آگئی، چنانچہ ہم نے دس دس

آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔ (ترمذی)

دو دانت کا جانور

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو دانتے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو' سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانتا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کر دو۔" (جذعہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں)۔ (مسلم)

فائدہ : علامہ البانی رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے' بکری کا جذعہ نہیں۔ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ گوشت کی بکری ہے۔ (قربانی کی نہیں۔")

انہوں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔"

علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں' البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے۔

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان چرا ہوا ہو یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔" (ابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2۔ آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو' اس کی قربانی درست نہیں۔

3۔ قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے' اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے' اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

قربانی کے لیے ناپسندیدہ

حضرت عبید بن فیروز رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا۔

"مجھے بتایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے کس جانور کو ناپسند کیا ہے یا اس سے منع فرمایا ہے؟

انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کوتاہ ہے۔ (اور فرمایا)

"قربانی میں چار جانور جائز نہیں' وہ کانا جانور جس کا

کانا پن واضح ہو ' بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو ' لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔"

عبید نے کہا "میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔"

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "جو چیز تمہیں پسند نہیں ' اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو ' قربانی میں رکاوٹ نہیں۔ "جس کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور وہ چلنے سے عاجز ہو۔" (حاشیہ سنن ابن ماجہ) لیکن یہ صورت لنگڑا ہونے میں شامل ہے۔ نواب وحید الزمان خان نے اس کا ترجمہ "دبلی" کیا ہے۔ وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ابن اثیر رحمتہ اللہ نے کسر کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے "وہ ہڈی جس پر زیادہ گوشت نہ ہو۔"

سینگ ٹوٹا کان کٹا

حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا جس کا سینگ ٹوٹا ہوا یا کان کٹا ہوا ہو۔ (ابوداؤد)

گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرنا

حضرت عطاء بن یسار رحمتہ اللہ سے روایت ہے ' انہوں نے فرمایا۔

"میں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں؟"

انہوں نے فرمایا "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا کرتا تھا۔ (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے ' اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگ فخر (کے طور پر زیادہ جانور ذبح) کرنے لگے تو وہ حال ہو گیا جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ جن لوگوں کا کھانا پینا اور خرچ وغیرہ مشترک ہو ' وہ ایک گھر کے افراد ہیں۔ ان کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دینا یا گائے یا اونٹ کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔

2۔ ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن تفاخر اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے ' اس صورت میں کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

3۔ کسی بھی نیکی میں نیت کا صحیح ہونا اور دل کا خلوص لازمی شرط ہے۔

سنت طریقہ

حضرت ابو سریحہ (حذیفہ بن اسید غفاری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' انہوں نے فرمایا۔

"میرے گھر والوں نے مجھے غلط کام پر مجبور کر دیا جبکہ مجھے سنت طریقہ معلوم ہے۔ ایک گھر والے ایک بکری یا دو بکریاں ذبح کیا کرتے تھے۔ اب تو (اگر ہم ایک بکری کی قربانی دیں تو) ہمارے ہمسائے ہمیں بخیل کہنے لگتے ہیں۔" (بیہقی)

کس چیز سے ذبح کیا جائے؟

حضرت محمد بن صیفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' انہوں نے فرمایا۔

میں نے دو خرگوش پتھر سے ذبح کیے اور انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو آپ نے مجھے ان کو کھا لینے کا حکم دیا۔ (دارمی)



تہوار خوشیوں کی علامت ہوتے ہیں اور عید تو نام ہی خوشی کا ہے۔ یہ خوشی جہاں ایک مذہبی فریضہ ہے' وہاں اس سے بہت سی خوش کن روایتیں بھی وابستہ ہیں۔ مہندی' چوڑیاں' نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات' گھر کی آرائش وزیبائش..... یہ سب اس تہوار میں رنگ بھرتے ہیں' لیکن اس کا سب سے زیادہ خوب صورت اور دلکش پہلو مہمانوں کی آمد اور ان کی تواضع ہے۔ جب سب اپنے مل کر بیٹھتے ہیں تو قہقہوں' مسکراہٹوں کے ہجوم میں مدتوں کے گلے شکوے مٹ جاتے ہیں اور موقع اگر عیدالاضحیٰ کا ہو تو دسترخوان کی رونق قابل دید ہوتی ہے۔ مل بیٹھ کر کھانے اور پکانے سے کھانے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔

عیدالاضحیٰ پر قارئین سے سروے میں ہم نے اسی حوالے سے سوالات کیے ہیں۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی گلی کوچوں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔ جانوروں کی خریداری' ان کی آمد کا شور' ان کے پیچھے بھاگتے بچے.... ان ہی ہنگاموں میں عیدالاضحیٰ کا دن طلوع ہوتا ہے تو قصائی کی آمد کے انتظار سے لے کر گوشت بننے' اسے تقسیم کرنے اور اسے پکانے تک مصروفیت کا وہ عالم ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ آپ ان مراحل سے کیسے نبرد آزما ہوتی ہیں۔ گھر میں قربانی کے جانوروں کی آمد سے لے کر قربانی ہونے تک کا احوال لکھیں۔

2۔ گوشت سے بنی آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟ آپ خود بناتی ہیں یا فرمائش کرکے بنواتی ہیں؟

3۔ ہر صوبے' ہر قوم' ہر خاندان کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے' جو خاص موقعوں پر ضرور بنائی جاتی ہے۔ آپ کے گھر کی روایتی ڈش کون سی ہے؟

4۔ گوشت کی تقسیم کس طرح کرتی ہیں۔ گوشت تقسیم کرتے ہوئے آپ کون سی باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

عیدِ قرباں کی روایتیں

ادارہ

کوثر خالد..... جڑانوالہ فیصل آباد

1 مشترکہ حال مختلف عیدوں کا کچھ یوں ہے کہ ماں کے گھر تو قربانی کی توفیق نہیں ملی' مگر چچا باقاعدگی سے قربانی بھی کرتے اور دعوت بھی دیتے۔ محلے سے بھی آتا۔ اتنا گوشت کہ ہم کھا نہ سکتے تو پھر ابا جان ہی کھا کر اس کی قدر فرماتے .... بعد شادی' جب تک جوائنٹ فیملی سسٹم رہا' حیات سسر تک تو چاروں بھائی عید سے ایک یا دو دن پہلے بکرا لاتے .... خود ہی چھری پھیر کر گوشت بنا لیتے .... قیمہ بگدے پر .... اور تکے چھری سے میں بناتی۔ ہنڈیا جٹھانی پکاتیں .... بانٹنے میں نند بعد ازاں دیورانی پیش پیش رہیں .... کلیجی وغیرہ پکا کر ختم دلاتے مل کر روٹیاں پکاتے اور رشتہ داروں اور محلے داروں کو کھلاتے' بکرے کی سجاوٹ' سیر بچوں کے ذمے۔ سب سے زیادہ میرے بڑے بیٹے ثمر کو قربانی کا شوق ہے۔ ابتدائی عمر میں بھی کھلونا بکرے کی سنگی ہوا کرتی تھی۔

ایک بار بکرا بہت بولنے والا تھا' مطلب تنہائی کی وجہ سے شور مچاتا۔ کوئی پاس جاتا تو چپ کر جاتا۔ رات میں نے دیکھا۔ کبھی کوئی اسے چپ کرانے جا رہا ہے' کبھی کوئی۔ تو ہم نے سوچا کہ سب کی چھٹی کرادی جائے۔ چارپائی اٹھائی اور بکرے کے پاس فل سردی میں ہیٹر لگا کر سو رہے۔ بکرا اور باقی سب نے سکھ کا سانس لیا۔

نند جب لاہور بیاہ گئی تو اس نے فرمائش کی.... کہ بکرا جڑانوالہ سے آنا چاہیے۔ خالد صاحب لے آئے۔ میں نے اکیلے کچھ دن سنبھالا۔ رات رات بھر اس کے لیے جاگتی۔ گود میں رکھ کر لاہور لے گئے۔ خالد صاحب تو بیمار تھے۔ بکرے کو میں نے ہی اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ گاڑی



میں بھی پھر رکشے میں بھی۔

2 ہر ڈش میری پسندیدہ ڈش ہے۔ صرف پیاز موٹی نہیں کھا سکتی مگر کھا کر دکھا دیا خالد کے پیار میں۔

ہمیشہ ہم نے خود ہی کھانا بنانا پسند کیا یا مل کر.... بیٹھ کر کھانا ہر گز پسند نہیں ہے۔

3 جب اکٹھے ہوا کرتے تھے تو ہر عید پر میٹھے نمکین چاول ضروری قرار پاتے تھے۔ آج کل کھیر.... ہم سب دیورانیاں' جٹھانیاں پکانا پسند کرتی ہیں.... چونکہ ہم چاروں ایک ہی محلے میں ہیں تو ایک دوسرے کی ٹرائی بھی ہو جاتی ہے۔ چونکہ میری جٹھانی زیادہ دودھ والی کھیر نہیں پکاتی تو اس کے بچے آنٹیوں کی کھیر کی تعریف کرتے ہیں۔ جبکہ اس کی ہانڈی مزے دار ہوتی ہے۔

4 گوشت سارا مکس کر کے تولا جاتا ہے۔ پھر تین حصے۔ ہم اپنے حصے میں سے بھی دیتے رہتے ہیں۔ بیٹی تو گوشت کھاتی نہیں.... بیٹا باہر دعوتیں اڑاتا ہے۔ رہ گئی میں اور ساس.... تو کتنا کھائیں گے آخر۔ مہمانوں کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ لاہور والے آتے ہیں تو ختم ہوتا ہے.... اب میرا بیٹا قربانی میں حصہ ڈالتا ہے تو میں سارا اپنے حصے کا گوشت صفائی کرنے کے بعد بانٹ دیتی ہوں۔ یہ میری مرضی ہے۔ سوائے بونگ کے' جس کی میری بہو دو سال سے ہمیں نہاری پکا کر کھلاتی ہے۔ ہم کلیجی والی ہانڈی کے بجائے باری باری سب کو نہاری کھلاتے رہتے ہیں۔ اللہ سب کو مل کر رہنے کی توفیق دے۔

مثال ابراہیمی قیامت تک رہے گی قائم
کوئی کھائے گا گوشت کوئی کھلائے گا گوشت

سنبل ملک اعوان..... ونڈالہ دیال شاہ

1 ہر سال قربانی کے لیے پلاننگ بدلتی رہتی ہے۔ کچھ سال پہلے ہم قربانی کا جانور عیدالفطر کے فوراً" بعد خرید لیتے تھے۔ بقول پاپا کے' دو ڈھائی ماہ کی خدمت سے جانور صحت مند ہو جاتا ہے۔ ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

مگر پچھلے پانچ سالوں سے یہ ساری باتیں پس پشت ڈال دی گئی ہیں۔ چونکہ بڑے بھائی کی شادی پھر اس کا سسرال میں جا بسنا۔ پاپا نے ہر کام میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ جس سال بھائی کی شادی کی اس سال قربانی نہ کر سکے۔ سارا انظام جو درہم برہم ہو گیا تھا۔ آپ یقین کریں' محلے میں کسی نے ہمیں تین دنوں میں ایک سنگل بوٹی بھی نہیں بھیجی تھی۔

میری مما نے اس بات کو بہت محسوس کیا۔ اب ہم لوگ قربانی ضرور کرتے ہیں' جیسے بھی ہو۔ چونکہ بھائی علیحدہ ہو گئے ہیں تو اب وہ بالکل دلچسپی نہیں لیتے لہذا چار سالوں سے ان کا منہ دیکھتے دیکھتے ہم لوگ 9 ذی الحج کو قربانی کا جانور خرید ہی لیتے ہیں۔ اس سے پہلے تک روزانہ جانور دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔ قیمتیں پوچھتے ہیں اور کان لپیٹ کر واپس آجاتے ہیں۔

مما بکرے کو دال وغیرہ کھلاتی ہیں۔ چارے کا بندوبست

کرتی ہیں جبکہ میں مہندی لگاتی ہوں۔
فجر کی نماز ادا کرکے مسالے تیار کرتی ہوں پھر چھریاں نکال

کر رکھتی ہوں۔ قربانی کے لیے ہم لوگ قصائی کا انتظار نہیں کرتے۔ ماشاء اللہ میرے پاپا ہی تکبیر پڑھ کر ذبح کرتے ہیں اور کھال وغیرہ میرے بھائی اور پاپا مل کر اتار لیتے ہیں۔ جانور کو دھو کر بیٹھک میں رکھتے ہیں جہاں چٹائی اور کپڑے بچھا کر بوٹیاں کی جاتی ہیں۔ پھر مما بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

2 گوشت سے بنی میری پسندیدہ ڈش "چھوٹی موئی کوفتہ" جو کہ میں خود ہی بناتی ہوں۔ عید کے دوسرے دن دوپہر میں ہم یہی کھاتے ہیں تندوری روٹی کے ساتھ۔

چھوٹی موئی کوفتہ

ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چمچ
سبز مرچ پیسٹ	ایک چمچ
فریش کریم	ایک پیالی
ڈبل روٹی	تین سلائس
نمک	حسب ذائقہ
آئل یا گھی	آدھی پیالی
ٹماٹر پیسٹ	آدھی پیالی
زیرہ پسا ہوا	آدھا چمچہ
کالی مرچ پسی	آدھا چمچہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب :

قیمہ باریک پسوالیں۔ پھر اس میں لہسن ادرک اور سبز مرچ پیسٹ، کالی مرچ، ڈبل روٹی کا چورا اور فریش کریم ڈال کر اچھی طرح یکجا کرلیں۔ چھوٹے چھوٹے کوفتے بنالیں اور ان کو دس سے پندرہ منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پھر فرائی پین میں گھی ڈال کر زیرہ کڑکڑائیں اور ٹماٹر کا پیسٹ ڈال کر پکائیں۔ اس پیسٹ میں نمک اور سرخ مرچ ڈال کر بھونیں۔ جب پیسٹ آئل چھوڑ دے تو تھوڑا پانی ڈال کر پکائیں۔ گریوی گاڑھی ہو جائے تو کوفتے ڈال دیں۔ کٹا ہوا دھنیا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم دے دیں۔ اس منفرد اور ذائقہ دار ڈش کو گرم گرم تندوری روٹی سے تناول فرمائیے اور الحمد اللہ کہیں۔

3 روائتی ڈش نمکین گوشت ہے۔ جو میری پڑنانی سے چلی آرہی ہے۔ پھر میری نانی اماں اور اب میری مما یہ ڈش بناتی ہیں۔

4 پورے گوشت کی تین ڈھیریاں بنائی جاتی ہیں۔ ایک گھر کی ایک غریب مساکین کی اور ایک رشتے داروں کی۔



رشتے داروں میں گوشت پاپا بانٹتے ہیں۔ محلے میں میری مما بانٹتی ہیں۔ دور رہنے والے رشتے داروں کو سب سے آخر میں مما اور پاپا دینے جاتے ہیں۔ مما اپنے حصے میں سے بھی جو مانگے دے دیتی ہیں۔ کھال قریبی مسجد کے امام صاحب کو دی جاتی ہے۔ اور سری پائے صاف کر کے ایک بیوہ خاتون کو دے دیے جاتے ہیں، جن کے پانچ یتیم بچے ہیں۔ اس طرح عید کا دن اختتام پذیر ہوتا ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ.....لودھراں

1 عیدالاضحیٰ میں قربانی سے قبل کی رونق مجھے بہت پسند ہے۔

عیدالاضحیٰ کے حوالے سے شہر میں آج کل ایک فقرہ گردش کر رہا ہے کہ.... محبوب کے نخرے اور قربانی کے بکرے دونوں ہمیشہ بہت ہی مہنگے پڑتے ہیں۔ پھر بھی جناب عید سے قبل بچے اپنے جانوروں کی رسیاں تھامے سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوتے ہیں۔ جانوروں کی باں باں، میں میں، گھنگھروؤں کی چھن چھن، گلے میں پڑی گھنٹیوں کا شور مجھے یہ سب آوازیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

دوسرے دن جب گوشت کی وافر مقدار غریبوں میں تقسیم ہو رہی ہوتی ہے تو میں یہ بات سوچتی ہوں کہ اللہ تیرا لاکھ شکر ہے کہ اس مہنگائی کے دور میں جب گوشت خریدنا ایک عام آدمی کے لیے ضرورت کی جگہ عیاشی بن گیا ہے تو اس دن کی برکت سے ہر غریب گھر میں گوشت کی رسائی آسان ہو گئی ہے۔

2 بقر عید پر جہاں گوشت کی نئی نئی ڈشز بنائی جاتی ہیں، وہاں یہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ گوشت کھا کھا کر دل بھر گیا ہے میں اپنے گھر میں گوشت کی جو بھی ڈش بناتی ہوں۔ اس میں آئل کی مقدار کم رکھتی ہوں کیونکہ عید کے گوشت میں چکنائی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ گھر کی روایتی ڈش "بریانی" میں خود بناتی ہوں۔ فرمائش کر کے کوئی ڈش بنوانے کی حسرت ہی رہی کہ گھر میں بڑی بہن بھی اور سسرال میں بڑی بہو ہوں۔ دو ڈشز ہیں جو میں آپ کو بتاتی ہوں۔ جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتی ہیں اور لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔

تھوڑی سی املی سارا ہرا مسالا، لیموں کا رس اور دہی ملا کر پھینٹیں اور بکرے کے گوشت پر لگا کر رکھ دیں۔ ایک گھنٹہ بعد زیتون کا تیل گرم کر کے اس میں یہ مسالا ڈال کر بھون لیں اور دم پر رکھ دیں۔ نہایت لذیذ ڈش ہے۔

اسی طرح ایک اور آسان سی ترکیب ہے۔ ثابت دھنیا، ثابت زیرہ، ثابت لال مرچ، لہسن، توے پر بھون لیں۔ پیس کر دہی میں ملا کر بکرے کے گوشت پر لگا دیں۔ ایک گھنٹہ بعد بھون کر دم پر رکھ دیں۔

بہنوں کے لیے ایک خاص بات ضرور کہنا چاہوں گی اگر آپ چاہتی ہیں کہ مہمان آپ کے گھر سے خوش ہو کر جائیں تو کوشش کریں کہ اپنا تمام کام ان کے آنے سے پہلے مکمل کر لیں تاکہ ریلیکس ہو کر ان کو ٹائم دیں۔ آپ کا محبت سے بنایا کم کھانا (مطلب کم ڈشز) بھی مہمانوں کو خوش کرنے کا سبب بنے گا۔

اقراملک.....گوجرانوالہ

1 عید کے دن تو منڈی میں جانے کے لیے اتنی افراتفری مچی ہوتی ہے کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ ہمارا گھر ہے ایسا لگتا ہے جیسا مچھلی منڈی ہو خیر آ کر صفائی وغیرہ کر کے سوجاتے ہیں (دو دن) کیونکہ قصائی چچا کی بھتیجی ہوں، وہ بھی چار چار، ہماری روایت ہے کہ ہم عید کے تیسرے دن ہی قربانی کرتے ہیں۔ وہ بھی صبح چھ بجے میں نوکرانی پلس ملکہ ہوتی ہوں۔ وہ یوں کہ خوب اچھی طرح تیار شیار ہو کر اقرا بکرے کی ٹانگیں پکڑے گی۔ کھال اتارے گی کٹنگ ساتھ کروائے گی۔ پھر آئے گی کھانے کی باری تو اقرا مما کے ساتھ کھانا بھی پکوائے گی۔ عید کا تیسرا دن ایسا ہوتا ہے جیسا کہ پہلا دن ہو۔ ادھر اقرا، ادھر اقرا (ہائے اللہ) دعوت ہمیشہ ہمارے گھر ہوتی ہے دادی اور چاچو پھپھو چچی ان کے بچے اور پھر ہم.... چار پانچ بج جاتے ہیں۔

2 قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے کبھی نہیں گئی۔ اجازت بھی نہیں لیکن ہمارا قربانی کا جانور سارا سال رہتا ہے، ہم خود پالتے ہیں۔

حنا صدف، مقدس..... ضلع گجرات

1 ہم لوگ ہر دفعہ بکرا چار پانچ ماہ پہلے ہی لے لیتے ہیں تاکہ اس کی خدمت کر سکیں۔ اس سے محبت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ کا فرمان بھی ہے کہ جو چیز تمہیں عزیز اور پیاری ہو، وہ میری راہ میں دو۔

عید کے دن بکرے کی سجاوٹ کا خصوصی اہتمام کیا جاتا



ہے۔ اسپیشلی گلی کے بچے باجی مقدس کا بکرا دیکھنے آتے ہیں۔ عید کے دن ہم اپنے بکرے کو رنگ برنگے گلاب کے پھولوں کا ہار بنا کر پہناتے ہیں۔ بکرے کے سر پر مہندی لگائی جاتی ہے۔ بکرا خریدتے وقت میری ہدایت کے مطابق بکرے کے کچھ حصے کا سفید ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بکرے کے پاؤں میں جھانجریں اور سر پر تاج بھی پہنایا جاتا ہے۔

میں گوشت بالکل نہیں کھاتی۔ صرف قربانی کا ہی نہیں بلکہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن بکرے کی خدمت اور سجاوٹ بڑے ذوق و شوق سے کرتی ہوں۔ چونکہ ہمارے ہاں سب مل کر آپس میں خود ہی اپنی اپنی گائے، بکرا ذبح کر لیتے ہیں۔ اس لیے قصائی کی ٹینشن سے آزاد رہتے ہیں اور ارشد ماموں، عدنان، منان سب سے پہلے ہمارا بکرا ہی ذبح کرتے ہیں۔ دس بجے تک گوشت بھی بن چکا ہوتا ہے۔ پھر شروع ہوتا ہے اصل کام یعنی بانٹنا۔

2 گوشت سے بنائی گئی ہر ڈش ہی مزے دار ہوتی ہے مگر میں سفید سر کے والا گوشت امی سے فرمائش کر کے بنواتی ہوں۔

3 مسالے دار چانپیں بکرا عید پر ضرور بنائی جاتی ہیں۔ عام دنوں میں بھی بنتی ہیں مگر عید والے روز جب ماموں لوگ آتے ہیں تو ضرور بناتے ہیں مسالے دار چانپیں ہمارے گھر کی روایتی ڈش ہے (ترکیب آپ نے پوچھی نہیں ورنہ ضرور بتاتی)

4 گوشت کی تقسیم نانی اماں ہی کرتی ہیں لیکن اس بات کو مد نظر رکھا جاتا ہے کہ کوئی غریب اور خصوصاً" وہ لوگ جو کسی وجہ سے قربانی نہیں کر سکتے، ان کے گھر زیادہ بھیجا جائے۔ ویسے بھی قربانی کے گوشت کے اصل حق دار غریب مساکین لوگ ہی ہوتے ہیں مگر آج کل ہم لوگ اس مقصد کو بھول رہے ہیں اور اپنے فریزر کو بھرنے کا خیال ہی رکھا جاتا ہے۔

حرمت ردا اکرم ..... ڈلوال

1 ہمارے گھر بکرا نہیں آتا۔ بس محلے کے باقی گھروں کے بکرے ہی دیکھے جاتے ہیں۔ بچپن میں پڑوسیوں کے بکروں پر لاڈ پورے کیے جاتے تھے مگر اب تو ایسا کوئی چانس ہی نہیں اور نہ ہی دل کرتا ہے۔

باجی بتاتی ہیں 'ہمارے گھر تب بکرا آتا تھا جب ابو تھے'

میرے زندہ دل 'فیاض دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ابو ..... جو مجھے بھولے بسرے خواب کی طرح یاد ہیں۔ تین سالہ بچے کی آنکھیں اتنی بڑی نہیں ہوتیں کہ وہ پوری

زندگی کی متاع سنبھال سکے' بس دوسروں سے سنا ہے۔

"تمہارے باپ جیسا تمہارے خاندان میں پھر پیدا نہیں ہو گا۔"

تب مجھے اپنے ابو پہ اک ماں کی طرح فخر ہوتا ہے۔ میری پیدائش سے پہلے ددھیال میں گیارہ خاندان مل کر رہتے تھے۔ سب اچھا تھا۔ حسین تھا۔ اب کچھ نہیں ہے' فقط آپا دھاپی ہے' اپنا مفاد ہے' خود غرضی ہے' بے پروائی ہے۔

ہمارے گھر اگر بکرا نہیں آتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ گوشت بھی نہیں آتا۔ آتا ہے۔ سب سے پہلے میرے تایا زاد بھائی کے گھر سے آتا ہے' جو باجی اسی وقت دھو کر ککر میں چڑھا دیتی ہیں۔ بڑی عید پر میری مکمل چھٹی ہوتی ہے۔ عید سے اک دن پہلے سب مسالے تیار کرکے رکھ دیتی ہوں جو باجی وقتاً" فوقتاً" استعمال کرتی رہتی ہیں۔ مجھے گوشت کی بساند سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے' سو کچن میں بلا ضرورت جانے سے گریز کرتی ہوں۔

دوپہر کے بعد محلے' رشتہ داروں سب ہی کے گھروں سے گوشت آنے لگتا ہے اور وہ باجی کیسے سمیٹتی ہیں' یہ وہ جانیں' میں صبح اٹھ کر صفائی ستھرائی سے نبٹ کر تیار ہونے کا سوچتی ہی ہوں کہ ددھیال والے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سب سے عید مل کر ان کی خاطر مدارت سے فارغ ہو کر بس میں ہوتی ہوں اور ٹی وی۔ عید کے تیسرے دن جب سب گوشت سمیٹا جا چکا ہوتا ہے تو پھر میں کچن کو رونق بخشتی ہوں۔

2 ہمارے گھر ایک اور بہت بڑا مسئلہ ہے۔ وہ ہے میرا اور امی کا کھانے پینے کے معاملے میں اختلاف۔ مجھے بریانی پسند' ان کو پلاؤ۔ مجھے کچے قیمے کے کباب پسند' ان کو شامی۔ مجھے سیخ کباب پسند ہیں تو ان کو دہی میں میرینیٹ ہوئی چانپیں۔

مگر اک واحد ڈش ہے جو ہم دونوں کو از حد مرغوب ہے وہ ہے گرم مسالا گوشت۔

ترکیب انتہائی آسان ہے کہ بہت سا گوشت اک دیگچے میں ڈال کر نمک' کالی مرچ' لہسن اور خوب سارا گرم مسالا ڈال کر دیگچے کے گلے پہ آٹا لگا کر سیل کر دیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو دہکتے کوئلے پہ گھی ڈال کر دھواں دے لیں۔ اک انتہائی اچھی خوشبو اس میں رچ جائے گی۔ میں عید پہ یہ ڈش اور کچے قیمے کے کباب شوق سے کھاتی' پکاتی اور فرمائش کرکے بنواتی بھی ہوں۔ اسی کو ہماری روایتی ڈش بھی سمجھ لیں۔

3 گوشت کی تقسیم کا مرحلہ ابھی تک تو میری زندگی میں آیا نہیں۔ دعا کریں جلد سے جلد اللہ پاک ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس کی راہ میں سنت ابراہیمی بھرپور طریقے سے ادا کر سکیں۔ اس وقت جو خوشی' جو مسرت ہو گی' وہ آپ کو تجربے کے بعد ہی بتاؤں گی۔

علینہ حیدر۔۔۔ اسلام آباد

1 ہمارے گھر میں سب کا یہ طریقہ رہا ہے کہ ہم ہمیشہ ہر عید گاؤں میں مناتے ہیں۔ میں نے اپنی ساڑھے سولہ سالہ زندگی میں کبھی اسلام آباد میں عید نہیں منائی۔ حالانکہ پیدائش رہائش۔۔۔ بچپن اور لڑکپن سب یہیں گزرا ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے مگر کبھی ہم نے یہاں عید منانے کی ضد بھی نہیں کی کیونکہ جو مزا اپنوں کے درمیان' اپنے خونی رشتوں کے درمیان عید منانے' قربانی کرنے' عیدی بٹورنے کا ہے' وہ کہیں اور کہاں۔۔۔۔

ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی ایک عجیب سا سماں ہو جاتا ہے۔ ہر طرف رونقیں۔ بکروں کی میں میں' گھنٹیوں کی آوازیں' بچوں کا شور' جوش جذبات سے ابھرتی آوازیں۔۔۔۔

"میرا بکرا دیکھا ہے۔۔۔۔؟" کسی ننھے بچے کی پرجوش آواز۔

"میری گائے جیسی گائے پورے محلے میں کسی کے گھر نہیں آئی۔" کسی کا فخریہ لہجہ۔۔۔۔

غرض ہر کوئی اپنی گائے' بیل' دنبے یا بکرے کی شان میں قصیدے پڑھنے میں مصروف۔۔۔۔ ان دنوں ہمارے گھر کے بالکل سامنے والا پارک تو بکرا منڈی کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ ہماری قربانی گاؤں میں ہوتی ہے۔ جہاں ہمارے اپنے جانور ہوتے ہیں۔ بڑے تایا ابو اور چھوٹے ماموں ہر سال دو جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ ایک بیل اور ایک گائے۔۔۔۔ تیرہ حصے گھر کے افراد کے اور ایک حصہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا ہے۔

اس سال میری طرف سے بھی قربانی کی جائے گی۔ قربانی کے لیے ہمارے گاؤں کے ہی دو چاچا جی بلائے جاتے ہیں۔ ہماری قربانی ہمیشہ عید کے دوسرے دن ہوتی ہے۔ غریبوں کے حصے کو فوراً" تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ رشتے داروں

کے ہاں بھی گوشت بھیجا جاتا ہے' اور ان کی طرف سے بھی آتا ہے۔ عید کے دن امی' پھپھو' ممانی' چھوٹی تائی سب بے حد مصروف ہوتے ہیں کاموں میں.... اور ہم ملے گلے اور عیدیاں بٹورنے میں....

ویسے ہمارے گھر میں جانوروں کی دیکھ بھال وغیرہ کا مسئلہ نہیں ہے کہ وہ فارم پہ ہوتے ہیں۔ قربانی وغیرہ بھی باہر بیٹھک یا گھر کے پچھلے حصے میں ہوتی ہے.... بچپن میں ہم قربانی ہوتے دیکھا کرتے تھے مگر بڑے ہونے کے بعد کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی۔

2 میری دو کزنز ہیں.... مسرت باجی (بڑی تایا زاد) اور شازیہ باجی (چھوٹی تایا زاد) دونوں کی شادی ایک ہی گھر میں ہوئی ہے۔ دونوں بہت اچھی کوکنگ کرتی ہیں۔ ان کا گھر ہمارے گھر سے ایک منٹ کے فاصلے پر ہے۔ ہم ہر دفعہ ان کے گھر جا دھمکتے ہیں اور نت نئی فرمائشیں کرتے ہیں۔ دونوں کے ہاتھ کے بنے قربانی کے گوشت کا سالن بہت لاجواب ہوتا ہے۔ سب پلیٹیں بھر کے یا تو گھر لے جاتے ہیں یا وہیں شروع ہو جاتے ہیں۔ زیادہ فرمائش ہم پلاؤ اور کباب کی کرتے ہیں۔ ویسے بڑی امی کے ہاتھ کا بنا گوشت سب سے مزے دار ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے سموسے بھی بنائے تھے اور اس بار سب کزنز کا باربی کیو کا پروگرام ہے....

3 ہمارے یہاں کی روایتی ڈش چاول اور حلوہ ہے جو ہر عید پر لازمی ہیں اور سب کو بے حد پسند بھی ہیں۔ چھوٹے ماموں کو تو ہم حلوے سے عشق کی بنا پر ماموں جان حلوہ بولتے ہیں۔ ہر قسم کے حلوے بنتے ہیں' جن میں بڑی امی کے ہاتھ کا بنا مکھڈی حلوہ سب پہ بازی لے جاتا ہے۔ اس بار عید پہ مومنہ آپی کا چنے کی دال کا حلوہ کھلانے کا ارادہ ہے۔

کھیر اور کسٹرڈ قسم کی چیزیں گھر کی چھ عدد منگنی شدہ لڑکیوں کی عیدی میں آتی ہیں۔ ہم سب ان کے ساتھ مل کر ڈھینوں کی طرح کھاتے ہیں۔ (چھ عدد کی شادیاں ہو چکیں ورنہ وہ مزے الگ تھے)

4 گوشت کی تقسیم وغیرہ باہر باہر سے ہی ہو جاتی ہے۔ ہمارے گھر میں گوشت کی تقسیم مرد کرتے ہیں۔ گھر کے اندر وہ گوشت آتا ہے' جو اپنا ہوتا ہے اور جو رشتے داروں کو بھجوانا ہوتا ہے۔

طوبیٰ بخاری.... ملتان

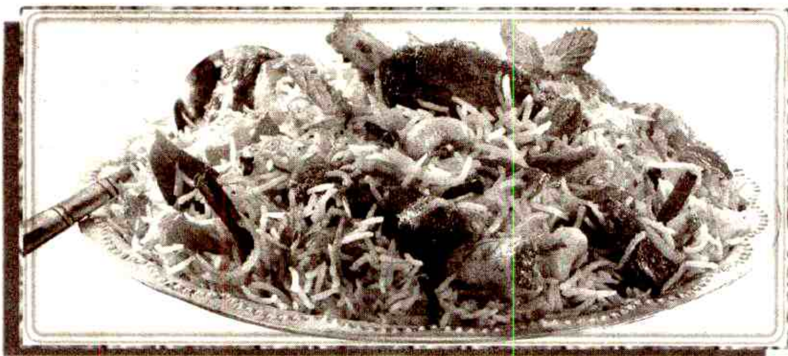
1 عید چھوٹی ہو یا بڑی' اس کی خوشی برابر ہی ہوتی ہے اور تقریباً" تیاریاں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں' بس نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ بچپن میں جانور کئی دن پہلے گھر آجاتا تھا۔ پھر اسے پالنا' نہلانا' چارہ کھلانا اور گھمانا بہت ہی خوب صورت یادوں میں سے ایک ہے۔ قربانی کے وقت جانور ذبح ہوتے دیکھنے کا شوق ابھی تک باقی ہے' جبکہ میرے دیور اور ساس حیران ہوتے ہیں میرے اس شوق پہ۔ دراصل میرے اندر زنانہ نہیں مردانہ روح ہے۔ سو شوق بھی مردانہ ہی ہیں (ہی ہی ہی) اب تو میکے اور سسرال دونوں میں جانور عید سے ایک دن پہلے آتا ہے اور اس کے قیام و طعام کا بندوبست دوسری جگہ کیا جاتا ہے پھر قربانی کے وقت یا اس سے کچھ دیر پہلے گھر لاتے ہیں۔

پھر چونکہ میرے میاں بڑے بھائی ہیں اس لیے چھری وہی پھیرتے ہیں' ان کے چھری پھیرتے ہی میں پیاز وغیرہ کاٹنا شروع کر دیتی ہوں۔ لیکن کلیجی بناتی میری ساس ہی ہیں۔ سب کو ان ہی کے ذائقے کی عادت ہے۔ پھر کھانے کا اور گوشت کی تقسیم کا کام ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کیونکہ گھر میں افراد زیادہ ہیں اس لیے کام ساتھ ساتھ نمٹ بھی جاتا ہے ہمارے ہاں جانور بڑا ہی لایا جاتا ہے اور گوشت بنتے بنتے مغرب کا ٹائم لازمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے سارا گوشت ایک دن میں نہیں نپٹایا جا سکتا۔ اس لیے کچھ پہلے دن بانٹ کے باقی میرے میاں اگلے دن صبح صبح بانٹنے نکلتے ہیں۔

2 عید پہ گوشت دیکھ دیکھ کے اور سنبھال سنبھال کے حالت یہ ہو جاتی ہے کہ گوشت کھانے کا دل بالکل نہیں کرتا' لیکن پھر بھی اپنی امی کے ہاتھ کا بنا لہسن مرچ کا گوشت بہت پسند ہے اور ان سے فرمائش کر کے بنواتی ہوں اس کی ترکیب بہت آسان اور سادہ ہے جو درج ذیل ہیں۔

لہسن مرچ کا گوشت

اگر آپ کے گھر والے بوٹیوں کے ساتھ لگی چکنائی برداشت کر لیتے ہیں تو بہت اچھا ہے۔ رواج والی بوٹی لے لیں ورنہ روکھی سے ہی کام چلائیں' پھر گوشت دھو کے اس کو دیگچی میں ڈال کے چولہے پر چڑھا دیں۔ اس میں نمک اور ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال دیں اور بالکل ہلکی آنچ پہ رکھ



دیں۔ ویسے تو گوشت اپنے ہی پانی میں گل جائے گا لیکن اگر نہ گلے تو تھوڑا سا پانی ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو تھوڑا آئل ڈال کر ہلکی سی بھنائی کرلیں۔ بھنائی کرتے ہوئے کالی مرچیں پسی ہوئی بھی تھوڑی سی چھڑک دیں اور لیموں چھڑک کے پیش کریں۔ یہ ڈش روکھی ہی کھانے کے لیے ہے۔

3 ہمارے گھر کی خاص ڈش شیر خرما ہے۔ جو کہ ہر عید اور خاص موقعے پہ بنتا ہے اور میری ساس ہی بناتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔

4 گوشت کی تقسیم ہمارے ہاں شرعی طریقے سے ہوتی ہے۔ گھر میں بہت کم گوشت رکھا جاتا ہے کیونکہ میرے میاں اور ساس کا کہنا ہے کہ ہم لوگ تو پورا سال ہی کھاتے ہیں۔ عید پہ ان لوگوں کو ملنا چاہیے جنہیں پورا سال گوشت کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جن رشتہ داروں کے ہاں قربانی ہوتی ہے ان کے ہاں بھی نہیں بھیجا جاتا۔ گوشت کے پیکٹس بنا کر میرے میاں اور دیور بانٹنے کے لیے غریب بستیوں میں جاتے ہیں اور جو گھر مانگنے آتے ہیں، انہیں بھی دے دیتے ہیں۔

عمرانہ تجمل ..... اسلام آباد

1 ہمارے ہاں عید کی تیاری عید سے دس پندرہ روز قبل ہی کرلی جاتی ہے اور جناب یہ تیاری ہوتی ہے بچوں کے کپڑے اور شوز کی۔ جہانزیب اور بصیرت مارکیٹ جاکر اپنی پسند کے کپڑے وغیرہ خرید لیتے ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ عیدالاضحیٰ کی یہ تیاری؟

دراصل ہم لوگ عید ہمیشہ اپنے آبائی گاؤں مکھیال تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک میں کرتے ہیں جو کہ اسلام آباد سے "تقریباً" 90 کلومیٹر دور ہے اور "تقریباً" دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ جانوروں کی خریداری ابو اور بھائیوں کے ذمے ہوتی ہے۔ فون پر روزانہ کی بنیاد پر اپ ڈیٹس لی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کو بتایا جاتا ہے کہ کیسا جانور دیکھا؟ قیمت کتنی ہے؟ بچوں کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑے سینگوں والا بکرا ہو اور ویڑی (گائے) براؤن یا بلیک کلر کی ہو۔

گاؤں سے میرے بھتیجے عبداللہ اور سجیل فون کرکے اطلاع دیتے ہیں کہ زیب بھیا جلدی آجائیں ہم نے جانور خرید لیے ہیں۔ بالکل آپ کی پسند کے ہیں۔ جب بچے چھوٹے تھے تو ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ہم گاڑی میں ڈال کر انہیں ایک دفعہ اسلام آباد لے آئیں تاکہ وہ بھی اپنے دوستوں کو دکھا سکیں لیکن گاؤں کے بچوں کو ایسی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ جانوروں کو ٹہلایا جائے یا گھاس کھلائی جائے، کیونکہ سارا سال ہی جانور نظر کے سامنے ہوتے ہیں۔

میرے بھائی مبشر تجمل کے ذمے (اگر وہ عراق سے آیا ہوا ہو تو) قصائی سے ٹائم لینا ہوتا ہے۔ ہمیشہ ہی ہمارا دوسرا نمبر ہوتا۔ پہلا نمبر ہمارے پیارے تایا جان ملک ظفر صاحب کا ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے کافی زیادہ جانور ذبح کرا کے پورے گاؤں میں تقسیم کرنے ہوتے تھے، لیکن اس رمضان میں ان کی اچانک وفات نے ہم سب کو نہایت دکھی کردیا ہے۔

عید کی نماز پڑھ کر ابو، بھائی (مبشر، مدثر) میرے میاں ممتاز ملک اور بچے گھر آتے ہیں۔ مدثر اور جہانزیب اور



مدثر کے دوست گاڑی لے کر پھوپھی زاد بھائی عرفان کی ڈھوک پر جاتے ہیں (ڈھوک کھیتوں کے بیچ بنے ہوئے گھر کو کہتے ہیں جو کہ آبادی سے کافی دور ہوتے ہیں) وہاں سے جانور لے کر حویلی آتے ہیں۔ وہاں پر ان کو ذبح کرکے اور گوشت صاف کرکے گھر لایا جاتا ہے۔ اب جناب ہماری ڈیوٹی شروع۔ ہمارے ابو کی کوشش ہوتی ہے کہ حسب ضرورت گوشت گھر لایا جائے جبکہ امی کی خواہش ہوتی ہے کہ میرے ننھیالی گاؤں اخلاص میں موجود رشتہ داروں تک بھی گوشت پہنچایا جائے۔ اس سارے عمل کے دوران میری اور مبشر کی شامت آتی ہے کیونکہ اب گوشت سنبھالنا ہم دونوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ طاہرہ اور راحیلہ بھابھیاں کچن میں مصروف ہوتی ہیں اور ہم لوگ گوشت کے بڑے بڑے ٹب لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر اتنے گوشت کو ٹھکانے بھی تو لگانا ہوتا ہے۔ امی نام بتاتی جاتی ہیں جبکہ میں اور مبشر گوشت شاپر میں ڈال کر اوپر نام لکھتے جاتے ہیں۔ امی شارجہ میں مقیم میری بہن نبیلہ کے لیے بھی گوشت فریز کراتی ہیں۔ جب ہمیں نظر آتا ہے کہ اب سارا گوشت گیا تو پھر میں اور بھائی چالاکی پر اتر آتے ہیں۔ امی کسی کام سے آگے پیچھے ہوں تو میں 'ادھر ہم نے گوشت کی ایک پرات بھر کے بیڈ کے نیچے چھپا دی۔ کیونکہ بچوں نے راحیلہ کے ساتھ مل کر باربی کیوں کا پروگرام بھی تو کرنا ہوتا ہے۔

میری دوست خالدہ سب سے پہلے گوشت کا تحفہ لے کر حاضر ہو جاتی ہے۔

اس دوران طاہرہ بھابھی کی آواز آتی ہے۔ باجی آئیں کلیجی پکا دیں۔ اس کے بعد دوبارہ گوشت کی تقسیم کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محلے کے بچوں کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ مدثر گوشت کے پیکٹ لے کر اخلاص روانہ ہو جاتا ہے اور بچے بھی اس کے ساتھ گاڑی میں لد کر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک تھکا دینے والے دن کا اختتام ہوتا ہے لیکن خوشی ہوتی ہے کہ ایک اہم مذہبی فریضہ بھی خیریت سے انجام پا گیا۔

2 میرے اور سب گھر والوں کی پسندیدہ ڈش بریانی ہے جو کہ میں خود ہی بناتی ہوں۔

3 ہمارے گاؤں کی روایتی ڈش دودھی والا حلوہ ہے۔ جو کہ عید پر بھی لازمی بنتا ہے اور راحیلہ عید کی صبح نماز کے بعد ہی یہ ڈش تیار کر دیتی ہے۔

4 ہمارے ابو کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ گوشت گھر سے باہر تقسیم کرکے بقدر ضرورت ہی گھر لایا جائے اور باقی کسر امی پوری کر دیتی ہیں۔ میرے اور مبشر کے ذمے تو نام لکھنا ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے قربانی نہیں کی 'ان تک گوشت ضرور پہنچے اور میں اسلام آباد میں آس پاس موجود لوگوں جو کہ ضرورت مند ہوں جیسے کہ کام والی ماسیاں' میرے اسکول کے جاننے والے' سب کا حصہ گاؤں میں فریز کر دیتی ہوں اور عید کے تیسرے دن جب اسلام آباد واپسی ہوتی ہے' ساتھ لے

آتی ہوں۔

شیریں ظفر۔۔۔ملتان

1 عیدالاضحیٰ کا چاند نظر آتے ہی ایک گہما گہمی کا عالم ہوتا ہے گلیوں ' کالونیوں میں ' بازاروں میں ' بچے تو بچے بڑے بھی جانور لے کر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بیچنے والے بھی جگہ جگہ بے انتہا خوب صورت جانور کبھی بکرے تو کبھی گائے وغیرہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں مابدولت کو خود بھی بڑا شوق ہے جانوروں کا۔

خوب صورت بکروں کی تو میں دیوانی ہوں۔ ہمارے ملتان میں بڑی شان دار منڈیاں لگتی ہیں اور ہم سب دو گاڑیاں بھر کر دھاوا بول دیتے ہیں۔ میں اور بھابھی عائشہ تو واری صدقے جاتے ہیں۔ قیمتیں سن سن کر بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ بھی کرتے ہیں۔ ان کی تصویریں بھی بناتے ہیں۔ ہارون 'فہد اور عثمان گھوم گھوم کر پسند کر کر کے قیمت کی وجہ سے ریجیکٹ کر کر کے آگے پوری منڈی گھوم لیتے ہیں۔

ایسا ہر روز رات کو ہوتا ہے کیونکہ یکم ذوالحجہ سے قبل ہی منڈیاں سج جاتی ہیں۔ 7 ذوالحجہ تک بیوپاری بھی کچھ قیمت مناسب کرتے ہیں۔ بعض اتنے ضدی ہوتے ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔ میرے میاں صاحب میری قربانی کے پیسے مجھے دے دیتے ہیں کہ بھئی اپنی پسند کا خود لے لینا۔

جب امی ابو تھے تب ہمارے گھر میں چھ سات بکرے قربان کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی عائشہ کو وہڑہ (بڑا جانور) لینے کا بخار چڑھتا ہے جس کو ہم سب مل کر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ ایک تو قیمت.... دوسرا اس کی قربانی.... قصائی صاحب دوسرے دن کر کے دیتے ہیں۔ ایک بار ہم نے بھی روٹین سے ہٹ کر قربانی کی۔ دوسرے دن قربانی ہوئی۔ پہلے دن ہمارے گھر ایک چھیچھڑا تک کسی نے نہ بھیجا۔

یقین جانیے ہم پچھلے 30 سال سے 'کیونکہ اس کے پیچھے یادداشت ساتھ نہیں دیتی' قربانی کرتے آرہے ہیں۔ خوب بڑے بڑے بکرے لاتے ہیں۔ ہر گھر میں قربانی کا خوب سارا گوشت پلیٹیں بھر بھر کر لے جاتے ہیں تاکہ قربانی کے روز گھر کا ہر فرد گوشت کھا سکے۔

ہمارے گھر "بلوچ ہاؤس" کے سامنے ریلوے کوارٹرز کی بہت بڑی آبادی ہے۔ وہاں پر بھی ہم گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہ عید والے دن سواری نہ ملنے کے سبب ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے بھی حصے کر کے چٹ لگا کر سنبھال کر رکھتے ہیں کہ جب وہ آئیں گے تو انہیں دے دیں گے۔ جیسے جیسے آئیں گے۔ ان کو دیکھتے جانا ہے الحمدللہ کہ اللہ نے ہمیں اس فرض کی ادائیگی کی توفیق دی ہے۔

عید کا دن شدید مصروف ہوتا ہے۔ عید کی نماز کے فوراً بعد ہمارے محلے میں سب سے پہلے ہمارے گھر قربانی ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے قصائی انکل بھی بہت اچھے ہیں۔ چھ سات بکرے تو دس منٹوں میں ذبح کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دو گھنٹے میں ٹبوں کے ٹب گوشت کی بوٹیوں کے تیار کر دیتے ہیں۔

2 سب سے پہلے ہم کلیجی کھاتے بناتے ہیں۔ اپنے قربانی کے جانور کی کلیجی پکانے اور کھانے کا جو مزا ہے وہ کسی ڈش میں نہیں ہے۔ سب ہی بہت شوق سے کھاتے ہیں پکاتے ہیں۔ میرے ہاتھ کی کلیجی سب کو بہت پسند ہے۔

3 ہم ہیں تو بلوچ مگر بلوچوں میں بھی پٹھانوں کی طرح سجی یعنی "سالم بکرا" یا "گوشت کا روش" بہت مقبول ہے۔ یہ دونوں خاص ریسیپی ہیں جو کہ عموماً مرد تیار کرتے ہیں دونوں میں تنور کی آگ استعمال ہوتی ہے۔ پھر بھی روش کی طرح گوشت کھانا چاہیں تو بہت سمپل طریقہ ہے کہ چھوٹا یا بڑا گوشت تھوڑا بڑی بوٹیوں میں کٹوائیں۔ تقریباً ایک ایک پاؤ کی بوٹی ہو۔ پھر اس کو لہسن ادرک 'دہی 'نمک اور کالی مرچ اپنی پسند اور ذائقے کے مطابق لگا کر رکھ دیں۔ ایک دن لگائیں پھر دوسرے دن پکائیں۔

ہلکا آئل ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ گوشت اپنے اور دہی کے پانی میں ہی گل جائے گا۔ قربانی کے گوشت میں چربی صاف بھی کروالیں تو کچھ نہ کچھ چکنائی نکل آتی ہے۔ اسی چکنائی کے ساتھ آہستہ آہستہ بوٹیوں کو ہلا کر گھماتے رہیں۔ بڑی بڑی نمکین بوٹیاں روٹی اور چٹنی کے ساتھ بہت مزا دیتی ہیں۔

4 گوشت کی تقسیم اللہ اور رسولؐ کے فرمان کے عین مطابق تین حصے۔ ایک ہمارا 'ایک ہمارے رشتے داروں کا۔ قرابت دار ہمسائے سب اس میں شامل ہیں اور ایک حصہ ٹوٹل غریبوں کا۔ اس میں رد و بدل کی گنجائش ہی نہیں۔ مذہبی فریضوں کی ادائیگی کرتے ہوئے احتیاط کریں ان کو من وعن پورا کریں۔



اگر آپ بور ہو رہی ہیں اور ٹی وی چینلز پہ بھی کچھ خاص نہیں ہے دیکھنے کو، تو آپ فوراً" کسی کوکنگ چینل کو لگائیں۔ پھر دیکھیں کہ نہ صرف آپ کا وقت اچھا گزر جائے گا، بلکہ آپ کچھ نہ کچھ سیکھ بھی لیں گی۔ اور اگر کبھی بوریت ٹائم میں آپ خود بھی کوکنگ کو آزمائیں تو یقیناً" وقت گزرنے کا پتا نہیں چلے گا اور اپنی بنائی ہوئی ڈش اپنے گھر والوں کو پیش کریں گی تو ان کی حوصلہ افزائی سے آپ کا ڈھیروں خون بھی بڑھ جائے گا۔

ہر چیز سیکھنے سے آتی ہے۔ دنیا کا کوئی فن ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے سیکھنے کی ضرورت نہ ہو اور کھانا

معروف شیف

گلزار سے ملاقات

شاہین رشید

پکانا تو ایک بہت ہی بڑا فن ہے۔ کھانے میں لذت بھی اسی وقت آتی ہے، جب اسے آپ شوق کے ساتھ پکائیں۔

شیف کے ہاتھوں میں لذت کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے ناکہ وہ شوق و ذوق کے ساتھ سیکھتے ہیں پھر اس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو جناب! آج ایسے ہی ایک شیف سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں ۔ جو کھانا پکانے کے ماہر ہیں۔ جی شیف گلزار حسین سے کچھ باتیں آپ کی نذر ہیں۔

"جی.... کیسے ہیں؟"

"الحمد للہ۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"جی ضرور.... میں 5 اگست 1964ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ مدراسی فیملی سے ہمارا تعلق ہے۔ والد صاحب انڈیا کے رہنے والے ہیں اور مدراسی فیملیز والے بزنس مائنڈ کے لوگ ہوتے ہیں۔ جاب پر ذرا دھیان کم ہی رہتے ہیں.... میں گھر میں بڑا ہوں اور ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہوں اور ہماری ایک بیٹی ہے۔"

"آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ نے کسی جاپانی لڑکی سے شادی کی ہے؟"

"جی۔ آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میں نے جاپانی لڑکی Onena سے شادی کی۔ مگر شادی کرنے سے پہلے اس کا نام "روبینہ" رکھا۔ اسے مسلمان کیا اور یہ نام میری والدہ نے پسند کیا۔"

"اچھا.... گڈ.... کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ پاکستان میں ہی یا جاپان میں؟"

"جاپان میں ملاقات ہوئی، جب میں وہاں نوکری کرتا تھا۔ وہاں اور بھی لڑکیاں کام کرتی تھیں، لیکن مجھے Onena پسند آگئی اور بس.... پھر 1994ء میں ہماری شادی ہوئی۔"

"ہوں.... اچھا۔ گھر والے خوش ہوئے یا ناراض؟"

"ناراض تو خیر نہیں ہوئے، لیکن بہت زیادہ خوش بھی نہیں ہوئے۔ مگر کہا کچھ نہیں۔۔۔ امی نے بہت ساتھ دیا میرا اور کہا کہ بیٹا! زندگی آپ نے گزارنی ہے' لڑکی اچھی ہے اور مسلمان ہو کر شادی کرنا چاہتی ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے' بلکہ یہ تو نیکی کا کام ہے۔"

"پھر شادی کے بعد مسز کو مذہب کے بارے میں کیسا پایا؟"

"بہت اچھا۔۔۔ اس نے بہت شوق سے اور بہت دل سے اسلام کو قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نماز' روزے کی بہت پابند ہے۔ مذہب سے اس کی لگن دیکھ کر میں بہت خوش ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ نیک کام کروایا اور اس نے گھر والوں سے بات چیت کرنے کے لیے مجھ سے اردو بھی سیکھی۔"

"گویا زندگی مزے کی گزر رہی ہے؟"

"جی بالکل۔۔۔ اللہ کا بہت کرم ہے ہم پر۔"

"شیف بننے کا خیال کیسے آیا؟"

"ایک بار مجھے جاپان ایمبیسی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت میں ٹین ایج میں تھا۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ یہاں پہ فوڈ اینڈ بیوریج کی ٹریننگ بھی ہوتی ہے اور کچھ کورسز بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ ساری معلومات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ کورسز کرنے کے لیے جاپان جانا پڑے گا۔ خیر میں نے پہلے اپنی پڑھائی پہ توجہ دی۔ یہاں سے گریجویشن کی اور پھر شیف کی ٹریننگ کے لیے جاپان چلا گیا۔ وہاں جا کر شروع شروع میں تو مزہ نہیں آیا۔ سوچا کہ کس کام میں آ گیا ہوں۔ مگر پھر آہستہ آہستہ دلچسپی ہوتی گئی تو بس پھر سوچ لیا کہ شیف ہی بننا ہے۔"

"گھر والوں نے یقیناً" کہا ہو گا کہ یہ کیا حماقت ہے؟"

"بالکل جی۔۔۔ اور ایسا نہیں ہے کہ مجھے بچپن سے شوق تھا شیف بننے کا۔ آپ کو آئیڈیا ہو گا کہ بچوں کے شوق وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے تو بچپن میں فلم' ٹی وی اور ریڈیو پہ کام کرنے کا شوق تھا۔ ڈانس کرنے اور گانا گانے کا بھی شوق تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بھی شوق تھا اور حصہ لیتا بھی تھا۔ مگر بس پھر اچانک ہی شیف بننے کی دھن سوار ہو گئی اور اپنے شوق کا اظہار جب گھر والوں سے کیا تو والد صاحب کافی ناراض ہوئے۔ اصل میں وہ واپڈا میں انجینئر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں بھی اسی سائیڈ آؤں۔ مگر میرا رجحان نہیں تھا اس طرف تو کیسے آ جاتا اس جانب۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر ہوا یہ کہ میں تین سال کے کورس کے لیے جاپان چلا گیا جہاں فوڈ اینڈ بیوریج کا کورس کیا۔ جس میں ہوٹل مینجمنٹ' شیف اور کچن مینجمنٹ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور نہ صرف جاپان میں ہماری ٹریننگ ہوئی بلکہ تھائی لینڈ میں بھی ٹریننگ ہوئی اور میں نے انڈین' پاکستانی کھانوں کے علاوہ اٹالین' تھائی' جاپانی' اسپینش کھانے پکانے کی بھی ٹریننگ لی اور پھر وہیں جاپان میں ہی نوکری کر لی اور شادی کر کے کچھ کما کے 2005ء میں پاکستان آ گیا۔ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی سے بھی نوازا۔"

"کیسا لگا تھا پاکستان آ کر؟"

"بہت اچھا۔۔۔ کیونکہ اپنا اسلامی ملک ہے۔ اپنے لوگ ہیں۔ اپنی ثقافت ہے۔ اپنا گھر ہے۔ اپنے لوگ ہیں۔ اپنی زبان ہے تو سب کچھ تو اپنا ہے۔۔۔ تو پھر بھلا اچھا کیوں نہیں لگے۔"

"آپ کے والد انجینئر ہیں' ان کا دل تھا کہ آپ بھی اسی لائن پہ آئیں۔ تو کیا آپ کی بھی خواہش ہو گی کہ آپ کی بیٹی اسی لائن میں آئے؟ اور آپ کی بیگم بھی تو اسی لائن سے وابستہ ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ میں اپنی بیٹی کو فورس نہیں کروں گا۔ وہ جس شعبے کو بھی' جس پروفیشن کو بھی پسند کرے گی میں اس کے ساتھ تعاون کروں گا اور اس کی حوصلہ افزائی کروں گا۔"

"میڈیا تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی؟"

"میں جب پاکستان میں آیا تو میں نے یہاں بطور شیف اور بطور کنسلٹنٹ کے کام شروع کیا' پہلے مجھے انڈس ویژن سے بلاوا آیا' وہاں ہم دونوں میاں' بیوی پروگرام کرتے تھے۔ پھر ایک ریسٹورنٹ کی ساری سیٹنگ کرنے کے بعد اس کی اوپننگ کے دن میری ملاقات "ہم ٹی وی" کی سلطانہ صدیقی صاحبہ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک مارننگ شو پروگرام شروع کررہی ہیں تو آپ اس میں ایک کوکنگ کا آئٹم بھی شروع کریں تو اس طرح میڈیا تک آیا... میں آپ کو بتاؤں کہ "ہم ٹی وی" اور "مسالا ٹی وی" کا پہلا شیف میں ہوں۔ میرے بعد دوسرے شیف آنے شروع ہوئے اور میں نے انڈس ویژن' ٹی وی ون سے بھی پروگرام کیے اور پھر مسالا ٹی وی سے وابستہ ہوگیا۔"

"بقر عید کی آمد آمد ہے' اس لیے پہلے اس کے حوالے سے تھوڑی سی بات چیت آپ سے کریں گے... تو بکرے کی خریداری سے لے کر اس کی کٹائی تک کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟"

"میں بتاتا ہوں آپ کو کہ آپ کن باتوں کا خیال رکھیں اور جو میں بات آپ کو بتانے لگا ہوں اسے بالکل بھی مذاق نہ سمجھیے گا' بلکہ واقعی بہت سیریس لیجیے گا۔

آپ کے بڑے یا مرد حضرات جب بھی جانور کی خریداری کے لیے جائیں تو اپنے ساتھ "انچ ٹیپ" ضرور لے جائیں اور اگر بکرا خریدنا ہے تو اس کی گردن ناپیں' جتنے انچ کی گردن ہوگی اتنے ہی کلو کا بکرا ہوگا۔ یعنی اتنے ہی کلو گوشت ہوگا اس میں۔ کبھی بھی بکرے کے ڈیل ڈول پہ نہ جائیں۔ بس گردن دیکھیں۔

دوسری بات یہ کہ جب قربانی کریں تو بکرے کے گوشت کی بوٹیاں فوراً" نہ بنوائیں' بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اسے پڑا رہنے دیں' کیونکہ جب تک گوشت کو ہوا نہیں لگے گی اس کی بوٹیاں ٹھیک نہیں بنیں گی۔

ایک بات اور یاد رکھیں کہ بقر عید کے دن گوشت کی مخصوص بو سے بچنے کے لیے آپ گوشت میں آٹے کا بھوسا لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں اور پھر گوشت کو دھولیں اور پھر گوشت کے حصے بنا کر فریج یا فریزر میں رکھ دیں۔"

"اور کلیجی' گردے اور دل کی مہک کو کس طرح دور کریں؟"

"یہ بھی بہت آسان ہے۔ کلیجی' گردوں اور دل کو پکانے سے پہلے اس میں سفید سرکہ' لیموں کا رس اور ادرک کا پانی لگا کر رکھ دیں اور جس برتن میں آپ نے کلیجی' گردے رکھے ہیں اس کو ذرا ٹیڑھا کرکے رکھ دیں۔ تاکہ اس کا سارا پانی نکل جائے۔ آدھے گھنٹے کے بعد کلیجی' گردے کو دھولیں اور پھر آپ اسے جس طریقے سے پکانا چاہیں' پکالیں۔ پکاتے وقت آپ پیاز کا استعمال نہ کریں' کیونکہ اس سے کھانا بھاری ہوجائے گا اور آپ دو' چار بوٹیوں سے زیادہ کھا نہیں سکیں گی۔"

"چلیں جی۔ یہ تو ہوگئیں بقر عید کی باتیں۔ سنا ہے کہ شیف حضرات کھانا پکاتے وقت کچھ نہ کچھ ہنر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں' تاکہ لذت میں کمی رہ جائے؟"

قہقہہ... "بالکل جی بالکل... میں تو خود ایسا ہی کرتا ہوں اور کچھ ٹپس اپنے پاس رکھتا ہوں' کیونکہ مجھے ریسٹورنٹ بھی چلانے ہوتے ہیں اور دیگر جگہوں پہ بھی کام کے لیے جانا ہوتا ہے۔"

"ریسٹورنٹ میں لوگ دیسی کھانے زیادہ پسند کرتے ہیں یا کانٹی نینٹل؟"

"دیسی کھانے زیادہ پسند کرتے ہیں اور لوگ زیادہ تر باربی کیو' کڑاہی اور چائنیز - پسند کرتے ہیں۔ باقی کھانے کچھ مخصوص لوگ یا جو فارنر ہوتے ہیں وہ ہی پسند کرتے ہیں۔"

"گھر میں بیٹی کس کے ہاتھ کے کھانے پسند کرتی ہے؟"

"میرے گھر کی انچارج میری بیگم ہیں۔ وہ سیاہ کریں یا سفید... میں کبھی ان کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ وہ ہی گھر میں کھانا پکاتی ہیں۔ ہاں

کبھی کوئی بہت بڑی دعوت ہو تو پھر میں بھی بیگم کا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔"

"آپ کی بیٹی کا رجحان تو اس طرف نہیں ہے۔ لیکن کیا آج کل کی نوجوان نسل کا رجحان اس طرف ہے؟"

"جی بالکل ہے اور میں حیران — ہوتا ہوں یہ دیکھ کر کہ اس فیلڈ میں پڑھے لکھے نوجوان خاص طور پر لڑکے آرہے ہیں اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ اس فیلڈ میں پیسہ بہت ہے۔ اگر آپ اچھے شیف ہیں تو پھر سمجھیے کہ آپ کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

"آپ گھر کے بڑے بیٹے ہیں اور باقی؟"

"باقی میں تین بھائی اور دو بہنیں مجھ سے چھوٹی ہیں اور اس جانب کسی کا بھی رجحان نہیں ہے۔ سب انجینئرنگ سائیڈ پہ گئے ہیں۔"

"طبیعتاً" آپ کیسے ہیں؟"

"طبیعت کا تھوڑا تیز ہوں۔ کیونکہ اگست کی پیدائش ہوں اور اگست کے لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا غصہ تیز ہوتا ہے اور سچ میں ایسی ہی بات ہے۔ اصل میں، میں اصولوں کا بہت پابند ہوں اور جہاں میری مرضی کے خلاف کام ہوتا ہے مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں اپنے کام میں بہت **پنکچوئل** ہوں۔"

"اچھا... گڈ... مگر پاکستان میں یہ سب کہاں چلتا ہے۔ **پنکچوئل** ہونا... وقت کی پابندی کرنا... وغیرہ وغیرہ۔"

"جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ... میں نے ملک سے باہر تقریباً" بیس سال کام کیا ہے اور باہر تو آپ کو پتا ہے کہ وقت کی کتنی قدر و منزلت ہے۔ میں اس پابندی کا عادی ہو گیا اور جب پاکستان آیا تب اس عادت کے تحت چلا تو اندازہ ہوا کہ یہاں وقت کی پابندی کرنے والے بے وقوف کہلاتے ہیں۔ لیکن خیر آہستہ آہستہ سب میری عادت سے واقف ہو گئے۔"

"پھر تو آپ کو لائیو پروگرام کر کے بہت اچھا لگتا ہو گا؟"

"جی ہاں... لائیو پروگرام کا یہی تو فائدہ ہے کہ آپ وقت پر پہنچ جاتے ہیں اور وقت پر سارے کام ہو کر وقت پہ فارغ ہو جاتے ہیں۔ وقت کی پابندی کرنے سے بہت سا فارغ وقت بھی مل جاتا ہے۔"

"آپ غصے کے تیز، اصولوں کے پابند، وقت کے پنکچوئل... بیگم کیسی ہیں؟"

"وہ مزاج کی ٹھنڈی ہیں... اگر دونوں ہی ہم تیز ہوتے تو پھر تو اللہ ہی حافظ تھا ہم دونوں کا۔"

"جس حساب سے پیسہ کماتے ہیں۔ کیا اسی حساب سے خرچ بھی کرتے ہیں؟"

"مجھے خرچ کرنے کا شوق ہے۔ بیگم کو زیادہ شوق نہیں ہے، میں فضول خرچ ہوں... مگر اتنا نہیں کہ جو کمایا، لگا دیا۔"

"کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتے ہیں؟"

"مجھے کوئی ایک شوق تو ہے نہیں۔ بہت سے شوق ہیں جن پر خرچ کرتا رہتا ہوں۔ مجھے گلاسز لینا بھی اچھا لگتا ہے۔ گھڑیوں، کپڑوں اور جوتوں کا بھی شوق ہے اور گھر کو سجانے کا، نت نئی چیزیں لانے کا تو بہت ہی شوق ہے۔ بس ان ہی چیزوں پہ خرچ کرتا ہوں۔"

"ریسٹورنٹ، ہوٹلز اور شادی بیاہ میں آپ کو بھی جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہو گا۔ کیا بات خاص طور پر نوٹ کرتے ہیں؟"

"میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق بہت ضائع کرتے ہیں۔ خاص طور پر شادیوں میں... پلیٹیں بھر لیتے ہیں اور پھر پیٹ بھر جانے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے رزق بہت ضائع ہوتا ہے۔

ہمیں تو بچپن میں یہی سکھایا گیا تھا کہ جتنی بھوک ہو اتنا ہی لو... مزید ضرورت ہو مزید لے لو، مگر پلیٹ میں کچھ بچاؤ نہیں... اس عادت پہ خود بھی چلتا ہوں اور اولاد کو بھی چلاتا ہوں اور لوگوں سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ اس عادت کو اپنائیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے گلزار حسین صاحب سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید



مسعود عالم
میوزک ڈائریکٹر، فلم میکر HTV

"جی کیسے ہیں مسعود عالم صاحب؟"

"جی الحمد للہ۔"

"آپ کے بارے میں سنا ہے کہ بہت جدوجہد کے بعد آپ نے یہ مقام حاصل کیا۔ کچھ بتائیے کہ کس طرح سیڑھی بہ سیڑھی اوپر آئے؟"

"جی آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ میں فلم میکنگ میں گریجویشن کررہا ہوں۔ پڑھائی کا مجھے بہت شوق ہے۔ کیونکہ پڑھائی ہی ہمیں ہماری منزل تک لے جاتی ہے۔ میرا گریجویشن 2007ء 2008 میں مکمل ہوجانا تھا، لیکن چونکہ گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے اور میں گھر کو سپورٹ بھی کرتا تھا تو میں کمانے کے لیے گھر سے نکلا اور چھوٹی موٹی فری لانس جو بھی جاب مل جاتی تھی کرلیتا تھا۔ اس دوران اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ہم نے اپنا ایک بینڈ بنایا اور اس میں اچھا خاصا کام کیا ہے اور کررہے ہیں۔

مگر لوگ ابھی اتنا نہیں جانتے تھے تو ترقی کی سیڑھیاں اس طرح عبور ہونا شروع ہوئیں کہ ایف ایم 106 میں ہم ایک پروگرام کرنے گئے۔ وہاں میری ملاقات ایک پروڈیوسر سے ہوئی۔۔۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے بارے میں بتایا تو کہنے لگیں کہ آپ، ہم ٹی وی پہ آجائیں اور انٹرویو دے دیں۔

میں نے انٹرویو دیا، لیکن میں ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے انہوں نے مجھے کال بھی نہیں کی اور انٹرویو میں ناکام اس لیے ہوا کہ میں تھوڑا سا الگ دماغ کا ہوں، ہر بات میں ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور بہت کم سامنے والے کی بات سے متاثر ہوتا ہوں۔ خیر میں پھر اپنی فری لانس جاب میں مصروف ہوگیا۔

تقریباً" تین مہینے کے بعد مجھے دوبارہ کال آئی اور کہا کہ آپ نے تقریباً" پندرہ دن بہ حیثیت اسسٹنٹ پروڈیوسر کام کرنا ہوگا۔ میرے پاس کام تھا نہیں۔ لہٰذا میں نے ہاں کردی اور پندرہ دن فری کام کیا۔

پھر کچھ دن کے بعد انہوں نے مجھے جاب آفر کردی۔ اس طرح باقاعدہ جاب بہ حیثیت اسسٹنٹ پروڈیوسر شروع ہوئی۔۔۔ اور آج میں HTV میں میوزک ڈائریکٹر اور فلم میکر کی حیثیت سے کام کررہا ہوں۔

یہاں تک پہنچنے میں مشکلات کچھ یوں ہوئیں کہ گھر والوں کی طرف سے زیادہ سپورٹ نہیں ملی۔ ہمارے یہاں مڈل کلاس یا لوئر مڈل کلاس کے بچوں کے دماغوں میں یہی بات ڈالی جاتی ہے کہ آپ نے انجینئر بننا ہے یا ڈاکٹر بننا ہے مگر میرا اس طرف رجحان نہیں تھا۔

ہمارے ملک میں سب سے زیادہ بدقسمت انسان تخلیقی ذہن رکھنے والا ہوتا ہے۔ اگر وہ پینٹر ہے یا

میوزک کی طرف اس کا رجحان ہے یا کوئی اور تخلیقی کام کرنے کا رجحان ہے تو گھر والے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

مجھے بچپن سے پیانو بجانے کا شوق تھا، مگر کوئی میری حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہی کہا جاتا تھا کہ "تم میراثی بنوگے، تم کیا کروگے۔ تمہارا کیا فیوچر ہوگا۔ کیا شادی بیاہ میں جاکر پیانو بجاؤ گے۔" ہمارے یہاں اس پروفیشن کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور جب آپ کو گھر والے سپورٹ نہیں کرتے تو پھر وہ مالی سپورٹ بھی نہیں کرتے۔

میرے والد کا ہماری کم عمری میں انتقال ہوگیا تھا تو بڑے بھائی نے ہی ساتھ دیا۔ میٹرک تک ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، مگر میٹرک کے بعد صاف کہہ دیا کہ جو آپ بنانا چاہ رہے ہیں، میں وہ نہیں بن سکتا۔ خیر بہت لمبی کہانی ہے۔ میں نے زندگی میں بہت زیادہ مشکلات اٹھائی ہیں، تب کہیں جاکر اس قابل ہوا ہوں کہ اچھا کما لیتا ہوں اور اب تو مجھے HTV والوں نے اسپانسر شپ دے دی ہے اور اب میں ان کے تعاون سے مفت

ضیاء الدین یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہا

ہوں ۔میں ایچ ٹی وی اور ضیاء الدین والوں کا بڑا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے کام کرنے کے لیے پلیٹ فارم دیا اور آج ایچ ٹی وی کا میوزک ڈائریکٹر ہوں اور میوزک کے سارے کام میرے ذمے ہیں۔"

"اور اب گھر والے خوش ہیں؟"

"جی ہاں.... سب اب پوزیٹو ہوگئے ہیں۔ انسان اپنے کام سے ہی منوا سکتا ہے اور میں نے منوایا ہے اور بہت محنت کی۔ اور میری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ضیاء الدین یونیورسٹی کا ترانہ میں نے کمپوز کیا ہے جو پروفیسر "پیرزادہ قاسم" نے لکھا تھا اور جب تک یونیورسٹی قائم رہے گی تب تک میرا نام بھی "پیرزادہ قاسم صاحب" کے ساتھ رہے گا۔"

بڑے بھائی چونکہ انجینئر ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہی شعبہ اچھا ہے۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی بھی انجینئر بن رہے ہیں۔ ایک این ای ڈی یونیورسٹی میں ہے اور دوسرا "فاسٹ" میں ہے۔ میں گھر میں تھوڑا ٹیڑھا نکلا اور اس فیلڈ میں آگیا۔

ہم پانچ بھائی ہیں۔ دو مجھ سے بڑے اور دو مجھ سے چھوٹے ہیں۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ میرے والد حسن علی "جنگ اخبار" میں کام کرتے تھے میرے دونوں بڑے بھائیوں نے باپ بن کے پالا اور ہماری بہت اچھی اسکولنگ کی میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

"آج کل کیا کررہے ہیں؟"

"ہم ٹی وی پہ بھی میرے تین ڈرامے چل رہے ہیں جن کی میوزک میں دے رہا ہوں۔ وقاص اپنے دوست کے ساتھ مل کر اس کا اپنا اسٹوڈیو ہے، ان تین ڈراموں میں ایک "للا" ہے دوسرا "محبت اب نہیں ہوگی" اور تیسرا ہے "آہستہ آہستہ" اور اپنے لیے جو گانے گاتا ہوں، وہ خود ہی لکھتا ہوں.... اور میرا تو کام ہی یہ ہے۔ گانے لکھنا۔ ان کی دھن بنانا اور پھر ان کی میوزک ترتیب دینا۔"

"آپ کا جو کام ہے، وہ کیمرے کے پیچھے کا ہے۔ کیا کیمرے کے آگے آنے کا کبھی دل نہیں چاہا؟"

"میں کیمرے کے سامنے بھی آتا ہوں۔ میری ایک میوزک ویڈیو ریلیز ہوئی تھی، اس میں میں نے ایکٹ کیا۔ اس میں، میں ایک بچہ فروش بنا ہوں.... کچھ اداکاری کا بھی شوق ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران تھیٹر بھی کیا ہے اور ہمارے ایچ ٹی وی میں ایک "سٹ کام" ہوتا تھا اس میں بھی میں نے اداکاری کی ہے۔ بڑے لیول پہ اداکاری نہیں کی۔ لیکن اگر موقع ملا تو ضرور کروں گا اور وہ کام کروں گا جس سے میرے ملک و قوم کو کوئی فائدہ ہوگا۔"

"آپ بتارہے تھے کہ وائس اوور بھی کرتے ہیں تو کہاں کہاں کس کس کے لیے کرتے ہیں؟"

"وائس اوور دستاویزی فلموں کے لیے کرتا ہوں۔ فلمز کے لیے ٹی وی کے پروگراموں کے جو اوقات کار بتائے جاتے ہیں اُن کے لیے اور ہر طرح کی وائس اوور کر سکتا ہوں۔ خواہ ایکشن ہو فنی کامیڈی سیریس یا شاعری، رومانٹک اور ڈراما۔۔۔ ترکش ڈراموں کی ایکٹنگ وائس اوور نہیں کی میں نے کیونکہ صداکاری کرنا مجھے بورنگ کام لگتا ہے۔"

"آپ کو بچپن سے میوزک اپنی طرف کھینچتی تھی تو کیا کسی سے متاثر تھے آپ؟"

"میں بہت چھوٹا سا تھا اور مجھے بہت اچھی طرح یاد بھی نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پی ٹی وی پہ میوزک کا ایک پروگرام جو بچوں کے لیے ہوتا تھا اور جس کے میزبان "عدنان سمیع" تھے۔ اسے میں بہت غور سے دیکھتا تھا۔ حالانکہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔۔۔ تو بس اس وقت دل چاہتا تھا کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، وہ میں بھی کروں اور میری بڑی خواہش ہے کہ میں ان کے ساتھ کام کر سکوں اور کچھ سیکھ سکوں۔

دوسری بات جو مجھے میوزک کی طرف کھینچتی تھی وہ یہ کہ اسکول سے آتے وقت ایک گفٹ شاپ پہ میں "پیانو" دیکھا کرتا تھا اور میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ میں اسے خرید لوں اور چونکہ وہ بہت مہنگا تھا۔ اس لیے سوچ تو سکتا تھا، مگر خرید نہیں سکتا تھا۔

اس خواہش کا اظہار میں نے اپنے بھائی جان سے کیا تو انہوں نے کہا کہ نمبر اچھے لے آؤ تو کچھ ہو سکتا ہے۔ خوب محنت کی اور اچھے نمبر لے آیا تو بھائی نے کہا کہ جب پیانو لینا ہی ہے تو اچھا والا لیں گے، تم بھی کچھ پیسے جمع کرو۔۔۔ کچھ اپنی پاکٹ منی کی بچت اور کچھ عید پہ ملنے والی عیدی کو جمع کر کے بھائی جان کو پیسے دیے پھر بھائی جان نے پیانو لا کر دیا اور چھٹی کلاس سے میرا میوزک کا سفر شروع ہوا۔

میرے رول ماڈل شعیب منصور ہیں۔ وہ آڈیو بھی جانتے ہیں۔ ویژول بھی جانتے ہیں۔ اور یہ بات آپ ضرور لکھیے گا کہ پی ٹی وی ہمارا پہلا چینل ہے اور بہت معذرت کے ساتھ ایک بات کہوں گا کہ اس چینل سے ہزاروں کی تعداد میں ڈائریکٹر اور پروڈیوسر نکلے ہوں گے۔ مگر سب کے سب گھروں میں بیٹھ کر پنشن کھا رہے ہیں اور ان سب میں صرف ایک شخص نکلا ہے شعیب منصور۔۔۔ کیوں؟"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں کہ کب کہاں پیدا ہوئے، کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"

"میں کراچی میں پیدا ہوا۔ 7 جون 1988ء میں۔ میرے والد کا تعلق ڈھاکہ سے ہے۔ وہ یہاں اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے آئے تھے اور پھر یہیں رہنے لگے اور ہم کراچی کے ہی ہو کے رہ گئے۔۔۔"

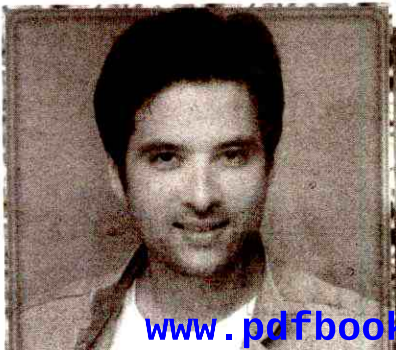
"شادی۔۔۔ اب تو آپ کی ہی باری ہے؟"

"جی باری تو میری ہی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیسوں کے نمبر نہیں بڑھ رہے، ویسے ہی نمبر بڑھے جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا ایک چھوٹا سا اپنا گھر ہو۔ ایک چھوٹی سی گاڑی ہو، تاکہ میری آنے والی شریک حیات کو بسوں کے دھکے نہ کھانے پڑیں۔"

"چلیں جی۔ جلدی سے شادی کریں، تاکہ آپ کی مسز کے ساتھ آپ کا ایک اور انٹرویو کریں اور پسند سے کریں گے شادی؟"

"ضرور۔۔۔ ان شاء اللہ۔۔۔ بس تھوڑا اسٹیبلش ہو جاؤں، پھر شادی تو کرنی ہی ہے اور شادی اپنی پسند سے کروں گا اور پسند کر بھی چکا ہوں، مگر ابھی اُن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جب شادی ہو گی تو پھر انٹرویو میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔"

میکال ذوالفقار



"کیسے ہیں جی؟"
"اللہ کا شکر ہے جی۔"
"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"
"وہی کام جو ایک زمانے سے ہو رہا ہے۔"
"آپ کو اتنی شہرت ملی ہے' کبھی سوچا تھا؟"
"شہرت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا' کیونکہ اس فیلڈ میں آنے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ بس بائی چانس آگیا اور پھر اس کا ہو گیا۔"
"شکر کرتے ہیں کہ اس فیلڈ میں آگیا یا بس آگیا ہوں تو کرنا ہی ہے۔"
"شکر کی بات نہیں۔۔۔ اللہ نے اس فیلڈ کے ذریعے سے رزق لکھا تھا سو آگیا اور میرے رب نے جو میرے لیے کیا بہت اچھا کیا۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے بندوں کے لیے اچھا ہی سوچتا ہے۔"
"آپ نے انڈیا جا کر کام کیا۔۔۔ کیسا رہا تجربہ؟"
"جی۔ میں نے انڈیا کی تین فلموں میں کام کیا اور ماشاء اللہ بہت اچھا تجربہ رہا۔ انڈیا کی فلم انڈسٹری کافی بڑی ہے اور وہاں فنکاروں کو کام کرنے کے مواقع ملتے ہیں اور یہ بڑا اچھا رجحان ہے کہ دونوں ممالک کے لوگ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔"
"کس فلم میں کر کے زیادہ مطمئن ہوئے یا اچھا لگا؟"
"میں نے جن تین فلموں میں کام کیا . . . وہ "شوٹ آن سائیڈ" "یو آرمائی جان" اور "گاڈ فادر" تھیں - تینوں میں ہی میرا کام اچھا تھا' یا ور فل رول تھا میرا۔۔۔ اور ان میں دو فلمیں پاکستان میں ریلیز ہوئیں' تیسری پاکستان میں ریلیز نہیں ہوئی۔"
"کیوں؟"
"سنسر پرابلم ہے۔"
"اچھا۔۔۔ کیا بولڈ سین تھے؟"
"ارے نہیں۔۔۔ کہانی کے سلسلے میں کچھ وجوہات تھیں۔"
"فیوچر پلاننگ کیا ہے؟"
"بس جی۔۔۔ اسی فیلڈ میں آگے جانا ہے۔ ان شاء اللہ پروڈکشن سائیڈ پہ بھی آنے کا ارادہ ہے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد۔ ابھی تو میں کمرشلز اور ٹی وی کے لیے بہت زیادہ مصروف ہوں۔"
"کمرشلز اور ڈرامے کی مقبولیت کے لیے کیا ضروری ہے؟ فنکار یا کانسپٹ اور کہانی؟"
"کانسپٹ اور کہانی کی اہمیت زیادہ ہے' پھر فنکار' ہاں اگر کانسپٹ اچھا ہے اور فنکار بھی تو پھر کمرشل کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح مضبوط کہانی کے ساتھ اچھا ڈائریکٹر اور فنکار بھی ہوں تو سیریل کو نکھار آجاتا ہے اور اسے مقبولیت بھی حاصل ہوتی ہے۔"
"مارننگ شو میں جانے یا مارننگ شو کرنے کا اتفاق ہوا؟"
"جانے کا اتفاق بہت کم ہوا ہے اور کرنے کا اتفاق تو بالکل بھی نہیں ہوا اور نہ ہی ایسا کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر بھی۔۔۔ اگر کسی نے کہا' بہت مجبور کیا بھی تو پھر میرا مارننگ شو سب سے الگ ہو گا۔۔۔ بالکل عام روٹین سے ہٹ کر۔"
"آپ پہلے ڈراموں میں آئے یا کمرشل میں۔۔۔ عموماً" لوگ ڈراموں سے کمرشل کی طرف آتے ہیں؟"
"میں پہلے کمرشل کی طرف آیا اور بالکل غیر ارادی طور پر۔ طالب علمی کے زمانے میں مجھے کمرشل کی آفر ہوئی اور میں نے یوں ہی کہ چلو جب پیش کش ہو ہی رہی ہے تو کیوں نہ کر لوں۔۔۔ میں نے اس کمرشل میں کام کر لیا۔ بس قسمت اچھی تھی کہ کمرشل مقبول ہو گیا۔۔۔ پھر ابرار الحق کے گانے میں ماڈلنگ کی آفر آئی وہ بھی کر لیا' وہ بھی ہٹ ہو گیا' تو بڑا حیران ہوا۔"
"سوچا ہو گا کہ فیلڈ تو اچھی ہے؟"
"بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ یہی سوچا کہ اگر میں اس فیلڈ کو تھوڑا سنجیدہ لوں اور دل جمعی کے ساتھ کام کروں تو نام بھی کما سکتا ہوں اور پیسہ بھی۔۔۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔"
"گڈ۔۔۔ میکال! ان شاء اللہ پھر آپ سے بات کریں گے۔"

نبیلہ عزیز



ماورا مرتضٰی، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ، ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی، آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس





کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا، عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کردیتی ہے۔ ماورا ہی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ پی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کردیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کہ وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور، فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کرلیتی ہے۔

—۱۵—

پندرہویں قسط

وہ ابھی ڈور بیل پہ ہاتھ رکھنے ہی والی تھی کہ چوکیدار نے یک دم خود ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

"آیئے میڈم! چھوٹی بیگم صاحبہ آپ کا ہی انتظار کررہی ہیں۔" چوکیدار نے انتہائی احترام سے کہتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی تھی۔

گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی، لیکن سامنے ہی انتہائی آف موڈ کے ساتھ ٹہلتی فارہ کو دیکھ کر اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

اور وہ فوراً" سے پیشتر سمجھ گئی تھی کہ اس کا موڈ کیوں آف ہے؟ اسی لیے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے قریب آکر سلام کیا... لیکن فارہ نے فوراً" کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیسی ہو؟" اس نے جواب نہ ملنے کے باوجود اگلا سوال کردیا... مگر رسپانس ندارد...

"اوکے... مت جواب دو، میں باقی گھر والوں سے مل لیتی ہوں۔"

ماورا کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہتے ہوئے اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئی اور اسے یوں لاپروائی سے اندر جاتے دیکھ کر فارہ تلملا کر پاؤں پٹختی ہوئی اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"اب بھی نہ آتیں۔" ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی فارہ پھٹ پڑی تھی۔

"مجبوری تھی... وعدہ کر بیٹھی تھی۔" ماورا بے چارگی سے کہتے ہوئے شاپنگ بیگز صوفے پہ رکھنے لگی، جبکہ فارہ کی تلملاہٹ میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔

"اچھا... تو تم مجبور بھی ہوتی ہو؟" فارہ نے ایک کھلا طنز کیا۔

"ہاں... کبھی کبھی..." وہ سکون سے کہتے ہوئے خود بھی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"کبھی کبھی کیوں... وہ بھی نہ ہوا کرو۔" فارہ نے دانت پیسے تھے۔

"میرے بس میں ہو تو یہ بھی نہ ہو... لیکن کیا کروں؟ کبھی کبھی مجبور ہونا بھی ایک مجبوری ہے... بندہ نہ بھی چاہے تب بھی ہونا پڑتا ہے۔" اس کی لاپروائی ہنوز تھی۔

''کیوں ہونا پڑتا ہے؟''

''کیونکہ کچھ لوگوں کے ساتھ رشتہ ہی کچھ ایسا بن جاتا ہے کہ انسان ان کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ نہیں، نہیں کرنے کے باوجود۔'' ماورا کا لہجہ بے ساختہ ہی سنجیدگی کے دائرے میں چلا گیا تھا اور فارہ کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

''اور تمہارے ان ''کچھ لوگوں'' میں کون کون شمار ہوتا ہے۔'' اس کا سوال اور انداز خاصا معنی خیز تھا۔

''میرے ان ''کچھ لوگوں'' میں صرف دو انسان ہی شمار ہوتے ہیں۔'' ماورا نے اس کے سوال اور اس کے انداز کا کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا' اسی لیے اس کا جواب لاپروائی لیے ہوئے تھا۔

''کون دو انسان۔'' فارہ نجانے کیا سننا چاہتی تھی اور کیا امید لگا بیٹھی تھی۔

''تم اور بی گل۔۔۔'' اس کا جواب دوٹوک اور مختصر سا تھا۔ جبکہ فارہ سن کر حیران رہ گئی تھی' کیونکہ اسے اس جواب کی توقع جو نہیں تھی۔

''میں اور بی گل۔۔۔'' اس نے حیرانی سے دہرایا۔

''کیوں۔۔۔ اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے بھلا۔'' ماورا نے تعجب کا اظہار کیا۔

''میں تو کچھ اور سمجھی تھی۔'' فارہ نے معصومیت سے کہا۔

''کچھ اور۔۔۔ مطلب۔۔۔'' ماورا نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور پھر ساری بات خود بخود ہی سمجھ گئی تھی۔

''ہونہہ۔۔۔! خوش فہمی بھی بس کبھی کبھی ہی اچھی ہوتی ہے۔ مائی ڈیر فارہ آفاق!''

''لیکن ماورا۔۔۔! میں نے ابھی ابھی خود تمہیں ان کے ساتھ آتے دیکھا ہے اور وہ بھی اتنے اچھے موڈ میں۔۔۔ میری خوش فہمی تو اک لازمی امر ہے۔'' فارہ نے خوش فہمی کا جواز پیش کیا۔

''اس کے ساتھ آنا میری مجبوری نہیں تھی۔ میری اپنی مرضی تھی۔ ورنہ میں انکار بھی کر سکتی تھی اور تمہیں نہیں پتا شاید۔۔۔ اس کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے میں اپنا فائدہ سوچتی ہوں۔ اپنا مطلب سوچتی ہوں۔ اپنا مفاد سوچتی ہوں۔''

ماورا نے بڑے بے دھڑک انداز میں اپنی مفاد پرستی کا اعلان کیا تھا۔

اور اس کے اس اعلان پہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے تیمور حیدر کی ساری خوشی اور ساری خوش فہمی وہیں کی وہیں ملیا میٹ ہو گئی تھی اور وہ پتھر کا ہو کے رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ فارہ کی بات بھی سن چکا تھا اور ماورا کی بھی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے ماورا' مگر احساس بھی تو کوئی چیز ہے۔۔۔ کسی کے ساتھ رہتے ہوئے ہمیشہ مفاد ہی تو نہیں دیکھا جاتا۔۔۔ بلکہ کبھی کبھی تو مفاد بہت پیچھے رہ۔۔۔''

بات کرتے کرتے اچانک فارہ کی نظر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت اٹھی اور اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

کیونکہ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں تیمور حیدر کی موجودگی اور اس کے چہرے کے تاثرات کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی ہے۔

''تیمور بھائی۔۔۔ آ۔۔۔ آپ!'' فارہ کے لفظ بے ربط سے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائی تھی' جبکہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اور اس کی متغیر رنگت پہ ماورا نے بھی یک دم چونک کر گردن موڑ کر دیکھا تھا اور تیمور حیدر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کے اپنے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

"سوری۔۔۔ آپ کا یہ بیگ گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔" تیمور بڑی مشکل سے اپنے تاثرات اور اپنے اعصاب، کنٹرول کرتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا اور ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ ماورا کے سامنے والی ٹیبل پہ رکھ کے پلٹا اور یک دم ڈرائنگ روم سے نکلتا چلا گیا تھا۔

"تیمور بھائی پلیز۔۔۔ رکیں۔" فارہ یک دم حواسوں میں آتے ہی اس کے پیچھے لپکی۔ "پلیز تیمور بھائی۔۔۔ میری بات تو سنیں۔۔۔ پلیز۔" فارہ کے پکارنے کے باوجود وہ رکا نہیں تھا اور وہاں سے ذہنی انتشار لیے گاڑی نکال لے گیا تھا۔

اور فارہ مایوس اور پریشان سی بے دلی سے قدم اٹھاتی واپس اندر آگئی تھی جہاں ماورا بھی پریشان اور خاموش بیٹھی نظر آرہی تھی۔

"کیا ہوا؟" ماورا نے فارہ کو اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ نہیں رکے ماورا۔۔۔ وہ چلے گئے۔" فارہ کا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔

"ہوں۔۔۔ یعنی اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔" ماورا کا لہجہ پرسوچ سا تھا۔

"ہاں۔۔۔ انہوں نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ لیکن یہ اچھا نہیں ہوا ماورا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کیا سوچ رہے ہوں گے۔" فارہ کو اپنی طرف سے بھی ٹینشن ہو رہی تھی کیونکہ تیمور اس کا بہت اچھا کزن تھا اور وہ اسی کے حوالے سے اپنی دوست کے ساتھ مل کر ایسی باتیں کر رہی تھی جن کو سن کر یقیناً" تیمور کو صدمہ تو ہوا ہی ہو گا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی سوچے گا۔۔۔ میرے بارے میں ہی سوچے گا۔۔۔ اسے تمہارے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ملے گی۔"

ماورا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں تھی کہ اتنی جلدی ذہن سے اتر جاتی۔ کیونکہ بے شک ماورا ظاہر نہ کرتی مگر ٹینشن تو اسے بھی ہو چکی تھی کہ اب کیا ہو گا۔

اور تیمور حیدر کیسا ری ایکشن دے گا۔

اور اس کے اسی ممکنہ ری ایکشن کے بارے میں سوچتے سوچتے سارا ٹائم گزر گیا تھا۔ فارہ کی ساری خوشی غارت ہو چکی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو چکی تھیں۔



اس کی گاڑی اک جھٹکے سے آکر اپنے گھر کی ڈرائیو وے پہ رکی تھی۔

اور وہ فرنٹ سیٹ پہ رکھا ماورا مرتضیٰ کا دیا ہوا گفٹ اٹھا کر گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اندر سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ رابعہ بیگم نے پکار لیا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم۔۔۔" تمہارے پاپا ناشتے پہ تمہارا انتظار کر کر کے چلے گئے۔۔۔ فون بھی تم گھر پہ ہی چھوڑ گئے تھے۔ رابعہ بیگم کہتے ہوئے قریب آگئی تھیں۔

"سوری! ایک کام سے چلا گیا تھا۔" وہ مختصراً" کہہ کر ان کی طرف دیکھے بغیر اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا اور آتے ہی اس نے ہاتھوں میں پکڑا ماورا کا وہ گفٹ انتہائی زور سے سامنے دیوار پہ دے مارا تھا۔

"مفاد۔۔۔" وہ یک دم زوردار آواز سے بڑبڑایا تھا۔ "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے۔۔۔ اپنا فائدہ سوچتی ہے۔۔۔ اپنا مطلب سوچتی ہے۔۔۔ اپنا مفاد سوچتی ہے۔ اس سے آگے اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ یعنی۔۔۔ میں۔۔۔ میری محبت۔۔۔ میرے جذبات۔۔۔ کو کچھ بھی معنی نہیں رکھتے؟ میں۔۔۔ میں۔۔۔ جو اندھوں کی طرح۔۔۔ بے وقوفوں

کی طرح۔۔۔ اور پاگلوں کی طرح ہر اونچ نیچ سے بے نیاز ہو کر صرف اس کی چاہ اور صرف اس کی محبت میں دیوانہ ہوا پھر رہا ہوں تو کس لیے؟ بے کار میں۔۔۔ فضول میں۔۔۔ اپنے مطلب۔۔۔ اپنے مفاد۔۔۔ اور اپنے فائدے میں اسے میری محبت۔۔۔ میرے جذبات اور میرے احساسات بھی نظر نہیں آتے۔ کیا اسے میں بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جانتی بھی ہے کہ میں۔۔۔ میں تیمور حیدر اس سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ وہ ایسی باتیں کر رہی تھی۔" تیمور بیڈ پہ بیٹھا اپنا سر دونوں ہاتھوں میں جکڑے یہی سب کچھ سوچے جا رہا تھا۔

"خوش فہمی بھی بس کبھی کبھی ہی اچھی ہوتی ہے۔ یائی ڈیر فارہ آفاق۔۔۔ اس کے ساتھ آنا میری مجبوری نہیں تھی۔ میری اپنی مرضی تھی۔ ورنہ میں انکار بھی کر سکتی تھی۔"

ماورا کی لاپروا سی باتیں اب بھی اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں اور وہ لحہ بہ لحہ بے چین ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر ہول اٹھ رہے تھے۔ ماورا کی باتیں اس کے دماغ پہ ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔۔۔ فائدہ۔۔۔ مطلب۔۔۔ مفاد۔۔۔ یہ تین لفظ تھے جو اس کے ذہن سے چپک کے رہ گئے تھے۔

"کیسا فائدہ۔۔۔ کیسا مطلب۔۔۔ اور۔۔۔ اور کیسا مفاد۔۔۔؟ کیا سوچتی ہے وہ۔۔۔ آخر کیا ارادہ ہے اس کا۔" یہ ایک آخری سوچ تھی جس پہ آکر تیمور کا ابلتا ہوا دماغ یک دم رک گیا تھا۔

یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ آخر ایسا کیوں سوچتی ہے؟ کیا مطلب اور کیا مفاد ہے اس کا؟ کیا ارادہ اور کیا مقصد ہے اس کے اندر۔

"ہوں۔۔۔ تو اب مجھے یہ جاننا چاہیے کہ وجہ کیا ہے؟" اس نے سوچتے ہوئے اک گہری سانس خارج کی تھی اور پھر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے یک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا اور شاور لینے کی غرض سے باتھ روم کا رخ کیا تھا۔



"دیکھو ولید... اس رپورٹ کو رہنے دو۔ اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔" ولید کے ایک کولیگ ضمیر انصاری نے ولید کی ایک انتہائی اہم رپورٹ پہ اس کی سرگرمی دیکھتے ہوئے اسے ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

اور ولید نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ "یہ تم کہہ رہے ہو؟ ایک جرنلسٹ ہو کر یہ مشورہ دے رہے ہو۔" ولید کے چہرے پہ تعجب تھا۔

"ہاں... ایک جرنلسٹ ہوں' اسی لیے تو یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سینئر ہوں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس فیلڈ میں کیا' کیا نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ جبکہ تم ابھی نئے ہو' اس لیے تمہیں یہ سب مہنگا پڑ سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا' تم کسی مشکل میں پھنسو۔"

ضمیر انصاری ان کے چینل کا ایک بہت ہی اچھا اور ایمان دار صحافی تھا اور اس کا اسی چینل پہ ایک ٹاک شو بھی آتا تھا جس کی اچھی خاصی دھوم تھی۔ کیونکہ وہ کافی منہ پھٹ صحافی تھا اور اس وقت وہی منہ پھٹ صحافی اسے چپ رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں اس فیلڈ میں نیا ہوں۔ لیکن اس فیلڈ میں پرانا ہونے کے لیے ہی تو یہ سب کر رہا ہوں۔" ولید قدرے لاپرواسا ہو رہا تھا۔

"کرو... ضرور... مگر تب... جب تم سارے داؤ پیچ جان جاؤ... ابھی صرف گزارا کرو... تاکہ تمہاری ذات پہ برے اثرات نہ پڑیں... ورنہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔" ضمیر انصاری نے اس کا کندھا تھپکا۔

"کیوں... ضمیر! کیوں... اگر ہم بھی ڈر کے پیچھے ہٹ جائیں گے تو معصوم لوگوں کا دفاع کون کرے گا؟ عوام کی آنکھوں پہ بندھی پٹی کون ہٹائے گا۔ یہ بڑے بڑے محلوں میں بیٹھے چہرے بے نقاب کیسے ہوں گے؟" ولید تڑپ گیا تھا۔

"دیکھو ولید...! تمہاری اس ایک رپورٹ سے اور کچھ ہو یا نہ ہو' لیکن تم پہ گرفت ضرور ہو جائے گی اور تمہیں میرا یہ مشورہ بھی ضرور یاد آئے گا۔"

"تو کیا کروں؟ چھوڑ دوں یہ سب کچھ۔" ولید تلخ ہونے لگا۔ اس کے اندر کا انتشار اب باہر آنے لگا تھا۔ جس کو وہ ضبط بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

"میں نے کہا نا... مت چھوڑو... کرو... ضرور کرو... مگر فی الحال مت کرو... ابھی اپنے پیر جماؤ۔" ضمیر انصاری اسے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ولید رحمان باز آنے والا نہیں ہے۔

"اور میرے پیر جمانے تک وہ اپنا پنجہ جما جائے گا... ہونہہ... ایسا نہیں ہو سکتا... میں اس کے عزائم پہلے سے ہی منظر عام پہ لے آنا چاہتا ہوں۔" ولید نے اپنی ضد پہ ڈٹے رہنے کا اعلان کیا تھا اور ضمیر انصاری کندھے اچکاتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں نئے لوگوں کا خون اسی طرح گرم ہوتا ہے۔ اینی وے... از یو وش... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں... بیسٹ آف لک۔"

ضمیر انصاری اسے اس کے حال پہ چھوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ولید سر ہلا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔



عزت ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی تھی کہ یوں ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں

آگئی تھی اور ٹیبل پر پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا تھا۔
نو بجے کا ٹائم ہو رہا تھا' مختلف چینلز پہ ڈرامے تقریباً" اختتام کو پہنچ رہے تھے اور نیوز چینلز پہ ہیڈ لائنز آنا شروع ہو گئی تھیں۔
جن کو وہ کافی بوریت سے دیکھ رہی تھی اور ابھی وہ چینل بدلنے ہی والی تھی کہ سامنے ہی نیوز بریک کے دوران ولید رحمان کے پروگرام کا پرومو آنا شروع ہو گیا۔
"ایک سچ' ایک شام۔ اینکر پرسن ولید رحمان۔۔۔ عزت اس کی تصویر اور اس کا نام دیکھ کر حیرت زدہ سی بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو؟ کوئی اسپیشل نیوز ہے کیا۔" تیمور سیڑھیوں کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔
اور عزت تیمور کی آواز پہ چونک گئی تھی۔ اس نے تیمور کو حیران کن نظروں سے دیکھا تھا۔
"ارے۔۔۔ کیا بات ہے تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔" تیمور کو اب کی بار اچھی خاصی تشویش ہوئی تھی۔
"آپ بیٹھیں۔۔۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔" اس نے تیمور کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
"مگر کچھ بتاؤ تو سہی؟" تیمور الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔
"یہ بتانے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے' بس چند منٹ ویٹ کریں' نیوز ختم ہو رہی ہیں۔" عزت نے اسے انتظار کرنے کو کہا تھا اور تیمور تحمل سے کام لیتے ہوئے خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔
لیکن جیسے ہی نیوز بلیٹن ختم ہونے کے بعد ایک سچ ایک شام پروگرام آن ایر ہوا۔ تیمور صوفے پہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا تھا۔
"واٹ۔۔۔ ولید لائیو شو کر رہا ہے۔" تیمور کو پتا تھا کہ نیوز چینلز پہ آج کل کتنے کڑوے سچ آن ایر آ رہے ہیں اور ان کے نتائج کیا نکلتے ہیں' یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا۔
"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ یہ کیوں اپنا اور اپنے گھر والوں کا دشمن بنا ہوا ہے" تیمور نے اپنا سر تھام لیا تھا۔
"ولید رحمٰن آپ کا دوست ہے۔۔۔ تو کیا آپ کو نہیں پتا کہ وہ آج کل کیا کر رہا ہے؟" عزت نے تیمور کے رد عمل پر الٹا تیمور کو حیرت اور تعجب کا نشانہ بنایا تھا۔
"مجھے کسی کا پتا نہیں ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟"
تیمور کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ اسے ایک دھچکا مادرا کی طرف سے لگا تھا اور اب ایک دھچکا ولید کی طرف سے۔
"کیوں۔۔۔ اتنے آدم بے زاد کیوں ہو رہے ہیں؟" عزت کو مزید تعجب ہوا تھا۔
"کچھ نہیں۔" تیمور نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ولید کے پروگرام کا ٹاپک سنا۔
اور پھر ٹاپک کے ساتھ ساتھ جیسے ہی اس کا پروگرام سے اسٹارٹ ہوا' تیمور کا پریشانی کے مارے رنگ ہی بدل گیا تھا۔
اور ایسا ہی کچھ حال عزت کا بھی تھا' مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ اور لاپروا سی بیٹھی رہی تھی۔ مگر تیمور چپ نہیں رہ سکا تھا۔ اس کا پروگرام ختم ہوتے ہی اس کے نمبر پہ پہلی کال تیمور حیدر کی ہی گئی تھی۔
"ارے واہ۔۔۔ تمہیں بھی پروگرام دیکھنے کا ٹائم مل گیا؟ حالانکہ مجھے امید نہیں تھی۔" ولید نے اس کی کال ریسیو کرتے ہی بڑی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کیا تھا' یہاں تک کہ دعا سلام کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔

''اس پروگرام سے تو بہتر تھا کہ تم خودکشی کر لیتے۔'' تیمور کا غصہ اس کے لہجے اور اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہا تھا۔

''ہاہاہا... سمجھ لو کہ یہی کیا ہے۔'' ولید قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''یہ وہ خودکشی ہے' جس میں تمہیں خود بھی پتا نہیں ہو گا کہ تم نے کب مرنا ہے۔ جبکہ خود کو گولی مار لیتے تو تمہیں یقیناً علم ہوتا کہ تم نے ابھی اور آج ہی مرنا ہے۔''

جس طرح ولید کے اندر غبار اور انتشار ہلکورے لے رہا تھا۔ اسی طرح تیمور کے اندر بھی اک لاوا سا پک رہا تھا۔ جس کو نکلنے کے لیے کوئی راستہ چاہیے تھا۔

''جب انسان کو علم ہو جائے کہ اس نے آج اور ابھی مرنا ہے تو وہ اس مرنے سے پہلے بھی کئی بار مرتا ہے... جبکہ لاعلمی کی موت اذیت نہیں دیتی... بس موت ہی دیتی ہے۔ اک جھٹکے میں سب کچھ فنش...'' ولید نے جیسے بڑے لطف اندوز ہونے والے انداز میں کہا تھا اور تیمور کے دماغ کی پھرکی گھوم کے رہ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے... تم مرنا چاہتے ہو تو مرو... مجھے روکنے کی اور سمجھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔''

تیمور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور اپنا موبائل وہیں ٹی وی لاؤنج کے صوفے پہ اچھال کر غصے سے تلملاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

اور عزت وہیں بیٹھی تیمور کا ردعمل دیکھتی رہ گئی تھی۔



''ولید... ولید رحمان...!'' ماورا ٹی وی کے سامنے بیٹھی پروگرام ایک سچ ایک شام کے اینکر ولید رحمان کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا وہ اس سے مل چکی تھی... کیونکہ اس کی شکل اسے دیکھی بھالی سی لگ رہی تھی۔ اور اسے یاد آ گیا تھا کہ ولید رحمان' تیمور حیدر کا دوست ہے اور اس کی اس سے ملاقات فارہ اور آفاق کی شادی میں ہوئی تھی۔

''ہوں... تو یہ تیمور حیدر کا دوست ہے۔'' ماورا پر سوچ سے لہجے میں کہتی ہوئی ٹی وی آف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ماورا!'' وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی' جب ڈرائنگ روم سے عافیہ بیگم کی آواز سنائی دی تھی اور اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

''جی امی!'' وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی' وہ جائے نماز پہ بیٹھی تھیں۔ شاید ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔

''ادھر بیٹھو میرے پاس۔'' انہوں نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اور ماورا ان کے اشارے پہ اندر ہی اندر حیران ہوتی ان کے قریب ہی نیچے قالین پہ بیٹھ گئی تھی اور ان کے سفید چادر کے ہالے میں لپٹے ہوئے چہرے کی طرف کافی گہری اور سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''تم پریشان ہو؟'' اس کی سوالیہ نظروں کا جواب بھی اک سوال کی صورت ہی سامنے آیا تھا اور ماورا ان کے سوال پہ چونک گئی تھی۔

''میں... پریشان... نن... نہیں تو...'' ماورا کو پہلی بار ان کے سامنے اس طرح کسی چیز سے انکار کرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنا پڑا تھا۔

''تمہارے چہرے پہ لکھا ہے کہ تم پریشان ہو۔'' عافیہ بیگم کے لہجے میں یقین تھا۔

"غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بھلا کیا پریشانی ہوگی۔" اس نے لاپروائی کا خول چڑھاتے ہوئے فوراً" کندھے اچکائے تھے۔

"ماؤں کو کبھی غلط فہمی نہیں ہوتی۔ ہاں اولاد ماں 'باپ کو غلط قرار دے دے۔۔۔ یہ الگ بات ہے۔" عافیہ بیگم بڑے عجیب سے لہجے میں بولی تھیں۔

ماورا کو اس لمحے اپنے رب اور اپنی ماں کے سامنے بے پناہ شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"ایم سوری امی۔ ایسی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے۔ بس آفس کے کام کی طرف سے تھوڑی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔" اس نے ان کی تسلی کے لیے کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیا تھا۔

"تھوڑی نہیں۔۔۔ بہت زیادہ کہو۔۔۔ اگر تم تھوڑی ڈسٹرب ہوتیں تو تمہیں پتا ہوتا کہ بی گل کہاں ہیں؟" عافیہ بیگم نے کہتے ہوئے جائے نماز پہ رکھی تسبیح اٹھالی تھی۔

جبکہ ان کی بات پہ ماورا کو یک دم کرنٹ لگا تھا اور اس نے چونک کر تشویش بھری نظروں سے بے ساختہ ادھر ادھر دیکھا تھا۔

"واٹ بی گل! کہاں ہیں وہ؟"

"جب سے تم واپس آئی ہو۔۔۔ تمہیں نہیں پتا کہ بی گل کہاں ہیں۔ اور وہ نظر کیوں نہیں آ رہیں۔" عافیہ بیگم کے انداز میں اب خفگی اتر آئی تھی۔

"پلیز امی۔۔۔ اس بات کو چھوڑیں۔۔۔ بتائیں کہ بی گل کہاں ہیں۔" ماورا کی تو جیسے بی گل میں جان تھی 'اسے لگتا تھا کہ بی گل کے سوا کوئی ہے ہی نہیں جو اسے سمجھ سکتا ہو اور ان کے بغیر تو وہ کچھ بھی نہیں تھی۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔" عافیہ بیگم نے کہہ کر تسبیح شروع کرلی تھی اور ماورا ایک دم اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف لپکی تھی۔

"بی گل۔۔۔!" دروازہ کھولتے ہی اس نے ان کو پکارا تھا۔ وہ سامنے ہی بستر پہ بے سدھ پڑی تھیں۔ انہیں صبح سے بخار تھا اور وہ صبح سے ہی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ عافیہ بیگم نے ماورا کی بے دھیانی 'لاپروائی اور پریشان سی صورت دیکھ کر اسے نہیں بتایا تھا' ورنہ وہ کھانا پینا چھوڑ کر ان کے سرہانے بیٹھ جاتی۔

"بی گل۔۔۔ بی گل۔" وہ ان کو پکارتی ہوئی ان کے بیڈ کے قریب آئی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر چیک کیا تھا' مگر بخار کی شدت ایسی تھی کہ ماورا کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔ اتنا تیز بخار۔۔۔ اور۔۔۔ اور مجھے خبر ہی نہیں ہے۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی ان کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگی۔ "بی گل۔۔۔ ادھر دیکھیں نا میری طرف۔۔۔ کیا ہوا ہے آپ کو۔۔۔ یوں اچانک اتنا بخار کیسے ہو گیا؟" ماورا ان کا چہرہ تھپکتے ہوئے سچ مچ روہانسی سی ہو گئی تھی اور بے ساختہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر چومنے لگی تھی۔

"ما۔۔۔ و۔۔۔ را۔۔۔" اس کے ہاتھوں کا اور ہونٹوں کا لمس اپنے ہاتھوں پہ محسوس کرتے ہی بی گل نے غنودگی کے باوجود بے ربط سے الفاظ میں اس کا نام لیا تھا۔ ماورا ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔ آپ جلدی اٹھیں۔۔۔ ہم ابھی بی گل کو ہاسپٹل لے کر جا رہے ہیں۔"

"ابھی۔۔۔ مگر کیسے۔۔۔ ٹائم دیکھا ہے تم نے۔ اور ہمیں تو یہاں کے ہاسپٹلز اور ڈاکٹرز کا بھی نہیں پتا۔" عافیہ بیگم اٹھ کر جائے نماز سمیٹ رہی تھیں۔

"کس سے کہوں؟ کس سے ہیلپ لوں۔" ماورا نے اس وقت ہیلپ کے لیے ہر طرف ذہن دوڑایا تھا اور پہلا خیال نجانے کیوں تیمور حیدر کی طرف ہی گیا تھا۔ "نہیں۔۔۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں فارہ سے کہہ دوں۔ وہ گاڑی بھیج دے۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی تھی۔

"ماورا۔۔۔ کیا کررہی ہو' کیا کرنا ہے اب۔" عافیہ بیگم ذرا خفگی سے بولی تھیں۔
"بس۔۔۔ جسٹ فائیو منٹس۔۔۔ ابھی آرہی ہوں۔" ماورا اب انہیں کیا کہتی کہ ابھی تک تو کسی سے رابطہ ہی نہیں ہوا۔
"اس وقت کس کو ڈسٹرب کروگی' ابھی رہنے دو' ابھی میرا خیال ہے کہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو کر رکھتی ہوں' صبح ہوتے ہی ہاسپٹل لے جائیں گے۔"
عافیہ بیگم اس وقت گھر سے نکلنے سے کترا رہی تھیں۔ ان کے اندر کے وہم و وسوسے اب بھی مکمل طور پہ ختم نہیں ہوئے تھے۔
"پلیز امی۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوا۔ بی گل اتنا شدید بخار نہیں سہ سکیں گی' ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے سے بخار کم ہوگا۔ ان کی ویک نیس نہیں۔۔۔ انہیں پورے ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔" ماورا انہیں تسلی دینے والے اور سمجھانے والے انداز میں کہتی اپنے موبائل سمیت کمرے سے نکل آئی تھی۔
لیکن فارہ کا نمبر ڈائل کرتے کرتے رک گئی تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ رات کے اس پہر آفاق بھی ڈسٹرب ہوگا اور ویسے بھی رات کے اس پہر کسی کو پریشان کرنا۔
"ماورا۔۔۔ بی گل کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ جلدی آؤ۔" عافیہ بیگم بی گل کے پاس جاتے ہی گھبرا گئی تھیں اور انہوں نے کافی گھبرائے ہوئے انداز میں ماورا کو آواز دی تھی۔ جس پہ ماورا لپک کے دوبارہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔
بی گل کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا اور ان کے منہ سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ ان کی سفید رنگت اس وقت بخار کی حدت سے سرخی مائل ہو رہی تھی۔
اور ان کا یہ حال دیکھتے ہوئے ماورا سے رہا نہیں گیا تھا اور اس نے تیمور حیدر کی نیند میں بڑے بے دھڑک انداز میں خلل ڈال دیا تھا۔



تیمور کو سوئے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اس کے سیل فون پہ یک دم وائبریشن کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ سیل فون بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہوا تھا۔ اس لیے وائبریشن زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے باعث وہ کچی نیند سے ہڑبڑا کر بیدار ہوا تھا اور یوں ہی جاگے سوئے سے، ذہن کے ساتھ ہلکے سے اندھیرے میں سائیڈ ٹیبل کو ٹٹولتے ہوئے موبائل اٹھا لیا تھا' لیکن اس کے اٹھانے تک کال مس ہوگئی تھی۔
اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے نمبر چیک کیا اور نمبر چیک کرتے ہی اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔
"ماورا۔۔۔" تیمور نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔
"اس وقت۔۔۔ اس کی کال۔۔۔" تیمور کی پریشانی ایک فطری عمل تھا۔ جس کے تحت اس نے لیمپ آن کرتے ہوئے بے اختیار وال کلاک کی سمت دیکھا جہاں گھڑی اس وقت ایک بجا رہی تھی۔
"کیا مسئلہ ہے؟ وہ مجھے کال کیوں کر رہی ہے۔" وہ پریشان ہوا تھا۔
"کرتی ہے تو کرنے دو۔۔۔ تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ بس چپکے بیٹھے رہو۔" دل تو پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ فوراً" تلملاہٹ کا اظہار کیا تھا۔
"لیکن۔۔۔ کوئی پریشانی۔۔۔ کوئی مسئلہ بھی تو ہو سکتا ہے نا۔" دماغ اپنی سمجھ داری کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

''ہوتا ہے تو کسی اور سے کہے... تم سے کیوں؟'' دل کی بے رخی اور بے مروتی انتہا پہ تھی۔
''اس کا اور کون ہے یہاں۔'' دماغ پورا پورا دفاع کر رہا تھا۔
''اچھا... تم سمجھتے ہو کہ تم ہو اس کے۔'' دل نے مذاق اڑایا۔
''نہیں... ایسا سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔'' دماغ حقیقت قبول کر چکا تھا۔
''تو پھر اسے بھی چھوڑ دو... اور سو جاؤ۔'' دل' دماغ پہ حاوی ہو رہا تھا اور تیمور ان دونوں کی بحث و تکرار کے باعث سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ گیا تھا۔ مگر ابھی ایک منٹ ہی گزرا تھا کہ ماورا کی کال دوبارہ آ گئی تھی۔
اور تیمور کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ یقیناً" کسی پرابلم میں ہے۔ اس لیے ہر چیز کو کچھ دیر کے لیے دل و دماغ سے الگ کر کے رکھتے ہوئے اس کی کال ریسیو کر لی تھی۔
''السلام علیکم!'' تیمور نے بڑے نپے تلے سے لہجے میں سلام کیا۔
''وعلیکم السلام سر! ایم سوری... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔'' اس نے چھوٹتے ہی معذرت کی۔
''خیریت...'' وہ اس کے لہجے کی عجلت سے پریشان ہوا تھا۔
''جی... وہ دراصل بی گل بہت بیمار ہیں' ان کو ہاسٹل لے کر جانا بہت ضروری ہے۔'' ماورا بڑی عجلت میں بول رہی تھی۔
''ہوں... تو میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔'' تیمور کا لہجہ اور انداز حد درجہ نپے تلے سے ہو رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی نارمل نہیں ہو پایا تھا۔
''پلیز... ڈرائیور بھیج دیں... گاڑی بھیج دیں۔ کچھ بھی کریں... مگر پلیز میری ہیلپ کریں۔ میری بی گل بہت تکلیف میں ہیں۔ ان کی زندگی کا سوال ہے۔'' ماورا نے آج اپنی انا پرستی کے خول کو اتار کر ایک اس شخص سے ہیلپ کی التجا کی تھی' جس سے وہ خود بھی مر جاتی تو کبھی بھی ہیلپ نہ مانگتی' مگر بی گل کی خاطر وہ یہ بھی کر گزری تھی۔
اور تیمور حیدر اپنے دل و دماغ پہ اپنے جذبات کے مجروح ہونے کا داغ لیے بے اختیار اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔
''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' تیمور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
''ہونہہ... پھر وہی سلسلہ۔'' دل نے طنز کا تیر چھوڑا۔
''نہیں... یہ محض انسانیت کے ناتے کرنے جا رہا ہوں۔ ورنہ اس کے سود اور میرے زیاں کا قصہ وہیں کا وہیں ہے۔ وہ حساب کتاب کسی فرصت کے لیے اٹھا رکھا ہے۔'' وہ اپنے دل کو سمجھاتا' شرٹ پہن کر اپنا موبائل اور والٹ وغیرہ لے کر کمرے سے نکل آیا تھا۔



ٹھیک دس منٹ بعد جیسے ہی ان کی ڈور بیل بجی تھی ماورا نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا اور اپنے سامنے انتہائی لاپروا' گھریلو اور عام سے حلیے میں کھڑی ماورا مرتضیٰ کو دیکھ کر تیمور نے بے اختیار نظروں کا زاویہ بدل دیا تھا۔
''السلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔'' وہ باہر کھڑا اجازت طلب کر رہا تھا۔
''جی... جی... آیئے۔'' وہ فوراً" پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''آپ کی بی گل کہاں ہیں۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی سوال کیا تھا۔
''ادھر کمرے میں ہیں۔'' ماورا نے دائیں سائیڈ کی طرف اشارہ کیا تھا اور تیمور اس کی ہمراہی میں چلتا بی گل کے بیڈ روم تک آیا تھا۔
جہاں عافیہ بیگم بی گل کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔
''امی!'' ماورا کے پکارنے پہ انہوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور ماورا کے عین برابر کھڑے تیمور حیدر کو دیکھ کر بس دیکھتی رہ گئی تھیں۔
اگر ان کی ماورا خوب صورت اور پرکشش تھی تو اس کی پرسنالٹی بھی لاکھوں میں ایک تھی.... دونوں ایک ساتھ کھڑے ان کے احساسات کو چونکا گئے تھے۔
''یہ میرے باس ہیں۔'' اس نے آدھا ادھورا سا تعارف کروایا تھا' کیونکہ وہ کچھ دیر پہلے ہی ان کو بتا چکی تھی کہ اس پریشانی کے عالم میں اس کے پاس اپنی کمپنی کے باس کو کال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔
''السلام علیکم آنٹی۔'' تیمور نے احتراماً'' سلام کیا۔
''وعلیکم السلام۔'' عافیہ بیگم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔
''ماورا! آپ میرے ساتھ نیچے چل کر گاڑی کا دروازہ کھولیں' میں بی گل کو لے کر آرہا ہوں۔ آنٹی! آپ گھر لاک کر کے آجائیں۔'' تیمور مزید کچھ بھی کہے بغیر بی گل کی طرف بڑھا تھا اور پھر انہیں خود اٹھا کر نیچے گاڑی تک لے کر آیا تھا۔
عافیہ بیگم ماورا کا بیگ' موبائل' اپنی چادر وغیرہ لے کر گھر کو اچھی طرح لاک کر کے نیچے آگئی تھیں اور ان کے آتے ہی تیمور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔
اور پھر گھر سے لے کر ہاسپٹل تک سارے کام اور سارے انتظام تیمور نے خود ہی نپٹائے تھے۔
ماورا تو بس بی گل کے ساتھ ساتھ تھی۔



فجر کی نماز ادا کر کے جیسے ہی اس نے سلام پھیرا اس کی نظریں ایک ہی جگہ پہ ٹکی رہ گئی تھیں۔
تیمور حیدر بائیں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور اس کی یہ غفلت بھری نیند دیکھ کر ماورا کو احساس ہوا تھا کہ اس نے ان لوگوں کی وجہ سے یہ رات ان کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے گزار دی تھی اور نیند آئی بھی تو کب....
جب صبح ہونے کو تھی۔
وہ بی گل کے لیے دعا مانگنے کے بعد اٹھ کر دھیمے قدم اٹھاتی' سیدھی اس کے قریب آئی تھی۔
''ہیلو.... سر....'' اس نے آہستگی سے اسے پکارنے کی اور جگانے کی کوشش کی تھی۔
''ہیلو....'' اسے ساتھ ساتھ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ابھی ابھی سوئی عافیہ بیگم ہی نہ اٹھ جائیں۔ آخر وہ بھی رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ ماورا نے ضد کر کے انہیں آرام کرنے کے لیے بیڈ پہ لٹایا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سو گئی تھیں۔
''ہیلو سر....!'' ماورا کے دو' تین بار پکارنے کے باوجود وہ نیند سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ماورا نے ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرے صوفے پہ اس کی اپنی چادر رکھی ہوئی تھی۔ وہ یوں ہی دبے قدموں گئی اور اپنی چادر تہ کر کے لے آئی تھی۔

اور تیمور کے صوفے کی پُشت پہ دائیں طرف لڑھکے ہوئے سر کے نیچے اپنی چادر کا تکیہ سا بنا کے رکھ دیا تھا اور اس کے سر کو اک آرام دہ پوزیشن میں ٹکا کر پیچھے ہٹتے ہوئے ابھی وہ اپنا ہاتھ کھینچ ہی رہی تھی کہ تیمور کی کسی نرم سے احساس کے تحت بے ساختہ آنکھ کھل گئی تھی۔

اور صوفے پہ اس طرح اپنے بے حد قریب جھکی ماورا کو دیکھ کر اس کی ساری نیند ہوا ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔

جس کو محسوس کرتے ہوئے وہ یک دم پیچھے ہٹ گئی تھی، لیکن تیمور تو جیسے جوں کا توں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ پہلے سو رہا تھا یا اب۔

"ایم سوری سر.... میں کافی دیر سے آپ کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر آپ شاید گہری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے میں نے آپ کے سر کے نیچے...."

ماورا کو وضاحت دیتے ہوئے اندر سے اچھی خاصی خفت ہوئی تھی۔

جبکہ تیمور نے اپنے دماغ کو نیند سے بیدار کرتے ہوئے آس پاس کی سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور پھر اپنے سر کی دائیں سائیڈ پہ رکھی اس کی چادر کا تکیہ دیکھ کر چپ ہو گیا تھا۔ گویا وہ اس کے آرام کا خیال کر رہی تھی؟

"اٹس اوکے.... بیٹھے بیٹھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب نیند آ گئی؟" تیمور نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیرتے ہوئے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لانے چاہے تھے۔

"ایم سوری! ہماری وجہ سے آپ رات بھر ڈسٹرب ہوئے ہیں، لیکن اب اللہ کا کرم ہے، بی گل کی طبیعت سنبھل چکی ہے۔ اسی لیے میں آپ کو جگا رہی تھی کہ صبح ہونے ہی والی ہے، آپ گھر چلے جائیں اور تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" ماورا نے اسے جگانے کی وجہ بھی بیان کر ڈالی تھی۔

"ڈاکٹر یا کسی نرس نے وزٹ کیا۔" تیمور اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں.... اب وہ صبح آٹھ بجے ہی وزٹ کریں گے اور ویسے بھی بی گل کا بخار پہلے سے کافی کم ہو چکا ہے۔" ماورا نے کہتے ہوئے بیڈ کی طرف دیکھا، جہاں بی گل دوائیوں کے زیر اثر غنودگی میں گم تھیں۔

"اور وہ ڈرپ؟" تیمور ساری تفصیل معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔

"وہ صبح لگے گی۔" وہ بڑے سکون سے جواب دے رہی تھی۔

"ہوں.... ٹھیک ہے.... میں چلتا ہوں اب.... آدھے گھنٹے تک آپ لوگوں کا ناشتا پہنچ جائے گا۔" تیمور کچھ لیے دیے سے انداز میں کہتا دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"مگر سر! ناشتے کی کیا ضرورت۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ناشتا میں اس لیے نہیں بھیج رہا کہ آپ میرے لیے کچھ اسپیشل ہیں.... بلکہ آپ کی جگہ اس وقت کوئی اور بھی ہوتا تو میں اتنا خیال تو ضرور ہی کرتا۔ خاص طور پہ خواتین کے لیے۔"

دروازے میں جا کر پلٹتے ہوئے وہ ایسا جواب دے کر گیا تھا کہ ماورا کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ تیمور حیدر کے دل کی جلن اس کے الفاظ میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اور اس کے جانے کے بعد ماورا کو احساس ہوا تھا کہ مرد عورت کے لیے کتنا بڑا تحفظ اور کتنا بڑا سہارا ہے؟ اس کے جانے کے بعد پھر سے وہ تینوں خواتین اکیلی اور بے سہارا لگنے لگی تھیں۔ جن کو اپنے لیے، جو بھی کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔

وہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی تھی جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا۔



ولید کو رات سے ہی طرح طرح کی فون کالز موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ اتنا لاپروا اور بے نیاز تھا کہ اسے کسی کی بھی کال کی کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ ہاں البتہ ایک تیمور حیدر تھا جس کی کوئی بھی چیز وہ نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اپنے کام کے دوران بھی اس کا دھیان تیمور کی کال کی طرف ہی رہا تھا۔

کیونکہ اسے پتا تھا کہ تیمور اس کی وجہ سے اندر ہی اندر جلتا کڑھتا رہے گا اور طرح طرح کی ٹینشن سوار کیے رکھے گا۔ اس لیے صبح ہوتے ہی اپنے چند اہم کام نپٹا کر وہ سیدھا اس کے آفس گیا تھا۔ وہاں اس کی سیکریٹری سے پتا چلا کہ سر کی شاید طبیعت خراب ہے۔ اس لیے وہ ابھی تک آفس نہیں آئے۔

''اوہ۔۔۔ طبیعت کیوں خراب ہو گئی۔'' ولید سوچتے ہوئے واپس اپنی بائیک تک آ گیا۔ ''کال کروں تب بھی وہ ریسیو نہیں کرے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس سے گھر پہ ہی جا کر مل لوں۔'' بائیک کو کک لگاتے ہوئے اس نے سوچا اور بائیک کا رخ تیمور کے گھر کی طرف ہی موڑ دیا تھا۔

''لیکن عزت بھی وہیں ہو گی۔'' اک اور سوچ کے آتے ہی اس نے بائیک کی اسپیڈ کم کر دی تھی۔

''نہیں۔۔۔ اس وقت وہ یونیورسٹی میں ہو گی ـــ میں تب تک تیمور سے مل کر واپس آ جاؤں گا۔ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہمارا ایک دوسرے سے سامنا نہ ہو۔''

ولید کچھ دیر بعد ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے پہنچ ہی گیا تھا۔

''ہیلو۔۔۔ تیمور گھر پہ ہے۔'' اس نے بریک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاحب جی۔۔۔ تیمور صاحب گھر پہ ہی ہیں۔۔۔ آئیے آپ اندر آ جائیے۔'' چوکیدار نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے گیٹ کھول دیا اور ولید بائیک اندر لے آیا تھا۔

''آئیے صاحب جی۔۔۔'' ملازمہ اسے ساتھ لیے اندر آ گئی تھی۔

''آپ بیٹھیں۔۔۔ چھوٹی بیگم صاحبہ بھی اندر ہی ہیں۔ میں تیمور صاحب کو اطلاع کرتی ہوں۔'' ملازمہ اسے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ جبکہ ولید چھوٹی بیگم صاحبہ کا نام سن کر ٹھٹک گیا تھا۔ لیکن اب وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ مگر اندر سے آنے والی اپنی آواز سن کر اسے یک دم اندر کی طرف دیکھنا ہی پڑا تھا۔ جہاں عزت حیدر صوفے پہ نیم دراز اپنی گود میں لیپ ٹاپ رکھے ولید کے پروگرام کو بار بار دیکھ رہی تھی اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں کھڑا ولید اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



حیا بخاری

دل کی عید

"سائرہ۔" وہ دادو کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی کہ جہاں آرا اسے ڈھونڈتی وہاں آپہنچیں۔

"امی پلیز! میرا اس وقت کوئی کام کرنے کا موڈ نہیں۔" ہمیشہ کی کاہل سائرہ نے فوراً" منہ دادو کی گود میں چھپالیا۔ امی کے ساتھ دادو بھی مسکرادیں اس کی اس حرکت پہ۔

"توبہ ہے لڑکی! کام کے نام سے ایسی چڑ اچھی نہیں ہے۔ اگلے گھر جا کے میری ناک نہ کٹوا دینا کہیں۔" جہاں آرا نے اس کی کمر پہ دھپ رسید کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ تو وہ تیزی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

"امی پلیز! میرا موڈ آف نہ کریں۔" وہ بگڑی۔

"اچھا شہریار دو تین بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔ تم نے عید کی شاپنگ کرنے نہیں جانا؟ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔" جہاں آرا اسے اصل بات بتاتے ہوئے بولیں تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"مجھے نہیں منانی اس بار عید۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔

"ہیں..... وہ کیوں؟" اب امی کے ساتھ دادو بھی حیران ہوئیں۔

"نام کی ہی عید ہوتی ہے ہماری .... سارا دن میٹھا کھا کھا کر منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔" ایک اور نئی منطق۔

"اور پھر خالہ' ماموں' چاچا' سب کے گھر جاؤ مگر عیدی کے نام چند سو روپے ہی بنتے ہیں۔" سائرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تو اندر آتا شہریار زور سے ہنس دیا۔

"اس دفعہ تو پھر تم عید کی ڈھیر ساری تیاری کرو۔" وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیڈ پہ ٹکتے ہوئے بولا تھا۔

"وہ کیوں۔" وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

"کیوں کہ یہ پچاس پچاس روپے والی عیدی تب ملتی تھی 'جب میری جاب نہیں تھی اور گھر میں تنگی چل رہی تھی۔ اب میری اتنی اچھی جاب سے جہاں حالات بدلے ہیں 'وہیں دیکھنا یہ سب رشتے دار کیسے رنگ بدلتے ہیں۔" شہریار کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"ایسا نہیں کہتے شہریار بیٹا۔" امی نے فوراً" اسے سمجھایا۔

"کسی کے بارے میں بدگمان نہیں ہوا کرتے شہری۔" دادو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بدگمان؟ نہیں دادو! میں بدگمان نہیں ہوں۔ بلکہ سب کچھ ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ بابا کی اچانک وفات کے بعد سب لوگوں نے کس طرح ہم سے منہ پھیر لیا۔ اس بات کے سب گواہ ہیں۔ وہ بابا جو سب کی خوشی غمی میں پیش پیش ہوتے 'دوسروں کی تکلیف پہ پانی کی طرح پیسے بہا دیتے' جب ان کی اپنی فیملی پہ کٹھن وقت آیا تو سب ہی نے منہ پھیر لیا۔ حتیٰ کہ سگے چاچو بھی دادی! انہوں نے تو آپ کا حال تک نہیں پوچھا کبھی اس خوف سے کہ کہیں آپ کا بوجھ بھی ان کے سر نہ آجائے۔ یہ تو بس آپ اور امی ہیں کہ ہم زبردستی ان سے نباہ رہے ہیں۔"

وہ تلخی سے بولا۔ اس بار دونوں خواتین چپ رہیں کہ اس کی بات بھی بالکل سچ تھی۔

"لیکن اس بار دیکھیے گا۔ واضح فرق محسوس کریں گی آپ ان کے رویے میں' بلکہ سب کے رویوں میں اور تم سارو' خوب عیدی جمع کرنا اس بار۔"

وہ بہن کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"اور اگر اب کی بار بھی وہی پچاس کا نوٹ ملا ہر طرف سے تو۔" اس کی خوب صورت نیلی آنکھوں میں اندیشے بول رہے تھے۔

"تو بھائی زندہ باد یار۔ اس ماہ کی ساری تنخواہ تیرے ہاتھ پہ رکھ دینی ہے پھر۔" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ سائرہ خوشی سے اچھل پڑی۔

"شام کو تیار رہنا۔ شاپنگ کے لیے چلیں گے ہاں۔" اسے ہدایت کرتا وہ امی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

"ٹھیک ہی کہتا ہے شہریار! آج کل تو رشتے بس دنیا داری طمع ولالچ کے زنجیروں سے ہی بندھ کے رہ گئے ہیں۔ اب اس کی اچھی جاب کی وجہ سے سب کو اپنی اپنی بچیوں کے اچھے مستقبل نظر آرہے ہیں۔ ہک ہاہ' ایک ہمارا دور ہوا کرتا تھا۔ خالص' محبتوں اور رواداری سے بھرپور۔ تب مزہ آتا تھا عید کا۔" دادو کی آنکھوں میں پرانی یادوں کی چمک ابھری۔ سائرہ اشتیاق سے ان کو دیکھنے لگی۔

"دادو کیسی ہوتی تھی تب عید۔ آپ کو عیدی ملتی تھی۔" وہ پر تجسس انداز میں بولی۔

"بہت پیاری' محبتوں بھری۔ ہر لالچ سے پاک لوگ بے دھڑک ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے۔ آج کے دور کی طرح نہیں کہ آؤ تو فون کر کے آنا۔ اس وقت تو یہ بدتہذیبی سمجھی جاتی۔ سارا دن آنا جانا رہتا۔ خوب محفلیں جمتیں۔ ٹکے آنے میں عیدی ملتی اور کئی بچوں کو یہ بھی نہ ملتی۔ مگر انہیں احساس تک نہ ہوتا۔ کیونکہ سارے فرق مٹا کر عید منائی جاتی تھی تب۔ جو کچھ بھی ہوتا آپس میں مل بانٹ کر کھایا جاتا۔"

"اوہ مطلب شیرنگ از کیرنگ" وہ مسکرائی۔

"اب یہ تو مجھے پتا نہیں۔ ہاں مگر سچ کہوں تو پیسہ ویسہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ دل کی عیدی بڑی چیز ہوتی ہے۔"

دادو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سائرہ نے حیرت سے دادو کا چہرہ دیکھا جو کسی انجانی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"دل کی عیدی۔ اس کا کیا مطلب دادو!" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب دل کو وہ سچی خوشی مل جائے جو اس عید کا مقصد ہے اور جس کے لیے اللہ پاک نے ہمیں اس نعمت سے نوازا ہے۔"

"دادی اس کا کیا مطلب ہوا میں سمجھی نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"جب تجھے کبھی زندگی میں یہ احساس ہوگا نا تو تجھے خود بخود سمجھ آجائے گا۔ اسے لفظوں سے میں تو سمجھا نہیں سکتی تجھے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب جاؤ۔ ذرا ماں کا ہاتھ بھی بٹا دیا کرو۔ میں بھی ذرا تلاوت کرلوں۔" دادو نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ فوراً" سر اثبات میں ہلا کر اٹھ گئی۔



شہریار نے اس بار اسے خوب جی بھر کے شاپنگ کرائی تھی۔ اس نے ہر وہ چیز لی تھی، جس کی کبھی وہ صرف خواہش کیا کرتی تھی۔ شہریار نے اسے مکمل آزادی دی تھی اور اس نے بھی خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ امی اور دادو کے لیے بھی ساری شاپنگ اس نے کی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

چاند رات کو شہریار کی بات سو فیصد سچ ثابت ہوئی۔ جو رشتہ دار عید کے دن بھی ان کے گھر آنے سے کتراتے تھے۔ تحائف سے لدے پھندے چاند رات کو ان کے موجود تھے۔ اپنے سابقہ تمام رویے بھلائے وہ یوں محبت نچھاور کررہے تھے۔ دادو تاسف سے اپنی اولاد کو دیکھے جارہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پہ اک چپ سی لگی تھی، وہ کسی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھیں۔ امی البتہ ان کی خاطر داری میں لگی تھیں۔

شہریار کے ہونٹوں سے بھی طنزیہ مسکراہٹ چپک کے رہ گئی تھی، نہ جانے کیوں دل کے شفاف آئینے پہ ایک بار میل آجائے تو دھل ہی نہیں پاتی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سائرہ البتہ بے حد خوش تھی۔ وہ ہمیشہ رشتوں کے لیے ترسی تھی۔ سو اپنے گرد جمع اب یہ لوگ اسے نعمت خداوندی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ سب لوگ آدھی رات تک ان کے گھر رہے۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک بھائی کے ساتھ سب کے گھر جانے کی پلاننگ کرتی رہی اور شہریار دل ہی دل میں ان کی اچانک محبت کا توڑ سوچے جارہا تھا۔



بھائی کے پیچھے بائیک پہ بیٹھی وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی، سب سے پہلے وہ خالہ کے گھر گئے۔ خالہ اور ان کی دونوں بیٹیاں آج ان دونوں کی بہت آؤ بھگت کررہی تھیں۔ سائرہ تو حیران تھی۔ کیوں کہ جب وہ آئے تو ان کے آگے ذرا سی مٹھائی رکھ کر یہ کہہ کر فارغ کردیا جاتا کہ ان کی کہیں دعوت ہے۔ مگر آج تو وہ انہیں لنچ کی دعوت دے رہے تھے۔

آج خالہ نے پچاس کی جگہ اسے ہزار کا نوٹ تھمایا تو اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"اور بیٹا امی کیسی ہیں؟" خالہ نے لہجے میں محبت سمو کر کہا۔

"بالکل ٹھیک ہیں خالہ اور اب تو خوش بھی کافی ہیں۔" شہریار مسکرایا۔

"ہاں خوش کیوں نہیں ہوگی۔ ماشاءاللہ کتنا بڑا افسر بن گیا ہے اس کا بیٹا۔" خالہ کی آنکھیں چمکیں۔

"اس سے بھی بڑی خوشی میری شادی کی ہے خالہ۔ میں نے امی کے لیے بہت پیاری بہو تلاش کرلی ہے۔ امی تو بے حد خوش ہیں۔" مٹھائی کھاتی سائرہ کو زور سے اچھو لگا۔ وہ حیرت سے بھائی کو تکنے لگی۔ ادھر خالہ اور بیٹیوں کا موڈ ایک دم آف ہوا تھا۔

"چلتے ہیں خالہ! پھر آئیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے اجازت لیتا باہر آیا۔

"کون ہے بھائی کیسی ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ خفا تھی۔

"ڈراما ہے۔ تم بس دیکھتی جاؤ۔" وہ ہنسا تھا۔ اور سائرہ نا سمجھی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

چاچا' چاچی دونوں ہی آج شہریار کی تعریفوں میں رطب اللسان تھے۔ جو پہلے ان کے لیے جاہل اور نکمھٹو ہوا کرتا تھا۔ آج ان کی نظر میں فرمانبردار اور قابل ترین انسان تھا۔ سائرہ بھی شاید یہ بدلے تیور سمجھنے لگی تھی۔ تب ہی اس بار اس کے دل کو وہ خوشی حاصل نہ ہوئی جو اس نے خالہ کے گھر محسوس کی۔

باتوں باتوں میں شہریار نے وہاں بھی اپنی پسند کا ذکر چھیڑ دیا تھا اور خالہ کے گھر کی طرح وہاں بھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ساری محبت ساری رواداری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہاں سے نکلتے وقت سائرہ مکمل طور پہ اداس تھی۔

"اب کہاں چلیں سارو۔" اس نے محبت سے بہن کو پکارا۔

"دریا کے کنارے چلیں بھائی! میرا دل بہت اداس ہو رہا ہے۔" اس نے فرمائش کی۔ شہریار نے خاموشی سے اس کی بات کی تعمیل کی۔

"پتا ہے سارو! خوشی پیسے' حیثیت یا امارت سے نہیں ملتی۔ خوشی.... سچی خوشی دل کی سچائی سے ملتی ہے۔ محبت سے ملتی ہے۔ خلوص سے ملتی ہے۔"

دریا کے کنارے بنی تارکول کی صاف شفاف سڑک پر بے حد دھیمی رفتار سے بائیک چلاتے ہوئے وہ بہن کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"دل کی خوشی پیسے سے نہیں خریدی جاسکتی۔ بلکہ دوسروں کے کام آکر اور لوگوں کی محبت اور سچائی کو پرکھ کے ملتی ہے۔" وہ بھی اداس تھا۔

موسم بے حد پیارا ہو رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ چرند پرند غول کی صورت میں گھروں کو روانہ تھے اور سائرہ کے دل میں یہ منظر جو کبھی بے حد مسرت کا باعث بنتے آج یاسیت سی بھر رہے تھے۔

تب ہی اس کی نگاہ سڑک کے دوسری طرف بنی بہت سی جھونپڑیوں پہ پڑی۔ اس نے فوراً" شہریار کو بائیک روکنے کے لیے کہا اور نیچے اتر آئی۔ سڑک کنارے ٹھہر کے وہ ان لوگوں کا جائزہ لینے لگی۔

حال ہی میں وزیرستان کے کچھ علاقوں میں آرمی نے آپریشن شروع کیا تھا ملک میں دہشت گردی کی وجہ بننے والے لوگوں کے خلاف۔ جس کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ لوگوں کو اپنا بسا بسایا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ سائرہ نے دیکھا۔ جھونپڑیوں میں مکمل بے سروسامانی تھی۔ وہ کسی کو بارش' دھوپ یا موسم کی کسی بھی شدت سے بچانے کے لیے کافی نہ تھیں۔

سر شام ہی عورتیں کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ کچھ سوکھے پتے جلا کر تو کوئی کوڑا کرکٹ جلا کر کھانا پکا رہی تھی۔ نامکمل کپڑے پہنے بچے ماؤں سے بے فکر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کچی مٹی میں کھیل رہے تھے۔

مرد چارپائیوں پہ بیٹھے لیٹے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھے گئی اور شہریار اسے۔

"بھائی! ہم لوگ ذرا لائٹ جانے پہ واپڈا والوں کو کتنی بددعائیں دیتے ہیں اور یہاں تو ان کو پتا ہے کبھی ان جھونپڑیوں میں ایک بلب بھی نہیں جلنا۔ پھر بھی کتنا سکون ہے ان کے چہروں پہ۔" وہ حیرت سے بولی۔

"یہاں شہر میں لوگ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر بھی انتہائی باریک اور سلیولیس لباس پہنتے ہیں پھر بھی گرمی سے تڑپتے ہیں اور یہ جو اس گرمی کے عادی بھی نہیں' بے حد ٹھنڈے علاقوں کے مکین ہیں۔ ان کے موٹے اور مکمل کپڑے کیا یہ ہمارے منہ پہ طمانچہ نہیں۔" وہ نہ جانے کس سوچ میں گم کہہ رہی تھی۔ شہریار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پھر بھی ہمارے چہروں اور ہمارے دلوں میں وہ سکون نہیں جو ان کے چہروں پہ میں دیکھ پا رہی ہوں۔ کتنے مطمئن انداز میں جی رہے ہیں۔ نہ بستر مکمل نہ چھت اور نہ ہی خوراک پھر بھی اتنی آسودگی۔

کچھ بھی تو نہیں ان کے پاس۔ نہ پیسہ' نہ عیش و عشرت' بلکہ اپنا پیارا گھر تک نہیں رہا ان لوگوں کے

پاس۔ پھر بھی کیسے صبر سے جی رہے ہیں۔ کتنا اطمینان ہے ان کے چہروں پہ۔" وہ گم صم بولے جارہی تھی۔

"چلیں گڑیا شام گہری ہو رہی ہے۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" شہریار موبائل پہ وقت دیکھتے ہوئے بولا۔

"ان کے پاس نیچے چلیں بھائی۔" اس نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"ہاں۔" شہریار چونکا۔

"وہاں چلیں مجھے ان لوگوں سے عید ملنا ہے۔ ان سب سے باتیں کرنی ہیں۔" وہ مچلی۔

"وہ ناراض نہ ہو جائیں۔ غیور پٹھان ہیں یار۔" وہ ہچکچایا۔

"نہیں ہوں گے۔ آپ دور کھڑے رہنا۔ میں اکیلے مل آؤں گی۔" وہ اڑ گئی۔

"اوکے بابا' چلو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ سامنے لیٹا مرد دیکھتے ہی ان کے قریب چلا آیا تھا۔ شہریار کو پشتو آتی تھی۔ تب ہی اسے بات کرنے میں کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ سائرہ شہریار کا اشارہ ملتے ہی تیزی سے اندر عورتوں کے پاس چلی آئی۔ وہ سب اپنی اپنی چادر کا کونا دانتوں تلے دبانے لگیں۔ سائرہ نے دیکھا وہ بے حد حسین تھیں۔ ننھے منے گورے چٹے بچے اسے گھیرنے لگے تھے۔ اسے بے حد مزہ آنے لگا۔ ان میں ایک عورت اردو جانتی تھی۔ وہ اسے اپنے علاقے کے متعلق بتانے لگی۔ انہوں نے اسے گڑ کا بنا ہوا پتیسا بھی دیا جو اس نے بہت شوق سے کھایا۔

"تم لوگ اپنے گھربار چھوڑ کے اداس تو ہو گے۔" بہت ساری باتیں کرنے کے بعد اس نے شاہ گل نامی عورت سے پوچھا جو اردو جانتی تھی۔

"نہ بی بی! اداس کیسا۔ بس ایک بار پاکستان اچھا ہو جائے۔ یقین کرو بی بی۔ اتنے خوب صورت خوب صورت جوان ہیں ہمارا اور جان ہتھیلی پہ رکھ کر صرف ہمارے آرام کی خاطر کھڑا ہوتا ہے۔ خدا کی قسم اگر امارا فوج نہ ہوتا تو اب تک پاکستان کو کچا کھا گیا ہوتا دشمن۔"

سائرہ نے حیرت سے اس محب وطن عورت کو دیکھا تھا۔ جس کی آنکھوں میں گھربار چھوٹنے کے افسوس کے بجائے وطن کی محبت چمک رہی تھی۔

"ہم تو دعا کرتا ہے کہ اللہ پاکستان کے دشمنوں کو ایسے مٹا دے جیسے اس نے کہا ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کو جڑ سے ختم کر دے گا۔" وہ کتنا سادہ بولتی تھی۔ سائرہ کو اس پہ فخر سا محسوس ہوا۔

"تم لوگوں کو کتنی...." وہ فکرمند ہوئی۔

"مشکل آتی رہتی ہے بی بی۔ تم دیکھنا ہم پھر سے اپنے گھروں میں آباد ہو گا۔ پورے امن اور خوشی کے ساتھ۔" وہ جذبے سے بولتی سائرہ کو سرشار کر گئی۔

اس نے نرمی سے اس عورت کا ہاتھ تھام لیا۔

"سارو! چلیں جلدی آؤ۔" شہریار نے آواز لگائی۔

سائرہ نے اپنی ساری عیدی ان عورتوں اور بچوں میں بانٹ دی اور ڈھیر ساری محبتیں اور دعائیں سمیٹے وہاں سے نکل آئی۔

"سو۔ اب وہاں جا کر کیا مل گیا میری سارو کو۔" شہریار نے بائیک اسٹارٹ کرتے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ایک بہت بڑا یقین ملا ہے بھائی۔ دادو نے کہا تھا کہ ان کے دور میں جو سچی خوشی ملتی تھی وہ آج کل نہیں ملتی۔ ایک لفظ کہا تھا انہوں نے دل کی عیدی۔ مجھے اس وقت اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ مگر آج مجھے یہ یقین ملا ہے کہ آج بھی مخلص محبتیں اور سچی خوشیاں موجود ہیں۔ بس ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔" وہ سرشاری سے بولی۔

"واہ۔ مطلب میری بہن کو سچی خوشی مل گئی آج۔" شہریار نے بائیک آگے بڑھائی۔

"سچی خوشی بھی اور دل کی عیدی بھی۔ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔"

تیز ہوا میں اڑتے بالوں کو سنبھالتے ہوئے وہ بھائی کے کانوں میں زور سے چلائی تھی اور شہریار اس کی اس حرکت پہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

٭

عائشہ نصیر احمد

اک ہاتھ ذرا بڑھا

"ابا جی نے کہا ہے اس مہینے کے آخر میں وہ گاؤں جائیں گے اور نسیمہ اور بھائی کے رشتے کی بات پکی کر کے ہی واپس آئیں گے۔ بھلا بتاؤ... میرے رنج کے سونے بھائی کے لیے اس پوری دنیا میں ایک وہی بھینس رہ گئی ہے۔"

صبح سے یہ تیسرا نام تھا' جو رانی اپنی متوقع بھابھی کو دے چکی تھی۔ غصے اور تشویش کے باعث ہاتھ میں پکڑے گولے گنڈے کو چوس چوس کر اس کا رنگ بھی اڑا چکی تھی۔ مومل نے ایک نظر اس کے پھولے پھولے گالوں پر ڈالی۔ اگر نسیمہ بھینس تھی تو رانی کسی بچھیا سے بالکل بھی کم نہیں تھی۔ مگر اس وقت اس کے سامنے یہ بات کرنا ایک نئی بحث کو چھیڑنے کے مترادف تھا اور مومل پہلے ہی بے زار بیٹھی تھی۔

"چھوڑو رانی... تم فضول میں فکر کر رہی ہو۔ تمہارا بھائی تو بہت خوش ہوگا۔ اس کے باڑے میں ایک اور بھینس کا اضافہ ہوئے گا۔" رانی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"اڑا لے مذاق بدتمیز... تیری بھابھی اتنی خوب صورت ہے۔ اس لیے تجھے یہ لطیفے سوجھ رہے ہیں۔ میرا تو اکلوتا اک بھائی ہے۔ وہ بھی اتنا سجیلا۔ میں تو بالکل برداشت نہیں کرنے والی۔ اس ڈھول کو بھابھی کے روپ میں۔"

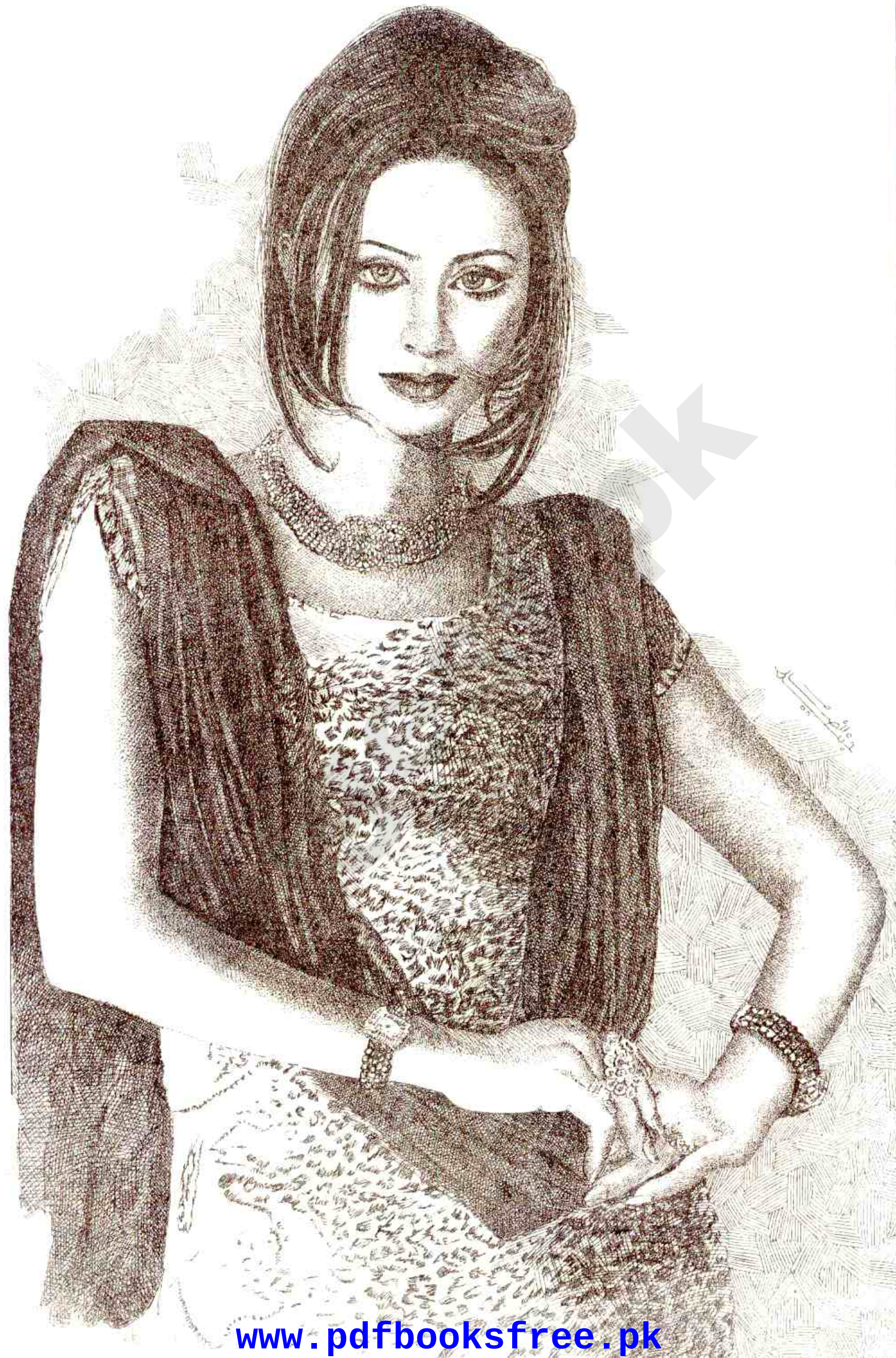
"آہ... یہی تو رونا ہے۔ ساری دنیا بس خوب صورتی کے پیچھے بھاگتی ہے... یہ نہیں دیکھتی کہ اس خوب صورتی کے پیچھے کیسی کیسی چڑیلیں چھپی بیٹھی ہیں۔ اب میری بھابھی کو ہی دیکھ لو۔ صورت سے جتنی حسین نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے رات ہوتے ہی

ناولٹ



اس نے دانت لمبے اور پاؤں پیچھے کو مڑ جاتے ہوں گے۔ ایسی ایسی حرکتیں ہیں اس کی کہ چھل پیریاں بھی شرما جائیں۔ تلوار سی زبان اور فتنہ دماغ... خدا ہی بچائے تمہیں میری بھابھی جیسی بھابھی سے۔ دوست ہوں' سچے دل سے دعا دے رہی ہوں۔" رانی نے بھابھی کا نام کیا لیا' مومل کے تو زخم ادھڑ گئے۔

"ہاں... تو تیرا بھائی بھی تو پکا رن مرید ہے۔ کوئی ہو بیوی کی لگائیں کسنے والا۔ پھر وہ چوں کر کے دکھائے۔" رانی نے چمک کر کہتے ہوئے گولے گنڈے والا ہاتھ ہلایا تو ذائقے اور رنگ سے عاری برف بکھر کر زمین پر جا



گری۔

"بس کردے' جان چھوڑدے اس کی۔ ویسے بھی اب اس میں کچھ نہیں بچا۔" مومل اپنا گولا گنڈا کب کا ختم کر چکی تھی' جبکہ رانی نے جوش خطابت میں اس کا برا حال کر دیا تھا۔

"ہاں... تو تجھے کیا لگا... میں اب زمین سے اٹھا کر کھانے والی ہوں۔"

"تیرا کوئی بھروسا بھی نہیں۔ چل اٹھ 'اب کلاس میں چلیں' ویسے بھی جس طرح آج صبح سے میڈم زرینہ ایک ایک بندے کو جھاڑ رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے پکا آج ساس سے جھگڑا کرکے آئی ہیں۔"

"ہائے... مجھے نہیں جانا۔" وہ ایک دم ہی رکی تھی۔ چہرے پر ہراس بکھر گیا۔

"کیوں...؟" مومل نے ٹھٹک کر اس کی صورت دیکھی۔ "اب یہ مت کہہ دینا کہ تم نے آج پھر ٹیسٹ کی تیاری نہیں کی۔"

"آہو... کچھ ایسا ہی ہے۔" اس نے تھوڑی جھنجلاہٹ اور شرمندگی سے کہا۔

"مر کہیں جاکے منحوس... تو اسی قابل ہے کہ وہ نسیمہ ہی تیری بھابھی بنے۔" مومل سلگ گئی۔

"ایک انگریزی کا ٹیسٹ یاد نہیں کیا تو' تو اس نسیمہ کو میری بھابھی بنانے لگی۔ ہائے مومل... دیکھ لی تیری دوستی۔" وہ صدمے میں آگئی۔

"ہاں... یہ ہی ہے میری دوستی... تیرے مارکس دیکھ کر تجھ سے زیادہ رونا آتا ہے مجھے۔ مگر خیر اب مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں روز' روز تیرے لیے اپنی جان ہلکان نہیں کرسکتی۔ میں جارہی ہوں۔ تجھے آنا ہو تو آجانا۔" اسے گھور کر کہتے ہوئے مومل نے کلاس روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔ رانی تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"اوئے یوسف... تیری بھینسوں نے آج کل کچھ زیادہ ہی پتلا دودھ دینا شروع کر دیا ہے۔ بالائی تو چھوٹ... چائے بھی ایسی کالی سیاہ کہ پینے سے پہلے ہی دل اوب جائے۔"

وہ دوپہر کے بعد حسب معمول اپنی دودھ' دہی کی دکان پہ بیٹھا تھا۔ گاہکوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے ہاں کا دودھ خالص ہونے کے باعث آگے کے تین' چار محلوں میں مشہور تھا' مگر اب پہلی بار محلے کے ایک چچا نے شکایت کی تھی' وہ چونک گیا۔

"کوئی نہیں چاچا... بھینسیں بے چاری بھلا کیوں پتلا دودھ دینے لگیں۔ آپ بتاؤ کون لے کر جاتا ہے دودھ۔"

"میرا پوتا۔" چاچا جی نے جواب دیا۔

"لو... تو پھر اس سے کان سے پکڑ کر پوچھنا ضرور... کہ وہ دودھ یہیں سے لے کر جاتا ہے یا پھر کہیں اور سے... اگر کوئی دکان دار ہمارے سپلائی کیے ہوئے دودھ میں اپنی مرضی کا پانی ملانے لگے تو اس میں بھینس تو نہیں نا قصوروار ہوئی... او حمید! چاچا کے لیے آدھا کلو دودھ الگ سے ڈال دے... پہلی بار خود آئے ہیں۔ انہیں پتا چلنا چاہیے ہمارے دودھ کی کوالٹی۔" وہ اپنے معاون ملازم سے مخاطب ہوا۔ چاچا جی خوش ہوگئے اور صرف وہی کیا' یوسف اپنے کسی بھی گاہک کو ناخوش نہیں جانے دیتا تھا اور یہ ہی راز تھا اس کی روزافزوں ترقی کا بھی اور اس کی ہر دل عزیزی کا بھی۔

"یوسف بھائی... ایک کلو دہی مگر خوب بالائی والا۔" ڈھیر ساری بھاری مردانہ آوازوں میں یہ بچکانہ سی آواز سنتے ہی اس نے بے اختیار سر اٹھایا اور اس کے چہرے پر بے اختیار ایک روشن مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

بظاہر کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود سامنے کھڑا یہ دس' گیارہ سال کا لڑکا اسے اتنا پیارا تھا کہ ہر روز ایک مخصوص وقت تک وہ لاشعوری طور پر اس کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ اس کی وجہ بڑی سادہ سی تھی کہ جس ہستی نے کسی قبضہ گروپ کی طرح اس کے دل اور دماغ پر بنا پوچھے' بنا بتائے دھڑلے سے قبضہ

جمایا تھا۔ اکمل عرف اکو اسی کا چھوٹا لاڈلا اور دلارا سا بھائی تھا اور اسی لیے یوسف کو بھی وہ اپنی بھینسوں سے کم پیارا نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود اٹھ کر اس کی بات سنتا۔ دکان سے ملحق باڑے سے مشتاق عجلت بھرے انداز میں اندر آیا تھا۔

"بھائی جی۔۔۔ جلدی چلو۔۔۔"

"کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے اس کی اڑی رنگت صورت دیکھی۔

"وہ۔۔۔ وہ بھینس بالکل ہی بیٹھ گئی ہے بھائی۔۔۔ بالکل نہیں اٹھ رہی۔ میں نے پرویز کے ساتھ مل کر کوشش بھی کی مگر۔۔۔ کہیں وہ مر نہ جائے۔"

مشتاق نے پریشانی سے کہتے ہوئے اس کا دل ہولا دیا۔ لب بھینچتے ہوئے وہ اسے دھکیلتا تیزی سے باڑے کی سمت آیا۔ مشتاق اس کے پیچھے تھا۔ یہ بھینس کئی دنوں سے بیمار تھی۔ اسے دوسری بھینسوں سے الگ باندھا گیا تھا۔ کئی بار ڈاکٹر دیکھ کر بھی گیا۔ مگر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا وقت پورا ہو چکا ہو۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے یوسف نے بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے ایک لمحہ کو اس طرف یوں دیکھا جیسے اس کا لمس پہچان لیا ہو۔ حالانکہ پہلے جب بھی یوسف اسے سہلاتا تھا' وہ بھی اپنی انسیت کا اظہار ضرور کرتی تھی۔ مگر اب بے حس و حرکت بیٹھی تھی شاید اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ یوسف کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"اٹھ میری سونی۔" اسے سہلاتے ہوئے اس نے گویا منت سی کی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح اس کی تکلیف ختم کر کے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دے۔

"بھائی جی! یہ مر رہی ہے۔" مشتاق بوکھلا کر بولا۔ اس کا سر لڑھک گیا تھا۔ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اس نے جیب سے سیل فون نکال کر ابا کو کال ملائی۔ وہ پوری بات سنتے ہی پریشان ہو گئے۔

"میں فوراً" قصائی کو لے کر آتا ہوں۔" اتنی بڑی

بھینس کے یوں مر جانے کا نقصان وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے تھوڑی ہی دیر میں وہ قصائی کے ہمراہ آپہنچے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ایک جانب کھڑا ہونٹ کاٹتے ہوئے خود پر ضبط کرنے کی کوششوں میں تھا۔

قصائی نے قریب بیٹھ کر اس کا معائنہ کیا اور پھر مایوسی سے سرہلادیا۔

"لو۔ پڑ گیا دو لاکھ کا ڈنر۔" ابا جی نے ہاتھ پھیلائے' یوسف نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل آیا' کیونکہ اگر تھوڑی دیر اور وہاں کھڑا رہتا تو مذاق بن کر رہ جاتا کہ یوسف مراد ایک بھینس کے مرنے پر عورتوں کی طرح رو رہا ہے۔



"مومل۔ مومل کہاں ہے تو۔ باہر آ ذرا۔" رانی کی آواز آئی تھی۔ وہ جو بڑی محویت سے ڈراما دیکھنے میں مگن تھی' چونک گئی۔ آواز دھیمی کرکے اس نے دوپٹا اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"کیا ہوا؟" ان کے گھروں کی دیوار ملی ہوئی تھی اور رانی اسی دیوار سے سر ٹکائے اسے پکار رہی تھی۔

"کیا کر رہی تھیں۔؟" رانی نے اس کی مصروفیت جاننی چاہی۔

"ڈراما دیکھ رہی تھی۔ تم بتاؤ۔ اس بھری دوپہر میں چین نہیں ہے تمہیں۔" آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے اسے ایک جانب پڑا پانی کا کین نظر آیا تو اسے اٹھا کر دیوار کے قریب رکھا اور اچھل کر اس پر چڑھ گئی۔ اس کا قد بوٹا سا تھا' اس لیے کین پر چڑھنے کے باوجود وہ پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی تھی اور ہاتھ دیوار کی نکر پر جما لیے تھے۔

"میں تجھے بتانے آئی تھی کہ تیری نظر لگ گئی ہے میرے بھائی کی بھینسوں کو۔ خوش ہو جا اب۔" اس نے بتایا۔

"کیا کہہ رہی ہے؟" مومل حیران ہو گئی۔

"کل ایک بھینس مر گئی ہماری۔" رانی کے لہجے میں تاسف در آیا۔

"ہائے اللہ نہیں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "کیسے مر گئی' کیا ہوا تھا؟"

"کئی دنوں سے بیمار تھی۔ بس کل وقت پورا ہو گیا اس کا۔ ابا جی بھاگم بھاگ قصائی کو لے کر بھی گئے مگر تب تک اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔"

"اچھا ہی ہے کہ تب تک مر چکی تھی۔" اس نے بے ساختہ کہا تو رانی اسے گھورنے لگی۔

"بیمار بھینس کا گوشت بندے کو بھی بیمار کر سکتا ہے۔" یہ اس کی اپنی منطق تھی۔ رانی کو غصہ آگیا۔

"چل بی بی۔ زیادہ ڈاکٹر نہ بن۔ پچھلے دنوں جو تم لوگوں نے اپنے ککڑ پر چھری پھیری تھی' وہ کہاں کا پہلوان تھا۔"

"میں نے تو اس کی ایک بوٹی بھی نہیں کھائی تھی۔ قسم کھاتی ہوں۔ خیر۔ بڑا افسوس ہوا تمہاری بھینس کا سن کر۔" اس نے لگے ہاتھوں تعزیت بھی کرلی۔

"تجھے افسوس ہوا ہے اور دیکھ۔ بھائی نے کل رات سے کھانا نہیں کھایا۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ بندہ جانوروں سے بھی اتنا دل لگا سکتا ہے۔"

"ہاں۔ تمہارا بھائی صرف جانوروں سے ہی دل لگا سکتا ہے۔" وہ صرف یہ سوچ کر رہ گئی۔

"مومل۔ کہاں ہو؟" اسی پل بھابھی کی آواز آئی تھی' اور اگلے ہی لمحے وہ خود بھی اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ رانی پر نظر پڑتے ہی چونک گئیں۔

"اوہ۔ تو یہ تم ہو۔ پورا دن کالج میں ساتھ رہ کر جی نہیں بھرتا جو گھر آکر بھی دیواروں پر چڑھ کر سر جوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہو۔"

"میں آج کالج نہیں گئی۔" رانی کے پھولے پھولے گال مزید پھول گئے۔

"ان کی بھینس مر گئی ہے۔" مومل نے گردن موڑ کر انہیں اطلاع دی۔

"اچھا۔ جب ہی میں کہوں' ان کی طرف ایسی خاموشی کیوں ہے۔ تو یہ بھینس کا سوگ منایا جا رہا ہے۔" انہوں نے سرہلایا۔ "چل کہہ دینا ماں

سے۔ میں شام کو چکر لگاؤں گی افسوس کرنے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بھینس ہی مری ہے کوئی ہمارا چاچا نہیں مرا۔"

کوثر بھابھی کے انداز مومل کے ساتھ ساتھ اسے بھی سلگا کر رکھ دیتے تھے۔

"ویسے اب تو کئی دن تک تمہارے گھر سے آنے والے گوشت سے محتاط رہنا پڑے گا۔" بھابھی نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ رانی کے نتھنے پھڑک اٹھے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ ہم مردار گوشت کھاتے ہیں۔ کمینی! کیا ضرورت تھی اسے بتانے کی۔ اب ٹھٹے لگا رہی ہے۔" غصے سے کہتے ہوئے اس نے ساتھ ہی ایک چپت مومل کے کندھے پہ رسید کی۔

"آؤ چ۔۔۔" وہ جو بمشکل پنجوں کے بل کھڑی اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھی۔ کندھا سہلاتے ہوئے کراہ کر رہ گئی۔

"ظاہر ہے پوری سالم بھینس مری ہے۔ تمہارا ابا یہ نقصان برداشت تھوڑی کرے گا۔ کیا پتا آدھی قیمت پر کسی قصائی کو ہی بیچ دے۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے انہوں نے رانی کے قہر کو مزید بڑھا دیا۔

"بے فکر رہیں۔ اگر آپ کے ابے نے نہیں خریدی تو پھر اسے چیل کووں نے ہی کھانا ہے۔" رانی نے سلگ کر کہا تھا۔ ان کے چہرے کی بے نیازی ناگواری میں بدل گئی۔

"چل اتر مومل۔۔۔ کین دے مجھے اپنے کمرے میں گھڑی کے لیے کیل ٹھونکنی ہے۔" وہ اب اپنی ناراضی اس طرح سے ظاہر کر رہی تھیں۔

"بعد میں ٹھونک لینا۔ کیوں اس دوپہر میں سب کو بے آرام کرتی ہو۔ اماں ابھی سر درد کی دوا لے کر سوئی ہیں، جاگ جائیں گی۔" اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس کا خمیازہ اسے یوں بھگتنا پڑا کہ کوثر نے اگلے ہی لمحے اس کے پیروں کے نیچے سے گویا زمین ہی کھینچ لی۔

"بھابھی! واپس لاؤ۔ میں گر جاؤں گی۔" دیوار کی نگر پر ہاتھ جمائے وہ لٹکی رہ گئی۔

"تو گر جاؤ۔۔۔ مر نہیں جاؤ گی۔ دو فٹ کا فاصلہ بھی نہیں ہے۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ کین لے کر یہ جا وہ جا۔

"اللہ کرے مرجائے کمبخت۔۔۔" چھلتی ہوئی ہتھیلیاں تکلیف دینے لگیں تو وہ ہاتھ چھوڑ گئی۔ پیر بہت زور سے زمین پر لگے تھے۔ وہ ایک لمحے کو بیٹھی رہ گئی۔

"اٹھ سکتی ہو یا سہارا دینے آجاؤں۔" رانی نے جھانک کر پوچھا۔

"اٹھ سکتی ہوں۔" "ہائے۔۔" وہ پیر ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ "تو نے دیکھی اس چڑیل کی حرکت۔"

"اس کے لیے چڑیل نام بہت چھوٹا ہے۔ کوئی دوسرا نام سوچ۔" رانی پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔

"جی تو چاہتا ہے اس کی بھابھی بنوں اور پھر اس کے ساتھ وہ کروں کہ اس کی سات پشتیں بھی یاد رکھیں۔" مومل کا غصے سے برا حال تھا۔

"تو بن کیوں نہیں جاتی۔" رانی کو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔

"کیونکہ اس کے سارے بھائی بھی اسی کی طرح ہیں۔ ایک نمبر کے ذلیل، نکمے اور ویلے۔" مومل نے دانت پیسے۔

"چل پھر تو میرا چانس بھی گیا۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔ مومل اسے گھورنے لگی۔

"اچھا بتا۔۔۔ کل رات تو نے کیا بنایا تھا۔ بڑی اچھی خوشبو آرہی تھی۔" وہ اس کی گھوریاں نظرانداز کر کے تجسس سے پوچھنے لگی۔

"کڑھی بنائی تھی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہائے تو بھیج نہیں سکتی تھی۔" رانی کو قلق ہوا۔

"میں نے خود نہیں کھائی۔ مجھے پکوڑوں کے بغیر اچھی نہیں لگتی۔ بھابھی سے پکوڑے بنانے کا کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے سوچا اگر میں بنا بھی لوں تو مجھ سے پہلے یہ ڈکاریں گی اسی لیے ضد میں آکر میں نے بھی نہیں بنائے۔" مومل نے پوری تفصیل بتائی۔

"فٹے منہ تیرا۔" وہ بدمزہ ہو گئی۔

"ویسے ابھی بھی فریج میں کافی ساری پڑی ہے۔ کڑھی اتنا زیادہ کون کھاتا ہے۔ کل رات تو ابا کو روٹی ڈبو کر کھانے کے بجائے لسی کی طرح چڑھا گیا پھر بھی کافی ساری بچ گئی۔ تو کہے تو دے دوں؟" مومل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رات کو تو بھیجتے ہوئے موت آرہی تھی۔ اب باسی کڑھی بھیجے گی۔" وہ مزید برہم ہوئی تھی اس کے انداز پر۔

"چل پھر۔ میں جا کر اپنا ادھورا ڈرامہ دیکھ لوں۔ تیری بھینس کے سوگ میں میں اسے بھی بھول گئی۔" اسے یاد آیا تو اندر کی طرف بھاگی تھی۔ مجبوراً رانی کو بھی اترنا پڑا۔



"اماں... کیا ابا سچ مچ گاؤں جانے والے ہیں؟" وہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر کچھ دیر پہلے ہی آکر دراز ہوا تھا۔ چہرے پر رومال ڈالے کچھ سستا کر باہر نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ کچن میں موجود رانی کی آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی — وہ چونک گیا۔ کچھ دن پہلے اماں نے سرسری ساذکر کیا تھا۔ اسی لیے اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دھیان اسی جانب لگ گیا۔

"مجھے کیا پتا۔ اپنے باپ سے ہی پوچھ' دماغ خراب کرکے رکھ دیا ہے۔ جانے کیا ہڑک جاگی ہے گاؤں جانے کی۔ جیسے ساری دنیا کی کڑیاں مک گئی ہیں۔ لے کے اس فتنی کی بیٹی کو میری بہو بنا رہا ہے۔ میں تو مر کر بھی یہ نہ ہونے دوں۔" اماں کا لہجہ انتہائی بھنایا ہوا تھا۔ اور وہ یہ سنتے ہی تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ دل و دماغ جھنجھنا سے گئے۔

"آپ پھپھو کی بات کر رہی ہیں۔ خود نسیمہ کیا کسی فتنے سے کم ہے۔ پتا ہے جب پچھلے سال ہم گاؤں گئے تھے تو اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا..." رانی پرانے کھاتے کھولنے لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس سمت آیا۔ اسے دیکھ کر دونوں چونک گئیں۔

"اماں... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" بے چین سے لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کی سیاہ آنکھوں میں اضطراب کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ "ابا گاؤں کیوں جارہے ہیں؟"

"آپ کا رشتہ پکا کرنے۔" اماں کے ساتھ کریلے چھیلتی رانی کی طرف سے جھٹ سے جواب آیا تھا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر۔" وہ شاکی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"کون سا اس نے ٹکٹ کٹا لیا ہے یوسف۔ تجھے لگتا ہے میں ایسا ہونے دوں گی۔" اماں اس کی پریشانی بھانپ گئیں۔

"ان کے ذہن میں یہ بات آئی کیسے؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"اصل میں پہلے بات تیری پھپھو نے شروع کی تھی۔" اماں کے لہجے میں ازحد بے زاری تھی۔ "خاور کے لیے رانی کا رشتہ مانگ کر' تمہارے ابا نے سوچنے کے لیے وقت مانگ لیا۔ میں جانتی ہوں یہ اس کی چال ہے۔ اپنے ناکارہ بیٹے کے لیے میری پھول سی بچی مانگ کر اپنی بیٹی ہمارے متھے مارنے کی۔ مگر میں بھی دیکھتی ہوں تمہارے ابا میرے ہوتے یہ رشتے کیسے جوڑتے ہیں۔ نہ تو مجھے اپنی بیٹی وہاں بھیجنی ہے اور نہ اپنے ہیرا بیٹے کو اس چڑیل کے شکنجے میں دینا ہے۔ اس بار مجھ سے بات کرے تو صاف کہہ دوں گی اس سے۔" اماں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ رانی چپ سی ہو گئی کیونکہ اس سے پہلے اماں نے اس بات کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ جبکہ یوسف نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جانتا تھا اماں اپنی کرنی پر آجائیں تو ابا اکثر ہار مان لیا کرتے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ یکدم ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ صحن پار کرکے اسی طرف آرہی تھی۔ ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ سے سر سے سرکا دوپٹا واپس اپنی جگہ پر جماتے ہوئے اس کے قدم اسے دیکھ کر سست پڑ گئے۔ یوسف بنا کسی جھجک اور خوف کے نہایت پر اعتماد اور پر استحقاق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کی رنگت میں گندم کے خوشوں سا سنہرا پن تھا۔ سیاہ

آنکھوں میں ستارے دمکتے تھے۔ گھنیری پلکوں میں رات بستی تھی اور زلفوں میں گھنگھور گھٹائیں مقید تھیں، جس کی ستواں ناک میں پڑی چمکتی لونگ کی چمک میں یوسف کا دل ایسے کھویا تھا کہ وہ ابھی تک ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

اس کی وارفتہ نگاہوں نے بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھارا۔ دھیمے لہجے میں سلام کرتی وہ نظریں جھکائے اس کے پاس سے گزر گئی تھی اور یوسف ہمیشہ کی طرح دل تھام کر رہ گیا تھا۔

"مومل۔۔۔ کیا لائی ہے؟" پیچھے سے رانی کی پرجوش آواز سنائی دی۔ "کڑھی؟"

"تیرے دل سے ابھی تک کڑھی نہیں نکلی۔ جب میں دے رہی تھی تو کیوں کیے اتنے نخرے۔"

"یہ حلوہ کس خوشی میں؟" اب رانی نے شاید پلیٹ دیکھ لی تھی۔

"بھابھی تین دن کے لیے میکے گئی ہیں' اسی خوشی میں بنایا تھا۔ سوچا تجھے بھی اس خوشی میں شریک کرلوں۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"تم جتنا چاہے انجان بن لو۔ تم میری ہو اور تمہیں میری ہی بننا ہے۔" ہلکی سی مسکراہٹ نے یوسف کے لبوں کو چھوا تھا۔ دل ہی دل میں اسے مخاطب کرتے وہ باہر نکل آیا تھا۔

"توبہ ہے میری۔۔۔ خالہ کے بچے ہیں یا یاجوج ماجوج کی قوم' پورا گھر تلپٹ کرکے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو سوچ سوچ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں اسے سمیٹوں گی کیسے۔ کتنی بار کہا اماں سے بھابھی کو مت جانے دو۔ خالہ کے آنے کے دن ہیں میں تو پاگل ہی ہو جاؤں گی مگر نہیں۔۔۔"

وہ اس شدید گرمی میں چولہے کے سامنے کھڑی ایک کے بعد ایک روٹی توے سے اتار رہی تھی۔ تپش نے اس کی رنگت میں انگارے دہکا دیے تھے۔ کچھ غصہ اور جھنجلاہٹ تھی۔ اسی جھنجلاہٹ میں اس نے ایک چپاتی کو زور سے توے پر ڈالا اور وہ بجائے پھیلنے کے سکڑ کر عجیب سا نقشہ پیش کرنے لگی۔

"آگئی ناں بھابھی کی قدر۔۔۔ جس کے جانے پر حلوے بانٹ رہی تھیں۔" اکو کو اس نے اپنے ساتھ پیڑے بنانے پر لگا دیا تھا' اس کی جھلاہٹ پر وہ بولے بنا نہ رہ سکا۔

"قدر اور ان کی۔۔۔؟ دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔؟" اسے غصہ آگیا اور تب ہی اس کی نظر سامنے پڑی۔ خالہ کا سب سے چھوٹا سپوت جو جسامت میں اتنا چھوٹا بھی نہ تھا۔ مرغیوں کا ڈربہ کھولے دو ننھے منے چوزوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑے ہوئے تھا اور وہ بے چارے چوں تک نہیں کر پا رہے تھے۔

"اللہ! اکو جا۔۔۔ یہ موٹو تو مار ہی ڈالے گا میرے چوزوں کو۔" وہ ہول کر اکو کو جھنجوڑ گئی۔ وہ پیڑے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگا۔

"ادھر لا۔۔۔" وہ اس کے ہاتھ سے یوں چھیننے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ جیتے جاگتے جانور نہ ہوں۔ کھلونے ہوں۔

"اکو آرام سے۔۔۔ کہیں ان کا دم ہی نہ نکل جائے۔" وہ چیخ اٹھی۔ "ہائے۔۔۔ کہاں پھنس گئی میں تو۔" ۔۔۔ نظر توے پر پڑی جلتی روٹی پر گئی تو وہ روہانسی ہو گئی۔ آج صبح خالہ اپنے چھ عدد شیطان کے چیلوں نما بچوں کے ساتھ منہ اندھیرے ہی آن وارد ہوئی تھیں۔ ناشتا کیا اور جیسے ہی چائے کی پیالی رکھی ویسے ہی برقعہ دوبارہ سے سر پر جمایا اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر نکل گئیں۔ اس دم والی باجی کا پتا کرنے جس کے ایک تعویذ سے ہی شوہر قدموں میں اور ساس قبر میں محو استراحت ہو جایا کرتی تھی اور پیچھے ان کے بچوں نے مومل کو پاگل کرکے رکھ دیا تھا' ایک کو اس نے چھت پر پانی کی ٹنکی سے اتارا تو دوسرے کو بھابھی کے کمرے میں ٹیبل پر چڑھ کر شوکیس کے شوپیس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پکڑا اور اسی غصے میں جب وہ اسے ایک ہاتھ جما کر نیچے اتار رہی تھی۔ مٹی کی بنی وہ خوب صورت سی چڑیا زمین بوس ہو کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بنٹی اس کا جرنل کھولے مار کرے

اس پر جو نقش و نگار بنا رہی تھی، مومل نے دیکھا تو دل پکڑ کر رہ گئی۔ منجھلا والا کہیں سے چھوٹی سی تھیلی میں تیرنے والی مچھلیاں خرید کر لایا اور ایک طرف کیاریوں کے پاس رکھے مٹکے میں ڈال کر ان کی تیراکی کا نظارہ دیکھنے لگا۔ ایک تو آج کل ویسے ہی ان کے علاقے میں پانی کی قلت تھی اور اس آفت کی اس حرکت کے باعث اسے مٹکے کا سارا پانی ضائع کرنا پڑا تھا۔ اور اب جب وہ ناک تک بھر چکی تھی تب اسے رانی کو بلانے کا خیال آیا۔ روٹیاں کپڑے میں لپیٹ کر وہ باہر آئی اور اس لنگڑے سے اسٹول کو کھینچ کر دیوار کے برابر لگا دیا۔ وہ مسلسل لڑکھڑا رہا تھا۔ مگر کین پانی سے بھری تھی، اسی لیے اسے یہ رسک لینا پڑا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس پر کھڑی ہوئی تھی دوسری طرف دیکھا تو مکمل خاموشی۔ اسے کچھ حیرانی ہوئی۔

"رانی... رانی باہر آ... جلدی سے باہر آ... میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔" دیوار پر ہاتھ جمائے اس نے بمشکل خود کو سنبھال رکھا تھا۔ اور چند لمحے ہی گزرے تھے جب کونے والے کمرے سے وہ باہر نکل آیا۔ شلوار پر سفید بنیان میں ملبوس... بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے۔ مومل نے بے اختیار خود کو کوسا تھا۔

"رانی... گھر پر نہیں ہے۔" مسکراتی پرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ برآمدے کے ستون کے پاس آیا۔ اسے مزید قریب سے دیکھنے کے لیے۔

"تو تم کیوں گھر پر ہو۔" وہ کلس کر یہی کہنا چاہتی تھی۔ "ٹھیک ہے۔" اسے دیکھنے سے احتراز کرتے ہوئے اس نے اترنے کا ارادہ کیا۔

"کیا کہنا تھا...؟" وہ بھانپ گیا۔ اسی لیے جلدی سے پوچھا تھا۔

"یونہی بلا رہی تھی۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے زمین کی طرف دیکھا اور پھر بیٹھ کر جیسے ہی ایک پیر نیچے اتارا۔ دوسرا اتارتے ہی اسٹول بھی اس کے ساتھ ہی نیچے گرا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ بے چین ہو کر دیوار کے قریب چلا آیا تھا۔ "مومل... تم ٹھیک ہو؟" ایک طرف خالہ کے بچے کورس میں اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ دوسری طرف اس کی بے قرار آواز... اس کی سماعتوں سے ٹکرا کر اسے مزید چڑا گئی۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جل کر کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی اور کراہ کر رہ گئی۔ اس بار واقعی پیر میں بہت زور سے لگی تھی۔

"اکو ہاتھ دے مجھے۔" اکو سے سہارے کے لیے ہاتھ مانگتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں تھا کہ دوسری طرف وہ یوسف کو کیسی حسرت میں مبتلا کر گئی تھی۔



"تو کیسی تھی وہ باجی...!" تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ گرمی سے بے حال پسینے میں تربتر، تپتے چہروں اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ واپس آئے تھے۔ خالہ تو پنکھے کے عین نیچے چٹائی پر ہی تکیہ لے کر دراز ہو گئی تھیں۔ اماں نے برقعے کو گول مول کر کے پگڑی سی بنا کر سر پر جمالیا تھا اور مومل کے جیسے یہ پوچھنے کی دیر تھی۔ اماں سنتے ہی تڑخ گئیں۔

"ایک نمبر کی فراڈن۔"

"میں پہلے سے ہی جانتی تھی۔ کیوں پڑتی ہیں آپ ان چکروں میں۔" اسے غصہ آگیا۔ تکیے سے ٹیک لگائے وہ درد کرتے پیر کے پاس بھی ایک کشن رکھے ہوئے تھی۔

"میں تو اپنے ان دو سو روپوں کو رو رہی ہوں جو میں نے اس کی خبیث شکل والی اس خرانٹ سیکریٹری کے پاس جمع کروائے تھے۔ بڑی ملانی بنی بیٹھی تھی، سر پر دوپٹا لپیٹے ہاتھ میں تسبیح لیے۔ میں نے بھی ایسا بھانڈا پھوڑا کہ آئندہ کوئی عورت جھانک کر نہیں دیکھے گی اس کے آستانے میں۔" اماں کا چہرہ جلال سے سرخ ہو رہا تھا، مومل حیران ہو گئی۔

"کیا اماں... جھگڑا کر کے تو نہیں آرہیں؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے تو کہا بھی آپا سے، ہر ایک

کے ساتھ اس کا اپنا ایمان، مگر یہ جب تک تماشا نہ لگا لے اسے چین کہاں آتا ہے۔" خالہ پہلے ہی جلی بیٹھی تھیں، ناراضی سے کہتی اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے چھوڑ دیتی۔ میرے دو سو روپے کیا حرام کے تھے۔ میں نے تو اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر بھی نکلوا لینے تھے اور کچھ نہیں تو دو تین کلو تربوز تو آ ہی جانا تھا۔ بڑی آئی لوگوں کو بے وقوف بنانے والی۔ میں نے بھی ایسا مزہ چکھایا ہے کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔"

"پر کیا کیا... یہ تو بتائیں۔" وہ جھلا گئی۔

"میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا، مجھے کیا کرنا ہے، اس لیے جب اس کی چیلی نے ہمیں اندر جانے کے لیے کہا تو میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے سونے کی چوڑی اتار کر بٹوے میں رکھ لی۔" اماں کہتے ہوئے رکیں۔

"پھر...؟" بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"اس شیطان کی خالہ نے مجھ سے مسئلہ پوچھا۔ میں نے کہا۔ سونے کی ایک چوڑی گم ہو گئی ہے۔ کافی بھاری تھی۔ گھر میں بیٹی اور بہو ہے۔ بہو سے جھگڑے تو چلتے رہتے ہیں، مگر یہ یقین نہیں ہے کہ وہ چوری بھی کرے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا، کس پر شک کروں اور کس پر نہ کروں۔ آپ کا بڑا نام سنا ہے۔ بڑی کرامت والی ہیں۔ چوری کرنے والا جائے بھاڑ میں... بس مجھے میری چوڑی واپس مل جائے۔"

"ہاہ اماں... آپ نے تو بڑی ہوشیاری دکھائی۔" وہ یہ سنتے ہی پُرستائش نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اب اس کی بات تو سن لے۔ کہنے لگی۔ چوڑی کو تو آپ بھول ہی جاؤ۔ وہ اب آپ کے ہاتھ آنے سے رہی۔ ہاں چوری کرنے والا آپ کے گھر میں ہی موجود ہے۔ میں نے حیران ہو کے پوچھا۔ کیا یہ چوری میری بیٹی نے کی ہے، تو کہنے لگی۔ نہیں... نہیں چوری کرنے والا کوئی اور نہیں آپ کی بہو ہی ہے۔ کچھ دن پہلے آپ کا اس سے جھگڑا ہوا تھا، اس نے اسی کا بدلہ لینے کے لیے آپ کی چوڑی چوری کر ڈالی۔ لو دسو، یہ تو لوگوں کے گھر خراب کرنے کو بیٹھی ہوئی تھی فسادن، ایسے میں، میں ہنگامہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ میں نے تو اسی وقت بٹوے سے چوڑی نکال کر اسے دکھائی۔ وہاں بیٹھی ایک ایک عورت کو سارا قصہ سنایا اور اس کی تو وہ بے عزتی کی۔ وہ بے عزتی کی کہ آئندہ ایسا آستانہ کھولنے سے پہلے سو بار سوچے گی۔" اماں کی بات مکمل ہوئی تھی اور انہوں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سارا غصہ بھی باہر نکال دیا تھا۔

"تو خالہ... آپ کو اس دم والی باجی کا پتا دیا کس نے تھا۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں خالہ سے پوچھا تھا۔

"فیروزہ نے۔" انہوں نے مرے ہوئے لہجے میں اپنی نند کا نام لیا۔

"تو کیا ان کا کام ہو گیا؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" انہوں نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔

"یہ ان جیسی اور آپ جیسی خواتین ہی ہیں جنہوں نے ایسے ڈبا پیروں اور ان جعلی پیرنیوں کے کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ آج کل یہ صرف ایک بزنس بن کر رہ گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں خالہ! اگر آپ بھی دوپٹا پلیٹ کر... سبز پردے لگا کر آستانہ سجا کر بیٹھ جائیں تو اچھا خاصا کما لیں گی۔" وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہی تھی۔

"نہ دے اسے الٹے سیدھے مشورے۔ اگر کوئی میری جیسی مل گئی الٹی مت والی تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی جائے گی۔ میں تو پھر بھی ہلکا چھوڑ کر آ رہی ہوں۔" اماں سنتے ہی ٹوک گئیں۔

"ہائے آپا... ایسے ڈراوے تو نہ دو۔ میں کون سا آستانہ کھول کر ہی بیٹھ گئی ہوں۔" خالہ نے شاید تصور کی آنکھ سے وہ منظر دیکھ لیا تھا، اسی لیے دہل سی گئیں۔

"چل اٹھ مومل... کھانا لے آ۔ بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ اس منحوس ماری نے تو سارا کھایا پیا ہضم کروا دیا۔" اماں اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔ اس نے پیر کی جانب اشارہ کر دیا۔ "دیکھ نہیں رہیں۔ میرے پیر میں درد ہے۔"

"کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا پیر کو۔ کتنی بار کہا ہے' باندروں کی طرح چھلانگیں مار مار کر دیواریں نہ ٹاپا کر۔۔۔ ناں تو کیا میری ماں لگتی ہے۔ جو تھکی ہاری آکر بجائے اپنی فکر کرنے کے میں تیرے منہ میں نوالے ٹھونسوں۔" اماں کو یہ سنتے ہی شدید قسم کا غصہ آگیا۔

"ٹھیک ہے' آپ کہتی ہیں تو اٹھ جاتی ہوں' مگر شام تک ڈاکٹر کی فیس تیار رکھیے گا۔" وہ کشن ایک طرف ہٹا کر اٹھنے لگی۔

"بیٹھی رہ۔۔۔ مجھ پر احسان نہ دھر۔۔۔ میرے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ میں خود ہی لے آؤں گی۔" وہ چڑ کر اسے منع کر گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے پھر سے ٹیک لگالی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اماں اب اسے بستر سے نہیں اترنے دیں گی۔



اباجی کی ضعیف الاعتقادی ضرب المثل تھی۔ اسی لیے ایک بھینس کیا مری' انہوں نے تو صبح و شام لوبان کی دھونیاں دے دے کر انسان تو انسان' ان بے زبان جانوروں تک کو پریشان کر ڈالا۔ اس وقت بھی معائنے کے لیے آیا' بلکہ لایا گیا' جانوروں کا ڈاکٹر منہ پر رومال رکھے کسی بے چین گھوڑے کی طرح بدک اٹھنے کو بے تاب نظر آرہا تھا۔ جبکہ یوسف ایک جانب پریشان سا کھڑا اباجی کی باتوں کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"صرف دوا دارو سے کام نہیں چلتا۔ دم درود بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں' یہ ہمارے بدخواہوں کی بری نظر ہے۔ لوگ تو چاہتے ہی یہی ہیں کہ ایک کے بعد ایک میں اپنے سارے مویشیوں سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ بھلا بتاؤ' بھلی چنگی بھینس چند دنوں میں بیمار ہو کر ایسے جھٹ پٹ کیوں مر گئی۔ پیر صاحب تو کہہ رہے تھے' جادو ٹونے کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔" ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کا لہجہ پرسوچ تھا۔

"اوہو اباجی۔۔۔ آپ نہ آیا کریں اپنے ان پیر صاحب کی باتوں میں۔ وہ بھینس کئی دنوں سے بیمار تھی۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔" یوسف چڑ گیا۔ "آپ چھوڑیں یہ باتیں اور ڈاکٹر صاحب کو فارغ کریں۔ انہیں اور بھی کہیں جانا ہے۔" اس نے ان کی توجہ اس طرف دلائی۔ ڈاکٹر مشکرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"باقی سب ہی جانور ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کسی ایک میں بھی بیماری کے کوئی جراثیم نہیں ہیں' لیکن اگر پھر بھی آپ کو کسی قسم کا کوئی شک ہونے لگے تو اس جانور کو فوراً" ہی باقی جانوروں سے الگ کر دیجیے گا؟" ڈاکٹر نے ایک بار پھر تاکید کرنا ضروری سمجھی۔

"جسے الگ رکھا تھا۔ وہ کون سی بچ گئی۔" اباجی طنزاً" بولے۔

"دیکھیں۔۔۔ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔" اب ڈاکٹر کو قدرے غصہ آگیا۔

"دیکھ بھئی ڈاکٹر۔۔۔ ایسا ہے کہ میں تو اگلے ہفتے جا رہا ہوں اپنے پنڈ۔۔۔ کچھ پتا نہیں کہ کتنے دن لگ جائیں۔ آپ ہفتے میں ایک بار تو ضرور ہی چکر لگا لیا کرنا' ایسا نہ ہو میں واپس آؤں تو یہاں مجھے اپنے ڈنگروں کی جگہ ان کی کھالیں اور کھر ہی ملیں۔ میرا یہ بیٹا آپ کو ادھر ہی ملے گا۔ تھوڑا بھولا ہے' مگر کام سنبھال لیتا ہے۔" اباجی نے یوسف کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔ انہیں احساس نہیں تھا کہ یوسف کے اندر کیسا جوار بھاٹا اٹھنے لگا ہے۔ ڈاکٹر نے سرہلا کر عجلت بھرے انداز میں ہاتھ ملا کر رخصت لی تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ مشتاق کو آوازیں دینے لگے۔ "مشتاق۔۔۔ او مشتاق ادھر آ۔"

"کیا کہتا ہے اباجی۔" یوسف الجھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ مشتاق دوڑتے ہوئے آیا تھا۔

"یہ لے۔" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر تعویذ نکالے تھے۔ یوسف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"انہیں لے جا کر ایک ایک بھینس کے گلے میں باندھ دے۔ یہ پیر صاحب کے خاص جلالی تعویذ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے' ان کے ہوتے انہیں کسی کی بد نظر

نہیں چھو سکتی' لے جا۔" ان سارے تعویذوں کو مشتاق کے ہاتھ میں دیتے ہوئے انہوں نے ہدایت کی۔ مشتاق کو انہیں سنبھالنے کے لیے دوسرا ہاتھ بھی استعمال کرنا پڑا۔ کیونکہ ناٹے سے مشتاق کے ہاتھ بھی کافی چھوٹے چھوٹے سے تھے۔

"ابا جی۔۔۔ کیا کر رہے ہیں آپ۔۔۔ اب کیا جانوروں کے گلے میں بھی تعویذ باندھیں گے۔" وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

"تو زیادہ میرا دادا نہ بن۔ مجھے پتا ہے' مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے پیر صاحب کی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ یاد نہیں' جب تیری ماں بیمار ہوئی تھی۔ تب پیر صاحب کے کاٹے گئے چلّے کی وجہ سے ہی اس کے اثرات دور ہوئے تھے۔ ورنہ ان ڈاکٹروں' دوائیوں سے اس نے کہاں ٹھیک ہونا تھا۔" اسے ڈپٹتے ہوئے ان کی نظر ہنوز اپنی جگہ پر کھڑے مشتاق پر پڑی' تو انہیں غصہ آگیا۔ "تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ سنائی نہیں دیا' میں نے کیا کہا۔"

"جاتا ہوں چچا جی۔" وہ گھبرا کر پلٹ گیا تھا۔

"چل میں بھی نکلوں۔۔۔ تو گھر آئے تو تجھ سے بات کروں گا۔ ایسا کر آج دکان حمید کو ہی سونپ دے۔" انہوں نے جاتے ہوئے بڑا سرسری سا انداز اپنایا تھا۔ یوسف کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ ان کے جاتے ہی وہ اندرونی سمت آیا تھا۔

"مشتاق۔۔۔ تو نے سارے تعویذ باندھ دیے۔" وہ ایک بیٹھی ہوئی بھینس کے پاس جھکا تھا۔ جب یوسف نے سوال کیا۔ وہ چونک گیا۔

"ابھی نہیں بھائی جی۔"

"تو باندھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چل وہ سارے تعویذ مجھے لادے۔" کمر پر دونوں ہاتھ رکھے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن بھائی۔۔۔ چچا جی ڈانٹیں گے۔" مشتاق ہچکچا رہا تھا۔

"ان سے میں بات کرلوں گا۔ یہ اچھا تماشا ہے۔ سب دیکھیں گے تو کتنی ہنسی اڑائیں گے ہماری۔" وہ اس فکر میں الجھ کر اپنی وہ پریشانی بھولنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی دھڑکنیں مدھم کرنے لگی تھی۔ چار ناچار مشتاق نے سارے تعویذ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس نے یوں ہی ایک تعویذ کھول کر دیکھا تھا۔ آڑی ترچھی لائنوں سے خانے بنائے گئے تھے اور ان خانوں کو جن جناتی الفاظ سے پُر کیا گیا تھا۔ وہ اس کے سر پر سے گزر گئے تھے۔ صرف ایک لفظ ہی واضح تھا اور وہ تھا بھینس۔۔۔ اسے ایک پل کو ہنسی آگئی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا یہ پیر صاحب بھی بہت بڑے ڈرامہ تھے۔ مگر ابا جی سے ان کے خلاف کچھ کہنا گویا ان کی عقیدت' ان کی مریدی کو گالی دینے کے مترادف تھا۔ ایک ایک کرکے اس نے وہ سارے تعویذ ضائع کردیے تھے اور وہاں سے نکل آیا تھا۔



"ہائے اماں۔۔۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔۔۔ جب سے وسیم کے پولیس میں بھرتی ہونے کی خبر پھیلی ہے۔ لوگوں کے سینوں پر تو جیسے سانپ ہی لوٹ گئے ہیں۔ میری وحیدن تائی۔۔۔ ارے وہی جو اس دن اپنے نکمے آوارہ بیٹے کے لیے مومل کا ہاتھ مانگنے آئی تھی۔ اس نے تو یہ سنتے ہی فتویٰ صادر کردیا کہ ہمارے گھر کا کھانا پینا حرام ہے بتاؤ۔ میرا بھائی ان کے بیٹوں کی طرح چوریوں' ڈکیتیوں کا مال تو گھر نہیں لاتا جو ہمارے گھر کا کھانا پینا حرام ہونے لگا۔ اپنے بیٹوں کے کرتوتوں پر تو نظر ہے نہیں۔ کسی دن پولیس گدّی سے پکڑ کرلے گئی تو سفارش کے لیے آکر ہمارا ہی در کھٹکھٹائے گی۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے وسیم سے۔۔۔ پوری ذمہ داری اور ایمان داری سے اپنی ڈیوٹی کرنا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان غنڈوں' موالیوں کو اپنا رشتے دار ظاہر کرنے کی۔" کوثر بھابھی جب سے میکے سے واپس آئی تھیں۔ اپنے بھائی کی تعریفوں میں ان کی زبان نہیں رک رہی تھی اور ہر دوسرے جملے میں رشتے داروں کے جلنے بھننے کی مصدقہ اطلاع کے ساتھ۔ اماں کو تو شک ہونے لگا تھا' کہیں وہ یہ سب انہیں تو نہیں سنا

رہی۔

"یہ بھابھی کیا کہہ رہی ہیں؟" رانی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی تھی۔ اس کے ساتھ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھے ہوئے اس نے بھابھی کی باتیں سن کر دریافت کیا۔

"کہنا کیا ہے۔ ان کے چار نکمے بھائیوں میں سے ایک نکما کام پر لگ گیا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے۔ ان کے محلے کی لڑکیوں نے سکھ کا سانس لیا ہوگا اور بچوں میں ریوڑیاں تو ضرور ہی بانٹی ہوں گی۔" مومل نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کٹی ہوئی مسالا لگی کیریوں کی پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

"پولیس میں بھرتی ہوا ہے؟" رانی نے ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"نہ پوچھو... کانسٹیبل بھرتی ہوا ہے۔ مگر بھابھی کی باتیں سنو گی تو لگے گا جیسے کمشنر کی سیٹ سیدھی ان کے بھائی کو ہی ملی ہو۔ شہر کے چور لٹیرے منہ چھپاتے پھر رہے ہوں اور مجرموں نے جرم سے توبہ کرلی ہو۔ پولیس کے محکمے کو اس سے اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو۔ مجرموں سے جرم اگلوانے کے لیے انہیں صرف وسیم کی شکل ہی دکھا دینی کافی ہوگی۔ سچ کہتی ہوں رانی... بھابھی تو شہزادی ہیں 'شہزادی۔ ان کے بھائیوں کو دیکھو تو تمہیں کسی دیو پر بھی پیار آجائے۔" اپنی ہی دھن میں کہتے ہوئے بھابھی کو باہر نکلتے دیکھا تو آواز دھیمی ہوگئی۔

"چھوڑ نا... تو بتا 'یہ خاور دیکھنے میں کیسا ہے؟" بات بدلتے ہوئے اس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔ رانی آج صبح سے خاور کے بارے میں کافی کچھ بتا چکی تھی۔

"بالکل بھائی جیسا۔" رانی کے چہرے کا رنگ بدل گیا کہتے ہوئے۔

"چھوڑ بھی رانی... کزنز بھائی وائی نہیں ہوتے۔" مومل بے زار ہوگئی۔

رانی ایک پل کو الجھی تھی۔ پھر اسے ایک دھپ رسید کی۔ "مرجانی... میں کہہ رہی ہوں 'یوسف بھائی جیسا سوہنا۔"

"اوہ..." مومل نے ہونٹ سکوڑے۔ "چلو... اس دنیا میں تجھے کوئی تو اپنے بھائی جیسا ہینڈسم دکھا... تو اس کا مطلب ہے رانی... اب تجھے نسیمہ کو بھابھی بنانے میں کوئی اعتراض نہیں۔" مومل نے معنی خیزی سے سوال کیا تھا۔

رانی فوراً" تڑخ گئی۔ "کیوں بکواس کررہی ہے۔ میں نے ایسا کب کہا۔ یوسف بھائی کے لیے تو اگر مجھے پوری دنیا بھی کھنگالنی پڑے تو کھنگال لوں گی۔ مگر لڑکی ان کے پاسے کی ہی ہوگی اور اماں نے تو ڈھونڈنی بھی شروع کردی ہے کہ اگر ابا اس مقصد کے لیے گاؤں جارہے ہیں تو انہیں روکا جاسکے۔"

"تم لوگ اپنے بھائی سے سیدھے سیدھے پوچھ ہی کیوں نہیں لیتے اس کی پسند۔" ٹانگیں چارپائی سے لٹکا کر دھیرے دھیرے ہلاتے ہوئے مومل نے ایک اور ٹکڑا اٹھا کر کترنا شروع کیا۔

"نہ کہہ... میرا بھائی ایسا تھوڑی ہے۔" رانی برامان گئی۔

"ہائے... یہ بہنوں کی پتا نہیں کیسی عادت ہوتی ہے۔ بھائی چاہے پوری دنیا میں ادھر ادھر آنکھیں سینکتے پھریں۔ انہیں وہ معصوم اور بیبے ہی نظر آتے ہیں۔" وہ اس کی بات سن کر استہزائیہ ہنسی ہنس دی تھی۔

"چل تو ہی بتا... تو نے کبھی میرے بھائی کو دیکھا ہے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر شوخا بنتے ہوئے۔" رانی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ مومل نے ٹھنک کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں..." کچھ توقف کرتے ہوئے اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"تو پھر..." رانی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ وہ چپ سی ہوگئی۔ کیا کہتی مجھے ہی دیکھ کر اس کی آنکھیں کیوں بولنے لگتی ہیں۔

"رانی تو نے سنا... اس ہفتے کو میری اماں نے وسیم کی نوکری کی خوشی میں تقریب رکھی ہے۔ مومل کے ساتھ تجھے ضرور آنا ہے۔" کچن کے دروازے میں

کھڑی بھابھی کا موڈ بہت بدلا بدلا نظر آرہا تھا۔ رانی کو ہضم کرنے میں دشواری ہوئی۔ اس نے ایک نہ سمجھنے والی نظر مومل پر ڈالی۔

"اچھا۔۔۔ مومل نے بتایا نہیں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے جانا نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ مجھے نہیں پتا تھا کہ بھابھی تجھے بھی دعوت دینے والی ہیں۔" مومل نے لاپروائی سے کہتے ہوئے بھابھی کو اچھا خاصا سلگا دیا۔ وہ لب بھینچے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرپائیں۔

"کیوں۔۔۔؟ کیا میری بُو تھی، اب اس جوگی بھی نہیں کہ کوئی مجھے اپنے گھر ہی بلا سکے۔" رانی صدمے میں آگئی۔

"ارے۔۔۔ تو اس سے پہلے بھابھی نے کب تجھے اپنے میکے کی کسی خوشی میں بلایا ہے۔ خود ہمیں تقریب والے دن تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دعوت نامہ ملنے کا۔" مومل نے تہیہ کر رکھا تھا۔ بھابھی مسکراہٹ خونخواری میں بدلنے لگا۔

"ہاں تو پہلے کبھی ایسا موقع آیا بھی کب ہے۔ اب آیا ہے تو بتا رہی ہوں۔" بھابھی کا ضبط نہ چھوٹا' بلکہ ایک میٹھی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر وہ مومل سے مخاطب ہوئیں۔ "تو کیوں نہیں آئے گی مومل؟"

"کیونکہ پیر کو میرا اکنامکس کا ٹیسٹ ہے۔ مجھے اس کی بھی تیاری کرنا ہوگی۔ آپ کے گھر آکر تو بندہ خوار ہی ہو جاتا ہے۔ ثمینہ کی شادی یاد ہے مجھے۔" بے زاری سے کہتے ہوئے مومل اٹھ گئی تھی۔ بھابھی کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چلا۔ رانی نے ایک نظر دیکھا اور پھر وہ بھی خاموشی سے کھسک آئی تھی کہ شاید اب یہاں گھمسان کا رن ہونے کے روشن امکانات تھے۔



"یہ لے۔۔۔ کوچ کا ٹکٹ ہے۔ سنبھال کر رکھ۔ صبح سویرے نکلنا ہے۔ میرا بیگ بھی تیار کردے۔" اس دن ابا جی دوپہر میں کھانے کے لیے گھر آئے تو اماں کو اپنا ٹکٹ بھی پکڑا دیا۔ وہ گم صم سی کیفیت میں ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ کو دیکھتی رہیں۔ یوسف اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

"ٹھیک ہے' تو گاؤں جا رہا ہے تو ضرور جا۔ لیکن اگر تو نے وہاں یوسف یا رانی کے رشتے کی بات بھی چھیڑی تو میں وہاں آکر جو طوفان کھڑا کروں گی وہ پورا گاؤں دیکھے گا۔" اماں کا صبر تمام ہوا تھا۔

ابا جی جو ستانے لیٹے تھے۔ سیدھے ہو بیٹھے۔

"کیوں میرا دماغ خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تو زنانی ہے' زنانی ہی رہ۔۔۔ مردوں کے کام میں ٹانگ مت اڑایا کر۔ میں نے اپنی بہن کو زبان دے دی ہے۔ تو کیا چاہتی ہے' اب میں اپنی زبان سے پھر کے بے غیرت بن جاؤں۔"

"کیوں دی مجھ سے پوچھے بغیر زبان۔۔۔ رانی سے پوچھا۔ اپنے بیٹے سے پوچھا۔" اماں کی آواز بلند ہوگئی۔ یوسف بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پوچھا نہیں تو اب پوچھ لیتا ہوں۔۔۔ تو بتا یوسف۔۔۔ تجھے کوئی اعتراض ہے۔" وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ وہ گنگ ہو گیا۔ اماں اسے یوں دیکھ رہی تھیں۔ گویا "جو کچھ میرے سامنے کہتے ہو اب اپنے باپ کے سامنے بھی کہو۔"

"جی ابا جی۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے نسیمہ سے شادی نہیں کرنی۔" وہ بنا ہچکچائے گویا ہوا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں شادی نہیں کرنی" ان کا لہجہ آن کی آن میں بدلا تھا۔ "مسئلہ کیا ہے تیرا۔۔۔ اعتراض کیا ہے۔۔۔ تو کیا کہیں کا لاٹ صاحب ہے۔ ڈنگروں میں اٹھنا بیٹھنا۔ ڈنگروں میں کھانا پینا۔۔۔ دن میں تین' تین بار نہاتا ہے۔ کئی کئی بوتلیں سینٹ کی خالی کردیتا ہے۔ کلف والے کپڑے پہن کر بھی نکلے تو لوگ دور سے ہی پہچان لیں۔ یوسف باڑے والے کو۔ تو کیا سمجھتا ہے' راجے مہاراجے آئیں گے تجھے اپنی بیٹیاں پیش کرنے۔" ابا جی نے بڑی سفاکی سے اس کی ذات کے بخیے ادھیڑے تھے۔ ہونٹ بھینچے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"ابھی تیرا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جب ٹھکانے آئے گا' تب تجھ سے بات کروں گا۔ ویسے بھی مجھے کل

سویرے نکلنا ہے۔" ایک کاٹ دار نگاہ اس پر ڈال کر وہ اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی گھر سے نکل گئے تھے۔

وہ اماں کے پاس آیا۔ "مجھے نسیمہ سے شادی نہیں کرنی اماں! چاہے ابا کچھ بھی کہیں۔ میں لڑکی نہیں ہوں۔ وہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پھر وہ جو چاہیں کرتے پھریں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی کیفیت ہی اور تھی۔

"نہیں یوسف..." اماں تڑپ گئیں۔ "تو کچھ نہیں کرے گا۔ میں ہوں نا... میں سب سنبھال لوں گی۔ میں دیکھ رہی ہوں تیرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی... تیرے ابا کو جاتا ہے' جانے دے' اس کے آنے سے پہلے پہلے میں نے بھی تیری شادی نہ کرائی تو میرا نام بھی فضیلہ خاتون نہیں۔" اماں کے چہرے پر سختی تھی۔ ان کے لہجے اور عزم کی طرح۔

"آپ کو لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے اماں۔" ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ رک رک کر بولا تھا۔ اماں چونک گئیں۔

"کیوں؟"

اس نے کچھ دیر سوچتے ہوئے ذہن میں الفاظ ترتیب دیے۔ پھر گلا کھنکھارتے ہوئے وہ بات کہہ ڈالی۔ جو وہ اتنے دنوں سے کہنے کی ہمت مجتمع کر رہا تھا۔ اماں خاموش رہ گئی تھیں۔ غائب دماغی اتنی شدید تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود کچھ اور نہ پوچھ سکیں۔



"بس بھی کر دے مومل! اور کتنا روئے گی۔ دیکھ اب تو اس رومال میں کوئی سوکھی جگہ بھی نہیں بچی۔" نہ اس کے آنسو تھمنے میں آ رہے تھے۔ نہ اس کی سسکیاں۔ رانی نے چڑ کر رومال اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے اس کے سامنے لہرایا۔

"تو نہیں جانتی رانی! جب سے بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ وہ کتنا بدل گئے ہیں۔" سوں سوں کرتے ہوئے اب اس نے اپنے سفید دوپٹے کو تر کرنا شروع کر دیا۔

"ورنہ... ورنہ تو خود سوچ... وہ کیسے اتنی بڑی بات کر سکتے ہیں۔ ان کی زبان کانپنی چاہیے تھی۔ انہیں شرم آنی چاہیے تھی۔" اس کا بھیگا لہجہ تلخی کی کاٹ لیے ہوئے تھا۔

"اچھا چھوڑ بھی دے نا... تو بتا تیرے لیے بوتل سموسے لے کر آؤں۔" رانی اس کا موڈ بدلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مومل جب سے کالج آئی تھی۔ اس نے ایک بھی پیریڈ اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ رانی کون سا پڑھائی کی شوقین تھی۔ اس کا غم غلط کرنے کے بہانے اس کا پلو پکڑے بیٹھی رہی۔

"زہر لے آ تا کہ مر جاؤں۔ اس وسیم سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے میں قبر میں جا لیٹوں' ہائے... مجھے کیا پتا تھا' میرا غرور اتنی جلدی میرے گلے پڑ جائے گا۔ اس دن کیا' کیا کہہ ڈالا تھا۔ میں نے اس کے لیے۔" مومل کو اچانک ہی خیال آیا کہ کہیں یہ اس دن کیے گئے غرور کی سزا تو نہیں۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں غرور کا سر نیچا اور تو فضول میں ہی اپنے بھائی کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ یہ ساری تیری بھابھی کی چال ہے۔ اسی نے تیرے بھائی کو ورغلایا ہے۔ ورنہ جو... جو باتیں تو نے مجھے اس وسیم کے بارے میں بتائی ہیں۔ اسے تو کوئی اپنی گدھی دینا بھی پسند نہ کرے۔" رانی نے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔

مومل نے چونک کر اسے دیکھا۔ "بھابھی کہتی تھیں میں زبان دراز ہوں۔ اب انہیں میری زبان درازی یاد کیوں نہیں آ رہی۔"

"تو نے بھی تو کہا تھا کہ تو اس کی بھابھی بن جائے تو اسے سبق سکھا دے گی۔ تجھے بھی تو اپنی بات یاد نہیں رہی۔" رانی کو بڑے موقعے پر بات یاد آئی تھی۔ وہ دانت کچکچا کر اسے گھورنے لگی۔

"میں نے کہا تھا۔ اگر اس کا بھائی مر مر کر ہی سہی' گریجویشن تک پہنچا ہوتا۔ کلرک ہی ہوتا' مگر کسی آفس میں اٹھنے بیٹھنے لائق ہوتا۔ قسطوں کی ہی سہی' مگر بائیک رکھنے کی اوقات میں ہوتا۔ تجھے اندازا بھی

نہیں ہے رانی یہ وسیم کیا چیز ہے۔ پہلے اپنے لوفر دوستوں کے ساتھ مل کر فراڈ کرتا پھرتا تھا۔ اب پولیس کی وردی میں رشوت کے نام پر لوگوں کی جیبیں کاٹتا پھرے گا۔ میری زندگی حرام ہو جائے گی۔ رانی۔۔۔ میں سچ مچ مر جاؤں گی۔ مگر اس سے شادی نہیں کروں گی۔"
وہ پھر سے روہانسی ہونے لگی تھی۔

رانی نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ایسا ہی ایک مسئلہ اس کے اپنے گھر میں بھی چل رہا تھا اور آج اسے مومل کی جانب سے بھی کچھ ایسی ہی خبر سننے کو ملی۔

بھابھی کے میکے سے آنے کے بعد جب ان کی شہد ٹپکاتی زبان کا راز کھلا۔ در حقیقت ان کے بگڑے ہوئے بھائی نے کام پر لگتے ہی شادی کا مطالبہ کر دیا اور نظر اس کی آ کر رکی تھی اپنی بہن کی خوب صورت سی نند مومل پر۔ بھابھی کو اگر ذاتی طور پر ناپسند ہونے کے ناتے مومل کی بعض عادتوں پر اعتراض تھا بھی تو بھائی کی اس خواہش کے بعد انہیں اپنے اعتراضات کو پس پشت ڈالنا پڑا۔ کیونکہ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں، کہ وسیم جیسے شخص کے لیے مومل جیسی لڑکی کا ملنا گویا کسی لاٹری کا ٹکٹ لگ جانے کے مترادف تھا۔ گھر آتے ہی انہوں نے پہلے میاں سے ذکر کیا۔ وہ تو تھا ہی اس کی مٹھی میں۔۔۔ اب یہ معاملہ اماں کی عدالت میں پیش تھا اور غور و فکر چل رہی تھی۔ ایک طرف بہو اور بیٹے کے دلائل تو دوسری طرف بیٹی کے رونے دھونے۔۔۔ وہ حقیقی پریشانی میں الجھ گئی تھیں اور مومل یہ سب دیکھ دیکھ کر مزید ہراساں۔۔۔ ابا کی موت کے بعد اماں بڑی حد تک بھائی کی سمجھ داری اور ان کے فیصلوں پر انحصار کرنے لگی تھیں اور مومل کو یہی ڈر تھا کہ کہیں اس بار بھی وہ بھائی کے کہے میں آ کر اس کی زندگی کو کسی طوفان کے حوالے نہ کر دیں۔



"اماں۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ آپ کیوں اتنا وقت لے رہی ہیں۔ کوئی غیر تو ہیں نہیں ہم آپ کے لیے۔۔۔ جس طرح آپ نے میری باری میں آنکھیں بند کر کے ہم پر بھروسا کیا تھا۔ ویسے ہی آپ وسیم پر بھی یقین کر لیں۔ بھلا اس کی ایسی کون سی بات ہے جو آپ سے چھپی ہوئی ہو۔ ٹھیک ہے، پہلے وہ تھوڑا لاابالی تھا۔ کام دھندے میں دل نہیں لگتا تھا اس کا۔ مگر ایسا تو اکثر لڑکے بالے کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ سے پولیس میں ہے۔ اتنی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ خدا نہ کرے کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو سب سے پہلے وہی کام آئے گا۔" بھابھی کا بس چلتا تو اماں پر وسیم کی قابلیت ثابت کرنے کے لیے وہ انہیں کسی مشکل میں ڈالنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ جو مومل کے خیال میں وہ ڈالنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھیں۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے کوثر مگر۔۔۔ یہ فیصلے اتنی جلدی تھوڑی کیے جاتے ہیں۔ تو' تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہے۔ پہلے مجھے اپنے بہن' بھائی سے مشورہ تو کرنے دے۔ ویسے بھی جب تک مومل کا کالج ختم نہیں ہو جاتا' میں اسے کسی منگنی شنگنی کے جھمیلے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" اماں متذبذب تھیں۔ بیوہ تھیں' بیٹی کی فکر تو تھی ہی' ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ اچانک بلاوا آ گیا تو کہیں بیٹی بے آسرا ہی نہ رہ جائے۔ نصیب ہی کی بات تھی کہ شکل و صورت اچھی ہونے کے باوجود ابھی تک مومل کے اکا دکا رشتے ہی آئے تھے اور وہ بھی ایسے گئے گزرے کہ اماں نے انہیں فوراً سے پیشتر ہی دروازہ دکھا دیا تھا اور اب کوثر اپنے بھائی کے لیے سراپا سوال بن گئی تھیں۔ وہ حقیقت پسند تھیں۔ اپنی بیٹی کے لیے کسی کلکٹر کے انتظار میں نہیں تھیں۔ اس لیے اب انہیں وسیم کا رشتہ بھی قابل قبول لگنے لگا تھا۔

"تو ٹھیک ہے نا اماں۔۔۔ مومل کے امتحانوں میں کچھ ہی دن تو رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد منگنی رکھ لیتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں اماں کو فون کر کے آنے کا کہہ دوں۔"
وہ اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ اسی وقت مومل بھی اندر داخل ہوئی تھی۔ گیلے بالوں سے لپٹا تولیہ اتارتے ہوئے وہ موضوع گفتگو سمجھ گئی تھی مگر

اور اس کے ہاتھ کانپ سے گئے۔

"کہا نا کوثر ابھی نہیں۔۔۔ ٹھہر جا کچھ دن۔ مجھے ریحانہ اور بھائی سے بات کرنے دے، پھر میں خود تجھے بتادوں گی۔" اماں بے زار سی ہو چلیں ان کی عجلت پسندی پر۔

"ٹھیک ہے اماں۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔" ان کے چہرے پر بے دلی چھا گئی۔ مرے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

موول ان کے قریب آبیٹھی۔ "اماں۔۔۔ آپ کو واقعی لگتا ہے اس رشتے کو ٹھکرانے کے بعد مجھے زندگی بھر کنوارا رہنا پڑے گا۔" ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

اماں نے ایک حیرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ "تو ایسا کیوں سوچ رہی ہے؟"

"ایسا میں نہیں۔۔۔ ایسا آپ سوچتی ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات نہ ہوتی تو آپ کبھی بھابھی کو اس طرح سے ٹالتی نہیں۔ آپ انہیں صاف جواب دے دیتیں۔ آپ بھائی کو اسی وقت انکار کردیتیں۔ جب انہوں نے آپ کے سامنے یہ بات کی تھی۔" اس کا لہجہ تیز ہوتے ہوئے نم ہوگیا۔ "مجھے اس لفنگے سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ میں ایک بار پھر آپ کو بتا رہی ہوں۔"

اماں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی وقت اکو نے دوڑتے ہوئے آکر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ موول کو بھی متوجہ ہونا پڑا۔

"کیا ہوا؟"

"وہ۔۔۔ وہ یوسف بھائی کے ابا نہیں ہیں۔" اس نے ہانپتے ہوئے تمہید باندھی۔

"ہاں ہیں، آگے بول۔۔۔"

"انہیں ان کی بھینس نے ٹکر مار دی۔" اس نے انکشاف کیا تھا۔

موول بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مذاق کر رہا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ان کے سر سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ ابھی ہسپتال لے کے گئے ہیں۔ میں خود دیکھ کر آرہا ہوں۔" اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"ہائے اللہ۔۔۔" اماں نے پریشانی سے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "ان کی تو عمر بھی کافی ہوگئی ہے۔ کہیں زیادہ نقصان ہی نہ پہنچ گیا ہو۔ موول چادر پکڑا مجھے ذرا جاکر فضیلہ کو تو دیکھ آؤں۔" اماں نے فوراً ہی جانے کا ذہن بنالیا۔

موول سرہلاتی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔



"مجھے پیر صاحب نے کہا بھی تھا۔ گاؤں جانے کا خیال دل سے نکال دوں۔ مگر میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ تو شکر ہے ہڈیاں سلامت ہیں۔ ورنہ پیر صاحب نے تو کسی بڑے خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔" یوسف کے سہارے تکیوں سے ٹیک لگاکر نیم دراز ہوتے ہوئے ان کے منہ سے کراہیں نکل گئی تھیں۔ سر پر تو جو چوٹ آئی۔ سات ٹانکے تو اس کے لگے ہی۔۔۔ ساتھ ہی میں کمر میں چک آگئی۔ اب ان کا اٹھنا بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔

"دیکھا۔۔۔ منع تو ہم نے بھی کیا تھا۔ اس وقت تو منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی کہ پیر صاحب نے جانے سے روکا ہے۔ خود تو ان کی بات پلے پڑتی نہیں۔ آکر ہمیں ان کے نام کے ڈراوے دینے لگتے ہو۔ میں کہہ رہی ہوں یوسف کے ابا۔۔۔ آئندہ ہمارے سامنے اپنے پیر کا نام مت لینا۔" اماں کے لیے یہ انکشاف تھا جسے سنتے ہی وہ غصے سے بھر گئی تھیں۔

"سن یوسف۔۔۔ اس بھوری کا جلد سے جلد کوئی گاہک دیکھ۔۔۔ میں اسے اب اپنے باڑے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج ٹکر ماری ہے تو سر پھاڑ دیا ہے۔ کل کو اپنے سینگوں سے پیٹ پھاڑ دیا تو میں کیا کروں گا۔" ابا جی کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ یوسف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابا کو تکلیف میں دیکھ کر اسے

تکلیف تو ہو رہی تھی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ دل ہی دل میں بھوری کا شکر گزار تھا کہ جو کام ابا جی کے پیر صاحب نہیں کرپائے وہ بھوری نے کر دکھایا تھا۔

"نہ تو مجھے یہ بتاؤ.... تمہیں ضرورت کیا پڑی تھی۔ اتنے بے وقت باڑے جاکر انہیں چارہ ڈالنے کی.... جیسے تم نہ کرتے تو انہوں نے بھوکا ہی مرجانا تھا۔" اماں کو تو ابھی تک ڈھلتی شام میں ان کے باڑے جانے کی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی جبکہ سویرے انہیں گاؤں کے لیے بھی نکلنا تھا۔

"بس مت ماری گئی تھی.... سوچا جانے سے پہلے ایک بار پھر دیکھ آؤں۔" وہ خفت زدہ لہجے میں بولے۔

دل میں پھیلتی طمانیت کو محسوس کرتے ہوئے یوسف ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ تب ہی سامنے سے آتی خالہ کو دیکھ کر رک گیا۔

"سلام خالہ...." پشت پر ہاتھ باندھ کر مودب لہجے میں سلام کرتے ہوئے اس کے انداز میں جتنا احترام تھا ان کا جی خوش ہو گیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا.... کیسے ہو اور ابا جی کیسے ہیں تمہارے۔ سنا ہے بھینس نے ٹکر ماردی ہے۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" وہ تشویش بھرے لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

"نہیں.... زیادہ تو نہیں.... سر پر ٹانکے آئے ہیں۔ ویسے اب وہ ٹھیک ہیں۔" وہ بتانے لگا۔ اسی وقت اماں بھی خالہ کی آواز سن کر نکل آئی تھیں۔ دونوں میں رسمی مکالمے ہونے لگے تو وہ باہر نکل آیا تھا۔ اسے ایک بہت ضروری کام نپٹانا تھا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار اسے ابا جی کے پیر صاحب سے کام نکلوانا تھا۔ اور یہ کام ایسا تھا کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ کراماتی پیر صاحب اسے ضرور کر دکھائیں گے۔



پچھلے دو، تین دن سے پڑوس میں کافی ہلچل مچی رہی تھی۔ پھر رانی نے بھی کالج آنے کی زحمت نہیں کی۔ اگر مومل اپنے پڑھائی کے معاملے میں اتنی سنجیدہ نہ ہوتی تو اک آدھ چکر تو ان کے گھر کا لگا آتی۔ مگر امتحان تھے اور ان دنوں اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔ دوسری طرف اس کا انتظار کر کے رانی نے تنگ آکر اسے بلاوا بھیجا تو اسے تھوڑا ٹائم نکالنا ہی پڑا۔

"دیکھ.... کتنی سی شکل نکل آئی ہے تیری.... اتنی پڑھائیاں کر کے تجھے فائدہ کیا ہونے والا ہے مومل.... بننا تو تجھے اسی وسیم کی تھانے دارنی ہے۔" رانی اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی تھی۔

اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "بس بھی کر رانی.... تو میری دوست ہے یا دشمن۔"

"چل چھوٹ.... آمیں تجھے نسیمہ سے ملواؤں.... سچ میں بہت اچھی ہے۔"

رانی کے بدلے ہوئے تیور اس کے لیے حیران کن نہیں تھے۔ ویسے بھی اپنے بھائی کے ٹکر کھانے کی خبر سن کر جو اس کی پھپھو گاؤں سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ اپنے ساتھ مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکرے بھی ساتھ لائی تھیں۔ جسے دیکھ کر کوئی پاگل بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ بھائی کی طبیعت پوچھنے کے بہانے درحقیقت ان کا اصل مقصد کیا تھا۔

"ہاں.... یہ گاؤں سے کزن آگئی ہے۔ اسی لیے مجھے منہ نہیں لگایا جا رہا اور میں سمجھ رہی تھی۔ کہیں رانی مر تو نہیں گئی۔ ایک دن اور تیری خبر نہ آتی تو میں تجھ پر فاتحہ پڑھنے والی تھی۔" مومل کا غصہ یہ سنتے ہی عود کر آیا "اور یہ نسیمہ وہی نسیمہ ہے نا جسے تو بھینس، ڈھول اور ڈرم جیسے نام دیتے نہیں تھکتی تھی۔" اب اس نے یہ جتایا تو رانی کی رنگت اڑ گئی۔

"چپ کر جا مومل.... مروائے گی کیا۔ اس نسیمہ کے پیروں میں چکر ہے۔ پورے گھر میں دندناتی پھرتی ہے۔ ایسا نہ ہو تیری بکواس سن لے۔"

"سچ سچ بتا.... معاملہ کیا ہے؟" وہ اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"معاملہ کیا ہونا ہے۔ بتایا تو تھا تجھے.... پھپھو میرا ہاتھ مانگنے آئی ہیں۔" رانی شرما گئی بتاتے ہوئے۔

"اوہ۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اور وہ دوسری بات؟"

"کون سی؟" وہ الجھ گئی۔

"یوسف والی۔۔۔" اس نے قدرے برہمی سے یاد دلایا۔

"وہ تو اباجی کی خواہش تھی۔ پھپھو نے تھوڑی کوئی ایسا خیال ظاہر کیا تھا۔" اس نے منہ بنا کر بتایا۔

"اچھا۔۔۔ آنا۔۔۔ اس سے پہلے کہ نسیمہ یہاں آجائے۔ سوچے گی ہم یہاں کھڑے کیا کھسر پھسر کررہے ہیں۔ اتنی دیر سے اور شاید اسی لیے اس طرف آبھی نہیں رہی۔" وہ اس کے ساتھ کچن میں موجود تھی۔ جب رانی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس ڈرائنگ روم نما کمرے میں لے آئی۔ جہاں رانی کی اماں کے ساتھ اس کی پھپھو اور نسیمہ بھی موجود تھیں۔ خالہ نے اسے دیکھتے ہی انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ اور ان بھاری بھر کم جسامت والی خوش شکل سی خاتون سے جس خصوصیت سے اس کا نام لے کر تعارف کرایا۔ مومل قدرے حیران سی ہوگئی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے حال احوال پوچھا۔

"نسیمہ! یہ میری سکھی کم بہن۔۔۔ میں نے تجھے اس کے بارے میں بتایا تھا نا۔" رانی نسیمہ سے مخاطب ہوئی۔ جبکہ مومل اسے دیکھ کر دنگ تھی۔ گوری چٹی، دلکش نقوش کی حامل نسیمہ اتنی حسین تھی کہ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا آپ اس کے سامنے کم تر سا لگا تھا اور اسے دیکھنے کے بعد وہ رانی کو اکیلے میں گھیرنے کے لیے بے چین تھی۔ بڑی مشکل سے دس، پندرہ منٹ بیٹھ کر جب اس نے جانے کے لیے بہانا بنایا تو رانی اٹھ کر اس کے ساتھ دروازے تک آئی۔

"رانی کی بچی۔۔۔ کتنی بڑی جھوٹی ہے تو۔۔۔" اسے ایک زور کی چٹکی کاٹتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔

"کیا کیا ہے میں نے۔" اس کے چہرے پر حیرت اور اذیت ایک ساتھ ابھری تھی۔

"تو نے اس نسیمہ کے بارے میں کیا کیا بکواس کی تھی۔ پتا ہے میرے ذہن میں نسیمہ نام کے ساتھ کیسا تصور آتا تھا۔ ایک بڑی سی بھینس لڑکی کی شکل والی۔۔۔ بالکل لکی ایرانی سرکس کی ممتاز بیگم کی طرح۔" وہ اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تو جھوٹ تھوڑی بولا میں نے۔۔۔ تو صرف شکل دیکھ رہی ہے۔ وزن میں تو تجھ سے دگنی ہی ہوگی۔" رانی بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔

"مجھ سے دگنی ہوگی تیرے تو برابر کی ہے، پھر بھی تجھے اسے بھابھی بناتے ہوئے موت آرہی تھی، جبکہ وہ اچھلتی کودتی یہاں تک چلی آئی ہے۔ تجھے اپنی بھابھی بنانے کو۔" تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے مومل نے ملامت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

"تو مجھ پر کون سا احسان کررہی ہے۔ اگر گاؤں کے لڑکوں کو صحت مند لڑکیاں پسند نہ ہوتیں تو صائمہ اور نرگس کبھی وہاں اتنی ہٹ نہ ہوتیں۔" رانی نے شرمندہ ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

مومل بے زار ہوگئی۔ "دفع دور۔۔۔ میں جارہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر دیکھ۔۔۔ منگنی میں ضرور آنا ہے۔ ویسے بھی پیپرز ابھی بہت دور ہیں؟" رانی نے کہا تو وہ حیران ہوگئی۔

"تیری منگنی کب ہے؟"

"پتا نہیں۔۔۔ ابھی تاریخ پکی نہیں ہوئی۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"پھر دیکھوں گی۔ کچھ ہی دنوں میں ایگزامز ہیں۔ مجھے تیری طرح کوئی سہلی نہیں لانی۔" جتا کر کہتے ہوئے مومل نے دروازہ کھولا اور دروازے کے اس پار یوسف جو دستک کے لیے ہاتھ اٹھانے ہی والا تھا۔ حیران سا ہوگیا۔ مومل نے شکر کیا تھا کہ دروازہ کھولتے ہی قدم نہیں اٹھایا۔ ورنہ یوسف سے تصادم یقینی تھا۔ یوسف جس طرح اسے دیکھ رہا تھا بھول ہی گیا کہ پیچھے رانی بھی کھڑی ہے اور مومل ایک بار پھر اس کی سیاہ آنکھوں سے چھلکتے جذبوں سے الجھن محسوس کرنے لگی۔

"بھائی... راستہ دیں' مومل کو نکلنا ہے۔" رانی نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ جیسے ہوش میں آتے ہوئے سائیڈ پر ہوا تھا۔ مومل اس کے پہلو سے ہو کر باہر نکل آئی تھی۔



بھابھی اس دن دوپہر کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں موجود تھیں' جب ان کی اماں کا فون آیا اور ان سے بات کرکے جیسے ہی فون بند کیا۔ ہنڈیا کو جوں کا توں چھوڑ کر اماں کے پاس چلی آئی تھیں۔ مومل برآمدے میں اپنے نوٹس پھیلائے بیٹھی تھی۔ مگر بھابھی کی آواز اس کی سماعتوں تک با آسانی پہنچ گئی۔

"اماں... آپ نے کیا سوچا... آپ نے کہا تھا' آپ ریحانہ خالہ سے مشورہ کریں گی۔ مگر ابھی تک تو آپ نے ان سے بات بھی نہیں کی۔ اماں بار بار مجھ سے پوچھ رہی ہیں' میں انہیں کیا جواب دوں۔" اپنے لیے منگوائے گئے سرسوں کے ساگ کے پتے چنتے ہوئے اماں نے لمحہ بھر کو ہاتھ روک کر انہیں دیکھا۔

"بتا تو دیا تھا تجھے... جب تک مومل کے امتحان نہیں ہو جاتے' میں کوئی بکھیڑا نہیں چاہتی۔"

"امتحان تو صرف بہانہ ہے۔ آپ صاف کیوں نہیں کہتیں۔ آپ کو یہ رشتہ کرنا ہی نہیں ہے۔" ان کی بات ختم ہوتے ہی وہ تیز لہجے میں بول پڑیں۔ ان کی ناراضی بھی بے وجہ نہیں تھی۔ کیونکہ وسیم نے ان کی جان عذاب میں ڈال دی تھی۔ وہ بس جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے چکر میں تھا۔

"تو کیوں میرا منہ کھلوانے پر تلی ہوئی ہے کوثر! اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ تیرے باپ کے گھر سے روٹی نہیں آتی میری۔" ان کے بلند لہجے پر اماں کا جلال جاگ اٹھا۔

"میری بیٹی ہے' چاہے کسی فقیر کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑاؤں' چاہے ساری زندگی اپنے سر پر بٹھائے رکھوں اور تیرے بھائی میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ خدا خدا کرکے تو اسے نوکری ملی ہے۔ اس پر عقل اور شکل بھی ماشاء اللہ... میں اگر سوچ بچار کے بعد بھی ہاں کر دوں تو تجھے سو' سو بار شکرانے پڑھنے چاہئیں۔ کہاں کہ تو آکے میرے سر پر ہی سوار ہو گئی ہے۔ کہہ دینا اپنی ماں سے... انتظار کرنا ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ رکھیں اپنے بیٹے کو پلو سے باندھ کر... میری بچی کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" اماں نے بات ہی ختم کر دی۔ باہر مومل کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ اندر جاکر اماں کو گلے لگانے کی خواہش پر بمشکل قابو پایا تھا۔ اگلے ہی لمحے بھابھی منہ پھلائے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ وہ تھیں تو کافی تیز و طرار' مگر اماں کے سامنے ایک حد سے آگے انہوں نے کبھی زبان نہیں کھولی تھی۔

اس وقت جب ان کے نکلتے ہی وہ اندر جانے کا سوچ رہی تھی۔ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور جو ہستیاں داخل ہوئیں' بھابھی تو اپنی جگہ رکیں ہی... مومل بھی بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک پل کو سمجھ میں نہیں آیا اماں کو بلائے یا ان کے استقبال کو آگے بڑھے۔

"سلام خالہ..." اس نے حرکت کی تو بھابھی کو بھی رسم میزبانی نبھانے کا خیال آیا۔ خالہ کی آمد حیران کن نہیں تھی۔ رانی تو چوبیس گھنٹے یہیں پائی جاتی تھی۔ مگر ان کے ساتھ جو گاؤں کے مہمان تھے۔ اس نے انہیں الرٹ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟" تھوڑی دیر بعد بھابھی کچن میں چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"جاکر پوچھ کیوں نہیں لیتیں۔" اس نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔

"اصولی طور پر تو ہمیں جاکر ان مہمانوں کو آنے کی دعوت دینی چاہیے تھی' مگر خالہ انہیں خود ہی ساتھ لے آئیں۔ عجیب بات نہیں ہے۔" وہ اس سے تائید چاہنے لگیں۔

"پتا نہیں... یہ رانی بھی اندر صوفے پر یوں چڑھ کر بیٹھ گئی ہے۔ جیسے پہلی بار آئی ہو۔ باہر آمرے تو اسی سے پوچھ لوں۔" بے چینی سے کہتے ہوئے اس نے

کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔ ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"میں اندر جارہی ہوں۔" اس سے رہا نہ گیا تو اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"رکو ذرا... پہلے یہ برتن دھودو' پھر اندر جانے کی سوچنا اور چائے کو بھی دیکھتی رہنا۔ میں اتنی دیر سے یہاں کھڑی ہوں۔ اندر جاکر تھوڑی ہوا ہی کھا آؤں۔" بھابھی نے فوراً" ہی اس کے ارادے پر پانی پھیرتے ہوئے دوپٹے سے چہرہ پونچھا اور باہر نکل گئیں اور اس وقت جب وہ چائے کپوں میں ڈال رہی تھی 'اُسے اپنے نام کی پکار سنائی دی' وہ ٹھٹک گئی۔

"مجھے بلایا جارہا ہے۔" وہ تذبذب میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس بار اماں کی آواز بڑی تیزی سے سماعتوں تک پہنچی۔

"مومل..."

"آئی اماں..." اس نے جلدی سے چائے کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے اندر کمرے میں چلی آئی۔

"مومل... یہاں میرے پاس آکے بیٹھ۔" خالہ نے بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ اسے یکایک ہی عجیب سا احساس ہوا۔ سوائے بھابھی کے سب کے چہروں پر مسکراہٹ۔ رانی نے تو... پوری بتیسی ہی نکال لی تھی۔

وہ الجھتے ہوئے ان کے قریب آبیٹھی اور اگلا ہی لمحہ اس کے لیے شدید جھٹکے کا تھا جب خالہ نے نجانے کہاں سے اچانک ہی وہ انگوٹھی نکال کر زیر لب بسم اللہ کہتے ہوئے اس کی انگلی میں پہنائی اور پھر سامنے پڑے مٹھائی کے ڈبے سے' جس پر اس وقت پہلی بار مومل کی نظر پڑی۔ ایک گلاب جامن اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دی تھی۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ جبکہ مومل کا ذہن ماؤف اور وجود سُن پڑ چکا تھا۔



اس شام اچانک ہی ابا جی کے پیر صاحب اپنے مرید خاص کی طبیعت پوچھنے ان کے گھر تک چلے آئے تھے۔ ابا جی تو مارے عقیدت کے لرزہ براندام تھے۔ اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر وہ اٹھ کر دروازے تک ان کا استقبال کرنے دوڑے آئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی پلکوں سے جھاڑو مارتے ہوئے ان کی راہ سجا کر ان پر پھولوں کی برسات کردیتے۔

سیاہ رنگت... بھاری بھرکم جسامت والے سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس سر پر سیاہ پگڑی اور بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت انگیز سے لال ڈورے... ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے ان کی نظریں۔ گھر میں چاروں طرف یوں گھوم رہی تھیں۔ گویا ابھی کسی کونے سے کسی شیر یا تیندوے کو برآمد کرلیں گے۔ اپنی شکل و صورت اور حلیے سے وہ پیر صاحب کم اور کوئی سفلی و کالے جادو کے ماہر بنگالی بابا زیادہ لگ رہے تھے۔ رانی اور نسیمہ تو انہیں دیکھتے ہی خوف زدہ سی ہو کر اپنے کمرے میں جا چھپی تھیں۔ جبکہ اماں اور پھپھو دوپٹا اچھی طرح اوڑھے ان کے سامنے ہاتھ باندھے یوں مودب و ساکت کھڑی تھیں۔ جیسے پلکیں جھپکنے پر بھی کسی گستاخی کا احتمال ہو اور یہ سب دیکھتا بے حد سلگتا یوسف۔ اگر ان گھڑیوں میں ضبط لازم نہ ہوتا تو وہ ایک منٹ بھی یہ سب برداشت نہ کرتا۔ پیر صاحب نے پہلے تو پورے گھر کا چکر کاٹا۔ ایک ایک کمرہ دیکھا۔ جس کے نتیجے میں نسیمہ اور رانی کو بھاگ کر کچن میں آکر پناہ لینی پڑی۔ پھر منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے انہوں نے اپنے منحنی اور مسکین سے چیلے کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر گھر کے کونوں میں چھڑکاؤ کرنا شروع کردیا۔ جب ان کا رخ کچن کی سمت ہوا تو ان دونوں کو وہاں سے بھی کسی پسپا ہوتی فوج کی مانند راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ مگر اس بار ان دونوں نے باتھ روم کو زیادہ محفوظ پناہ گاہ تصور کیا اور دروازہ بند کرکے انتظار کرنے لگیں۔ اس کے بعد پیر صاحب' ابا جی کو لے کر ان کے کمرے میں بیٹھے اور اس بند کمرہ میٹنگ میں انہوں نے اپنے چیلے تک کو نہ شامل کیا۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد جب وہ باہر نکلے تو ابا

جی بھی ان کے پیچھے تھے۔ انداز میں احترام برقرار تھا۔ مگر وہ جوش اور ولولہ اب مفقود ہو چکا تھا۔ چہرے پر مردنی لیے وہ پیر صاحب کو دروازے تک چھوڑنے گئے تھے اور اس کے بعد جب اپنے کمرے میں آکر بیٹھے تو اماں کو بلا لیا تھا۔

"پیر صاحب نے کہا ہے "اس گھر پر شدید اثرات ہیں۔ کسی کی بہت بری نظر ہے۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ خود جتنا دہل گئے تھے۔ اپنے انداز سے اماں کو اس سے زیادہ ہولا رہے تھے۔

"یا اللہ... اب کیا ہوگا۔" اماں کی رنگت زرد ہوئی۔

"پیر صاحب نے کہا ہے 'وہ تین راتوں کا چلہ کاٹ کر اثرات تو ختم کردیں گے' مگر اب جو ہم خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کر رہے ہیں 'ہمیں اس سے باز رہنا ہوگا۔" ابا کی یہ بات ان کے پلے نہیں پڑی تھی۔ وہ الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"کون سی مصیبت؟"

"یہی یوسف اور نسیمہ کے رشتے کی۔" وہ نظریں چرانے لگے۔ کیونکہ انہیں اماں کا اگلا جملہ پتا تھا۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی۔" مگر اس بار یہ سن کر اماں نے صرف جتانے والی نظروں پر اکتفا کیا۔

"پیر صاحب نے کہا ہے کہ یہ رشتہ ہمارے لیے خوشی کا نہیں 'مشکلوں کا' مصیبتوں کا باعث ہوگا۔ نہ لڑکی کبھی خوش رہے گی 'نہ میرا بیٹا۔ گھر نحوستوں کا شکار ہو جائے گا۔ ایک کے بعد ایک بلا نازل ہوگی۔" ابا جی ماتھے پر آیا پسینہ پونچھنے لگے۔

"کیا انہوں نے استخارہ کیا تھا ہمارے لیے؟" اماں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں... پیر صاحب کو ایسی باتیں پہلے سے پتا چل جاتی ہیں۔"

"کیوں... نعوذ باللہ... وہ کیا عالم الغیب ہیں۔" اماں ناگواری کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکیں۔ ابا جی گھور کر انہیں دیکھنے لگے۔

"او جاہل عورت... ایسے لوگ اللہ کے خاص قریب ہوتے ہیں۔ خاص درجہ ہوتا ہے ان کا... انہیں وہ سب بھی نظر آجاتا ہے جو میرے اور تیرے جیسے گناہ گار سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"میں تو شکر ادا کر رہی ہوں کہ ہم نے ابھی تک جمیلہ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔" اماں تو ممکنہ صورت حال کا سوچ کر ہی ہراساں ہو گئی تھیں۔

"انہوں نے اس دوسرے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔" انہیں اچانک خیال آیا تو چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"میں نے ان سے پوچھا تھا۔" ابا جی نے سر ہلایا۔ "انہوں نے بتایا کہ اس میں ایسی کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں 'جو یوسف کے رشتے میں آئیں گی۔ ہم چاہیں تو استخارہ کرکے بات آگے بڑھا سکتے ہیں۔"

"تو انہوں نے یوسف کے لیے استخارے کا کیوں نہیں کہا۔" اماں معترض ہوئیں۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ چڑ گئے۔ "میں پیر صاحب سے کیوں' کیسے 'کس طرح جیسے سوالات نہیں کرتا' دیکھ **فضیلہ**... میری بہن یہاں تک آئی ہے 'تو میں اسے مایوس نہیں لوٹاؤں گا۔ یوسف کے رشتے سے تو میں پیچھے ہو ہی رہا ہوں 'اب خاور کے لیے اسے کس منہ سے انکار کروں۔ ویسے بھی اب تو پیر صاحب نے بھی کہہ دیا ہے کہ اس رشتے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ میں کہتا ہوں 'ہمیں رانی کی بات پکی کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ اسے بھی کسی کی بری نظر لگ جائے۔" پیر صاحب کی باتیں سننے کے بعد ابا جی کے لیے اب اتنا بھی غنیمت تھا۔

"یوسف کا رشتہ پھر میں اپنی مرضی سے طے کروں گی۔" انہوں نے ہامی بھرنے سے پہلے شرط عائد کردی۔ کیونکہ جب سے انہوں نے خاور کے دبئی جانے کی خبر سنی تھی 'وہ کافی حد تک موم پڑ چکی تھیں۔

"ٹھیک ہے 'مگر اس کے لیے بھی میں پیر صاحب سے مشورہ تو ضرور لوں گا۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا پیر۔" اپنے اندرونی جوش کو

چھپاتے ہوئے انہوں نے بمشکل خود کو یہ کہنے سے باز رکھا اور وہاں سے اٹھ آئیں کہ ابھی انہیں یوسف کو بھی خوش خبری دینی تھی اور جمیلہ سے بات کرکے کل کا پروگرام بھی ترتیب دینا تھا۔



رانی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اگیزامز کا بہانہ بنائے بغیر اس کی منگنی میں شریک ہوگی اور یہ شرکت بڑے بھرپور انداز میں ہوگی۔ مگر اس وقت یہ کہتے ہوئے رانی کو یہ بالکل نہیں پتا تھا کہ پھپھو جو آئیں تو چند دن کے لیے تھیں' اب ان کا قیام ہفتہ' دس دن سے بڑھ کر پورے مہینے پر محیط ہوجائے گا اور وہ اس کی منگنی چھوڑ کر یوسف کی شادی کی تیاریوں میں لگ جائیں گی اور وہ جو منگنی کے انتظار میں کتابیں بھولے' امتحانات بھلائے دن بھر سہانے سپنوں میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ منگنی کھنچتے کھنچتے یوسف کی شادی والے دن تک جا پہنچے گی۔

امتحانات میں جہاں پیپر ختم ہونے کے بعد موول دمکتا چہرہ لیے کلاس روم سے نکلتی' وہیں اس کی شکل پر بارہ بج رہے ہوتے۔ مگر پھر تسلی دینے کو یہ خیال کافی ہوتا۔

"فیل ہوگئی تو ہوگئی۔ میں نے کون سا پی ایچ ڈی کرنی ہے۔ شادی کے بعد چولہا چوکی ہی تو سنبھالنا ہے۔"

اور بالکل اسی طرح رانی کو اس کی منگنی میں آنے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے موول کو بھی یہ پتا نہیں تھا کہ وہ خود اس کی منگنی میں دلہن بنی بیٹھی ہوگی۔ پورا پورا پروٹوکول لے رہی ہوگی اور رانی اس کے ناز اٹھانے کو اس کے آگے پیچھے ہورہی ہوگی۔

جس دن خالہ نے اسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ حیرت و بے یقینی کی زیادتی سے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی اور پھر رات کو جہاں ایک طرف بھابھی نے ہنگامہ کھڑا کیا' وہیں اس نے بھی اماں کے اس اچانک فیصلے پر کافی احتجاج کیا۔ کہاں تو وہ بھابھی کو امتحانوں تک ٹالے جارہی تھیں۔ کہاں اب ایک ہی دن میں اسے یوسف کے نام کی انگوٹھی پہنوا دی۔

مگر اس کے شور مچانے پر اماں نے ایک ہی بات کی تھی جس نے اس کے سارے غصے کو ایک پل میں ٹھنڈا کردیا تھا۔

"دیکھ موول۔ شادی تو تیری ہونی ہے' آج نہیں تو کل۔ میں ساری زندگی تیرے ساتھ نہیں رہوں گی۔ نہ تیری بھابھی ایک وقت سے زیادہ تجھے برداشت کرنے والی ہے۔ وسیم کے رشتے پر تو میں سوچ رہی تھی۔ مگر جب **فضیلہ** نے مجھ سے بات کی تو مجھے خیال آیا کہ یوسف سے بھلا لڑکا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اکلوتا ہے' اچھا خاصا روزگار ہے۔ اتنا نیک اور فرماں بردار۔ میں تو دعاؤں میں اللہ سے تیرے لیے ایسا رشتہ مانگا کرتی تھی۔ تو کیا سوچتی ہے میں نہیں جانتی۔ لیکن اگر تجھے یوسف نہیں پسند تو پھر وسیم کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اب تو خود فیصلہ کر۔ یوسف یا وسیم۔" دو ہی تو آپشنز تھے اس کے پاس اور تب اس نے آنکھیں بند کرکے یوسف کا نام لے دیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ کسی دفتر میں اٹھنا بیٹھنا نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی ڈگری بھی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ وسیم سے ہزار درجے بہتر تھا۔ مزاج میں' صورت میں اور کردار میں۔

اور اب وہ اس کی سیج پر بیٹھی اس کی زبان سے اس کی شدتوں اور بے تابیوں کی جو داستانیں سن رہی تھی' اس پر حیرتوں کے عجیب ہی در کھلتے جارہے تھے۔

"تم نہیں جانتیں۔ تمہیں پانے کے لیے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔" اس کی سج دھج' اس کے سنگھار کو نگاہوں میں سموتے ہوئے وہ اسے اپنی والہانہ نظروں سے دہکانے لگا تھا۔

"مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آرہا۔ تم میری ہوچکی ہو' میرے سامنے بیٹھی ہو۔" اتنی سی دیر میں وہ نجانے کتنی بار اسے چھو چھو کر خود کو اس کی موجودگی کا یقین دلا چکا تھا۔ وہ نازاں سی ہونے لگی تھی اس کی اس درجہ

دیوانگی پر۔

"آپ کے ابا جی نہیں مان رہے تھے ناں؟" اُسے اتنا ہی پتا تھا۔

"نہیں۔" وہ دھیمے سے بولا۔ "اور وہ کبھی نہ مانتے اگر جو میں نے... تم سنو گی تو شاید تمہیں میرا طریقہ کار غلط لگے۔ مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

اس مبہم سی وضاحت پر وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ "کیا مطلب؟"

"ابا جی کے پیر صاحب کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا میں نے۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ مومل الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابا جی ان کو بہت مانتے ہیں۔ میں ان سے کچھ دن پہلے ملا اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ انہیں ابا جی کو اس رشتے سے کیسے باز رکھنا ہے۔"

"لیکن اگر وہ واقعی پیر ہیں تو انہوں نے آپ کی بات کیوں مانی؟" مومل نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔" ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کے چہرے پر تاسف بکھر گیا۔

"اگر وہ سچے پیر ہوتے تو بھی ابا جی کی ان کے لیے اتنی شدید عقیدت کسی طور جائز نہیں تھی جبکہ وہ پیر..." غصے سے کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جانتی ہو' اس نے مجھ سے اس کام کے لیے کتنے پیسے مانگے تھے..." وہ پوچھ رہا تھا۔ "پورے پچاس ہزار..." مومل کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا اس انکشاف پر۔

"پچاس ہزار... آ... آپ نے دے دیے۔" وہ بے یقین تھی۔

"میرے لیے یہ کرنا بہت ضروری تھا مومل۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں تھک گیا تھا یہ سوچتے سوچتے کہ ابا جی کو کیسے بتاؤں۔ کیسے سمجھاؤں۔ ہول جاتا تھا یہ سوچ کر کہ جس شخص کو وہ اپنا مرشد مان کر اس کی عقیدت میں شرک کی حدوں تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ انہیں کہاں پہنچا سکتا ہے۔ براہ راست انہیں کچھ کہتا تو وہ کبھی نہ سمجھتے' اس سے پہلے بھی بارہا کوشش کر چکا ہوں۔ ابا جی کا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ انہیں چھینک بھی آ جائے تو گلے میں اپنے پیر کا تعویذ لٹکائے گھومنے لگتے ہیں۔ سودا سلف کے لیے بازار جانا ہو تو پہلے پیر صاحب سے مشورہ کر کے بازار کا نام پتا کرتے ہیں۔ کوئی کام نہ بن رہا ہو تو بجائے اللہ سے مدد مانگنے کے پیر صاحب کو چلہ کاٹنے کا کہتے ہیں۔" وہ کہتے کہتے رکا تھا۔ "اسی لیے... اسی لیے مجھے یہی راستہ بہتر لگا۔ تمہیں پانے کے میرے پاس اور بھی طریقے تھے۔ میں نہ چاہتا تو ابا جی سو سالوں میں بھی مجھ سے اپنی بات نہیں منوا سکتے تھے۔ میں انہیں دکھانا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا کہ اپنے جس پیر کی قدموں کی خاک کو وہ اٹھا اٹھا کر اپنے ماتھے پر لگاتے ہیں' اس کی

اصل اوقات کیا ہے۔ جسے وہ عالم الغیب ٹھہرا کر شرک جیسے بد ترین گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں "اس کا اپنا ایمان کیا ہے۔ اور کل میں ان کے سامنے ساری بات کھول دوں گا۔"

"کل ہی...." مومل جو تعجب کے عالم میں اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پریشان سی ہو گئی۔ "وہ ناراض نہیں ہوں گے؟ یہ بھی ایک طرح کا دھوکا ہی تھا۔"

یوسف نے نفی میں سر ہلایا۔ "اپنے پیر سے ملنے والے دھوکے کے بعد انہیں کچھ اور نظر ہی کہاں آئے گا۔ وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔ غصہ بھی ہوں گے مگر مجھ پر ہرگز نہیں۔ مجھے انہیں یہ سچائی جلد ہی بتانی ہوگی مومل! ورنہ ان سے کچھ بعید نہیں ہے۔ ہماری جوڑی کو نظر بد سے بچانے کے لیے اپنے پیر سے چار پانچ تعویذ اور لے آئیں اور ہمارے گلے میں باندھ دیں۔"

اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تھا۔ مومل کے چہرے شرمیلی سی مسکان آئی۔

"شکر ہے آپ ایسے نہیں ہیں۔ ورنہ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے، سمجھ دار لوگوں کو بھی ان پیروں فقیروں کے چکر میں پڑتے ہوئے دیکھا

ہے۔" اسے حقیقتاً" اطمینان نصیب ہوا تھا۔ ورنہ باپ کی دیکھا دیکھی یوسف کا ان چیزوں میں پڑنا کچھ اچنبھے کی بات نہ ہوتی۔

"اپنے اپنے عقیدے اور ایمان کی بات ہوتی ہے۔ اور میں یہی سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ میں اباجی کو ایک پیر صاحب کی اصلیت بتا سکتا ہوں۔ اور کس کس کے پول کھولتا پھروں گا' اباجی کا بھروسا ایک پیر سے اٹھ سکتا ہے' مگر اس بات کے لیے کوئی انہیں کیسے سمجھائے کہ ہر مصیبت' ہر مشکل' کسی جادو ٹونے یا اثرات کا شاخسانہ نہیں ہوتی۔ کچھ مشکلیں اور آزمائشیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ جنہیں ہمیں جھیلنا پڑتا ہے ہر حال میں.... جنہیں کوئی تعویذ' کسی قسم کا کوئی چلہ دور نہیں کر سکتا' سوائے ہماری اپنی دعا

کے۔" وہ متاسف و متفکر لہجے میں کہتا چلا گیا۔

مومل یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی وہ کتنا حساس تھا خود سے وابستہ رشتوں کے لیے۔ اسے ایک لمحے کے لیے خود پر رشک سا آیا۔ اپنے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت محسوس کرتے ہوئے وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"آپ یہ تو مانتے ہیں ناں کہ دعا میں ضرور اثر ہوتا ہے۔ تو بس ہم بھی ان کے لیے دعا کریں گے' کچھ باتیں ہم اس طرح سے نہیں سمجھا سکتے جس طرح کہ گزرتا وقت انسان کو سمجھا دیتا ہے۔ آپ بھی یقین رکھیے کہ ایک نہ ایک دن وہ خود سمجھ جائیں گے ...اور...."

"اور....؟" وہ جو محویت سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا' اس کے اچانک چپ ہو جانے پر بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

"اور پلیز.... ایک دن اور انتظار کر لیجیے۔ کل کے دن انہیں کچھ مت بتایئے گا۔" وہ نظریں جھکائے ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

"کیوں....؟" یوسف نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اٹھایا۔

"میں.... میں کل کے دن کوئی تلخی یا تناؤ نہیں چاہتی چاہے' وہ کسی بھی صورت ہو۔ میں.... کل سب سے خوش گوار صبح چاہتی ہوں۔" اس کی رنگت میں گلابیاں بکھری تھیں۔ یوسف دیوانہ سا ہو گیا۔

"جو حکم سرکار کا.... نہیں بتاؤں گا۔ میں خود بھی آج کی رات کو اور اس رات کی صبح کو سب سے خوش گوار اور خوب صورت ترین بنانا چاہتا ہوں۔" دھیمے بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اسے قریب کیا تھا۔ اور اس کی دھڑکنوں میں ساز سے بج اٹھے تھے۔



ایمان علی

آفریں آفریں

"پیاری سکھی پروین عرف پینو!

آج اتنے عرصے بعد میرا سندیسہ ملتے ہی تو یقیناً" ٹھٹک کر یہی سوچنے لگ گئی ہو گی کہ کہیں میں نے تجھ سے کوئی جوڑا، کوئی زیور شیور، کوئی سرخی پاؤڈر یا پیسے ادھار لینے کی خاطر تو چٹھی نہیں لکھی.... یاد ہے! شادی سے پہلے میں تجھے یوں ہی "چٹھی ذرا سکھی کے نام لکھ دو" کی تفسیر بنی، تجھ سے چیزوں کی مانگ تانگ کیا کرتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ تو نے کبھی مجھے کچھ نہ دیا۔ وہی تیری کنجوسی کی موروثی بیماری.... خیر مٹی پا!

اماں اور خالاؤں سے سنتے قد نکالا کہ سسرال ایسا میدان ہے، جہاں آپ کی اس قدر خوشیاں نوچی جاتی ہیں کہ آپ کھسیانی بلی بن کر کھمبا ہی نوچے جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ تیری غصے سے پھولی نسیں پھٹیں اور تو بھی چیخ مار کر بے ہوش ہونے کی ناکام سعی کرے.... میں ہی بتا دیتی ہوں۔ اوپر کی باتیں میں نے کل والے ڈرامے کی قسط سے چرائی ہیں۔ تو دل پر نہ لے۔ چورنی تو میں بچپن سے ہی ہوں۔

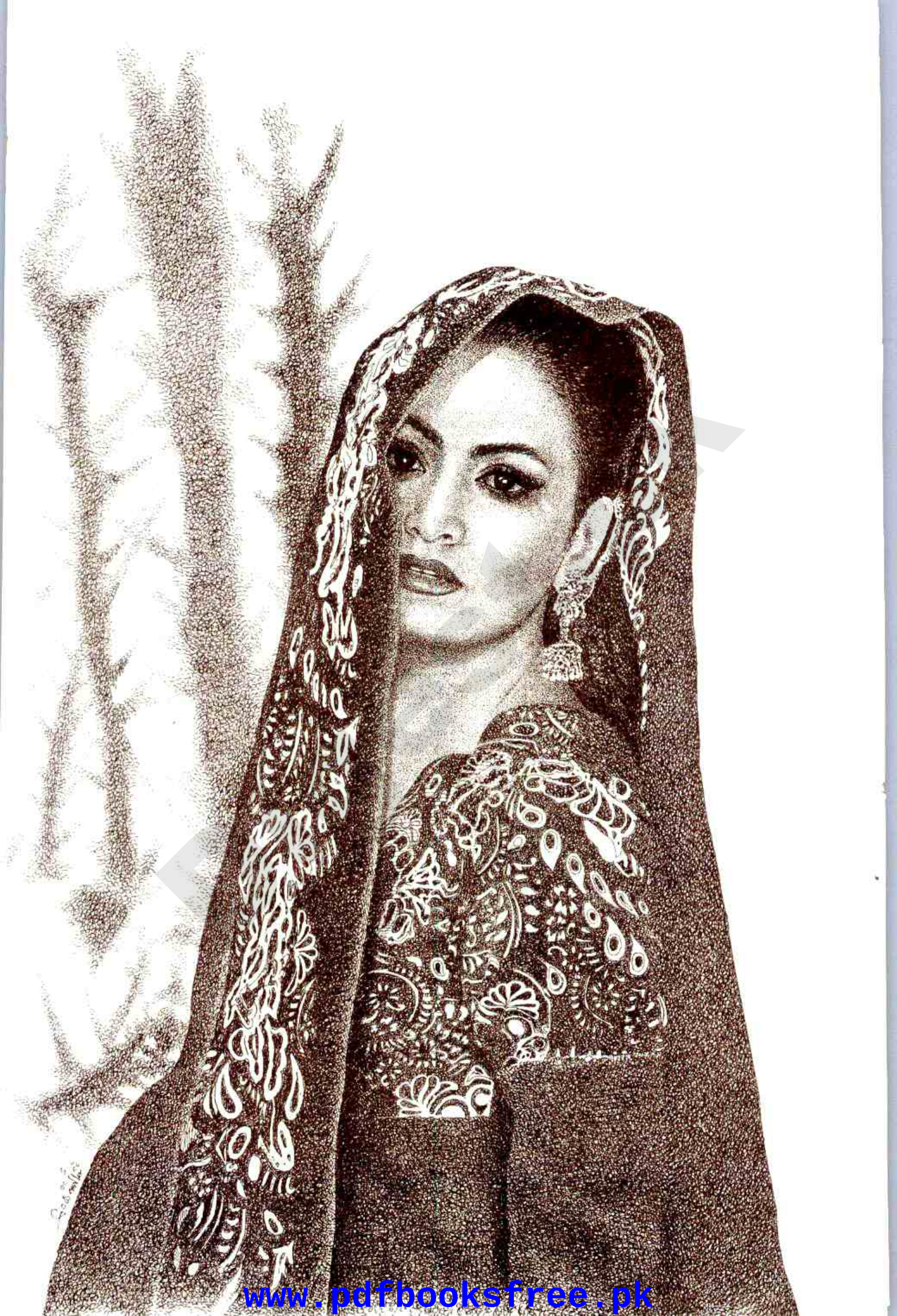
پیاری پینو! ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پیر لرز رہے ہیں۔ سر گھوم رہا ہے۔ غم سے آنسو آنکھوں کے مکان میں کرائے دار سے مالک مکان بن بیٹھے ہیں۔ دل حزیں دن و رات آہ و فغاں کرتا رہتا ہے۔ ساری ساری رات شوکت علی کے دکھیارے ماہیے ٹپے سن کر اشک بہاتی ہوں۔ میں تو آج بھی اس پل کو کوستی ہوں، جب تین بار "قبول ہے" کا رسا گلے میں ڈال کر اپنی ہنستی کھیلتی ناچتی کودتی زندگانی کا گلا دبا دیا تھا۔ کہنے کو تو شادی کو ابھی چار ہی ماہ ہوئے ہیں مگر ان چار ماہ کے روز و شب نے مجھے ادھ موا کر کے میرا وزن نوے کلو سے گھٹا کر ستر کر دیا ہے۔ اماں سے تو میں ضرور پوچھوں گی جو اس ماسی فضیلتے کے کہنے پر اپنی حور جیسی بیٹی کو آگ کے تندور میں جھونک کر آسمان بالا کو رونقیں بخشنے چلی۔ اماں! یہ تو نے کون سے جنم کا مجھ سے بدلہ لیا ہے....

اور ماسی فضیلتے کو تو میں اٹھتے بیٹھتے صلواتیں سناتی ہوں ایسے جنجال پورا سسرال دینے پر۔ کاش، اے کاش! اس یتیم میرا ابا زندہ ہوتا.... مگر وہ تو میرے دنیا میں آنے سے پہلے ہی چل بسا تھا۔ شاید وہ مجھے دیکھنے سے خوف زدہ تھا۔

"پینو! تو میری بچپنی دوپٹا بدل بہن! تجھے یاد ہے، ایک ہی تھالی میں کھاتے کھاتے لڑتے مارتے جھگڑتے ہم نے ساتویں جماعت بھی اکٹھی فیل کی۔ ارے کیا تجھے اپنی رنگین دنیا میں ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ تیری ہم جولی کن انگاروں پر چل رہی ہے۔ تو گواہ تھی کہ میری کتنی بڑی خواہش تھی کہ میں بھی تیری طرح اپنے میاں کو ایسے ایسے انگلیوں پر نچاؤں گی مگر آہ....

کبھی تو آ کر جان تو.... اس میرے جاہل سسرالیوں سے مل کے تو دیکھ، پھر تو خود ہی میرے گلے لگ کر زار وزار روئے گی۔ غم خوئی کے لیے تجھ سے بڑھ کر ہے بھلا کون، جس کے آگے جلے دل کے پھپھولے پھوڑوں اور اپنے دکھڑے سناؤں....

اس گھر کی مالکہ شکورن بانو عرف اماں شکورہ ہے، جو محلہ بھر میں خالہ چرب زبان کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اماں اپنے آدھے سیاہ آدھے سفید بالوں کی طرح



گھر کی ہر سیاہ و سفید پر قابض ہے۔ میاں دس سال پہلے بیوگی کا تحفہ دے کر دور ہو چلے۔
ان کی پہلی اولاد شگفتہ عرف شگو آپا۔۔۔ خبردار! نام پر دھوکا مت کھانا۔ یہ صرف اپنے نام کی شگفتہ ہے، ورنہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے مزاج اور حال چال کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔
ہر ہفتے کی شام سے اتوار کی شام تک۔۔۔ ماں کے در پر حاضری دیتی ہے اور ساتھ میں اپنے پانچ فسادی بچوں کو لا کر تو ایسی دھمال چوکڑی مچاتی ہے کہ دل کرتا ہے اپنے روکھے سوکھے بے رونق بال کھول کر میں بھی دھمال ڈالوں۔
دوسرے نمبر پر آفتاب جلال میرے مجازی خدا۔۔۔
دسویں جماعت پاس۔ کیا ہوا جو تین واری فیل ہوئے' سرتاج کے مزاج کا آفتاب ہر ویلے سوا نیزے پہ رہتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کا نام "آفتی" رکھا ہوا ہے۔ کبھی منہ پر کہا تو ان کے ہاتھ ہوں گے اور میری گردن۔ کریانے کی دکان کے اکلوتے مالک ہیں۔ کہنے کو میاں میرے ہیں' مگر چلتے ماں کی سکھائی پٹیوں پر ہیں۔۔۔ یہی روگ میرے دل پر چھریاں چلاتا ہے۔۔۔
مجال ہے جو شادی کے بعد ایک ٹیم بھی مجھے اپنی بائیک پر بٹھا کر کوئی چاٹ کوئی دہی بڑے یا کبھی کوئی قلفی' گول گپے کھلانے لے گیا ہو' شکوہ کرو تو طیش سے فرماتے ہیں۔
"یہ کوئی شوق ہے زنانیوں والا۔۔۔ "لو جی گل مک گئی۔ اب کیا نسوار لگانے کی فرمائش کروں۔۔۔
بیس سالہ شبانہ عرف شبو۔ چار جماعت پاس' مگر اپنی چار جماعتی ذہانت پر اکڑتی ایسے ہے کہ اگر کسی اسکول کی ماسٹرانی بھی دیکھے تو توبہ توبہ کر کے ہاتھ کانوں پر لگائے۔ بلا کی جنگ جو ہے۔ چغلیاں لگانے میں دس عورتوں کے برابر۔ حیلہ سازی میں اس کا زمین پر تو کوئی ثانی نہیں۔ اس کے دو ہی شوق ہیں۔ فیشن کرنا۔۔۔ پھر چاہے وہ کھوتی لگے یا بھوتنی۔۔۔ اسے کوئی پروا نہیں اور دوسرا ہر وقت کچھ نہ کچھ چرنا۔۔۔ مجھ سے تو سمجھو خدا واسطے کا بیر ہے اسے۔ ہونہہ!
اور میں سسرالیوں کی ستائی دکھیاری آفرین آفتاب تیری ہم جولی۔۔۔



"ہائے ہائے! میرا تو اسی موئی گرمی سے دم نکل رہا ہے۔" شکورن بانو نے ہاتھ سے پنکھی جھلاتے واویلا مچایا۔
ڈھلتی شام کا وقت تھا اور حسب معمول بجلی کسی یاترا پر نکلی ہوئی تھی۔
"اللہ کرے آج تو دم نکل ہی جائے۔" صحن میں جھاڑو لگاتی آفرین کے دل میں خواہش امڈی۔
"شبو او شبو! ناس پٹی! تو کیا گھنٹہ بھر سے باورچی خانے میں چلہ کاٹ رہی ہے۔" شکورن جھنجلاہٹ اور اشتعال سے پھر چلائیں۔
"چلہ نہیں اماں چولھا کاٹ رہی تھی"۔ کھی کھی کھی
نمک لگی کیری مزے سے چوستی اور مضحکہ خیز کھی کھی کرتی شبو باورچی خانے سے نمودار ہو کر دھپ سے ایک خالی چارپائی پہ دھنسی۔
"چل ہر وقت کھی کھی اور ٹر ٹر نہ کیا کر۔ گرمی سے میرا سر پھٹ رہا ہے۔ دو گھڑی ماں کا سر دبا دے۔" شکورن نے بےزاری سے جھاڑا۔
"اف۔۔۔ اماں! تو دیکھ نہیں رہی۔ میں مصروف ہوں۔ بھرجائی سے دبوا لے۔" شبو نے ڈھٹائی سے انکار کیا۔
"اور تم بھی دیکھ نہیں رہیں کہ میں بھی مصروف ہوں۔ ویسے بھی آج میں سارا دن کام کر کے تھک گئی ہوں۔" آفرین نے تیکھی نگاہ اٹھا کر اسے جتایا۔
"میری ماں کا کام کرتے۔ ہمیشہ تمہیں تھکن ہو جاتی ہے۔ آج کون سی نئی بات ہے۔" شبو نے طنزیہ تیر اچھالا۔ مکارپن چہرے سے ٹپک رہا تھا۔
"اچھا۔۔۔ تم تو جیسے دن رات بیوہ ماں کی خدمت کر کے ثواب ہی کماتی رہتی ہو۔" آفرین بھی اسی انداز

میں گویا ہوئی۔

"اماں!" شبو نے تلملا کر چوسی گٹھلی غصے سے پھینکی پھر چیخی۔ آفرین کے جواب پر وہ جل بھن کے رہ گئی تھی۔

"اری او چھچھوریو ..... میں کہتی ہوں چپ کرو، ورنہ ابھی چھری سے دونوں کی زبانیں کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔"

اماں غضب ناک لہجے میں دھاڑی تو شبو چھکوں پھکوں رونے لگی۔ جہاں اس سے جواب نہ بن پڑتا تھا' وہاں وہ یہی کرتی تھی۔

"ہونہہ ڈرامہ!" آفرین نے قہر بھری نگاہوں سے مکار نند کو گھورا۔

"نی میں تجھے تھوڑی کہہ رہی تھی۔ وہ..... اچھا چل نا چپ ہو جا۔ میری پیاری بچی!" اماں کو پتا تھا اگر یہ باجا بج اٹھا تو رات گئے تک بجتا رہے گا۔ سو دو میٹھے بول سے معاملہ رفع کرنا چاہا۔

"اماں! تو ہمیشہ اس پرائی عورت کی خاطر مجھے نیچا کرتی ہے۔ سناتی ہے۔ جیسے میں تیری بیٹی ہی نہیں۔ جیسے تو نے مجھے پیدا ہی نہیں کیا۔" اس کی اداکاری عروج پر تھی۔

"نہ تجھے تیرے ابے نے پیدا کیا ہے۔ دفع ہو جا۔ مغز چاٹ لیا ہے میرا بھی..... جا کر گلو کو زہر بنا کر دے مجھے' ورنہ اس میلی کچیلی چپی کو ایسا مروڑوں گی کہ تیرا ساہ ہی نکل جائے گا۔"

ایک تو سر کا درد' اوپر سے نہ ختم ہونے والے شبو کے نخرے دیکھ کر اماں نے چراغ پا ہو کر اسے لتاڑا۔ شبو نے ماں کے کڑے تیور دیکھ کر بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

"اور تو....." اماں شکورن نے اب روئے سخن بہو کی طرف موڑا۔

"تو کیا رینگ کر جھاڑو لگا رہی ہے۔ غضب خدا کا گھنٹہ ہو گیا ہے مگر تیری جھاڑو نہ ختم ہوئی۔ ایک نمبر کی کاہل اور پھوہڑ ہے۔ ہر کام میں ڈھیلا پن۔ میکے سے بس یہی چیز کوٹ کوٹ کر بھر لائی ہے۔ نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جو تجھے بیاہ لائے۔"

شکورن نے پہلے کھری کھری سنا کر اس کی طبیعت صاف کی اور پھر قسمت کا رونا رو کر منہ لپیٹ کر اونگھنے لگی۔

آفرین نے کلس کر ساس کو دیکھا اور پھر جھاڑو اٹھا کر فرش پر مارنے لگی۔ دل نے اک لمبی سسکی لی۔

"اماں! یہ تو نے کون سے جنم کا مجھ سے بدلہ لیا ہے؟"



آفرین چائے کا کپ تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو محترم میاں اخبار میں منہ گھسیڑے ہوئے تھے۔ میاں کو کپ پکڑاتے وہ چہکی۔

"سنیے! میری کلائیاں کیسی لگ رہی ہیں!" اس نے چھن چھن کرتی چوڑیاں' ناز سے اس کے سامنے چھنکائیں۔

"کیوں تم نے ان پر سونے کا پانی چڑھوایا ہے۔"

سرتاج نے اس کی طرف دیکھے بغیر اخبار لپیٹا اور ٹی وی کھول لیا۔

آفرین کا تو مانو دل ہی خاک ہو گیا۔

"اللہ ایسا شقی القلب اور سڑیل شوہر کسی کو نہ دے۔"

وہ بڑبڑائی مگر چند ثانیوں کے بعد دوبارہ بولی۔

"اچھا سنیں تو....." اس نے اپنی آواز میں کھنک پیدا کی۔

"اب کیا ہے؟"

آفتاب میاں جو اسکرین پہ ناچتی حسینہ کو حریصانہ نظروں سے تاڑ رہے تھے اس خلل پہ بے زاری سے جھنجلائے۔

"اتنی الفت سے کاش کبھی مجھے بھی دیکھا ہوتا۔"

وہ دل میں سلگی۔

"وہ..... وہ کہ میاں آ رہی ہیں۔" آفرین دبے لہجے میں منمنائی۔

"تو..." غصے سے بیوی کو گھورا۔

"وہ... وہ نئے کپڑے..." میاں کے خطرناک تیوروں پہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیوں تمہارے پہلے والے کپڑے ڈاکو لے گئے ہیں؟" میاں خشمگیں لہجے میں دھاڑے۔

"نہیں وہ پرانے..." آفرین کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"تو پھر کیا نئی حکومت نے پرانے کپڑے پہننے پر پابندی عائد کردی ہے۔" میاں نے غرا کر پوچھا۔

آفرین کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر گرنے لگے۔

"اف کیا مصیبت اماں نے میرے گلے ڈال دی۔ کوئی پیسے ویسے نہیں ہیں میرے پاس۔ ایک تو مہینے کا آخر' اوپر سے اگلے ماہ بقرعید۔ اتنا خرچہ میرے کندھوں پر ہے اور اسے شوق سوجھتے ہیں کاکیوں کی طرح۔ جہاں اتنا گزارا کیا ہے تین ماہ اور گزار لو انہی کپڑوں میں۔" سرتاج نے برہمی سے طبیعت صاف کی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"اماں یہ تو نے کون سے جنم کا مجھ سے بدلہ لیا ہے۔"

آفرین نے روتے روتے دل میں سسکی بھری۔

جب سے اور جس دن سے شبو کی منگنی ہوئی تھی' تب سے وہ اپنی موٹی بھدّی انگلی میں پھنسی پیتل جیسی انگوٹھی گھماتی پھدکتی پھرتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو انگلی کاٹ کر گھر کے بیرونی دروازے پر چسپاں کردیتی۔

"وہ کہتے ہیں شادی پر دو تولے کا سیٹ چڑھے گا تجھے۔"

خصوصاً" آفرین کو بتایا جاتا۔

اور آفرین خاک ہوتے دل کو سنبھالتی مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتی اسے شادی پر سونے کے نام پر بس ناک کا کوکا ہی نصیب ہوا تھا۔

"ہونہہ! صرف سیٹ مل رہا ہے نا سونے کا۔ میاں تو بخشا ہوا ہی ہے۔ سوکھا' کالا لمبا... اس پر یہ لن ترانیاں... ہونہہ!"

آفرین بڑبڑائی۔ اسے شبو کے روز بہ روز بڑھتے ناز نخرے ایک آنکھ نہیں بھارہے تھے۔

"سلیم کہتے ہیں گوشت والی عید کے بعد تاریخ لینے آئیں گے۔"

وہ باورچی خانے میں کھڑی قیمہ بھون رہی تھی کہ اس کے کان میں شبو کی آواز پڑی۔

"اپنے آپ کو انار کلی ہی سمجھنے لگ گئی ہے۔" وہ سُلگی۔ پھر قیمہ جلنے کی بو نتھنوں سے ٹکرائی تو شبو پہ دو ناگوار لفظ بھیج کر سالن کی طرف متوجہ ہوگئی۔



"شگو کا فون آیا تھا۔ وہ آرہی ہے کچھ گھنٹوں میں۔"

اماں نے ناشتے کے دسترخوان پہ شبو کو ایسی نوید سنائی کہ اس کا نوالہ ہی حلق میں اٹک گیا۔

"کیوں آج ہفتہ تھوڑی ہے۔" شبو نے حیرت سے دریافت کیا۔

"کہتی ہے' جی گھبرا رہا ہے۔"

"ابھی دو دن پہلے بھی تو اس کا جی گھبرایا تھا۔ آج پھر۔" شبو نے نخوت سے ناک سکوڑی۔

"نی تجھے کیوں سوئی کی طرح چبھتی ہے وہ۔" اماں نے بھنّا کر اعتراض کیا۔

"رہنے دو اماں! تم دونوں تو کسی کونے میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر لمبے راگ چھیڑ دیتی ہو اور ان کی فسادن اولاد کی آیا گیری کرکے میری ٹانگیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔" شبو نے منہ بسور کر اپنا دکھڑا رویا۔

اماں جواباً" منہ کھول ہی رہی تھی کہ اسی اثنا میں محترم آفتاب جلال ناشتا کرنے دسترخوان پر چلے آئے۔

"آفرین وے آفرین! اپنے خصم کے لیے ناشتہ لانی!" اماں نے کڑک دار آواز میں بہو کو صدا لگائی۔

آفرین نے ناشتا لا کر میاں کے سامنے رکھا اور خود بھی

موڑھا کھینچ کر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔
"پتر! شگو آرہی ہے۔"
اماں نے ایسے صاحبزادی کی آمد کی اطلاع دی جیسے محترمہ بیس سال بعد تشریف لارہی ہوں۔ پتر کا ایسا منہ سوجا کہ منہ تک جاتا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔
"آپا کو اپنے گھر میں چین نہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو آئی تھی۔" آفتاب نے پھولے منہ جتایا۔ شبو نے کن انکھیوں سے ماں کو دیکھا۔ جیسے اشارہ کر رہی ہو دیکھا نا اماں۔
"ارے تو اداس ہوتی ہے نا پھر اتنی بھری پُری اس کی سسرال۔ اگر انکار کیا تو سو سو باتیں بنیں گی۔ اس کی چپے منہ والی ساس اور چڑیل نندیں دن رات ذرا ذرا سی بات کے طعنے دے کر اس کا جینا حرام کرتی ہیں۔" اماں نے لمبی تمہید باندھی۔
"ہونہہ! جیسے تم لوگوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔" آفرین نے ناگواری سے دل میں ہنکارا بھرا۔ بڑی نند سے تو اس کی بنتی ہی نہیں تھی.... شبو پھر بھی اس کے مقابلے میں چنگی تھی۔
"ٹھیک ہے اماں!" بیٹا نرم پڑا۔
"سودا سلف تو میں اپنی دکان سے منگوالوں گی۔ مگر کچھ پیسے...." وہ کہتے کہتے رکی۔
"وہ کس لیے؟" بیٹے نے ماں کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔
"کرکڑیکا نا ہے نا۔ شگو ہر آئے گئے کے سامنے خوشی خوشی بتاتی ہے کہ جب بھی میکے جاتی ہے بھائی مرحوم ابے کو کمی محسوس ہونے نہیں دیتا۔" اماں کے میٹھے بولوں کا اثر تھا۔ اس کا ہاتھ فوراً جیب تک پہنچا اور پانچ سو کا نوٹ نکال کر ماں کی ہتھیلی پر رکھ کر بولا۔
"میرے پاس فی الحال یہی ہیں۔"
"یہی بہت ہیں۔ جیتا رہ میرا پتر۔" اماں نے جھٹ بیٹے کی بلائیں لیں اور دوپٹے کے پلو میں پیسے باندھ کر گرہ لگانے لگی۔ مبادا بیٹا واپس نہ مانگ لے۔
"آفتاب!" آفرین چیخی۔ اس کی آنکھیں پھٹی۔ رہ گئیں۔ اس کی نگاہوں میں دو دن پہلے کی رات ناچنے لگی' جب سرتاج نے پیسے نہ ہونے کا جواز بتا کر اسے جھڑکا تھا۔
"آپ کے پاس تو پیسے نہیں تھے۔ اب کہاں سے آئے؟" وہ میاں کو گھورتے ہوئے چلائی تھی۔
"تیرے چاچے کی طرح ڈاکا ڈال کر لایا ہوگا۔" اماں نے تنک کر جواب دیا۔
"بتایئے مجھے' اپنی اماں کو دینے کو کہاں سے آئے ؟" وہ ساس کو نظر انداز کرتی بپھری شیرنی بنی میاں پر چڑھی۔ دل پہ ایسا وار پڑا تھا کہ نہ جانے کہاں سے بہادری اور طاقت آگئی تھی۔
"تو دیکھ رہا ہے آفتاب! اپنی زنانی کو۔ کیسے تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اچھل رہی ہے۔ ارے ماں ہوں۔ حق ہے میرا۔ مگر یہ تو منہ کو آرہی ہے۔ لے پتر! واپس لے اپنے پیسے۔ میں باز آئی۔" اماں نے بندھی گرہ کھولی اور پیسے بیٹے کی ہتھیلی پر رکھے جو ابھی تک ہکا بکا تھا۔
"ہائے شگو کے ابا.... کیوں ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔ ہائے تیری شگو یتیم ہو گئی۔ اللہ کسی غریب کو یتیم نہ کرے۔ ہم لٹ گئے برباد ہو گئے۔ ہائے شگو کے ابا! تو سن رہا ہے۔" اماں چارپائی پر بیٹھ کر بین کرنے لگی۔
"اوہو! اماں تو کس باؤلی کی باتوں پر جا رہی ہے۔ شگو میری بہن ہے۔ یہ لے رکھ پیسے۔ کون ہے جو مجھے روکے۔ ٹانگیں نہ توڑ دوں اس کی۔" آفتاب روتی ماں کو دلاسا دیتے سمجھانے لگا۔
"اور تو۔" وہ اب بیوی کی طرف گھوما۔
"اپنے قابو میں رہ سمجھی۔ ورنہ سیدھا کرنا آتا ہے مجھے۔" اس نے فضا میں ہاتھ لہرایا۔ آفرین فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔
آفتاب جلال نے بیرونی دروازہ پار کیا۔ اماں برقع پہن کر تیار ہوئی اور جاتے جاتے بہو کو ہدایت دی۔
"اور تو اچھا کھانا بنا لینا۔"

"کھانا بناتی ہے میری جوتی ہونہہ....." آفرین نے ساس کے حکم پر لعنت بھیجی اور منہ سجائے چلتی بنی۔



"اماں! یہ تو نے کون سے جنم کا مجھ سے بدلہ لیا ہے۔"

وہ جی بھر کر تکیہ بھگو کر اپنے کمرے سے نکلی تو سناٹے نے استقبال کیا۔ یقیناً" آپا کی اولاد باہر سیانے پر گئی ہوئی تھی' ورنہ اللہ کی پناہ ایسا شور کرتے کہ بم پھٹنے کی بھی آواز نہ آئے۔ اماں کے کمرے کا بھی دروازہ بند تھا۔ یقیناً" اندر تینوں ماں بیٹیاں کوئی کھچڑی پکا رہی تھیں۔ بس برآمدے میں شگو آپا کا دو سالہ بیٹا موبائل سے کھیل رہا تھا' جو اس کے ابے کا ہی لگ رہا تھا کیوں کہ آپا اکثر شومارنے کو اپنے میاں کا موبائل لاتی تھی۔

"آج تجھے مزا چکھا کر جلتے دل کی آگ ٹھنڈی نہ کی شگو بیگم! تو میرا نام بھی آفرین نہیں۔" آفرین نے جل کر کہا۔

وہ بھاگ کر باورچی خانے سے پانی سے بھرا گلاس لائی اور لپک کر بچے سے موبائل چھین کر پانی میں ڈالا۔ بچہ بجائے رونے دھونے کے ـــــ شوق سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔

اس نے اس وقت تک پانی میں ڈالے رکھا جب تک موبائل ڈیڈ نہ ہو گیا۔ کامیاب معرکہ مار کر وہ سرشاری سے اٹھی۔

اس کا اگلا نشانہ باورچی خانہ تھا۔ اس نے پہلے ایک پلیٹ میں چُن چُن کر اپنے لیے بوٹیاں رکھیں اور پھر نمک اور مرچ کا پورا ڈبا دیگچی میں انڈیل کر مسکرائی۔

"جاؤ آج عیش کرو شگو آپا!"

ساری بوٹیاں ڈکار کے وہ اماں کے کمرے میں آئی۔ جہاں شگو آپا کے موٹے موٹے ہاتھوں کا کے کی شامت آئی ہوئی تھی۔

"ہائے یہ اس کے پیو کا موبیل تھا۔ اس کا جلالی پیو تو میری بوٹی بوٹی بنا دے گا۔" شگو آپا نے روتے ہوئے دہائی دی۔

"کل پھر وہی پکا لیں گے۔" آپا کے بڑے بیٹے نے ہنستے ہوئے ماں کو چھیڑا۔

شگو نے جھک کر جوتی اٹھائی اور بیٹے کے پیچھے دوڑی۔

"اماں! کھانا لگاؤں۔" آفرین نے آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت سے پوچھا۔

"تجھے فرصت مل گئی اپنے سوگ سے..... جب ہم خود پکا سکتے ہیں تو لگا بھی سکتے ہیں۔ جا تو اپنے حجرے میں۔" اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔



وہ اپنے کمرے میں ٹی وی کے آگے بیٹھی ہیرو پر ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر فریفتہ ہوئے جا رہی تھی۔ جب برآمدے سے اماں نے کڑک دار آواز سے پکارا۔

"آفرین وے آفرین! ذرا دو گھڑی باہر آجا۔"

"کیا ہے اماں! ابھی ہی تو صفائی کر کے دو گھڑی سکھ کا سانس لینے بیٹھی ہوں۔" آفرین نے ناگواری سے جواب دیا۔

"نی منحوس بے حیا..... ہم نے تیرا کون سا سکون برباد کر کے سانس لینے پر پابندی لگائی ہے۔ نہ آوہیں مر۔ لیکن اگر پھر کسی آئے گئے کے آگے رونا رویا تاکہ ساس نے عید کے لتّے نہ لے کر دیے' تو اسی وقت گنجا کر دوں گی۔" اماں نے منہ بھر کر لتاڑا۔

وہ کپڑوں کا سن کر دوڑی آئی۔

برآمدے میں آئی تو دیکھا مائی گٹھڑی سے کپڑے نکال نکال کر چارپائی پر ڈھیر کرتی جا رہی ہے۔

وہ لپک کر چارپائی کے قریب آئی۔ جہاں رنگا رنگ کپڑے کے ڈھیر کو شبو حریصانہ نظروں سے تاڑ رہی تھی۔ بھانت بھانت کے ریشمی' سلک' گوٹا کناری' ستارہ موتی کے کام سے سجے کپڑے دیکھتے ہی آفرین کی بھی رال بہنے لگی۔

"یہ چکن کا جوڑا کتنے میں دو گی۔" اماں نے چکن کا

سفید کپڑا ہاتھوں میں لیتے پوچھا۔
"ہے تو جی پورے بارہ سو مگر میں آپ کو ہزار میں دے دوں گی۔" مائی نے خوشی خوشی بتایا۔
"ہزار؟" اماں کرنٹ کھا کے اچھلی۔ "دماغ ٹھیک ہے نی تیرا۔"
"او جی کپڑا بھی دیکھیں کتنا اچھا ہے اور اوپر سے مہنگائی بھی آسمان پر ہے۔"
"تو کیا میں نے کی ہے مہنگائی۔ ابھی پچھلے دنوں میری پنڈ کی عورت آئی تھی۔ سات سو میں دے رہی تھی یہی جوڑا۔"
"اچھا تو پھر اسی سے لے لینا۔" مائی نے بے تاثر چہرے سے چٹا جواب دیا۔ اماں شکورن کا منہ بن گیا۔ پھر دال نہ گلتے دیکھی تو ان دونوں پر برسی۔
"اوئے یہ تم دونوں کون سے وظیفے پڑھ رہی ہو بیٹھ کر لینا ہے تو جلدی لو ورنہ دفعان ہو۔"
"مجھے تو یہ نارنجی رنگ لینا ہے۔" آفرین نے نارنجی سوٹ پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں یہ کھٹا رنگ میں لوں گی۔ سلیم کہتے ہیں میں کھٹے رنگ میں شہزادی لگتی ہوں۔" شبو شرما شرما کے چہکی۔
"پہلے میں نے کہا ہے سو میں ہی لوں گی۔" آفرین نے لپک جھپک کر کپڑا اپنی تحویل میں لیا۔
"نہیں۔ یہ جوڑا تو میں نے ہی لینا ہے۔" شبو نے کپڑے پہ ہاتھ مار کر کھینچا ـــــ آفرین نے دوسری طرف سے کھینچا۔
"میں نے لینا ہے۔"
"میں نے لینا ہے۔"
"اواو مائیو ـــ میرا کپڑا ـــ" مائی کپڑا کپڑا کہتی چیختی رہ گئی۔
"ناس پیٹیو میں کہتی ہوں چھوڑ کپڑے کو پھٹ جائے گا۔" اماں طیش سے چلائی۔
"کہا نا میں نے لینا۔" یہ آفرین تھی۔
"نہیں یہ میرا ہے۔ دیکھتی ہوں تو کیسے لیتی ہے۔"
یہ شبو تھی۔
اسی نوچ کھسوٹ میں چرر کے ساتھ شیفون جارجٹ کا وہ کھٹا کپڑا چرر پھٹتا چلا گیا اور ایک ٹکڑا آفرین کے ہاتھ تو دوسرا شبو کے ہاتھ رہ گیا۔
"ہائے ربا! میرا کپڑا پھاڑ دیا۔" مائی روہانسی ہو کر گلوگیر لہجے میں بولی۔
"ہونہہ!" دونوں نے ہاتھوں میں تھما آدھا آدھا ٹکڑا پھینکا اور ایک دوسرے پر قہر بھری نظر ڈال کر چلتی بنیں۔
اور اماں ـــ اماں کا جی چاہ رہا تھا دونوں کا قیمہ بنا دے۔
نقصان تو اسے ہر حال میں بھرنا ہی تھا' سو دونوں ٹکڑے شگو کی کاکیوں کے لیے رکھ کر پیسے مائی کے ہاتھ میں رکھے۔

"سیانے سچ کہتے ہیں پینو! کبھی کبھار ہماری چھوٹی غلطیاں نادانیاں ہمیں بڑا نقصان دے کر پچھتاوا دیتی ہیں۔ جیسے آج کل شبو اور مجھے پچھتاوے کی مار پڑ رہی ہے۔ اماں نے اس دن کا بدلہ انوکھے انداز میں لیا شبو اور مجھے عید کا نیا جوڑا نہ دلوانے کا فیصلہ کر کے ـــ
اچھا سن ـــ خط زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اماں بھی کب سے باہر کھڑی سنا رہی ہے۔ ذرا تو بھی سن!
"آفرین وے آفرین ـــ اندر کیا ماں کی روح کو پکے راگ سنا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں باہر آجا۔ ہانڈی روٹی کی فکر کر' ورنہ عید کے دن دنبے کے بجائے تجھے ذبح کر دوں گی۔"
دیکھا ـــ فضول میں میری ماں کو بھی گھسیٹ لیا۔
اگر کسی تعویذ والے کی سن گُن ہو تو اگلے خط میں بتانا۔ یہ سسرال تو واقعی ہری مرچوں کی ایسی قلفی ہے جسے چوس چوس کر کھانا پڑتا ہے۔

اللہ بیلی
تمہاری آفرین!

چاول میں چاول ' چاول میں زیرہ
میری پینو سمندر کا ہیرا

سائرہ رضا



"ماؤں کے ارمان بدنام ہیں۔ ادھر ماں بے چاری کو کسی نے موقع ہی نہیں دیا۔ صاحب زادے کے اپنے ارمان ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے.... بلکہ ارمان بھی کیا صاف صاف شرائط ہی کہیے ہے۔" اماں جان کا لہجہ شکووں سے بھرپور اور جلا کٹا تھا۔

"تم زیادہ ہی برامان گئی ہو.... ہوتے ہیں اپنی لائف پارٹنر کے حوالے سے خیالات و تصورات.... اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔" ڈیڈ نے لبرل ڈیڈ ہونے کا ثبوت دیا۔

"ہماری بیٹیاں نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بے شرم بن جائیں۔ احساس ہی نہ کریں۔ دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے کہ کسی کے گھر جاکر کھائیں، پییں، امید دلائیں اور ہاتھ جھاڑ کر آجائیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ ہم کسی بچی کی تضحیک یا دل آزاری کا باعث بنیں۔" ڈیڈ سنجیدگی سے سیدھے ہو بیٹھے۔ "خاموشی سے گردو پیش پر نظر دوڑایے۔ ماشاء اللہ وسیع حلقہ احباب ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک اچھی قابل بچیاں بھی ہیں۔"

"بالکل ہیں۔ ایک سے ایک اچھی.... مگر آپ کے صاحب زادے کو فل پیکج چاہیے.... ہائی کوالیفائیڈ.... اچھے ادارے سے پڑھی لکھی بلکہ کہیں باہر کی بھی ڈگری لے رکھی ہو۔ عمر پچیس سے زیادہ نہ ہو۔ خوب صورت اتنی ہو کہ حور لگے۔ دراز قامت تو لازمی.... خوش لباس ہو۔ ماڈرن بھی، شرمیلی بھی.... سلیقہ شعار اصغری سی اور کھانے تو ایسے بنائے کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ مہمان نواز.... خوش گفتار ایسی کہ بات کرے تو منہ سے پھول جھڑیں، اور یہ بیٹھ کر چُنتا رہے۔"

"اتنی تمہید کیوں باندھ رہی ہو۔ سیدھے سیدھے کہو۔ مارننگ شو ہوسٹ سے شادی کرنا چاہتا ہے، گدھا۔"

مکمل ناول





"تو جی۔۔۔ آپ صرف سن کر بھڑک اٹھے اور مجھے ڈھونڈنی ہے۔ نو کمپرومائز کہہ کر گیا ہے۔ انچ بھر نہ سرکے گا۔" جو پریشانی پہلے اماں کے چہرے پر تھی اب

وہ ڈیڈ کے منہ سے بھی جھلکنے لگی۔

"اسے کہو خود ہی ڈھونڈ لے۔ ہم قبول کرلیں گے۔ اگر مل جاتی ہے تو۔۔۔ یعنی کہ حد ہوگئی۔۔۔ ایک ہم تھے، جو ماں نے لا دی، خاموشی اور صبر سے قبول کرلی۔ گھونگھٹ کھولنے کے بعد شکل دیکھی۔ ہفتہ بھر تو بیگم کی شکل یاد کرنے میں لگ گیا۔ کتنی ہی خواتین کو بیگم سمجھ کر مخاطب کرلیا۔"

"ہیں۔۔۔ کیا؟" زور و شور سے سرہلاتی اماں جان نے جملے کی گہرائی کو جب جانچا تو ہیں۔۔۔ ہیں کرتی رہ گئیں۔



خود ڈھونڈنے والی ہدایت عاشر کو پریشان کرگئی۔ خود کیسے ڈھونڈے۔ کیا اخبار میں اشتہار دے۔ ٹی وی پر پٹی چلوادے؟

"تو تو خوش نصیب ہے جو کھلی چھوٹ مل گئی۔ ورنہ خود ڈھونڈ لینے والی بات پر تو ماؤں کو ہارٹ اٹیک ہوجاتے ہیں۔" ابوذر نے روشن پہلو دکھایا۔

"اور ہمارے گریٹ ڈیڈ نے تو نشان منزل بھی دے دیا۔ سیدھا سیدھا مارننگ شو ہوسٹ۔ ویسے مجھے نہیں پتا تھا۔ آپ اتنے انسپائر ہیں مارننگ شو ہوسٹ سے۔۔۔"

تیمور نے بھی حصہ لیا۔ ابوذر نے زور و شور سے تائیدا" سرہلایا۔ عاشر کو گویا پتنگے لگ گئے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا، مگر ابوذر کچھ کہہ رہا تھا چلو اس کی بھی سن لے۔

"بھئی اتنی خوبیوں کا مجموعہ مارننگ شو ہوسٹ ہوسکتی ہے۔ مگر وہ پچیس کی ہو یہ ناممکن ہے۔۔۔ ہاں دو بار پچیس کی ہوسکتی ہے۔ تو پھر اتنی کوالٹیز کے بعد یہ چھوٹی سی کمی تو نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ ابوذر نے دریا دلی کی حد کردی۔

"دو پچیس کی دوبارنہ سہی۔۔۔ وہ پچیس سال تک بلکہ مزید کئی سال تک پچیس کی رہ ضرور سکتی ہے۔" تیمور نے حصہ ڈالا۔

"اپنے بڑے بھائی اور بالخصوص بھابھی کا مذاق اڑاتے تمہیں شرم نہیں آتی۔" عاشر نے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"تو بھابھی کا تو میں ماں کی طرح احترام کروں گا۔ مگر ایک بار وہ سامنے آئیں تو سہی۔" تیمور کا لہجہ احترام سے لبریز ہوگیا۔ "ابھی تو وہ نادیدہ ہیں۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں نادیدہ کیوں؟" عاشر اچھلا۔ "ابھی دوپہر کو تو میں نے اسے دیکھا ہے۔"

"کیا؟" ابوذر اور تیمور ہم آواز چلائے اور ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تو اتنی دیر سے میں کیا بکواس کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔" عاشر نے دانت پیسے۔



پھوپھو شاہ جہاں آرام کرسی پر براجمان تھیں۔ ٹانگیں سیدھی کرکے اسٹول پر دھری تھیں۔ آج جمعہ تھا اور بیوٹی پلان ہیلتھ پلان کے تحت جمعے کو وہ ایلو ویرا ڈے مناتی تھیں۔

ٹراؤزر کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھا رکھے تھے۔ ایلو ویرا (گھیکوار) کا پیلا جیل گھٹنوں اور ٹخنوں پر مل رکھا تھا۔ چہرے پر بطور ماسک لگایا تھا اور بالوں کی جڑوں میں بھی ماسی سے خوب گھس گھس کر لگوالیا تھا۔ ہینڈ فری کان سے لڑھک کر شانے پر گری پڑی تھی۔ یعنی وہ سوچکی تھیں۔

بیا نے اس بات کو بھانپ کر اپنے تیز تیز چلتے ہاتھوں کو ہلکا کرلیا۔ مبادا تیزی میں آوازیں پیدا ہونے لگیں اور ان کی نیند خراب ہو۔ وہ فریج میں سامان چیک کررہی تھی۔ کیا کیا موجود ہے اور کیا لانا ہے۔

ساتھ ہی اس نے ایک بڑی پلیٹ بھر کے ککڑیاں کاٹ رکھی تھیں۔ جنہیں وہ مسلسل کھاتی جاتی تھی۔

کمرے میں در آنے والی خاموشی بری طرح محسوس ہونے لگی اور اس سے زیادہ بری آواز ککڑی کی کڑ کڑ تھی۔

ایک کوکنگ میگزین میں بری طرح غرق آئرہ نے شعوری کوشش سے اپنی توجہ ہٹانی چاہی تھی مگر آواز زیادہ تیز اور لگاتار تھی۔ بیا کا مسئلہ تھا۔ وہ سخت ڈائٹ کانشس تھی۔ تول تول کر کھاتی تھی۔ سارا وقت انگلیوں کی پوروں پر انگوٹھے کی مدد سے کیلوریز گنتی پائی جاتی۔ اتنا کھانے سے کتنا بڑھ گئیں۔ اتنا کام کرنے سے کتنی جل گئیں۔ انجان بندہ نوجوانی' حشر سامانی کے زمانے میں ذکر کی اس حالت کو دیکھ کر اش اش کر اٹھتا۔ اتنی خوف خدا کرنے والی لڑکی... ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو...

اس نے بیا کو دیکھا جو کام روک کر ایک بار پھر انگوٹھے کو تیز تیز انگلیوں پر چلا رہی تھی۔ آئرہ نے غیر محسوس انداز میں بیا کی طرف والے کان میں انگلی ڈال کر میگزین عین چہرے کے سامنے کرلیا کہ شکل بھی نظر نہ آئے... مگر...

بیا ایک بار پھر انگلیوں کا پیچھا چھوڑ کر کڑ کڑ کر رہی تھی۔ آئرہ نے دانت پیسے۔ جیسے دنیا ذکر سمجھتی تھی۔ وہ دراصل فکر تھی۔

اس کے علاوہ بیا کا ایک دوسرا کام بھی تھا وہ ایکسر سائز کرتی تھی۔

"کیا آج بھی کچھ نہیں پکے گا۔ میرا مطلب ہے سالن روٹی وغیرہ..." ایراد کی بے زار دکھی آواز پر آئرہ اور بیا بری طرح چونکی تھیں۔ ساتھ دونوں نے تنبیہی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھوپھو کو بھی کہ "آہستہ... پھوپھو سو رہی ہیں۔"

ایراد نے باقی کے سوال حلق ہی میں گھوٹ لیے اور صبح کی روٹی کا بچا آدھا ٹکڑا لہرا کر دکھایا۔ انداز میں بے بسی تھی کہ کیا کھاؤں۔ وہ کچن میں دیکھ کر آگئی تھی۔ ایک چولہے پر چکن ابل رہی تھی' دوسرے پر آلو... ڈھیر ساری کٹی سبزیاں ڈھکی رکھی تھیں۔ دن کے ڈیڑھ بج رہے تھے اور اس گھر میں ہانڈی چڑھانے کا کوئی ارادہ تک نہ تھا۔

شاہی پھوپھو کا آج ایلو ویرا ڈے تھا۔ انہوں نے اٹھ کر بکرے کے گوشت میں ایلو ویرا کا گودا ڈال کر بھون کے روٹی سے کھالیتا تھا۔ جسم کے دردوں کے لیے اکسیر نسخہ... گھٹنوں' ٹخنوں کے آرام کے لیے جیل مل کر بیٹھی تھیں۔ چہرے کی چمک کے لیے منہ پر مل رکھا تھا۔ بالوں کی صحت کے لیے جڑوں پر۔

ایراد وہ کڑوا کسیلا سالن نہیں کھا سکتی تھی۔ ہاں پھوپھو اگر تھوڑا سا قیمہ بنا دیتیں تو... اور وہ بنا ہی دیتیں۔ مگر ابھی تو وہ سو رہی تھیں۔ پھر اٹھتیں۔ پھر جمعہ کی نماز... پھر کہیں جا کر... کھانے تک آتیں... تو کیا اس وقت تک... ایراد بھوکی رہتی۔ بیا نے تو کڑ کڑ کر کے اپنا پیٹ بھرلیا تھا۔ رہی آئرہ... وہ لنچ کرتی ہی نہ تھی۔ جب آفس سے آتی تو کھا لی کر ہی آتی۔

ایراد نے آگے ہو کر فریج میں جھانکا۔ مجال ہے اس میں انسانوں کے کھانے کے لیے کچھ ہو۔ بس بکریوں کے چرنے کا سامان... سلاد... سلاد اور بس سلاد... بنانے کے سارے آئٹمز... بیا نے اشارہ کیا کہ وہ روٹی پر ککڑی کے چند ٹکڑے رکھ کر کھا سکتی ہے۔

"میں کوئی پاگل ہوں۔" ایراد نے دھیمے سے کہہ کر اچار کی بوتل سے تین مرچیں روٹی پر رکھیں اور صوفے پر پیر اوپر رکھ کے ہاتھ میں پکڑے پکڑے کھانے لگی۔ آئرہ کو کھانے کا یہ طریقہ بہت برا لگا۔ اسے غصہ بھی سب سے زیادہ آئرہ پر ہی آتا تھا۔

"کیا فائدہ ایسی بڑی بہن کا... بھلے وہ کوکنگ ایکسپرٹ ہو۔ جب چھوٹی بہن صبح کی روٹی پر مرچوں کا اچار رکھ کے کھائے... میں بتاؤں گی ممی کو۔"

اس نے روہانسے لہجے میں شکایت کی۔ مرچوں کی تیزی نے آنکھیں پہلے ہی بھر دی تھیں۔ آئرہ کو ترس آیا' پھر غصہ اور پھر بہت زیادہ غصہ۔

"ممی کی بچی!" آئرہ پھوپھو کی نیند بھی بھول گئی۔

دانت پیس کر اسے دیکھا۔ ”وہ دو جہازی پراٹھے اور دو انڈوں کا آملیٹ کس نے بنا کر دیا تھا۔“

”وہ میرا ناشتا تھا اور شریف لوگوں کے گھر میں اس وقت لنچ بنتا تھا۔“

”اتنے ہیوی ناشتے کے بعد لنچ کی گنجائش رہ جاتی ہے کیا؟“ بیا نے بھی حیرانی کا اظہار کیا۔

”میں بتاؤں گی ممی کو... یہ میری بہنیں ہیں۔ میرے نوالے گنتی ہیں۔“

”نوالے نہیں‘ پراٹھے۔“ آئزہ نے تصحیح ضروری سمجھی۔ ”یہ بڑے بڑے پراٹھے۔“

”اور دو انڈوں کا آملیٹ بھی تو...“ بیا نے یاد دلانا ضروری سمجھا۔

”اور بہنیں ہوتی ہیں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتی ہیں اور ایک میری بہنیں ہیں۔“ وہ بس ہچکیوں سے رونا شروع ہی کرنے والی تھی۔

”چھوٹے بہن‘ بھائی...“ آئزہ میگزین پٹخ کر سیدھی ہوئی۔ ”تم چھوٹی ہو‘ اٹھارہ برس کی ہونے والی ہو... اور...“

”اور بات ایسے کر رہی ہے کہ انجان بندہ سن کر سمجھے آٹھ نو برس کی بچی شکوے کر رہی ہے۔“ بیا نے اور کے آگے بات کو مکمل کیا۔ آئزہ نے زور و شور سے سر ہلایا۔

”آپ لوگوں سے بہرحال چھوٹی ہوں۔“

وہ دکھ بیان کرتے ہوئے آٹھ سالہ بچی ہی بنی ٹھنک رہی تھی۔ لڑتے ہوئے اٹھارہ سال کی خرانٹ ہو گئی۔ انگلیوں پہ لگے اچار کے تیل کو ایک ایک انگلی منہ میں لے کر چاٹنا شروع کر دیا۔

آئزہ کا ضبط جواب دے گیا۔ پہلے ککڑیوں کی کڑکٹ... پھر مرچوں کی چرچر۔

”بند کرو یہ بدتمیزی... جا کر ہاتھ دھو گندی۔“ وہ بڑی بہن بن کر دھاڑی۔

ادھر ادھر تو کیا اثر ہونا تھا۔ پھوپھو شاہ جہاں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ آنکھ کھولنے سے پہلے ہوا میں دونوں ہاتھ لہرا کر کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی گردان شروع کر دی۔ پھر اچھل کر کھڑی بھی ہو گئیں۔

اور ان کا ہڑبڑانا خوف زدہ ہونا کیا معنی... کہ جوان تینوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

گھٹنوں سے اوپر تک چڑھے پائنچے۔ گوری ٹانگوں پر پیلا جیل... ایک دم بول پڑنے سے چہرے پر لگا پیلا ماسک چٹخ گیا۔ سب سے خراب صورت حال بالوں کی تھی۔ جیل سوکھ جانے کے بعد تین انچ لمبائی کے بال چھت کی طرف اکڑ کر یوں کھڑے تھے جیسے کرنٹ لگنے سے کارٹونز کے ہو جاتے ہیں۔ تینوں ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال ہو گئیں۔



”پہلی بار میں نے اسے کمپاؤنڈ اریا کے گیٹ پر کھڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں یہ ڈھیر سارے وزنی شاپر تھے۔ جنہیں ٹیکسی میں رکھنا بہت مشکل تھا اور بدتمیز ٹیکسی والا ہیلپ کرنے کے بجائے ہٹ دھرمی سے بیٹھا اپنے بال سنوار رہا تھا۔ تب میں نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اللہ جانے کیا کیا بھر رکھا تھا اس نے... پھر اس نے مجھے شکریہ کہا اور بس...“

”پہلی نظر کی محبت...“ تیمور بھونچکا رہ گیا۔ ”اتنی سی مڈبھیڑ میں جانچ لیا کہ یہی وہ خاتون مذکورہ ہیں۔ خوبیوں سے مرصع بے مثال و باکمال۔“

ابوذر کا چہرہ بھی تیمور کی تائید کر رہا تھا۔

”اونہوں...! دوسری بار میں نے اسے یہیں لفٹ کے انتظار میں دیکھا۔ پتا چلا لائٹ چلی گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ بیگز اور شاپر تھے۔ چوتھی منزل سے نیچے کیسے آئی۔ کسی بے حس انسان نے اس کی ہیلپ نہ کی‘ تب مجبوراً“ میں نے آگے بڑھ کر سامان نیچے اتارا۔“

”ایک بار پھر سامان۔“ ابوذر چونکا۔ ”وہ سیلز گرل تو نہیں؟“

"اونہوں..." عاشر کو ٹوکنا بھی برا لگا اور قیافہ بھی...

"تیسری بار وہ میٹرو میں نظر آئی۔ پانچ کلو تیل کی بوتل اٹھا کر ٹرالی میں رکھنا دوبھر تھا تب۔" عاشر کے ہونٹوں پر مسکان اور آنکھوں میں اس کا چہرہ رقص کرنے لگا۔ جیسے وہاں رہا ہی نہیں کہیں اور پہنچ گیا۔

"تب ایک بار پھر آپ نے آگے بڑھ کر وہ بوتل اٹھا کر ٹرالی میں رکھی۔ آپ پارٹ ٹائم قلی کا کام بھی کرتے ہیں۔" تیمور نے حسن اتفاقات کے ایک جیسا ہونے پر دانت کچکچائے اور سوال بھی پوچھ لیا اور اس سے پہلے کہ عاشر' تیمور کی طبیعت صاف کرتا' ابوذر چلایا۔

"یہ وہی تو نہیں جس کو تو نے اپنا نمبر دیا' بلکہ اس کی ٹرالی سے سامان اٹھا اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھا اور بعد میں دوبارہ ٹرالی بھری اور پھر میں آوازیں دیتا رہ گیا کہ بل تو دے جا۔ خالی جیب کھڑا تھا میں۔" ابوذر نے دہائی دی۔

اسے وہ دن جزئیات سے یاد تھا۔ جب گھر کے کچھ ضروری سامان کی خریداری کے لیے عاشر اسے بھی گھسیٹ لے گیا اور اتفاقاً ابوذر اپنا والٹ گھر بھول گیا۔ اس نے دہائی دی کہ والٹ تو لینے دے۔ تب عاشر نے اپنی جیب تھپتھپا کر یقین دہانی کروائی۔ میں ہوں نا اور بعد میں محض ایک لڑکی کی خاطر اسے کاؤنٹر پر ذلیل و رسوا ہونے کے لیے چھوڑ گیا۔ جب سیلزمین نے بل بنا کر پیسے مانگے۔ تب اسے کہنا پڑا۔ بھائی آکر دیتا ہے۔ پیچھے کھڑی لڑکیاں کیسے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تھیں۔ اتنا بڑا شیر جوان اور پیسے بھائی دے گا۔"

"ہاں... تو گیا تھا نا... وہ وزنی بوتل جو اس سے ریک سے اٹھا کر ٹرالی میں نہ رکھی جاتی تھی۔ وہ گاڑی میں کیسے رکھتی۔ اتنی تو نازک سی تھی وہ۔"

"نازک...!" ابوذر چلایا۔ "اسے نزاکت نہیں' کاہلی' سستی اور ہڈحرامی کہتے ہیں۔ یعنی میری اس دن کی ذلت کا احساس تک نہیں۔"

اس نے تیمور کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔

تیمور نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"بالکل... بالکل ایک لڑکی کی نظر میں اپنا امیج اچھا کرنے کے لیے کتنی لڑکیوں کی نظروں میں ابوذر کا امیج خراب کر دیا۔"

ابوذر کو اپنا دکھ نئے سرے سے یاد آیا مگر عاشر چکنا گھڑا بنا کھڑا تھا۔ مجال ہے' جو ذرا اثر ہوا ہو۔

"اوہ جن لڑکیوں کا دکھ رو رہا ہے' وہ کون سی پھپھی کی بیٹیاں تھیں۔ جانے دے اور عزت بے عزتی کا کیا... آنے جانے والی چیز ہے۔ آج ہے' کل نہیں ہے۔"




"تو وہ جس کا سامان آپ مستقل ڈھو رہے تھے۔
وہ کیا ماموں کی بیٹی تھی؟" تیمور، ابوذر کا وکیل تھا۔
"اونہوں...!" عاشر کے چہرے پر تادیب کی سختی آن رکی۔ "ادب سے، وہ بھابھی ہوگی تم لوگوں کی عنقریب۔"
"حاضر بھائی کے لیے چہرے پر کرختگی اور غائب بھابھی کے لیے اتنی ملائمت، شہد آگیں لہجہ..." تیمور نے اس کھلے تضاد پر توبہ توبہ کی۔ کانوں کی لویں چھوئیں۔ ابوذر نے ایک طویل چہ چہ کے ذریعے تیمور کی تائید کی۔
"اور کوئی نام، پتا، گھر، گلی نمبر؟" تیمور کو مزید دھیان آیا۔ اماں جان کو رپورٹ کرنی تھی۔
"وہ بھی پتا لگ جائے گا۔" عاشر کا چہرہ کھل گیا۔
"رہتی وہ یہیں کہیں ہے، یا پھر کسی دوست رشتے دار کے گھر ملنے آئی ہے۔"
"مجھے تو لگتا ہے اس کی کہیں پرچون کی دکان ہے۔" ابوذر بولا۔
عاشر نے اسے گھور کے دیکھا۔ ابوذر نے گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے صفائی دی۔
"جتنی اس کی ٹرالی بھری ہوئی تھی اور جیسے وہ سامان ڈھوتی ہے۔ اسی بنا پر کہہ رہا ہوں۔"
"ہاں واقعی کوئی باپ، بھائی نہیں ہے گھر میں سامان خریدنے کے لیے۔" تیمور بھی بولا۔
عاشر سوچ میں پڑ گیا۔



شاہی پھوپھو کی عزیز از جان دوست تشریف لا چکی تھیں۔ آئرہ نے آداب میزبانی سے قطع نظر محض پھوپھو کے خوف سے چائے پر اہتمام کیا تھا۔ فروٹ، سلاد مع میکرونی اینڈ مایونیز شیشے کے ڈونگے میں سجا تھا۔ رنگ برنگے پھل... چکن نگٹس کی بھری ٹرے... کیچپ کے ساتھ پھوپھو کی فیورٹ گرین چٹنی... آم کے جوس میں سیون اپ ڈال کر بنائی جانے والی ڈرنک، وائن گلاسوں میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔
ٹیبل پر سجی تمام چیزیں بیا کی پسندیدہ تھیں اور پھر جب بنائی ہوں آئرہ نے تو کیا ہی بات... لیکن چونکہ وہ شدید ترین ڈائٹ کانشس تھی، سو اس نے ایک بہت بڑی پلیٹ سلاد کی کھالی۔ اور بعد میں ان چیزوں کو ٹرائی کرتی رہی۔ پھر ایکسر سائز تو منہ کا چسکہ بھی پورا ہو جاتا اور چربی بھی نہ چڑھتی۔
آئرہ کے ساتھ وہی مسئلہ تھا جو ہر دوسرے پکانے والے کے ساتھ ہوتا ہے کہ پکاتے وقت محض خوشبو ہی سے دل بھر جاتا۔ پھر کچھ بھی چکھنے کو دل نہ کرتا کہ طبیعت سیر ہوتی۔
خوشی کا دن صرف ایراد کے لیے تھا۔ اس نے زندگی میں کوئی روگ نہ پال رکھا تھا کہ بھوکے رہ کر سوگ مناتی۔ وہ جی بھر کے بھر بھر کے پلیٹیں کھاتی تھی۔
آئرہ نے گھڑی دیکھی۔ ایراد کے آنے میں کچھ دیر تھی اور خود اس کے جانے میں بھی۔ اسے ابھی تیار بھی ہونا اور دیگر تیاریاں بھی کرنی تھیں۔
شاہی پھوپھو شاہانہ انداز بے نیازی سے صوفے پر براجمان تھیں اور دوست سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔
جب ایراد نے اندر قدم رکھا تب مارے جوش کے باچھیں چری ہوئی تھیں اور اپنے عین سامنے پھوپھو کی دوست کو دیکھ کر تو آنکھیں خوشی، فخر سے اور بھی جگمگا اٹھیں۔ مگر دوسری طرف سب کی خاص کر آئرہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے یہ تو کہا تھا کہ اس کی دوستوں کو "پھوپھو کی دوست" سے ملنا ہے۔ مگر دوستیں اتنی ساری ہوں گی۔ یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔
بیا نے صاف ستھرے ڈرائنگ روم کو دیکھا، جس کے ہر کونے میں سفید یونیفارم میں لڑکیاں ٹک گئی تھیں۔ کشنز پر... صوفے کی ہتھوں پر... ایک دوسرے میں گھس گھس کر... بیا نے چھت پر لگے پنکھے کو دیکھا... شکر وہ اوپر تھا۔ ورنہ تین کی جگہ وہاں بھی بن جاتی۔
ادھر دوستیں کبھی، دوست آنٹی کو دیکھتیں کبھی آئرہ کو۔

دوست نے کھلتے فیروزی رنگ کا لچکتا مٹکتا ڈھیلا ڈھالا سلک کا ایسا لبادہ زیب تن کیا تھا جو شانوں سے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ گلے میں رنگ برنگی چھوٹے موٹے گول موتیوں کی مالائیں... یہ اینٹیک جیولری کے ڈیزائن تھے۔ ویسے ہی کڑے موٹے ہیئت (مگر فیشن میں اِن) ہاتھوں کی زینت تھے۔ انگلیوں میں بڑی بڑی انگوٹھیاں اور ناخنوں پر چمک دار نیل کلر... بال کٹے ہوئے تھے اور سنہری ڈائی تھی۔ بے حد پتلے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک جیسے مار کر سے دو لکیریں کھینچ دی ہوں۔ (دائیں سے بائیں)

سب سے دلچسپ اور حیران کن شے آئی میک اپ تھا۔ دن کے ڈیڑھ بجے اسموکی میک اپ (یعنی پپوٹے سیاہ گھور رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔)

دوستوں کو جب یہ اندازہ ہوا کہ یہ سارا اہتمام آئرہ نے کیا ہے تو وہ کھانے کی اشیا پر ٹوٹ پڑیں۔

آئرہ کے گمان میں دو چار دوستیں تھیں۔ ان کے لیے انتظام تھا۔ مگر وہ اس بارات کو کہاں سے پورا کرتی، اس نے ایراد کو گھورا جو "لونا... تم بھی چکھو... ارے یہ چٹنی تو لو۔" جیسے الفاظ بڑی محبت سے بول رہی تھی۔

دراصل شاہی پھوپھو کی یہ دوست ماہر دست شناس تھیں۔ ساتھ ٹیرو کارڈ دیکھ کر حال مستقبل بتاتی تھیں۔ بچپن کی دلچسپی اور شوق اب پروفیشن بن چکا تھا۔ اور وہ ہر مارننگ شو میں بلوائی جاتی تھیں۔ اب یہ علم سچا تھا یا جھوٹا۔ صحیح یا غلط... مگر ان کی کہی کچھ باتیں جب من و عن درست ثابت ہوئیں تو وہ راتوں رات سب کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ آئرہ ایسی باتوں کو مانتی نہیں تھی۔

لیکن بیا کا ان سب باتوں پر آنکھ بند کرکے یقین تھا۔ آنٹی دست شناس نے اس سے کہا تھا کہ عنقریب اس کی زندگی میں خوابوں کا شہزادہ آنے والا ہے۔ بیا کو دو اعتراض ہوئے۔ عنقریب کی جگہ درست ٹائم بتایا جائے۔ دوسرے خوابوں کا شہزادہ کیوں؟ بادشاہ کیوں نہیں۔

آنٹی دست شناس نے اتنے گہرائی سے پُر سوالوں کے جوابات سے مسکراتے ہوئے پہلو تہی کی اور ڈٹی رہیں کہ خوابوں کا شہزادہ ہی آئے گا۔

جب ایراد نے اپنی دوستوں سے یوں ہی بر سبیل تذکرہ آنٹی کا ذکر کیا تو وہ ملاقات پر اتنا مصر ہوئیں کہ آج کا دن آ ہی گیا۔

اب آنٹی دست شناس جو کسی بھی پروگرام میں مہمان کی حیثیت سے بھی آنے کی ہینڈسم فیس چارج کرتی تھیں۔ اس وقت محض آداب دوستی نبھاتے ہوئے لڑکیوں کے گھیرے میں بیٹھی تھیں اور بدقت مسکرا رہی تھیں۔ اس دوران شاہی پھوپھو مجال ہے جو ایک لفظ بولی ہوں۔ بس دیکھے جاتی تھیں۔

اوپر سے لڑکیوں کے سوال... کسی ایک آدھ بے چاری کو ہی کیریر کی فکر تھی یا علم حاصل کرنے کی چنتا۔ سب کی سب نکمیوں نے دونوں ہاتھ آگے پھیلا رکھے تھے۔ (شکر آنٹی فقط دست شناس تھیں... لکیریں تو پیروں میں بھی ہوتی ہیں نا اور ان پگلیوں سے کیا بعید... کہ...)

کسی کے سوالات میں کچھ بھی نیا پن نہیں تھا۔ کھلم کھلا لپیٹ لپاٹ کر... ہونے والے "ان کے" نام کا پہلا حرف... ان کا کام اور... اور بعض بے حد شرمیلیوں نے دبی زبان میں بچے کتنے ہوں گے بھی پوچھ لیا۔ پھر تو جیسے لائن لگ گئی۔ جو اپنے منہ سے کوئی سوال بھول بھی جاتی۔ دوستیں اس کی ترجمان بن کر بڑھ چڑھ کر پوچھتیں۔

آئرہ نے شاہی پھوپھو کے کان میں سرگوشی کی۔

"اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ امپورٹنس جس لینگوئج کو دی، وہ تو عربی ہے۔ پھر لکیروں میں حرف انگلش ایلفابیٹس میں کیوں چھپا دیے؟"

"میرے بجائے یہ سوال مینی سے پوچھ لو اور یہ بھی پوچھنا کہ سارے حرف ایچ این ایم اے وائی جیسے ہی کیوں بتاتی ہیں۔ کسی کا نام کیو بی پی اور جی سے کیوں نہیں آرہا؟"

آئرہ کی آنکھیں پھیل گئیں جب اتنا منہ توڑ جواب

دے سکتی ہیں تو انہیں کیوں بلوالیا۔

"ان سب کے لیے.... جو پاگلوں کی طرح پیچھے پڑی ہیں۔" شاہی پھوپھو نے مسکراتے ہوئے پاگل بچیوں کو دیکھا۔ ایک لڑکی ہونقوں کی طرح آنٹی کا منہ دیکھ رہی تھی اور باقی سب کے قہقہے چھت کو چھو رہے تھے۔ وہ بے چاری بمشکل حیرت کے سمندر سے ابھری تو شرمندگی کی دلدل میں دھنسنے لگی۔

آنٹی نے اسے سات بچے بتائے تھے۔

ایراد کا ضبط جواب دے گیا۔ آخر وہ سب کب فارغ ہوتیں اور اس کا نمبر آتا۔

ایراد نے اسے ہاتھ سے صوفے سے دھکیلا اور خود اپنے لیے جگہ بنائی۔

"آنٹی! چھوڑیں آپ ان سب کو.... یہ سب پاگل ہیں۔ آپ میرا ہاتھ دیکھیں.... میں ہینڈ واش سے رگڑ رگڑ کر دھو کے آئی ہوں۔ تاکہ کوئی لکیر بھی چھپی نہ رہ سکے۔"

"تمہیں کیا پوچھنا ہے؟"

"آپ بس مجھے یہ بتادیں کہ.... میری زندگی میں شاہد آفریدی کی کیا جگہ ہے اور.... ہے بھی یا نہیں۔" سوال کے آخری حصے میں وہ دکھی بھی ہوگئی۔

"واٹ.... شاہد.... آفریدی...." بے یقین آوازوں سے کمرا بھر گیا۔

"تمہاری لکیروں میں شاہد آفریدی کا کیا کام؟"

"بس کسی بھی طرح بتادیں کہ کیا میں کبھی اس سے مل سکوں گی' بات کرسکوں گی' مجھے پتا نہیں کیوں لگتا ہے۔ ہمارے درمیان کچھ ہے۔"

"درمیان کا تو پتا نہیں' سر پر میرا ڈنڈا ضرور ہے۔ یہ کوئی سوال ہے؟" شاہی پھوپھو کو شاہانہ جلال آیا۔

"اوہو شاہی.... دیکھنے تو دو.... سب روایتی سوال کررہی تھیں۔ اسی بچی نے تو کچھ الگ پوچھا.... ویری انٹرسٹنگ کوئسچن.... کتنا مارجن ہے اس میں۔"

آئرہ نے دانت پیسے اسے۔ دیر ہورہی تھی' مگر وہ جواب کے لیے رک گئی تھی۔

آنٹی دست شناس نے اپنا سر اٹھایا' ان کے چہرے پر فاتحانہ چمک تھی۔

"میں نے تم دونوں کا الگ الگ حساب لگایا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی میں ایک ایسا مقام آئے گا۔ جب تمہاری وجہ شہرت شاہد آفریدی ہوگا۔" آنٹی نے ڈرامائی وقفہ دیا۔

"اور اس کی وجہ شہرت ایراد ہوگی۔ یعنی دونوں کا نام ایک ساتھ لیا جائے گا۔"

"کیا؟" ایراد کے دونوں ہاتھ کھلے منہ پر ٹک گئے۔ بے یقینی سی بے یقینی.... شادی مرگ کی کیفیت.... تحیر نے تمام لڑکیوں کو بھی گنگ کردیا تھا۔ یہی کیفیت آئرہ' بیا اور پھوپھو کی بھی تھی۔ ایراد کو شاہد آفریدی بے حد پسند تھا۔ اس نے کمرے میں اس کے بڑے بڑے پوسٹرز لگا رکھے تھے۔

مگر آج یہ سوال.... اور اس کا جواب۔

"اے سن نینی.... یہ جو تم لوگ ہوتے ہو پامسٹ وغیرہ۔ تم لوگوں کا علم پہنچا ہوا ہوتا ہے نا.... چہرہ شناسی کے فن میں تم لوگ ماہر ضرور ہوتے ہو۔ بچی کے چہرے سے اندھا بھی جان لے' وہ کیا جواب چاہتی ہے۔ اب تم سچ بولو.... علم کچھ کہہ رہا ہے یا تم نے بچی کو چلایا ہے۔"

"اف.... یہ بے تکلف جگری بچپن کی دوست۔" نینی دست شناس نے کراہ کر سوچا۔

"اگر دل رکھنے اور چہرہ شناسی والی بات ہوتی تو سالوں پہلے کسی کو یہ نہ کہہ دیتی کہ وہ کبھی نہ کبھی ظہیر عباس کو پالے گی۔ اس وقت حالانکہ میرا علم اور تجربہ اتنا ایکوریٹ بھی نہ تھا۔ مگر میں نے صاف صاف کہا تھا۔ نہ بی بی نہ.... ظہیر عباس کو بھول جا.... وہ کبھی بھی نہیں مل سکتا۔"

نینی نے بڑے ہی ڈھکے چھپے الفاظ میں شاہی پھوپھو کی بولتی بند کردی۔ ساتھ ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں جتایا۔ بھتیجی نے پھوپھی پر ہی تو جانا تھا نا.... شاہی پھوپھو گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

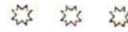
"اف یہ بے تکلف جگری بچپن کے دوست...."

"تو کیا ایراد کی شادی ہوگی آفریدی سے؟" ایک

دوست نے تیلی آواز میں رشک حسد سے تر لہجے میں سب کی ترجمان بن کر پوچھا تھا۔ نینی کی گردن نفی میں ہلی۔

"مجھے بس یہیں تک بتانا تھا۔"

سب سہیلیوں کے چہرے پر کسی حد تک طمانیت پھیلی۔ ادھر ایراد کا دل غوطے کھانے لگا۔



ایراد کی سہیلیاں ہنستی مسکراتی، اپنے مستقبل کا حال پوچھ پاچھ کر آئرہ اور نینی سے آٹوگراف لے کر روانہ ہوگئیں۔ آئرہ آفس سدھاری۔ بیا اور ایراد دوپہر کو سوتی تھیں۔ شاہی پھوپھو، نینی کو لے کر کچن میں آگئیں۔

"سب کچھ بچیاں ہی کھا گئیں۔ اب تم بتاؤ تمہارے لیے کیا بناؤں؟"

"کچھ بھی نہیں، بس ایک کپ چائے۔"

"صرف چائے۔ اتنے عرصے بعد تو ملی ہو، مصروف بھی کتنی ہو چکی ہو۔ کبھی اس چینل پر اور کبھی اس پر....."

"ہاں مصروفیت....." نینی نے سرد آہ کھینچی۔ "جینے کے لیے بہانے..... یہ بھی نہ ہوں تو مرنہ جائیں۔"

"ابھی تو بچیوں کی باتوں پر ہنس رہی تھیں اور ابھی اتنی مایوسی۔"

"وہ ہنسی اور باتیں تو ہفتوں یاد رہیں گی۔" نینی کا بجھ جانے والا چہرہ چمکا۔

"کتنا اچھا ہوتا ہے نا شاہی یہ دور زندگی کا..... یہی سولہ سترہ..... بیس، بائیس برس کا..... جو چاہتے ہیں پالیتے ہیں، کہہ لیتے ہیں، سن بھی لیتے ہیں۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، برا لگتا ہی نہیں اور اب تو کوئی مسکرا کر بھی دیکھے تو سو معنی تلاشتے ہیں کہ مسکرایا تو کیا سوچ کر مسکرایا..... کیوں مسکرایا۔"

"اتنی شدید مایوسی....." شاہی پھوپھو دوست کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ ٹیبل پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"مایوس نہیں ہوں۔" نینی نے شاہی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ "بس یوں ہی خیال آیا کہ اگر اللہ مجھے اولاد دیتا، بیٹا..... بیٹی تو لگ بھگ اتنی ہی عمر کے ہوتے نا کالج میں فرسٹ ایر، سیکنڈ ایر۔"

"ہوں....."

"تمہارا بیٹا بھی اسی ایج گروپ کا ہے نا۔" نینی نے یک دم کہہ دیا۔ "فرسٹ ایر میں ہی ہوگا۔" شاہی نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں چائے رکھ دوں۔ کباب بھی فرائی کرلیتی ہوں۔ چٹنی آئرہ نے تیار کرر کھی ہے۔"

شاہی پھوپھو نے جواب دینے کے بجائے آلتو فالتو کے جملوں کا ڈھیر سا لگا دیا۔ جواب نہ دینے سے سوال کی اہمیت گھٹتی نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ مسلم رہتی ہے اور جس سوال کا جواب نہ ہو۔

"فرسٹ ایر میں کون ہے یا ہوگا..... پتا نہیں، میرا بیٹا تو ففتھ گریڈ میں پڑھتا ہے۔" شاہی پھوپھو کا چہرہ مردے کی طرح سفید لگنے لگا۔

"بچکانہ بات ہے شاہی! وہ اب تک ففتھ گریڈ میں ہوگا۔"

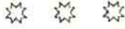
"بچکانہ بات نہیں ہے۔ کبھی بند گھڑی کو دیکھا ہے، جہاں سیل ختم ہوں وقت اور تاریخ وہیں رک جاتی ہے۔ دنیا بھر کی گھڑیاں جتنا مرضی آگے سرک جائیں، گھنٹوں، مہینوں، سالوں..... بند گھڑی وہیں کی وہیں رکی رہتی ہے۔ وہی تاریخ، سال، سیکنڈز اور منٹس۔ میرے دل کی دیوار پر لگی گھڑی سالوں سے ایک وقت تاریخ اور دن پر ٹھہر گئی ہے۔ مجھے کبھی وقت آگے بڑھا ہوا لگا ہی نہیں۔"

"یہ خود اذیتی ہے۔ تم کس سے انتقام لے رہی ہو، خود سے....." نینی کا لہجہ دکھی تھا۔

"بے حد عملی زندگی میں بے عملی کے چند لمحے، دل کے لمحے جو کسی سے انتقام نہیں لیتے، وہ خود سے لیتے ہیں اور پلیز اب اور کچھ نہ بولنا۔"

شاہی کا جملہ اور چہرہ قطعیت کا ترجمان بن گیا۔ نینی کو چپ ہونا پڑا۔

"پیا کب آئی؟" نینی نے موضوع بدلا۔
"تین ماہ ہونے والے ہیں۔ اپنی اماں سے لڑ کر آئی ہے۔ کہتی ہے۔ اب یہیں رہے گی۔"
"کیوں... اور لڑائی اپنی اماں سے...؟" نینی حیران ہوئیں۔
"ہاں وہ اس کے رشتے کے لیے پریشان ہے۔ وزن جو زیادہ ہے۔ رشتے کروانے والی عورتیں' جشمہ دیکھ کر موٹے بھگڑے رشتے لاتی ہیں جو عمر کے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس نے ماں سے کہا۔ وہ موٹی ہے 'مگر لڑکی ہے اور لڑکے سے شادی کرے گی۔ آدمی سے نہیں کرے گی۔ ماں اس دن سے ہر کسی سے پوچھتی پھرتی ہے 'لڑکے اور آدمی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس نے کہا' جس دن آپ اس فرق کو سمجھ لیں گی 'میں آجاؤں گی۔ میرے جسم پر چربی چڑھی ہے' دماغ اور دل پر نہیں۔"
"بہت خوب..." نینی کو مزا آگیا۔ "تمہارے بھائی وغیرہ مان گئے؟"
"ہاں... منوانا آنا چاہیے اور وہ آج کی نسل کو آتا ہے' ہماری طرح تھوڑی۔" شاہی پھوپھو کا چہرہ ایک بار پھر بجھنے لگا۔ آگے نہ بول سکیں۔
"آئرہ نے ماشاء اللہ بہت ترقی کرلی۔" نینی نے تیزی سے موضوع بدلا۔
"ہاں... ماشا اللہ... دبئی سے یہاں آتے ہوئے بڑے تحفظات کا شکار تھی۔ اب تو سب سیٹ ہے اور ایراد تو شروع سے مجھ سے اٹیچ ہے ہی... بھائی اکیلے بھیجنے پر متامل تھے۔ پھر فلیٹ بھی اپنا تھا۔ میں نے کہا' میں ساتھ رہوں گی اور اب لگتا ہے سالوں سے رہ رہی ہوں۔"
شاہی پھوپھو نے ٹرے تیار کرکے ٹیبل پر رکھی۔
"اور یہ تم نے آج ایراد کو کس لائن لگا دیا۔ حد کرتی ہو تم بھی۔"
"بھئی' میں تو پہلے ہی کہتی ہوں۔ میرا علم حتمی نہیں۔ یہ تو حساب کتاب ہے۔ جو میں نے لگایا۔ عالم الغیب تو اوپر والے کی ذات ہے اور زیادہ تر لوگ تو پامسٹری کو جسٹ فار انجوائے منٹ ہی لیتے ہیں۔"
انھوں نے ہنس کر کہا۔
شاہی پھوپھو نے ہنسی میں ساتھ دیا اور ساتھ ہی کباب کی پلیٹ بڑھائی۔ نینی نے پلیٹ پکڑ کر اپنے نزدیک رکھی اور ہاتھ پکڑ لیا۔
"تمہارا ہاتھ دیکھوں شاہی... تمہیں کتنا شوق تھا نا مستقبل کے بارے میں جاننے کا۔"
"فضول محنت کروگی۔" شاہی پھوپھو نے ہاتھ نرمی سے کھینچ لیا۔ "میرے ہاتھ میں خوشیاں نہیں ہیں۔" نینی ان کی شکل دیکھ کر چپ ہوگئیں۔



تیمور کے ہاتھ کا پکا گوشت کا سالن ابوذر تو خاموشی سے کھا رہا تھا۔ جبکہ عاشر ہر لقمے پر تیمور کے لیے وہ' وہ الفاظ کہتا کہ لکھیں تو کیسے۔
"اب اچانک یہ اتنی بڑی سخت بوٹی کہاں سے آگئی؟" عاشر بولا۔ اس نے روٹی کے نوالے کا دباؤ دے کر بوٹی توڑنے کی کوشش کی تو بوٹی پھسل کر آگے سرک گئی۔ پتا لگا وہ تو گلی ہی نہ تھی۔
"ہاں... میری بھی یہ والی دو کچی کچی ہیں سخت سی۔" ابوذر نے بھی دو بوٹیاں سائیڈ پر کر رکھی تھیں۔
"دراصل ایک کلو گوشت چڑھایا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد تین بوٹیاں نکال کر چیک کیں کہ گلی کہ نہیں۔ کچی تھیں بمشکل چبائیں۔ آدھے گھنٹے بعد پھر تین اور نکال لیں۔ وہ تھوڑی بہتر تھیں۔ اس کے بیس منٹ بعد بغیر گنے نکال لیں۔ وہ گل چکی تھیں۔ جب مسالا بھوننے لگا تو گنتی کی چار' پانچ بوٹیاں بچی تھیں۔ سو جلدی سے آدھ کلو کا ایک اور پیکٹ ڈال کر..."
"تو چکھتے چکھتے سارا گوشت کھا گیا؟" عاشر چلایا۔ منہ ابوذر کا بھی کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
"پیٹ ہی بھرنا ہے نا آپ لوگ مسالے سے کھالیں۔" تیمور خود بھی یہی کر رہا تھا۔
"ہاں مسالا تو جیسے بڑا مزے دار بنایا ہے نا؟" ابوذر نے لقمہ نگل ہی لیا تھا۔
"تو پھر کرلیں کسی خانساماں کا بندوبست... میں کیا

ماسی لگا ہوں یا تم لوگوں کی امی ہوں۔" تیمور نے ابوذر کو گھورا۔

"ماسی تو ہو نہیں سکتا اور میری ماں تیری جیسی مونچھوں والی ہو..... میرے ابا کا ذوق اب اتنا بھی گرا ہوا نہیں۔ بھلے سے وہ تم جیسوں کے چچا ہوں۔"

"وہ تم جیسے کے ابا ہو کر فخر سے جی سکتے ہیں تو ہمارے چچا ہونے پر کیا انہیں پتھر پڑیں گے۔" تیمور نے غصے کا جواب غصے سے دیا۔

"آپس میں لڑنے کے بجائے اس مسئلے کا حل سوچو۔" عاشر نے سربراہ کی حیثیت سے اصل مسئلے کی جانب آنے کا اشارہ دیا۔

"ایک اچھے کک کی تلاش....." ابوذر نے بات ختم کی۔

"اور ایک بہترین کام والی ماسی۔" عاشر کو صفائی کا خبط تھا۔

"ماسی چھڑوں کے گھر کام کرنے نہیں آتی۔" تیمور نے نکتے کی بات کہی۔

"ہم خدانخواستہ ہمیشہ چھڑے تھوڑی رہیں گے۔" عاشر کو تیمور کی بات بددعا کی طرح لگی۔ ساتھ ہی وہ نازک حسینہ بھی یاد آگئی۔

بددعا والے خیال پر ابوذر کا دل بھی سکڑا تھا۔" اللہ نہ کرے۔"

"تو اماں جان کی بات مان کر سیدھے سیدھے شادی کر کے اپنے گھر بسائیں۔ میری بھی جان بخشی ہو۔"

"مجھے میری پسند کی لڑکی اب تک ملی نہیں۔" ابوذر نے دکھی لہجے میں کہا۔

"اور مجھے تو بس اسی اسٹور والی سے کرنی ہے۔" عاشر کسی ہٹیلے بچے کی طرح ٹھنکا۔

"بس تو پھر ہو گئی شادی..... تم طویل رخصت لے کر شہر شہر، گلی گلی گھومو، جب تک منزل مقصود نہ ملے۔ اور آپ شہر کے ہر بڑے چھوٹے سپر اسٹور، کریانے کی دکان پر گھومنا شروع کر دیں۔ بلکہ ہر سپر اسٹور کے باہر پان کا کھوکھا کھول لیں۔ ٹیکسی ڈرائیور بن کر انتظار کریں۔ آئے گی تو وہ وہیں....." تیمور نے جل کر حقیقت بیان کی۔

عاشر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ چہرے پر ایک انوکھی مسکان آن رکی تھی۔

"مجھے یقین ہے، وہ مجھے مل کر رہے گی۔ دراصل اسے دیکھتے ہی میرے دل میں سیٹی سی بجی کہ وہی تو ہے جس کا....."

"اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے ککر کی سیٹی بھی صحیح وقت پر نہیں بجتی۔ بج جانے والی ہوتی تو آج میری ہانڈی کا یوں ناس ہوتا؟"

تیمور نے عاشر کی بے خودی کو دیکھتے ہوئے جل کر ابوذر کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں تو ڈیڈ کو فون کر کے یہ بھی کہنے والا ہوں کہ جس بیٹے کی تعلیمی قابلیت، ذہانت، ہائی فائی جاب کے طعنے دے دے کر انہوں نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ وہ عنقریب ڈگریوں کو آگ لگا کر..... نوکری پر لات مار کے جنگلوں بیابانوں کی خاک چھاننے والا ہے۔ عشق جو ہو گیا ہے۔"

تیمور کے جملوں میں ہمدردی تھی۔ لہجہ کاٹ سے بھرپور.....

مجنوں جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں دیوانے دو

ابوذر نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

عاشر نے کچھ جواب نہ دیا۔ سکتہ جو ہو گیا تھا۔ تیمور کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"بھائی..... بھائی! کیا ہوا؟" وہ اچھل کر اس تک آیا۔ "ایسے پتھر کا بت کیسے بن گئے؟"

"کہیں کوئی بھوت تو نہیں دیکھ لیا۔" ابوذر بھی اٹھ کر آیا۔ کھڑکی کا پردہ آخر تک سمیٹ دیا۔

سفید گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بڑا ہینڈ بیگ رکھ کے دروازہ ٹھاک سے بند کر کے ایک لڑکی اب فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ رہی تھی۔ دور کچھ بچیاں رسی کود رہی تھیں۔ بینچ پر کچھ بزرگ براجمان محو گفتگو تھے۔ گاڑی گیٹ سے نکلی، روڈ پر چڑھی اور اگلے پل نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابوذر نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔ وہ تو

بھوت کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا مگر عاشر کا سکتہ یک دم ٹوٹا۔

اس نے دونوں ہاتھ کھڑکی کی جالی سے باہر نکال کر زور' زور سے ہلانے شروع کردیے۔

"وہ... وہی... تھی... وہی... وہ سپر اسٹور والی... نہیں وہ پرچون والی نازک... نازک..."

تیمور کے حیران بت میں جان پڑ گئی۔ اس نے عاشر کو پیچھے دھکا سا دے کر اپنا من بھر کا سر بمشکل جالی سے باہر نکالا۔

"وہاں تو کوئی نہیں ہے۔" تیمور کو بھائی کی دماغی حالت پر شک گزرنے لگا۔

"وہ وہی تھی۔ ابھی... ابھی وائٹ گاڑی میں نیلے لباس میں۔" عاشر کا صدمہ سے بھرپور لہجہ... "اور ایک بار پھر غائب ہوگئی۔"

"اسے تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ ہٹ تیمور ہٹ۔" ابوذر اچھل پڑا۔

"کیسے ہٹوں... سر پھنس گیا میرا۔" تیمور کی آواز بھینچی بھینچی تھی۔ اس نے اتنی سی دیر میں کتنا سارا زور لگالیا تھا۔

"میں ابھی نکالتا ہوں اپنے بھائی کو..." ابوذر آستین چڑھا کر آگے بڑھا اور تیمور کے دونوں بازو پیچھے کرکے کھینچنے لگا۔ تیمور کی چیخیں نکل گئیں۔

"گردن پھنسوا کر اب تم لوگ مجھے بازوؤں سے بھی محروم کروگے کیا؟"

"نکالو مجھے نکالو..." تیمور خود بھی مقدور بھر کوشش کررہا تھا۔ ابوذر نے اب دونوں بازو چھوڑ کر ایک بازو پکڑ لیا تھا اور اپنے باڈی بلڈر ہاتھوں سے اسے کھینچتا ہی جارہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے۔

"آج سر نکلے گا... یا بازو۔"

تیمور کوئی مشرقی حسینہ تھا جو جبر بھی سہتا اور چپ بھی رہتا۔ لہٰذا وہ چیخ رہا تھا۔ نیچے بزرگ کھڑے اوپر دیکھ رہے تھے۔

"بھائی! مجھے پھنسا کر بھائی کہاں چلا گیا۔" تیمور نے دہائی دی۔ "ڈیڈ نے مجھے اسی کے بھروسے تو شہر بھیجا تھا۔" تیمور یک دم چار ماہ کا ہوگیا۔

"کہیں نہیں گیا' میں یہیں ہوں۔ یہ آری لایا ہوں۔ ابھی کاٹ دیتا ہوں۔" عاشر کو آخر بھائی کا خیال آگیا تھا۔

"کیا... میرا سر..."

"نہیں' نہیں یہ جنگلا..." عاشر نے آری لہرائی۔

"پہلے میرا بازو تو چھڑائیں اس بن مانس سے۔" عاشر چونکا۔ ابوذر کے بھینچے دانت (یا یہ رہے گا' یا نہیں رہے گا... بازو۔)

"چھوڑ' میرے بھائی کا بازو چھوڑ دے ابوذر!"

دونوں کے بیچ بازو کے حصول کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔

تیمور نے "یا اللہ مدد" کہہ کر آخری زور لگایا اور کولہوں کے بل زمین پر جاگرا۔ بازو ہاتھ سے نکل گیا' تب منظر یوں تھا کہ عاشر اور ابوذر بغل گیر تھے اور بجائے شرمندہ ہونے کے ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے تھے۔



تنگ پائنچے کی جینز پر گلابی بیگی شرٹ... پیروں میں گلابی باریک ہیل کی پمپی' گلے میں موٹے منکے والی مالا' شانوں پر تازہ کٹنگ والے بکھرے بال' چہکتی مہکتی... یہ ابراد تھی۔

سی گرین کلر کی جرسی کی پٹیالہ شلوار پر بند چاک والی جرسی ہی کی گھٹنوں سے اونچی بند دامن کی کالی قمیص' بڑا ہی بلی سا کالا اور سی گرین دوپٹا شانے پر دھرا تھا۔ پیروں میں فلیٹ بند پمپی سلور کلر کی... سلور کلر ہی کا اسٹائلش بیگ کلائی پر لٹکا رکھا تھا۔ کانوں میں بہت بڑے بڑے بالے سلیقے سے بنے بال اور میک اپ... یہ بیا تھی۔

دونوں گھر سے یوں نکلیں جیسے ماڈل ریمپ پر آتی ہیں۔ گردوپیش سے انجان شان بے نیازی سے خلا میں تکتی منہ اٹھا کر چلتی جب وہ چوتھے فلور سے نیچے اتریں' تو ہر کس ناکس نے ٹھٹک کر انہیں دیکھا۔

بیا کی بیسٹ فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ تیاری کے اپنے ہی قائم کردہ ریکارڈ توڑے۔ اب وہ منتوں ترلوں سے مانگی پھوپھو کی کار میں سفر کرنے کو تیار تھیں۔ مگر یہ کیا' گاڑی کے عین پیچھے ایک دوسری گاڑی پارک تھی۔ نجانے کس کی۔

"پہلے ہی دیر ہو رہی تھی اور اگر۔۔۔"

"اب آپ کچھ کریں نا۔"

"میں۔۔۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"آپ تو دعوے دار ہیں کہ ٹریفک جام میں گاڑی نکالنے میں آپ سے بڑھ کر کوئی ماہر نہیں۔"

"بالکل دعوے دار ہوں' مگر اب یہ تو کم از کم نہیں کر سکتی کہ گاڑی کو چٹکی سے اٹھاؤں اور مین روڈ پر رکھ دوں۔ پتا نہیں کس جاہل نے اس طرح گاڑی جوڑ دی ہے۔"

بیا نے مذکورہ جاہل شخص کی تلاش میں چہار جانب نظریں گھمائیں۔ ان گناہ گار آنکھوں نے وہ دیکھا' جس کو دیکھنے سے پہلے یا جس کے دیکھنے کا گمان۔۔۔ ہائے۔۔۔ مین روڈ کے چوک سے آئرہ کی آفس وین نے ٹرن لیا تھا اور وہ لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ خود پر شعورا" چڑھایا بے نیازی کا خول دھڑ سے اتر گیا۔ دونوں ہونق صورت ایک دوسرے کو تک رہی تھیں۔ بھاگ جانے کی خواہش تھی۔ بیا کے لیے بھاگنا ویسے ہی مشکل تھا اور ایراد کے لیے اس لمبی ہیل میں چلنا مشکل تھا۔

سکتے کے اس پل کا خاتمہ ہونے تک وین روڈ پر رک چکی تھی اور کسی بھی پل آئرہ باہر آجاتی۔

ایراد ہی نے جھک کر جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اگلے پل اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ بیا' ایراد کے پیچھے سرپٹ دوڑی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف جو تھا۔

اس دوڑ کو دیکھنے والے لوگ ششدر تھے۔ خاص طور پر وہ جنہوں نے چند منٹ پیشتر ان دونوں کو نزاکت سے غرور سے منہ کا پاؤچ بنا بنا کر نیچے اترتے دیکھا تھا۔ گرتی پڑتی ایراد نے پارکنگ کے بالکل آخر میں ایک مستقل کھڑی رہنے والی گاڑی کے پیچھے آکر پناہ لی۔ بیا نے بھی۔۔۔ دونوں کی نظریں مین گیٹ پر تھیں۔

جہاں سے آئرہ جلوہ گر ہوئی۔ پیچھے ملازمہ جو آئرہ کے بیگز اور باسکٹ کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھی۔ آئرہ حسب عادت بیگ کو نیچے کی طرف لٹکائے اپنے مخصوص مغرور نک چڑھے انداز میں قدم بڑھا رہی تھی۔

بلو جینز کے ساتھ لمبا آسمانی کرتا اور اسکارف۔ مجال ہے' جو ملازمہ سے ایک چیز پکڑ لے۔

نجانے کتنے ہی پل بیتے ان دونوں کو تو صدیاں گزر جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ آئرہ گھر کے اندر جا چکی تھی' مگر یہ کہاں جاتیں' گھر کے اندر؟ یا چھپی رہتیں کہ گاڑی پھنسی کھڑی تھی۔ آگے کنواں' پیچھے کھائی۔ اور اگر جو آئرہ دیکھ لیتی۔ نہیں' نہیں دونوں نے جھرجھری لی۔

پھر شاید برا وقت ٹل گیا۔ پیچھے والی گاڑی کا مالک اندر سے برآمد ہوا' جیسے ہی اس نے اپنی گاڑی پیچھے کی۔ یہ دونوں اپنے بل سے بھاگتی ہوئی آئیں۔ سرعت سے بیا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ایراد کے لیے دروازہ کھولا اور وہ جوتا ہاتھوں میں پکڑے پکڑے ہی سیٹ میں دھنس گئی۔ اس نے بعجلت چابی گھمائی اور اندھا دھند باہر نکل کر گاڑی کو فل اسپیڈ پر ڈال دیا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ ایراد مستقل دور ہوتے اپارٹمنٹ کو دیکھ رہی تھی اور دوری کا مسلسل بڑھتا احساس چہرے کے رنگ اور حواس کو واپس لا رہا تھا۔

"خدا کا شکر بچ نکلے۔" ایراد نے پیر جھاڑ کر جوتے پہننے شروع کیے۔

"لیکن یہ آئرہ اس وقت کہاں سے ٹپک گئی؟" بیا نے دانت کچکچا کر پوچھا تھا۔

"اللہ جانے۔۔۔ لیکن کیا اچھا نہ ہو کہ ہم ایک جوس پی لیں۔ توانائی کی بحالی کے لیے۔" بیا اس کی شکل دیکھنے لگی' جو بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"اب یہ نہ کہئے گا۔ اس میں اتنی اتنی کیلوریز اور فیٹس ہوں گے۔ اس بھاگ دوڑ میں ہزاروں کیلوریز تو

جلی ہی جلی ہیں، مجھے تو منوں خون جل جانے کا بھی احساس ہو رہا ہے۔"

"آخیر ہم کب تک اس طرح بچتے رہیں گے۔" بیا کے دکھی لہجے میں خدشات تھے۔

"جب تک بچ سکے بچتے رہیں گے۔" ایراد نے لاپروائی سے کہا۔

"تمہاری تو خیر ہے۔ تم اس کی سگی بہن ہو اور سائز میں اس سے بھی دبلی، مگر میرا کیا ہو گا۔" بیا کی فکر ناجائز نہیں تھی۔

"اس مسئلے کا کوئی حل؟" ایراد کو بیا کے غم کا اندازہ ہوا۔

"کوئی بھی نہیں.... اب کم از کم تمہاری خود غرض بہن یہ تو کر نہیں سکتی کہ وہ جو اسے ڈھیروں کے حساب سے ملبوسات ملتے ہیں، وہ خود ہی ان کی منصفانہ تقسیم کرتے ہوئے ہمیں ہمارا حصہ دے دے۔"

"تو دے تو دیتی ہیں نا.... سب ہم کو ملتے ہیں۔" ایراد نے بہن کی حمایت لی۔

"ہاں...." بیا کی جلی کٹی آواز ابھری۔ "استعمال کے بعد.... اور وہ سارے کے سارے بھی تم ہی کو مل جاتے ہیں۔ میرے حصے میں آتے ہیں بچے کھچے سارے اچھے والے تو تمہیں مل جاتے ہیں۔"

"تو اس میں اتنا جلنے کی کیا بات ہے۔ آپ ان کا، میرا.... اور اپنا سائز بھی تو دیکھیں۔"

"اب تم بھی طعنہ مارو گی؟"

"طعنہ نہیں مار رہی گراؤنڈ ریلٹی بتا رہی ہوں۔"

بیا کچھ نہ بولی، منہ بسورا اور رخ ہی پھیر لیا۔

"اب آپ ایسے خفا ہوں گی۔ وہ نہیں دیتیں تو کیا آپ پہنتی نہیں۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باہر نہ سہی، ہم گھر میں تو سارے کپڑے پہن پہن کر ارمان نکال ہی لیتے ہیں۔"

"ہاں تو ظاہر ہے جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو...."

"تو پھر شکوے کس چیز کے؟"

"شکوہ یہ کہ یہ جو چوہے، بلی والی ہمارے ساتھ ہوتی ہے، اگر جو وہ ہمیں اپنے کپڑوں یہاں تک کہ جوتے اور پرس تک میں دیکھ لیتی تو قسم سے وہ کھڑے کھڑے اتروا لیتی۔"

"جو بھی کرتیں کم ہی ہوتا۔" ایراد نے اس بار حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"نمبرون ڈیزائنر کے بھیجے وہ ڈریسز جو ابھی انہوں نے استعمال تو کیا کرنے شاپرز سے بھی نہیں نکالے تھے، ہم نے پہن لیے۔"

"اب ہم واپسی میں گھر کیسے جائیں گے؟ ایراد نے ایک اہم نکتہ پوچھا۔

وہ اس بار مسئلہ نہیں۔ میں نے صبح ہی تمہارا اور اپنا ایک ایک جوڑا گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ واپسی میں ہم اپنے ذاتی کپڑوں میں گھر جائیں گے۔"

"اور اگر اس وقفے میں انہوں نے الماری کھول کر دیکھ لی...." ایراد کو خیال آیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تمہاری ست الوجود بہن.... اب بیڈ پر آڑی ترچھی گرے گی تو صبح ہی کی خبر لائے گی۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔"

"تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں ہی ڈر رہے تھے۔ بھول گئیں آپ؟" ایراد نے چھیڑا۔

بیا ہنسی تھی۔



واپسی پر بیا اور ایراد بڑے نارمل حلیے (اپنے لباس و جوتے و لوازمات) میں تھیں۔ چابی اپنے پاس تھی۔ بظاہر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر ہاتھ میں پکڑے شاپرز میں خطرہ موجود تھا۔ ویسے تو دور، دور تک امکان نہیں تھا کہ آرہ تھیلے کے بھید تک پہنچتی۔ لیکن برا وقت کب بتا کر آتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی کچھ انہونی کا احساس ہوا۔ پھوپھو اس وقت ٹاک شوز دیکھا کرتی تھیں۔ مگر آج ٹی وی بند تھا۔

آرہ اس وقت سوئی تھی۔ دروازے، کھڑکیاں بند، گرے پردے.... مگر اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا

اور وہ بیڈ پر نہیں تھی۔ سانپ سونگھنے والی بات یہ ہوئی کہ پھوپھو کے کمرے سے رونے... اور آئرہ کے اونچا اور کچھ کڑوا اور قطعیت سے بھرپور بولنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

ایراد کی سانس خشک تھی کہ بیا کزن ہونے کا مارجن لے لیتی۔ پھوپھو بڑے ہونے کا... اس کا کیا ہوتا۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" بیا کی فطری بہادری عود کر آئی۔ وہ سینہ تان کر آگے بڑھنے لگی۔ "پلیز بیا!" ایراد نے ہراساں ہو کر اس کا شانہ پکڑا۔ بیا نے جھٹکے سے شانہ چھڑوایا۔

"بھئی جو بھی غلطی یا شرارت ہے یا جو بھی ہے، ہم نے کیا ہے۔ میں پھوپھو کو روتا برداشت نہیں کر سکتی اور اس سے پہلے کہ تمہاری بہن مجھ پر چڑھائی کرے۔ میں اس پر چڑھ دوڑوں گی کہ چند معمولی مادی چیزوں کے لیے کوئی اپنی پھوپھو جانی کو ایسے ہچکیوں سے رلاتا ہے۔"

"وہ چند معمولی مادی چیزیں آئرہ کو ایز اے سلیبرٹی... کمرشل پوائنٹ آف ویو سے پروموشن کے لیے دی جاتی ہیں۔" ایراد کا گھبرانا درست تھا۔

"ارے جاؤ..." بیا پر ذرا اثر نہ ہوا۔ سلیبرٹی ہوگی تو اپنے گھر میں ہوگی۔ ایسے وہ ہمیں اپنے رعب میں نہیں رکھ سکتی ہے۔"

"وہ اپنے گھر میں ہی تو ہیں۔" ایراد آگے بڑھتی بیا کے پیچھے گھسٹتی منمنائی۔

پھوپھو کے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے اور آئرہ کڑے تیوروں سے بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ مگر موضوع تو کچھ اور تھا۔

"لو اب تم بھی اپنی صفائی دے دو' ورنہ انہوں نے رو' رو کر اپنا حال برا کر لینا ہے۔" آئرہ نے بیا کو مخاطب کیا۔

"صفائی..." بیا اور ایراد نے طائرانہ نگاہ سے کمرے کو دیکھا۔ ہر شے جگہ پر درست' صاف ستھری۔

"کیسی صفائی..."

"تاکہ یہ ہر الزام سے بری الذمہ ہو کر کم از کم رونا بند کر دیں... میں آپ کو روتا نہیں دیکھ سکتی پھوپھو!" سخت تاثرات سے کہتی آئرہ کا لہجہ آخیر میں بے چین و بے بس ہو گیا۔

بیا کو بھی گمبھیرتا کا احساس ہوا۔ وہ بیڈ پر پھوپھو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ایراد صوفے پر ٹک گئی۔

"اب آپ بولیں گی یا میں ہی...؟" آئرہ نے پوچھا۔ شاہی پھوپھو کچھ نہ بولیں۔ ناک سکوڑ کر آنکھیں پونچھ کر جیسے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔

آئرہ ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوئی۔

"پہلے چچی امی کا فون آگیا۔ تمہاری بات ہوئی ہے آج کل میں ان سے... تمہارے کسی رشتے وشتے کے چکر میں؟"

"ہاں! روز ہی ہو رہی ہے' وہ کوئی رشتہ ہے؟ رکشہ ہے رکشہ... پھٹ پھٹ کرتا۔ عدنان سمیع کی کاربن کاپی۔ بولے تو یوں لگتا ہے روڈ پر پتھر کوٹنے والی مشین چل رہی ہو۔ چلتا ہے تو بجری کے ٹرک کی سی دھمک پیدا کرتا ہے۔ سانس لیتا ہے تو انجن کی پھک پھک... روبوٹ کا رشتہ آیا ہے بیا کے لیے۔" ایراد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مگر پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ ہو گئی۔ پھوپھو کا چہرہ بے حد دکھی تھا۔ آئرہ کا سنجیدہ۔

"تو تم نے چچی اماں سے کیا کہا؟" آئرہ نے پوچھا۔

"کیا کہنا ہے' یہی سب کہا جو تمہیں کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس طرح کے انسان سے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ شادی میں اسی بندے سے کروں گی جو اسمارٹ ہو۔ لڑکا سا ہو۔ اماں مانیں نہیں تو یہ الفاظ میں نے اس بندے کو فون کر کے کہہ دیے۔ بس... لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہیں کس نے بتایا۔ یہ تو ہم ماں بیٹی کی آپس کی بات تھی؟" بیا چونکی۔

"انہوں نے کہا کہ مردوں کے لیے میرے دل میں جو نفرت اور بغض اور بے یقینی ہے ان خیالات سے میں تم لوگوں کی برین واشنگ کر رہی ہوں۔ میں اپنے رشتوں کو نبھانے میں نااہل ثابت ہوئی ہوں اور مزید کسی رشتے کو بندھتے دیکھ نہیں سکتی۔ ورنہ بیا نے کبھی شادی سے انکار کیا ہی نہیں۔"

ساری گتھی یکدم سلجھ گئی۔
"تو میں نے اب بھی کب شادی سے انکار کیا ہے۔ میں نے تو اس روڈ رولر کو منع کیا ہے۔"
"اس لڑکے نے تمہاری فون کال کی باتیں اپنی ماں کو سنائیں اور اس کی ماں نے جو جو تمہاری ماں کو سنائیں وہ... سب زہر ضرب دے کر انہوں نے میرے کانوں میں انڈیل دیا۔ بھابھی یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نجانے کتنی زرعی زمینوں کا مالک اکلوتا بندہ ہے۔ وہ بہترین رشتہ..."
"ارے واہ کہاں کا بہترین رشتہ۔" بیا نے ہاتھ نچایا۔ "مجھے تو پہلے ہی شک ہو گیا تھا' وہ مجھ سے شادی پر راضی ہی اسی لیے ہوا ہو گا کہ ان زرعی زمینوں پر ہل چلانے کے لیے بیلوں کی جوڑی کی جگہ خود بھی چلے گا اور مجھے بھی جوت دے گا۔ تھنک اباؤٹ دس پھوپھو... ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھیں تو... بیلوں کی جوڑی کی جگہ... میں... پھوپھو میں... کانٹ یو امیجن اور مائی گاڈ!"
ایراد کو بڑے زور کی ہنسی آئی۔ اس نے دونوں گال دانتوں میں کس لیے۔ ہنسنے کا موقع نہیں تھا۔ پھوپھو رو رہی تھیں۔
"فضول باتیں مت کرو۔ تم خود بھی تو موٹی ہو بیا... یوں کیسے..."
"یعنی کہ اب میری اپنی پھوپھو بھی..." بیا نے آئرہ اور ایراد کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر بھی تائیدی مسکان آ گئی تھی۔
"میں ممی سے بات کروں گی کہ انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اور وہ لائف پارٹنر کے حوالے سے میرے آئیڈیل سے واقف بھی ہیں۔ میں تو کمپرومائز نہیں کروں گی۔ ہاں اس جیسا نہ ملا تو پھر کچھ اور سوچوں گی۔"
"تو لڑکے بھی تو ہلکی پھلکی لڑکی چاہتے ہیں نا۔ بس چلے تو ترازو میں تلوا کر دیکھ لیں۔" پھوپھو جیسے زچ ہو گئیں۔
"ارے واہ..." بیا کے چہرے پر شریر مسکراہٹ آ رکی۔ اس نے آنکھیں نچائیں۔ "ضرور تلوا لے... مگر دوسرے پلڑے میں سونا چاندی رکھے پھر... ہی ہی ہی۔"
اس کے بے ساختہ انداز پر آئرہ تو گھورنے لگی۔ جبکہ پھوپھو کی اچانک زور کی ہنسی نکل گئی۔
"ارے واہ..." بیا اچھل کر ان سے لپٹ گئی۔ "ہنستے ہوئے کتنی پیاری لگتی ہیں میری پھوپھو۔ میں کروں گی اپنی ماں کو فون... اور کریں گی وہ ایکسکیوز... ایسے کیسے میری پھوپھو کو رلایا' کوئی تماشا ہے بھلا۔"
"چھوٹی بھابھی ہی کیوں... بڑی بھابھی جان نے بھی وہاں دبئی سے فون کر کے نجانے کیا' کیا کہہ دیا۔"
"کیا کہہ دیا؟" بیا کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ سب معلوم تو تھا ہی۔
"یہی کہ آئرہ کا دماغ خراب کرنے میں سارا ہاتھ میرا ہی ہے۔ جو نفرت اور بے اعتباری مجھے ہوئی۔ وہ سب میں نے آئرہ میں انڈیل دی... اور یہ کہ میں نے تو نند کی تنہائی کے خیال سے بچی کو پاس چھوڑا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا۔ میں لڑکی کو فطرت سے دور کر دوں گی اور بھی نجانے کیا' کیا کچھ... اللہ گواہ ہے بیا! میں نے تو کبھی چھپ کر بھی آنسو نہیں بہائے کہ سوجی آنکھیں دیکھ کر آئرہ کچھ سوچنے نہ لگے۔ میں کیوں اسے کچھ بتاتی یا سمجھاتی... مجھے دکھ رونے کی عادت نہیں ہے۔ میں نے تو ہمیشہ خود کو الجھا رکھا ہے۔ کاموں میں' ٹی وی' شاپنگ' تم لوگوں کے ساتھ تم لوگوں کی طرح جینا اور... پوچھو آئرہ سے' میں نے کبھی اسے کچھ کہا ہو۔ کبھی اس کے سامنے روئی ہوں اور بھابھی کہتی ہیں۔ میری ناکام زندگی کو دیکھ کر ہی شادی آئرہ کی ترجیحات میں ہے ہی نہیں۔"
"کیوں گواہیاں مانگ رہی ہیں آپ۔" آئرہ کے اشارے پر بیا ذرا پیچھے سرکی۔ آئرہ نے پھوپھو کے شانے پر بازو رکھا۔ "آپ نے کبھی میرے سامنے دکھ نہیں روئے۔ مگر مجھے ہمیشہ پتا لگ جاتا تھا۔ آپ دکھی ہوتی تھیں... اور آپ جیسی پیاری عورت کے ساتھ

جو کچھ پھوپھا نے کیا، میں اسے فراموش کر بھی دوں تو وہ آخری دھوکا مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ہم شام تک اور پھر اگلے روز تک ۔۔۔ اور پھر آنے والے کئی روز تک ہم شاہ میر کا انتظار کرتے رہے۔ دل دہلتا گیا، کہیں کچھ ہو نہ جائے اور وہ باپ کے ساتھ ملک سے باہر جا چکا تھا۔ ملک سے باہر ایک دم نہیں چلے جاتے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ میر بے خبر ہو اور اس نے ماں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔"

"پھوپھا جیسے گھاگ کے پاس تو پورا پلان ہو گا۔ شاہ میر نے اتنی مکاری کہاں سے سیکھی؟" سوال سے زیادہ آئرہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"تو اس سے ہم نے یہ سیکھا کہ مرد پچاس سال کا ہو یا دس سال کا ۔۔۔ مرد ہوتا ہے اور دھوکا جس کی فطرت، میں سب کو ایک جیسا نہیں کہتی مگر مما کے بتائے یہ رشتے ۔۔۔ ٹی وی میں دیکھ کر پسند کر لیا ۔۔۔ میں آئیڈیل ہوں۔ خوب صورت ہوں، وہ میرے فین ہیں۔ نفرت ہے ان بلبلے جیسے جملوں سے اور رہا ان رشتے والے موصوف کا معاملہ ۔۔۔ جن پر مما فدا ہیں۔ دبئی کے بزنس مین ہیں۔ جانتی ہوں میں انہیں۔ کسی شوبز سیلیبرٹی سے شادی کر کے فیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ اور وہ آدمی جو عورت کو کسی بھی حوالے سے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔ اس سے تو مجھے گھن آتی ہے۔ عورت فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عورت خود اپنی ذات میں بہت بڑا منافع ہے۔"

"تم کتنی اچھی باتیں کرتی ہو آئرہ ۔۔۔ میں تو تمہیں بس ایک نخریلی، ست الوجود ایٹی ٹیوڈ دکھانے والی لڑکی سمجھتی تھی۔" بیا سحر زدہ تھی۔

آئرہ خاموشی سے تعریف سنتی رہی عاجزی سے ۔۔۔ مگر جملے کے اختتامی حصہ پر وہ اچھلی۔

"تم مجھے یہ سب سمجھتی ہو ۔۔۔ نخریلی اور ست الوجود۔" وہ دھاڑی اور جھپٹی۔

بیا نے پھوپھو کے پیچھے پناہ لی مگر بیا کے موٹے چوڑے وجود کے سامنے پھوپھو کا سہارا کیا؟



آخر زندگی ایسے کیسے گزر سکتی ہے۔ اتنی جدوجہد، ناامیدی اور خالی پیٹ کی زندگی، تو طے پھر ہوا تیمور کہ دراصل پیٹ ہی سب کچھ ہے، باقی سب جھوٹ یا ثانوی۔ ایک جانب انسان جاب لیس ہو، پھر چھڑا چھانٹ ہو اور بھوکا ہو تو زور کس پر ہوا بھوک پر۔ جسم میں جان ہو گی تو کام ڈھونڈا جائے گا نا۔"

وہ بڑے سے چائے کے مگ کے ساتھ پاپے کا شغل فرما رہا تھا۔ ہر لقمے سے اپنی کم مائیگی کا احساس بڑھ جاتا۔

"سب ہی کا گزارہ ہو رہا ہے مگر ایک میں۔" اس پر خود ترسی غالب ہونے لگی۔

عاشر کے آفس میں دوپہر کو لنچ ملتا تھا۔ وہ ساری کسر ہی نکال لیتا۔ ابوذر ادھر ادھر سے چٹخارے بھر لیتا۔

مسئلہ تو تیمور کا تھا اسے نوکری مل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ تین ٹائم گھر پر اور ان دونوں نے اسے امی ہی سمجھ لیا۔ گھر میں گھستے ہی ہانک لگاتے۔

"آج کیا پکایا ہے۔"

یہ نفی میں سر ہلاتا تو وہ وہ طعنے دیتے کہ کیا سوکنیں دیتی ہوں گی۔

"سالے تو گھر میں رہ کر ایک ہانڈی بھی نہیں بنا سکتا۔ گھر تو صاف رکھنا آتا ہی نہیں۔ یہ دیکھ اس ٹیبل کا حال دیکھ۔" عاشر بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا۔ شہادت کی پور پر لگی دھول اس کے چہرے کے عین سامنے کر دیتا۔

اب چونکہ گندگی اسے بھی نہیں بھاتی تھی۔ سو اگلے روز وہ جی لگا کر صفائی کرتا۔ گھر کو سجانے سنوارنے سے فرصت ملے تو جاب کی تلاش کو جائے گا ناں۔ وہ فون پر امی کو بتاتا۔

یہی حال ہانڈی کے ساتھ ہوتا۔ وہ دل لگا کر تیار کرتا۔ تب وہ اتنے کیڑے نکالتے کہ تیمور کا دل کرتا چلو بھر شوربے میں ڈوب کر جان دے دے۔

تیمور کا ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ کوئی بھی کام کرتا

اسے مکمل اور درست کرنا چاہتا۔

اس نے چائے کو چھوڑا اور لمبی کٹی بھنڈی کو دیکھا۔ تینوں کو مسالہ بھری بھنڈی بہت پسند تھی۔ اس نے اماں کو فون کر کے ترکیب پوچھنی چاہی مگر وائے قسمت فون اماں کا۔ ابا کے ہاتھ میں ۔ارے باپ رے۔

''ہاں ہاں، تم بھنڈیاں ہی بناتے رہنا۔ اور وہ جو میں نے تمہیں جاب کے لیے کہا تھا کہ میرے دوست کے آفس جانا۔ اسے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں بندہ چاہیے وہ کیا ہوا۔''

''اوہ نو!'' تیمور نے اپنے بالوں کا گچھا مٹھی میں جکڑا۔

''ڈیڈی کسی اور کا فون ریسیو نہیں کرتے۔''

''گدھے۔!'' ڈیڈی کے سر پر لگی۔ ''یہ کسی بیوی ہے میری۔''

''میں کب انکار کر رہا ہوں میں تو بس کہہ رہا تھا یہ مینرز کے خلاف ہے۔''

''مینرز کے بچے! تم فرقان کے آفس گئے؟''

''میں سفارش پسند نہیں کرتا ڈیڈی! اپنے بل بوتے پر کروں گا جو کچھ کروں گا۔ دراصل اپنے زور بازو۔''

''زور بازو کے باپ! تو ادھر فون کیوں کیا۔ یہ بھرواں بھنڈی بھی اپنے بل بوتے پر بنالینی تھی۔ خبردار! جو میری بیوی کو فون کیا؟'' ڈیڈی نے دھاڑ لگائی اور فون پٹخ دیا۔ تیمور کے کان میں سیٹی سی بجنے لگی۔

''اکاؤنٹ میری فیلڈ ہی نہیں ڈیڈی! آپ سمجھ کیوں نہیں لیتے۔'' تیمور صوفے پر تسلی سے بیٹھ کر سوچنے لگا۔

گہری سوچ نے گھڑی کی بڑھتی سوئیوں تک دھیان ہی نہ جانے دیا۔ نذیر کے جانے کے بعد سے فریج بھی تقریباً خالی تھا۔ کچھ کباب موجود تھے۔ مگر آخر کباب کب تک کھائے جاسکتے تھے۔ آلو تھے۔ وہ بادی ہوتے ہیں تو رہ گئی بھنڈی۔ ہاں مونگ کی دال بھی پڑی تھی۔ اس نے کچھ خیال آنے پر ٹی وی چلا لیا۔ چینل سرچنگ کے دوران سوچا جاسکتا تھا۔ تب ہی نگاہ کوکنگ چینل پر پڑی۔ وہ تو جیسے اچھل پڑا۔ مگر کچھ دیر بعد جھلا کر ریموٹ اچھال دیا۔ ایک جگہ کوئی دس طریقے کے کیک سکھائے جارہے تھے۔ دوسری طرف رنگین اشرفیوں والا سفید زردہ، سندھی بریانی اور مکس سبزی ... رائتہ۔ ایک دوسرے چینل پر شربت ویک منایا جارہا تھا۔ شربت ہی شربت۔ ہر رنگ و نسل ذائقے کے شربت۔

یہ چینل والے آسان روزمرہ کی چیزیں کیوں نہیں بناتے۔ اس کے دکھی دل نے دہائی دی۔ ساتھ ہی دماغ میں ایک شاندار خیال سوجھا اور اس نے خود کو داد دینے کے بجائے جی بھر کے کوسا۔ کہ پہلے اس جانب دھیان کیوں نہ دیا۔

بک شاپ پر گیا اور کوکنگ بکس کو ہاتھ لگایا کہ کرنٹ لگا۔ اتنی مہنگی اور وہ بے چارہ آج کل بے روزگار۔

درخواستیں دے دے کر تھک گیا۔ اپائنٹمنٹ لیٹر نجانے کب ملے گا۔ اللہ جانے۔

کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کے جواب آتے ہیں دل گرفتگی سے سوچتے ہوئے اس نے نزدیکی بڈھے بابے کی پرانی کتب و رسائل والی ریڑھی سے بوسیدہ اوراق والی ایک تراکیب والی کتاب بیس روپے میں خریدی۔



اگر نوکری نہ ملی تو کیا وہ ایسے ہی دونوں کام پر جانے والے بھائیوں کے لیے کھانا بنایا کرے گا۔ صبح جب ابوذر اور عاشر تیار شیار ہو کر خوب سارا پرفیوم اسپرے کر کے آفس کے لیے نکلے۔ تب بکھرا گھر دیکھ کر تیمور خود ترسی کا شکار ہو گیا۔

وہ کیا ان کا نوکر ہے۔ نوکر سے یاد آیا نوکری بھی نہیں ملی۔ تو کیا حیدر آباد چلا جائے۔ مگر حیدر آباد میں نوکری کہاں ملتی ہے۔ سارے چینلز تو کراچی میں تھے۔ سینئر پروڈیوسر سے اختلاف کے بعد استعفیٰ دیتے ہوئے اندازہ نہیں تھا۔ جاب اتنی مشکل بن جائے

گی۔

اور حیدر آباد چلا گیا تو ڈیڈ طعنے دے دے کر وہ جگر چھلنی کرتے کہ پھر کہیں پیوند کاری نہ ہو پاتی۔

انہیں اس کا میڈیا کی فیلڈ میں کام کرنا پسند ہی نہ تھا۔

تین بھائیوں میں بڑے بھائی جان فوج میں تھے اور کوئٹہ پوسٹڈ تھے۔ ڈیڈ کے چہیتے۔ پھر عاشر اعلا تعلیم کے ساتھ ملٹی نیشنل میں اعلیٰ پوسٹ.... یہ دونوں بھائیوں سے عمر میں بہت چھوٹا اور ماں کا لاڈلا تھا۔

ہائے! ماں کا لاڈلا' اس وقت کیسے صفائیاں' دھلائیاں کررہا تھا۔ گھر سنبھالنے کے بکھیڑے.... چھڑوں کو ملازمہ ملتی نہیں تھی ور ملازم ٹکتے نہیں تھے۔

یعنی کہ تیمور کی بے روزگاری سے عاشر اور ابو ذر نے جی بھر کے فائدہ اٹھایا اور ابو ذر چچا کا بیٹا تھا۔ اسے کراچی میں ملازمت مل گئی۔ عاشر اور تیمور فلیٹ میں اکیلے رہ رہے تھے۔ یہ بھی ساتھ رہنے لگا۔

سارا گھر بکھرا ہوا تھا۔ وہ گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔ کام کہاں سے شروع کرے۔ تب ہی ڈور بیل پر چونکا۔

اتنی صبح صبح کون آگیا۔

دروازہ کھولا سامنے پوسٹ مین تھا۔

اس نے بے دلی سے لفافہ کھولا۔ جمائی روکی۔ آنکھیں ملیں۔ پھر اچھل پڑا۔ جیسے کپڑوں میں چوہا گھس جائے۔ نجانے یہ کون سی ڈانس فارم تھی۔

"اپائنٹمنٹ لیٹر.... ارے میرے اللہ.... اماں.... اماں جان۔" وہ فون کی سمت بھاگا تھا۔

☆ ☆ ☆

کیمرے کے آگے تو بس ایک ہنستا مسکراتا' تیار شیار چہرہ پیش ہوتا تھا۔ مگر اس پیش کش کے پیچھے والوں کو دانتوں پسینہ آجاتا۔

وہ خاصا تجربہ کار تھا۔ مگر کوکنگ شو ایک قطعی مختلف چیز تھا۔ شو تین سے پانچ تک کا تھا۔ مگر اسے صبح ہی جانا پڑتا۔ کیا پکنا ہے کے حوالے سے خریداری۔ خوب صورت برتنوں کا انتخاب۔ سیٹ کے لوازمات' کیونکہ شوق اور سیکھنے کی لگن بہت زیادہ تھی' سو ہر چیز میں گھستا۔ ہلکان ہوجاتا' مگر جب شو کامیاب چلا جاتا' تب ساری تکان اڑن چھو ہوجاتی اور کل کے لیے تازہ دم.... ایم سی آر کی تکنیک' لائیو کالرز سے ڈیل اور سب سے بڑھ کر شیف کو اشاروں سے سمجھانا یا اسے اشاروں سے سمجھانا۔

یہ کوکنگ چینل کے پورے ایک دن کا سب سے کامیاب شو تھا۔ محنت تو سب ہی کرتے تھے' ہر حساب سے مگر.... "تھری ٹو' فائیو' دس ازمائی کوکنگ ٹائم" کی بات ہی نرالی تھی۔ اس کی ریٹنگ پورے ویک میں سب سے ہائی آتی اور یہ شاید سب کی محنت تھی۔ قسمت یا پھر پروگرام کی میزبان شیف جس کی موجودگی سے اسکرین جگمگا جاتی تھی۔ جسے کوکنگ سے ذرہ بھر دلچسپی نہ ہو۔ وہ محض شیف کی صورت دیکھنے کو دو گھنٹے پلکیں جھپکائے بغیر بیٹھ جائے۔

اور بڑے مزے سے جاب کے پل پل کو انجوائے کرتا' تیمور ہر روز نیا تجربہ حاصل کرتا' ہر چیز کو سمجھتا۔ نہیں سمجھ پایا تو اپنی شیف کے مزاج کو۔

وہ اپنے فن میں ماہر تھی۔ بنیادی طور پر وہ بدیسی کھانے بنانے کی مہارت رکھتی تھی۔ ساتھ ہی **بیکنگ**' کیک پیسٹری' پزا بھی خصوصیت تھی۔ یہ سب کورسز اس نے باہر ملک سے کیے تھے کہ وہ عرصہ دس برس سے دبئی میں مقیم تھی اور چینل کے مالک کے دوست کی بھانجی تھی اور وہی اسے درحقیقت میڈیا میں متعارف کروانے والا تھا۔ شروع میں سختی سے انکار کرنے کے بعد جب اس نے ایک بار اس فیلڈ میں قدم رکھ دیے۔ تب اسے اس کے اسکوپ کا اندازہ ہوا اور کوکنگ کے حوالے سے سرسری شوق کو باقاعدہ اپناتے ہوئے پھر اس نے دیسی کھانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مختلف کورسز کرلیے۔ تاوقتیکہ کہ ان میں بھی طاق ہوگئی۔

آن اسکرین شیف بہت شان دار تھی۔ اپنے حسن اور اداؤں میں مخصوص اسٹائل سے بولتی۔ کچھ

کوکنگ ایکسپرٹ اپنے ہاتھوں' انگلیوں اور ناخنوں کو انتہا حد تک سجا کر پیش کرتی تھیں کہ ان کے ہاتھ ہی نظر آیا کرتے۔ جب وہ گوندھتیں' کاٹتیں' چمچہ گھماتیں' مگر اس کی کلائیاں' انگلیاں اور ناخن ترشے ہوئے کسی بھی سجاوٹ سے پاک ہوتے۔ بالوں کو سختی سے کھینچ کر لمبی پونی باندھ کر کوکنگ کرتی۔ لیکن پروگرام کے آخری بریک کے بعد جب اسے پکے ہوئے کھانوں کو ٹیبل پر سجا کر ای میلز کے جواب دیتے ہوئے نزاکت' مہارت اور اداؤں کا مکمل نمونہ سامنے ہوتا۔



کہاں تو وہ بے دلی سے کافی پینے آیا تھا اور کہاں دل خوشی سے جھومنے لگا۔ سامنے وہ حسینہ جو چھلاوہ محسوس ہونے لگی تھی۔ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہی ڈبوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی۔ لکھے ہوئے اجزا کا ۔۔ گہرائی سے مطالعہ کرتی۔

عاشر نے کپ کو ٹیبل پر پٹخا اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ آج کا موقع وہ کسی صورت ضائع نہیں کرے گا۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھی آٹے کے تھیلوں پر لکھے نجانے کون سے اسرار کھوج رہی تھی۔ عاشر نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ' پانچ کلو مشہور چکی کا آٹا ٹرالی میں رکھ دیا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ فخر سے سینہ تانے کھڑے عاشر پر نگاہ ٹکی' ٹھٹکی اور اس میں شناسائی کے رنگ ابھر کر معدوم ہو گئے۔ اب صرف سوالیہ رنگ رہ گیا تھا۔ وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی اسے اور از حد حیرت سے آٹے کے تھیلے کو۔۔۔

"میں نے سوچا ابھی آپ کو اسے اٹھانے میں پرابلم ہو گی' اسی لیے۔"

"تھینکس۔۔۔" وہ مسکرائی اور عزیزی عاشر نے تھوک نگل لیا۔ خوب صورت لوگوں کے مسکرانے کی پیشگی اطلاع دینے کا بل پاس ہونا چاہیے۔ ایسی ناگہانی موت۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔

"مگر مجھے اسے لینا نہیں تھا۔ میں صرف دیکھ رہی تھی۔"

"میں واپس رکھ دیتا ہوں۔" عاشر جیسے حکم کا غلام ہو۔

"آپ۔۔۔!"

"آپ۔۔۔!"

دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ برآمد ہوا۔ پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔

"آپ کہیے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

عاشر نے لیڈیز فرسٹ والے اصولوں پر لعنت بھیجی کہ پہلے آپ۔۔۔ وہ دراصل کہنا' سننا وہی تو چاہتا تھا۔

"ہمارا یوں سرراہ بار بار ملنا محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"بالکل صحیح۔۔۔ اور اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ ہمارا راستہ ایک ہے۔"

"اوہ۔۔۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ منزل بھی ایک ہو جائے۔" عاشر صاحب کا پہلا موقع تھا۔ وہ کون سا جھوٹ بول رہا تھا یا فلرٹ کرنا چاہتا تھا۔ سو منہ پھاڑ کے کہہ دیا۔

"اتنی بڑی بات آپ نے اتنی آسانی سے کہہ دی اور یوں چھوٹتے ہی۔۔۔" اس کی بڑی آنکھیں حیرت کے باعث اور زیادہ بڑی ہو گئی تھیں۔

"سچ بولنا کبھی مشکل نہیں ہوتا۔" عاشر کے چہرے کی خوشی لہجے میں بھی عیاں تھی۔

"آپ نے سچ جھوٹ کا فیصلہ بھی خود سے کر لیا۔"

"میں فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ مگر یہ تو جانتا ہوں ناکہ سچ کہہ رہا ہوں اور منزل کے ایک ہو جانے کا کہہ کر سوال ہی تو پوچھا ہے۔ آپ جو جواب دیں' جو بھی آپ کی رائے۔"

عاشر کے لہجے سے سچائی ٹپک رہی تھی۔ اجنبی حسینہ نے جانا۔

"ہوں۔" اس نے ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے۔ دلچسپی بڑھی تھی۔ "رائے دو طرح کی ہے یا تو آپ بہت بڑے کھلاڑی ہیں یا پھر بڑے اناڑی۔"

"اب میں کچھ کہوں تو جانب داری کا الزام بھی لگ

جائے گا یا اپنے منہ میاں مٹھو والی بات۔ سو فیصلہ آپ ہی کیجئے۔ بڑی طمانیت اور بے فکری سے کھڑی سوال و جواب کر رہی ہیں۔ جبکہ میرا دل ڈر رہا ہے۔ اگر جو آپ کسی کو آواز دے کر کہہ دیں کہ میں لڑکی کو تنگ کر رہا ہوں یا سینڈل ہی اتار لیں۔"

عاشر کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ عاشر نے سہارے کے لیے ٹرالی پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ایسی جلترنگ... جلترنگ تھی۔ تب وہ متبسم لہجے میں گویا ہوئی۔

"میری طمانیت کی وجہ کچھ اور ہے۔ مجھے آپ جیسے ٹکرتے ہی رہتے ہیں۔"

عاشر کا چہرہ اور جوش و خروش پہلی بار سہما ہوا۔

"بہرحال آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔" حاضر جواب حسینہ نے بات سمیٹنی چاہی۔

"کچھ نہیں..." عاشر کے منہ سے نکلا۔ "میرا مطلب ہے پتا نہیں، مگر مجھے لگتا ہے آپ کے اور میرے بیچ کچھ کنکشن ہے۔ جب ہی تو ہم بار بار ملتے ہیں۔"

"وہ تو میں نے آپ کو بتایا نا ہمارا راستہ ایک ہے۔" وہ مسکرائی۔

"نہیں راستے کی بات نہیں۔ ان سرسری سی سر راہ ملاقاتوں کے بعد آپ بھولتی نہیں۔ ہر جگہ آپ ہی نظر آتی ہیں۔ اب جیسے یہ سامنے دودھ کے ڈبے پر بنی تصویر والی خاتون میں آپ نظر آرہی ہیں' وہ ادھر سامنے۔" عاشر نے سر کے عین اوپر بڑے سے اشتہاری بینر کی طرف اشارہ کیا۔

"کوکنگ آئل کے ڈبے کو لیے جو خاتون مامتا کا اظہار بتا رہی ہیں۔ وہ بھی مجھے آپ لگ رہی ہیں۔ بلکہ..."

"اس لیے کہ..." ٹرالی کو ریورس کر کے آگے جانے کا اشارہ دیتی حسینہ نے دونوں خواتین کو سرسری دیکھا۔ "وہ میں ہی ہوں۔"

عاشر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ پل بھر کی' مسکرائی اور اسے حق دق وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ٹی وی لاؤنج کے صوفوں پر چاروں براجمان تھیں۔ اور ٹی وی پر کرکٹ میچ چل رہا تھا۔ ساری قوم دعا گو تھی کہ اوپنرز جم جائیں کہ رنز کی مضبوط بنیاد ہی جیت کا باعث بنے گی۔ مگر ان سب سے پرے ایراد کے دونوں ہاتھ ہونٹوں سے جڑے تھے کہ یہ سب کے سب آؤٹ ہوں اور آفریدی پچ پر آجائے۔

"ہائے یہ آفریدی کو اوپنر کیوں نہیں بنا دیتے۔"

"اوپنر... آفریدی؟" پیا کو دھچکا لگا "مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں اسے دیکھ سکوں۔"

"بس پلک جھپکنے کی حد تک..." پھوپھو کی جلی کٹی آواز آئی۔ "قسمت یا آواری کرے تو کرے۔ وہ تو ہوا کا جھونکا بن کر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے چھو کر گزر گیا۔"

"ہائے پھوپھو..." ایراد جھوم اٹھی۔ "کیا شاعرانہ تشبیہ استعمال کی ہے۔ ہوا کا جھونکا... چھو کر گزرا' اف..." نجانے کیسی سرشاری سے اس نے آنکھیں میچیں۔

"لیکن یہی جھونکا اگر ٹک گیا نا تو مخالف ٹیم کے لیے طوفانی جھکڑ میں بدل جائے گا۔ سب کچھ اکھاڑ پچھاڑ دے گا۔"

"ہاں..." پھوپھو کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ "اگر ٹک گیا؟"

"اسے میچ کی فکر نہیں ہے' نہ ہار جیت سے مطلب۔" آئرہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔ وہ اپنی ڈریس ڈیزائنر کے بھیجے کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ جتی ہوئی تھی۔ سرسری نگاہ سے ٹی وی دیکھتی' ہاں کان گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔

"اسے بس آفریدی کو دیکھنا ہے۔"

"تو اس کا تو حل ہے نا' اسے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ لے کر امپائرنگ شروع کر دینی چاہیے۔ صبح سے شام ان دی گراؤنڈ... ہی ہی ہی۔"

پھوپھو اور آئرہ ہنس پڑیں۔ ایراد نے پیا کو گھورا۔

"اب بولنا بند کرو اور میچ انجوائے کرو..... اور کرنے دو۔" ایراد نے خفگی سے کہا۔

آرَہ آخری اوورز کے میچ میں دلچسپی لیتی تھی۔ صرف ایراد تھی جو پلکیں جھپکنے کو بھی تیار نہ ہوتی۔ اس وقت پاکستان کی اوپننگ چل رہی تھی اور میچ بہت ڈھیلا تھا۔ آرَہ فون پر چند ایک ڈریسز کو چھوڑ کر باقی سب میں کیڑے نکال رہی تھی۔

ایک سے ایک اسٹائلش قیمتی پیارے کپڑے۔ بیا کے چہرے پر حسرت پھیل رہی تھی یہی حال ایراد کا بھی تھا۔ جب دونوں کی نظریں کپڑوں سے ہٹ کر آپس میں ٹکرائیں تب دونوں کو ایک دوسرے کے دل کا حال معلوم ہوا اور یہ بھی کہ اس وقت دل پر کیا بیت رہی ہے اور آنے والے وقت کے لیے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ اسی وقت پھوپھو نے سخت تاسف میں گھر کے سرہاتھوں پر گرالیا۔ جبکہ ایراد خوشی سے بھنگڑے ڈالنے لگی۔ جتنی جلدی کھلاڑی آؤٹ ہوتے اتنی ہی جلدی آفریدی آتا ناں۔ بہرحال کھلاڑی پکے پھل کی طرح گرتے رہے اور آفریدی پہنچ ہی گئے۔

اور جب آفریدی اسکرین پر آیا تو ایراد جیسے پاگل ہوگئی۔

"یہ اتنی چھچھوری حرکتیں تم نے کہاں سے سیکھیں۔" اس کا نثار ہونا پھوپھو کی برداشت سے باہر ہوگیا۔

یک دم ایراد نے فلک شگاف چیخ ماری تو سب اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور پھران چیخوں میں آرَہ بیا اور پھوپھو تک کی شمولیت ہوگئی۔ کہ آفریدی ٹک گیا تھا۔ دے چھکے پہ چھکا۔ چوکے پہ چوکا اور ان ہی کے گھر پر کیا ہنگامہ۔ ہر کھلی کھڑکی سے چیخیں ہاہاکار اور نعرے بلند ہورہے تھے۔

آفریدی نے اپنے ہی قائم کردہ کسی شاندار ریکارڈ کو توڑ ڈالنے کی قسم کھائی تھی۔ چیخ چیخ اور اچھل اچھل کر ایراد کا گلا بیٹھ گیا مگر۔

چھکے چوکے سانس لینے کے بھی مہلت نہیں دے رہے تھے۔ پاکستان واضح ہار تا میچ جیت جانے کو تھا۔ اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

ہربار بلے پر گیند چڑھتی۔ تب سب آنکھیں میچ لیتے۔ پیٹ میں گرہ سی بندھ جاتی۔ پھر ٹی وی کے شور پر ایک آنکھ کھول کر ڈرتے ڈرتے اسکرین دیکھتے۔ شور آؤٹ ہونے کا تھا یا ایک اور چھکا پڑا ہے۔

اور وہ چھکا یا چوکا ہی ہوتا۔ ایراد کا حال برا تھا۔ وہ بیٹھ جاتی۔ کھڑی ہوجاتی۔ اچھل پڑتی۔

کہاں ہارنے کا خوف اور کہاں اب مسلسل پڑتے چھکے بھی دلِ ناتواں کی برداشت سے باہر ہورہے تھے۔

"یہ حرکتیں (اخلاق باختہ) پھوپھو کے نزدیک اب حد ہوگئی تھی۔ وہ جارحانہ عزائم کے ساتھ اٹھیں۔ کان سے پکڑ کر دو لگاتیں اور پھوپھو کے عزائم کی راہ میں ڈور بیل حائل ہوگئی۔

"دیکھا۔" پھوپھو نے آگے بڑھ کے آواز میوٹ کردی۔ ساتھ ہی اچھلتی ایراد کا بٹن بھی جیسے آف ہوگیا۔

"آگیا ناں کوئی کمپلین لے کر۔ اتنا شور۔ کوئی طریقہ ہے یہ شریفوں کا غضب خدا کا۔ حد ہے یعنی کہ۔" پھوپھو کے اعصاب کے لیے مسلسل بجتی بیل عذاب تھی۔

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے اس سے پہلے کہ آنے والا بندہ ہمارے گھر کے شور پر بحث کرے "آپ اس پر چڑھ دوڑیں کہ بیل کیا اس کے ابا کی ہے۔ جس پر انگلی رکھ کے وہ بھول گیا۔ اور اگر بیل خراب ہوگئی تو وہ پیسے بھرے گا کیا؟" بیا نے تیز تیز لہجے میں اپنی طرف سے بہترین حل پیش کیا۔

"ہاں ہاں بالکل۔ بلکہ آپ اسے شرمسار کیجیے کہ کیا اس میں ذرا سا بھی" ایراد نے چٹکی بنا کر دکھائی "جذبہ ملی نہیں کہ وہ اپنے ملک کی کامیابی پر خوش ہو اور اگر پھر بھی بولے تو مجھے بتایئے گا میں نے اس پر غداری کا مقدمہ نہ دائر کروایا۔ تو میرا نام ایراد کی جگہ....." وہ موزوں نام پر اٹک گئی۔

"فراڈ رکھ دینا۔" بیا کو گدگدی ہوئی۔

پھوپھو نے تینوں کو گھور کے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑی صورت نے ماتھے کی تیوریوں اور چہرے کی درشتی کو بڑھایا۔ پر غالب عنصر شدید حیرت تھی۔ اوپر سے نوارد کے سوال نے ہوش اڑا دیے۔

شور مچانے پر شکایت نہیں آئی تھی بلکہ فرمائش آئی تھی۔ سامنے والا وہ پڑوسی لڑکا جو زیادہ تر گھر میں رہتا تھا۔ ان کے کان، گلے اور ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ان سے ایک چوڑی۔ ان کی سونے کی چوڑی مانگ رہا تھا۔ کہ اسے گردہ کلیجی پھیپھڑا بنانا تھا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جی جی آنٹی!'' تیمور کی گھبراہٹ ختم ہونے لگی تھی۔

''دراصل میں نہیں کہہ رہا۔ یعنی کہ مجھے نہیں چاہیے چوڑی۔ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں خود کوکنگ کرتا ہوں ناں۔ تو۔ دراصل وہ جو نذیر تھا ہمارا کک پلس کیئر ٹیکر جب سے وہ چلا گیا۔ تب سے آپ جانتی ہوں گی نذیر کو وہ گنجا سادہ۔''

''ہاں ہاں جانتی ہوں۔'' پھوپھو کا حلق کڑوا ہو گیا۔ بے ضرر نظر آنے والا بدتمیز ملازم۔ تم اپنی بات کرو۔''

''میری کوئی بات نہیں ہے آنٹی۔ دراصل میچ کی خوشی میں ہم نے اپنے کچھ دوستوں کی دعوت کی تو۔

میں نے سوچا کہ کلیجی گردے بنا لیتا ہوں۔ تو بنا ہی رہا تھا مگر۔'' تیزی سے چلتی زبان کو بریک لگا۔

''تم کلیئر بات کرو گے یا میں دروازہ بند کردوں۔'' وہ جو ایک بار پھر الفاظ مجتمع کرنے کے لیے رکا تھا۔ پھوپھو کی دھاڑ سے گڑبڑا گیا۔ اس نے بڑے بوکھلائے انداز میں کتاب کو کھولا تیزی سے ورق پلٹ کر ترکیب ان کے سامنے کر دی۔

''میں یہ بھی لایا ہوں آنٹی!'' اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا نازک سا ترازو دکھایا جو سناروں کی دکان پر ہوتا ہے۔

پسا گرم مسالہ	ایک تولہ
سفید زیرہ	ایک تولہ
خشک دھنیا	آدھا تولہ
ادرک	پسی ہوئی تین تولہ
لہسن	ایک پوتھی

شاہی پھوپھو نے زیر لب پڑھا۔ ''تم نے کہاں سے لیا یہ بابائے آدم کے زمانے کا خفیہ طرز تحریر... تولے ماشے...'' شاہی پھوپھو کو گویا پتنگے لگ گئے۔

''دکان سے۔'' تیمور کا منہ لٹک گیا۔ شاہی پھوپھو نے ایک بار پھر اسے کڑے تیوروں سے دیکھا۔ تیمور گھبرایا۔

''میں دوبارہ کبھی اس بک سے کوئی **ریسیپی** فالو نہیں کروں گا مگر آج۔ بلکہ ابھی تو پھنس گیا ہوں ناں۔'' تیمور کا لہجہ منتی ہو گیا۔

''آپ کے پاس چونکہ بہت سے۔ میرا مطلب ہے مختلف سائز کے زیور ہیں اور آپ کو بھی میری اماں جان کی طرح یقیناً'' اندازہ ہوگا کہ کس کا کتنا وزن ہے تو...

بس آپ مجھے تولے بھر کی چوڑی دے دیں اور کچھ ماشے کی انگوٹھی۔ میں مسالوں کا وزن کرتے ہی واپس کر جاؤں گا۔ آپ۔ آپ یقین کریں۔ میں کوئی چور یا نوسرباز نہیں، میرے ڈیڈ فوج کے اعلا افسر ہیں اور یہ ہمارا اپنا ذاتی گھر ہے۔''

آنٹی کے چہرے کے تاثرات ہر جملے پر رنگ بدل رہے تھے۔ تیمور کا حوصلہ بڑھا۔

''تو پھر آپ مجھے زیور دے رہی ہیں۔'' تیمور نے حریص نگاہوں سے ہاتھوں کی چوڑی انگوٹھی کو دیکھا۔

''بالکل نہیں۔'' پھوپھو نے کتاب اس کے ہاتھ پر پٹخی اور بازو پیچھے کر لیا کہیں جھپٹ نہ لے۔

تیمور رو دینے والا ہو گیا۔ پہلے بے روزگار ہونے کی بنا پر کماؤ پوت اس پر ذمہ داریاں ڈال دیتے تھے۔ اب اس کے روزگار نے اسے کاما بنا دیا تھا۔

میچ دیکھنے کے لیے ابوذر نے اپنے کچھ دوستوں کو گھر بلا لیا۔

''کوکنگ چینل میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر و پروڈیوسر ہے میرا بھائی۔ ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔'' ابوذر

فخر سے اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا۔ تیمور بھونچکا رہ گیا۔
ادھر دوستوں کے چہرے پر ستائش پھیل گئی۔ اتنا سلیقہ شعار ہر فن مولا بھائی۔۔۔ اللہ سب کو ہی دے۔
"تل والے نان میں لے آیا ہوں۔ کولڈ ڈرنکس اور رس ملائی فریج میں۔۔۔ سلاد میں بنالوں گا' تو بس کلیجی گردے۔۔۔" ابو ذر نے اپنائیت اور لجاجت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا تھا۔
اور اسی چکر میں آج وہ نخریلی بدمزاج دبنگ سی پڑوسی آنٹی کے دروازے پر امید بیم کی حالت میں کھڑا تھا۔
آنٹی اسے دروازے پر چھوڑ کر کہاں چلی گئیں۔
ایسا نہ کروں۔ پیکٹ کا کوئی مسالا لا کر گھول گھال کر ہانڈی رکھ دوں۔
یا کسی تو اکلیجی والی ریڑھی سے پکی پکائی لے آؤں۔ کمال ہے یہ آئیڈیا پہلے کیوں نہ آیا اور بھاڑ میں گئی ہائی جین کی فکر' میں کیا کروں۔
آنٹی تو ٹہرنے کا کہہ کر گئی تھیں۔ کہیں ڈنڈا یا کوئی اور ہتھیار ہی نہ لے آئیں۔ اسے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔
"اے لڑکے!" دھاڑ کی آواز پر وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلٹا۔ "ادھر منہ کر کے کیا کھڑے ہو ادھر دیکھو۔"
آنٹی کے ہاتھ میں ایک کٹوری تھی۔ جس میں مسالے تھے۔" دیگچی میں ڈالو اپنے گردے' پھپھڑے اور کلیجی۔ اب اس میں ڈالو چار عدد پیاز چھوٹی کاٹ کر۔ لہسن ادرک کا پیسٹ ڈالو' یہ سارے مسالے ڈالو۔ دو عدد بڑے ٹماٹر۔ آدھا گلاس پانی اور گلنے کے لیے رکھ دو۔ کوئی بیس پچیس منٹ بعد دو ڈوئی کوکنگ آئل ڈال کر بھونو۔ اور خوب بھونو۔ لکڑی کی ڈوئی استعمال کرنا۔ جب گھی اوپر آجائے یعنی الگ سے سرخ سرخ نظر آنے لگے تو اوپر دھنیا' پودینا ہری مرچ کاٹ کر گارنش کرنا۔ سمجھے اور۔"
"جی۔ جی جی آنٹی! تھینک یو ویری مچ!" تیمور کے تو الفاظ گم ہو گئے۔ اتنی احسان مندی کہ کیا کہنے۔ دہرا سا ہو گیا۔ کہیں چرنوں ہی میں نہ بیٹھ جاتا۔
"میں۔۔۔ میں آپ کے لیے بھی لاؤں گا۔۔۔ میں۔۔۔"
"تم نے میری پوری بات نہیں سنی۔" آنٹی نے اسے گھورا۔ "اور دوبارہ اپنی شکل مت دکھانا ورنہ۔۔۔"
"نہیں پھوپھو! لانے دیجیے نا۔ ہم بھی تو چکھیں' کیا بنتا ہے' تم لے آنا۔" پیچھے سے ایک شریر آواز گونجی اور پھر بھتیجی سامنے بھی آگئی۔
تیمور کے ہاتھ سے پیالی گرتے گرتے بچی۔۔۔ بلکہ وہ خود بھی گرنے سے بچا۔ نیلے لباس میں سینے پر ہاتھ لپیٹ کر بھرپور مسکراہٹ سے اسے دیکھتی۔ تیمور نے پلکیں جھپکیں۔ شاید وہم ہو یا شکل ملتی ہو یا۔۔۔ مگر وہ وہی تھی۔
"ہم بھی تو دیکھیں' تیمور کے ہاتھ میں ذائقہ کتنا ہے۔ کیوں تیمور!"
"تم جانتی ہو اسے؟" پھوپھو کو بھتیجی کی بے تکلفی قطعاً" نہ بھائی۔ عورتیں بھی تو اکیلی رہتی تھیں نا۔
"صرف جاننا۔" اس نے گردن کو ذرا سا جھٹکا دے کر بال شانے پر چھوڑے۔ "میں تو ان کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی۔ کیوں تیمور؟" اسے تیمور کی حالت بے حد مزا دے رہی تھی۔
"جی جی جی۔۔۔ میں جاؤں۔۔۔ میں جاتا ہوں۔" وہ چار قدموں کا فاصلہ طے کر کے کیسے گھر تک پہنچا۔ جانے دیں۔



عاشر کو گھر پہنچ جانے کی جتنی جلدی تھی۔ اس روز اتنی ہی دیر ہو گئی۔ گھر پہنچا تو میچ آخری مراحل میں تھا۔ ابو ذر کے دوستوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ اشتہا انگیز خوشبو بھی ان ہی کے گھر سے اٹھ رہی تھی۔
یعنی ایک اچھا دن۔۔۔ آج دل بھی سیر ہو گیا تھا اور اب پیٹ بھی۔ دستر خوان لگا ہوا تھا۔ دوست رخصت ہو گئے' تب عاشر صوفے پر لیٹا۔ ایک انگڑائی لی۔
"بہت مشکل میچ تھا۔ آخر تک پھنسا ہوا۔" ابو ذر بکھری چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ تیمور منہ پھلا کر بیٹھا تھا'

اور بہت چپ تھا۔ ابوذر نے جان لیا۔ اتنے سارے کام کرنے کے بعد وہ تھک گیا تھا اور اب کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگائے گا۔

''آخر تک یقین نہیں تھا کہ پاکستان جیت جائے گا۔'' ابوذر ہی بول رہا تھا۔ عاشر صاحب کے چہرے پر تو مسکان تھی۔ کسی اور ہی دنیا میں تھے۔ تیمور اور ابوذر کا دھیان نہ پڑا۔

''اور مجھے یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی۔'' عاشر کا لہجہ پہنچے ہوئے بزرگ سا قطعی تھا۔

''ایسے کیسے یقین..... معجزہ ہی ہوا ہے، جو وکٹیں مل گئیں۔'' ابوذر متعجب تھا۔

''اس یقین کا تعلق وکٹوں سے نہیں ہے۔ دراصل بعض دن ایسے بھی طلوع ہوتے ہیں جب ہر کام اچھا ہوتا ہے۔''

عاشر کے انداز میں سرشاری تھی۔ تیمور نے برا منہ بنا کر عاشر کو دیکھا۔

''یقین کرو' اگر آج کے دن تم سامنے روڈ پر کھدائی شروع کردیتے تو تیل کے ذخائر بھی نکل آتے۔''

''او میرے بھائی تو ہے کس جہان میں۔ کسی نے کچھ کھلا پلا تو نہیں دیا؟؟''

ابوذر بے فکرمندی سے تیمور کو دیکھا جو سکتہ کی حالت میں تھا کب سے' ادھر عاشر کے لبوں سے مسکراہٹ اور گنگناہٹ جدا ہی نہ ہو رہی تھی۔

''اوہو..... کیا ہے آج؟'' ابوذر چلایا۔

''حال دل کہہ کر آیا ہے آپ کا بھائی۔''

''تو کیا سر پر لگی جو اول جلول باتیں کر رہا ہے۔''

ابوذر نے تیزی سے آگے بڑھ کر عاشر کا سر ٹٹولنا شروع کردیا۔

''ابے ہٹ..... نہ صرف حال دل کہا بلکہ یہ بھی پتا لگ گیا کہ وہ کون ہے۔ ہر روز ٹی وی پر آتی ہے بس میرا دھیان ہی نہ گیا۔ ہائے اتنی کمزور تھی نزدیک کی نظر۔''

''ٹی وی کی لڑکی۔'' تیمور چونکا۔

''آخر کون سی لڑکی؟'' جیسے تیمور نہیں جانتا۔

عاشر نے ریموٹ پکڑ لیا۔ تیزی سے چینل بدلنے لگا۔ یکدم ٹھٹکا اور چلایا۔

ابوذر اور تیمور بھی ٹی وی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

''کوکنگ آئل کا اشتہار تھا۔ میری چوائس صرف.....''

''یہ..... یہ تو وہی ہے۔'' عاشر سے پہلے ابوذر بول اٹھا۔

''ہاں میرے بھائی یہی ہے تمہاری ہونے والی بھابھی۔'' عاشر کے منہ میں لڈو کھل گئے۔

''یہ.....'' تیمور کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

''یہ تو میری شیف ہیں۔ آرہ امتیاز۔'' وہ بے یقینی سے دونوں کے اثبات میں ہلتے سر دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری شیف۔'' دونوں چلائے ہم آواز ہو کر۔

''پھر تو تمہیں اس کا سارا بائیو ڈیٹا پتا ہو گا۔''

تیمور کا منہ دوبارہ نروٹھے بچے کا سا ہو گیا۔ سر اثبات میں ہلایا۔

''کہاں ہے اس کا گھر؟'' عاشر اچھل کر تیمور کے صوفے پر شانے پر بازو رکھ کر بیٹھ گیا۔ بس بھائی کا منہ چومنے ہی والا تھا۔

''اس کا گھر..... یہ ہمارے عین سامنے والا.....'' (کتنی شرمندگی ہوئی تھی مسالے مانگنے چلا گیا)۔

''کیا؟'' عاشر کو جیسے کسی نے اسٹاپ کہہ دیا۔

''ہمارے عین سامنے والا۔'' اس نے تیمور کے الفاظ دہرائے۔ پھر اٹھ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کردیا۔ ساتھ بڑا بھائی بھی بن گیا۔

چٹاچٹ چھوٹے بھائی کے گال بھی چوم لیے۔

''یعنی کے عین سامنے والا۔''



'' جیسے تمہارے خیالات تھے۔ تمہاری شادی تو لوہے کا چنا ثابت ہونی تھی اور تم اتنے مزے سے بتا رہی ہو۔'' بیا کی حیرت جاتی نہ تھی۔

"بس مجھے خلوص کی مہک آگئی۔" آئرہ مسکرائی۔

"تم لوگوں کو سونگھ کر چیک کرتی ہو۔" ایراد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بکو مت۔" آئرہ بھنائی' جبکہ پھوپھو اور بیا کھلکھلا ئیں۔

"اس نے سیدھے سیدھے شادی کا کہہ دیا۔ میں نے کہا میں تو آپ کا نام تک نہیں جانتی اور آپ نے کیسے منہ کھول کر کہہ دیا۔"

"وہ بولا زیر لب کہتا تو بھی آپ کو شکوہ ہوتا صاف بات کیوں نہیں کرتا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو آپ کی خود اعتمادی پر حیرت ہے۔"

اس نے کہا اور مجھے آپ کی پہلو تہی پر۔ آخر آپ کو میری آنکھوں میں جلتی محبت کی جوت اور سچائی کا علم نظر کیوں نہیں آتا۔

اور اس کے اس جملے کے بعد میری بولتی بند ہو گئی۔ اس کے پاس ہر اعتراض کا جواب تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا میں اس سے باتوں میں نہیں جیت سکتی۔ اس کی پوری شخصیت تو کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتی ہے۔ پھر بات کرنے کا سلیقہ..... سب سے بڑھ کر وہ چرب زبان تو ہے مگر لفظوں کا مہذب استعمال جانتا ہے۔ اور زبان پر اعتبار نہ بھی کرو تو... اس کی آنکھیں جھوٹ نہیں بولتی تھیں۔"

آئرہ کا انداز بے بس ہو گیا۔ پھوپھو سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ دراصل جس طرح ہر بار وہ تمہارا سامان اٹھا اٹھا کر پہنچا رہا تھا۔ تم نے سوچا اس سے بڑھ کر بہترین لوڈر کہاں ملے گا۔" بیا نے قصہ کوتاہ کیا۔

"بیا کی بچی.....!" آئرہ نے اس کے کندھے پر چپت لگائی۔ "اور اب تو یہ پتا لگ گیا کہ وہ ہمارے ڈائریکٹر کا بڑا بھائی ہے۔"

پھوپھو کے چہرے پر تسلی پھیلی۔ "وہی جو مسالے مانگنے آیا تھا۔ اور یہ بات تو خیر سب ہی کہیں گے دعوے سے..... کہ اتنے عرصے سے یہاں ہمارے سامنے رہ رہے ہیں۔ نا تو ہمیں کسی قسم کی شکایت ہوئی اور نہ ہی کسی اور سے کوئی اعتراض سنا۔ ورنہ 'تنہا' فیملیز سے دور رہتے لڑکوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سنتے ہی ہیں۔"

پھوپھو کی تعریف ایک ووٹ بن گئی۔

ایراد نے ٹیبل بجانی شروع کر دی۔ "راجہ کی آئے گی بارات رنگیلی ہو گی رات۔"

"بھابھی بھی بہت خوش ہیں۔ اور بھائی جان فوجی بیک گراؤنڈ سے مطمئن۔"

شاہی پھوپھو نے مزید کہا۔ آئرہ مسکرانے لگی۔ تب ہی بیا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ایراد نے گانا روک دیا۔ "آپ کو کیا ہو گیا؟"

"ہائے جو شادی سے بھاگتی تھی۔ اس کے سہرے کے پھول کھل گئے۔ اور میں جو زندگی میں صرف شادی ہی کرنا چاہتی تھی۔ حق ہاہ۔"

"بس جی اپنی اپنی قسمت ہے جو بہت دور تھا وہ سامنے والا نکلا اور جو سامنے ہے۔" بیا سچ مچ صدمے میں تھی۔ یہ دھیان ہی نہ تھا۔ کیا بولنے لگی ہے۔

"وہ کتنی دور.....؟"

"سامنے کون سامنے ہے۔" آئرہ نے پوچھا۔

"وہی باڈی بلڈر۔ جو ہو بہو میرے آئیڈیل لڑکے سے مشابہ ہے بلکہ آئیڈیل ہی ہے۔"

"آئیڈیل لڑکا سامنے رہتا ہے.... اور تمہیں کیسے پتا۔ تم اس سے کب ملیں؟" پھوپھو کا بھاری بھرکم احساس ذمہ داری بیدار ہوا۔

"اتفاقاً"۔ بیا نے لاپروائی سے ہچکی لی۔

"بیا کی بچی صاف بولو۔ تمہاری ماں نے میری نگرانی میں تمہیں بھیجا ہے۔ وہ تو کچھ کیے بغیر بھی میرا ناطقہ بند رکھتی ہیں اور تم لے کر آگئیں نئی کہانی۔ شروع ہو جاؤ۔" پھوپھو نے تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ ساتھ ہی

چٹکی لینے کی کوشش کی۔ (ناکام)
"آئے ہائے۔" بیا تڑپی اچھلی اور پھر بولنا شروع ہوگئی۔



"بوتیک سے یونیک ڈریسز آئے تھے آئرہ کے لیے۔ یاد ہے ناں کیسے کیسے شاندار پرنٹ تھے کہ منہ میں پانی آتا تھا۔ وہ سفید اور گلابی اور سیاہ مجھے کس قدر پسند آیا۔ اور ہلکا نیلا اور گہرا نیلا بلاک پرنٹ ہائے۔۔۔ کوئی اچھے دل والی بہن ہوتی تو خود ہی سے ایک ایک دے دیتی۔ مگر اس نے مانگنے سے بھی نہیں دیے۔
پھر میں نے انتقام لینے کا سوچا اور سارے کپڑے بدل بدل کر پہن کر گھر میں خوب گھومی مگر وہ جو پسندیدہ ترین تھا۔ اسے پہن کر شیری سے ملنے چلی گئی۔ یہ شوٹنگ پر تھی۔ میں اپنے خیالوں میں شاداں فرحاں آئی۔ خوب شومار کے آئی تھی۔ اب جب آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو کیا دیکھتی ہوں سامنے سے آئرہ چلی آرہی ہے۔ بیل بجائی کہ جلدی سے اندر گھس جاؤں تو پھوپھو نے دروازہ نہ کھولا۔
تب میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سامنے والے گھر کا دروازہ بجادیا۔ دروازہ پلک جھپکتے کھلا۔ اور میں کچھ بھی دیکھے کہے بغیر اندر گھس گئی۔
"پلیز آپ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اندر رہنے دیجیے۔ پلیز میں بس پندرہ منٹ بعد چلی جاؤں گی۔"
"لیکن آپ ہیں کون؟ کہاں سے آئی ہیں اور کہاں چلی جائیں گی؟"
"میں بیا ہوں۔۔۔ شیری کے گھر سے آئی ہوں اور اپنے گھر چلی جاؤں گی مگر پلیز۔ اس وقت مجھے پناہ کی اشد ضرورت ہے ورنہ آج میری جان چلی جائے گی۔۔۔ اگر آپ نے میری ہیلپ نہ کی تو آج۔۔۔ اف۔" میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔
"میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ واقعی خوف زدہ ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ ڈھونگ رچاکر شریف لوگوں کو لوٹتی ہوں یا ان پر الزام لگاکر بلیک میل کرنا چاہتی ہوں۔"
"ارے! میں آپ کو ایسی ویسی نظر آتی ہوں۔ یہ سامنے والے گھر میں تو رہتی ہوں شاہی پھوپھو کے گھر۔۔۔ آپ کی پڑوسن ہوں اور میرے برے وقت میں آپ مجھے ایسے کہہ رہے ہیں۔"
"وہ فوراً" میری انتہائی مجبوری سمجھ گیا۔ سہلانے لگا، پھر تیزی سے دروازہ کھولنے لگا تب میں دروازے کے آگے دیوار بن گئی۔
"آپ مجھے گھر سے نکال رہے ہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے شاید۔
"نہیں نہیں۔۔۔" وہ معصوم پیچھے ہوا۔ تب مجھے یاد آیا امی کہتی تھیں۔ روتے ہوئے میں بڑی مظلوم و معصوم لگتی ہوں۔ خاص طور پر میری بھری ہوئی آنکھیں تو دل کو۔۔۔ تو شاید اس پر بھی ایسا ہی اثر ہوا ہو۔"
"جو آنٹی کہتی ہیں اسے ماما کہتے ہیں بیا!" آئرہ نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔
"ہاں ہاں۔۔۔ لیکن میری بھری آنکھوں میں اک اثر تو ہے ناں۔" ساتھ ہی اس نے پلکیں تیز تیز جھپک کر یقین دلانے کی سعی کی۔
"اچھا اوکے اوکے۔۔۔ اب آگے بتائیں پھر کیا ہوا۔"
"وہ بولا گھر سے نہیں نکال رہا صرف دیکھ رہا ہوں کہ ایسا کون مائی کالال ہے جو ہمارے اپارٹمنٹ کے اندر تک گھس کر لڑکی کو اس طرح ہراساں کررہا ہے۔ میں اس کا جبڑا توڑ کے اس کے ہاتھ میں سجادوں گا اس کی جرات کہ۔" اس نے مکا تان لیا۔ گردن کی رگیں تک پھولنے لگیں۔
"نن۔ نا نہیں۔ وہ مائی کالال نہیں لالی ہے۔ میرا مطلب ہے وہ ایک لڑکی ہے۔ میرا مطلب ہے۔"
"آپ ایک لڑکی سے خوف زدہ ہیں اتنی بری طرح۔۔۔ مگر کیوں؟"
اب میں اسے کیا بتاتی کہ جس کی بہن ٹی وی کی مشہور و معروف ہستی ہو، جسے بڑے بڑے ڈیزائنر

محض پبلسٹی کے لیے اپنے سوٹ پہننے کو دے جاتے ہوں اور مجھ جیسی بہن اس کے کپڑے ہمیشہ اس کے پہننے سے پہلے سارے شہر میں پہن کر گھوم لے۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر جتنی بھی خوف زدہ ہو کم ہے۔"بات کرتے ہوئے بیا مگن تھی۔ اگر جو رک کر آئزہ کا چہرہ ایک بار دیکھ لیتی بس ایک بار۔

"وہ لڑکی نہیں ہے وہ۔"

"اچھا آپ تسلی سے یہاں بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔" تب مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی پیاسی تھی۔ اور دل کیسا بے قابو تھا۔ آواز لگا کر کہا۔

"اس میں گلوکوز بھی ملا دیں۔" وہ انرجائل ملا لایا۔"

"اچھا!" آئزہ نے پھٹ پڑنے کی حد تک کھلی آنکھوں کو رگڑا۔ "پھر گھر کیسے پہنچیں۔"

"پھوپھو کو کال کر کے صورت حال بتا کر۔ وہ بہانے سے تمہیں اپنے بیڈ روم میں لے گئیں۔ میں دبے قدموں اپنے کمرے میں گھس گئی۔ کپڑے بھی پریس کر کے ٹھکانے پہنچائے۔"

" پھوپھو آپ بھی؟" آئزہ کے دو حرفی سوال میں کیا کیا نہ تھا۔ مگر دھیان کسے تھا۔

"پھر دوبارہ اس باڈی بلڈر سے ملاقات ہوئی؟"

"روبرو تو نہیں ہوئی مگر ایک لحاظ سے ہر روز ہی ہوئی۔"

"یہ کیسی بات ہے؟"

"دراصل وہ ہو بہو میرے خوابوں کے شہزادے سے مشابہ ہے۔ سو کبھی دھیان کے پردے سے اوجھل ہوا ہی نہیں۔" بیا نے شاعرانہ مثال دی۔

"دھیان کی بچی۔ اپنی ماں کی خبر ہے۔ وہ یہ الزام بھی مجھ پر ڈال دیں گی۔" پھوپھو نے اس کاشانہ دبوچ کر اسے ہوش دلانے کے لیے آگے پیچھے ہلانے کی کوشش کی۔ مگر بیا کو ہلانا کوئی آسان کام تھا۔

"یہ میرے کپڑوں کا کیا قصہ ہے۔ تم لوگ میری غیر موجودگی میں میرے کپڑے جو کہ مجھے پبلسٹی کے لیے دیے جاتے تھے۔ انہیں پہن کر گھومتی ہو۔ گھر سے باہر۔ ہائے۔"

باڈی بلڈر کے خیالوں کے جھولے میں جھولتی بیا جیسے زمین پر گری۔ یعنی ہوش میں آئی۔ کیا کیا کہہ گئی۔ اس نے اچنبھے سے ایراد کو دیکھا۔ جو غیر محسوس طریقے سے اس کے کمرے میں جا رہی تھی پھر پھوپھو کو..... کئی کپڑے تو وہ بھی پہن چکی تھیں۔ اور پناہ کے لیے اپنے کمرے کے دروازے تک بھی پہنچ چکی تھیں۔

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا کپڑوں میں ایک نیاپن نہیں ہے، مگر.... ایراد.... میں تم لوگوں کو آج نہیں چھوڑوں گی۔"

آئزہ حلق کے بل چلانا شروع ہو گئی تھی۔



سینٹرل ٹیبل پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھا تھا۔ آستین چڑھا کر عین سامنے ابوذر بیٹھا تھا اور مٹھائی کھا رہا تھا مگر انداز کچھ یوں تھا جیسے جبراً" کھلائی جا رہی ہو کہ تم کو ہی ختم کرنا ہے۔ تیمور اور عاشر اس کے عین سامنے صوفے پر بیٹھے نجانے کتنی ہی دیر سے اس کی جبری مشقت دیکھ رہے تھے۔ جس کی حالت کی وجہ سمجھ سے بالاتر تھی۔ پوچھ پوچھ کر تھک بھی گئے۔ منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔ اور جب دونوں چپ ہو گئے تو..... بولنا شروع ہو گیا۔

"تم لوگوں کا دل نہیں چاہتا کہ تم لوگ بھی اسی طرح میری بات طے ہو جانے کی خوشی میں مٹھائی لاتے؟"

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور منہ سے ٹاخ کی آواز ایک ساتھ نکالتے ہوئے زور زور سے گردن بھی نفی میں ہلائی۔

"کم از کم اس طریقے سے تو نہ کھاتے۔ جیسے یہ احسان جتا کر کھا رہا ہے۔" عاشر نے دانت پیس کر کہا۔

"تم لوگوں کو میرے سہرے کے پھول کھلنے کا کوئی ارمان نہیں؟" دونوں نے نتھنے پھلا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور زور زور سے گردن نفی میں ہلائی۔

"اب سہرے کا رواج ہی نہ رہا۔ وی آر ویری پریکٹیکل۔"

ابوذر غم سے دہرا ہو گیا۔ ایک ہچکی لی اور پھر کھانستے

کھانستے دہرا ہونے لگا۔ تیمور نے پانی کا گلاس زوردار آواز سے شیشے کی میز پر رکھا۔ کچھ چھلک بھی گیا۔ ہچکی غم کی انتہا پر نہیں نکلی تھی۔ ثابت برفی نگلنے کی کوشش میں نکلی تھی۔

''اگر اس بلاوجہ کی اداکاری اور بسیار خوری سے ہٹ کر صاف بات کرلو تو شاید معاملہ حل ہو جائے۔'' عاشر بولا۔

''ہم دونوں نے ایک اسکول میں پڑھا۔ کالج بھی ایک۔ پھر یونیورسٹی بھی۔ ہر جگہ ساتھ ساتھ رہے۔ ایک دوسرے کے کپڑے، جوتے بدل بدل کر پہنے۔''

''ایکسوزمی۔'' عاشر نے انگلی اٹھائی۔ ''صرف تم نے پہنے میرے کپڑے، جوتے۔''

''ہاں ہاں میں نے۔'' ابوذر نے اختلاف سے گریز کیا۔

''تو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ زندگی کے اس نئے سفر کے آغاز میں۔ بھی میں تمہارے ہم قدم رہوں؟ ہم دونوں زندگی کے نئے سفر کا آغاز بھی اکٹھے کریں؟

''مگر شادی کے لیے تو ایک لڑکی کا ہونا ضرور ہوتا ہے۔'' عاشر نے گر کی بات کہی۔

''ہاں تو ہے ناں۔ وہ۔ بیا!'' آخر کار منہ سے نکل ہی گیا۔

''یہ بیا کون ہے؟'' دونوں بھائی ایک بار پھر ہونق ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''تم لوگوں کو بیا کا نہیں پتا۔'' ابوذر رو دینے کو ہو گیا۔

دونوں نفی میں سرہلانے لگے پھر یک دم تیمور چلّایا۔

''بیا۔''

''وہ میڈم آئرہ کی کزن۔'' (تیمور کے منہ پر ابھی بھابھی نہیں۔ چڑھا تھا)

''تو نے اسے غور سے دیکھا ہے ناں؟'' عاشر کو شک ہوا۔ ابوذر نے سرہلا دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے وہ چھپنے کی چیز بھی کب ہے۔ ایک بار نظر آجائے تو پھر کتنی ہی دیر تک نظر آتی ہی رہتی ہے۔''

''اور فقط ایک ہی ملاقات میں یہ اتنا متاثر ہو گیا کہ ایسی تباہی مچانے پر آگیا۔ افسوس صد افسوس۔'' تیمور نے دکھ سے مٹھائی کے ٹوکرے کو دیکھا۔

''ایک ملاقات کب۔۔۔ تیسری ملاقات۔''

''تیسری۔۔۔ کیسے بھلا۔ ایک تو وہ جب سب لوگوں کے ساتھ حیدر آباد گئی تب۔ اور دوسری بات طے ہونے والے دن۔''

''نہیں اس سے بھی پہلے۔ جب وہ یہاں گھر آئی تھی۔''

''گھر آئی تھی۔۔۔ کب آئی تھی۔؟'' دونوں چونکے۔

ابوذر شروع ہو گیا۔ وہ اس دن کا واقعہ جزئیات کے ساتھ بتا رہا تھا جب بیا نے آئرہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور وہ پناہ کی درخواست لے کر آئی تھی۔

''بس اس کی وہ ہراساں آنکھیں۔ باربار گھڑی دیکھنا پھر اٹھ کر کھڑکی سے جھانکنا۔ اضطراب سے ہاتھ مسلنا۔ جیسے میرے دل کے سارے دروازے کھلتے چلے گئے۔''

''مگر وہ کچھ۔ (عاشر نے موٹی کہنے سے گریز کیا) تھوڑی بھاری نہیں ہے۔''

''تھوڑی نہیں وہ کافی بھاری ہے مگر چلے گی۔ بالکل چلے گی مجھے ایسی ہی لڑکی درکار تھی۔'' وہ سردھن رہا تھا۔

''شادی تو ہم ایک ہی دن کریں گے۔ مگر دونوں دلہنوں میں اتنا فرق۔ ایک اتنی نازک اور ایک اتنی وزنی۔'' عاشر ہچکچایا۔

''کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' ابوذر کی ساری بے زاری اڑنچھو تھی۔ ''نازک عورت سراسر درد سر ہے۔'' عاشر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''اور وزنی عورت درد کندھا۔''

اس بار فلک شگاف قہقہہ تیمور نے لگایا۔ پھر تینوں ہنس پڑے۔



گھر بھر میں شادیانے بجنے لگے۔ عاشر کا بس چلتا تو

بس اگلے جمعے ہی کو تقریب سعید کا دن رکھ لیتا۔ مگر اماں جان نے بڑی بہو کی ڈلیوری سے مشروط کر دیا۔

عاشر شادی تک کے پیریڈ کو خوب انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ مگر آئرہ نے منع کر دیا وہ کسی بھی طرح نظروں میں آ کر لائیو کالرز کے منہ کھلوانا نہیں چاہتی تھی۔

"مگر ہم گھر پر مل سکتے ہیں۔" عاشر نے فرمائش جڑ دی۔

"تو ہم شادی کے بعد مل تو لیں گے نا۔" آئرہ نے بات ہی ختم کر دی۔

"میں چاہتا ہوں' ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہو۔ ہم ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کے بارے میں۔"

"اور اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے 'یعنی مزاجاً" بالکل الٹ نکلے تو کیا آپ رشتہ ختم کر لیں گے۔"

"ارے اللہ نہ کرے 'کیسی بات کرتی ہو۔"

عاشر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ دوسری جانب بیا کوئی شوبز کی بندی تو نہیں تھی کہ اس کے تحفظات ہوتے اور پھر ابوذر تو خوابوں کے شہزادے سے مشابہہ تھا اور اب تو مانو دل کی سلطنت کا آغا بن چکا تھا اور وہ جیسے کنیز... مگر جتنی نزاکت لفظ کنیز میں ہے' وہ اس کنیز میں کہاں۔

کہاں چار حرفی لفظ کنیز... اور کہاں چار جانب پھیلی بیا۔

وہ شادی تک کم از کم بیس کلو وزن کم کر لینا چاہتی تھی اور اس سے پہلے ابوذر کے سامنے آنا گوارا نہیں تھا۔

وہ سرخ جوڑے میں ایک ہی بار چلبلی نار بن کر سامنا چاہتی تھی۔

اور ان خود ساختہ پیش بندیوں نے عاشر اور ابوذر کے ارمانوں کا جنازہ نکال دیا تھا۔

ڈیڈی کی جانب سے اعتراضات کا ڈر بھی جاتا رہا۔ وہ ان رشتوں سے بے پناہ خوش تھے۔ ہر ایک کو بتاتے' کوکنگ شو والی لڑکی ان کی بہو ہے۔ اسے شاپنگ پر بھی لے کر گئے۔ عاشر نے ڈرائیونگ کی پیش کش کی تو چابی جھپٹ لی۔

"ہم دونوں کے بیچ تمہاری کوئی جگہ نہیں۔"

"انکل! مجھے بھی نہیں لے جائیں گے۔" بیا بولی۔

"تمہیں لے جاتا ہوں۔" ابوذر کے دل کی کلی کھلی۔

"کل شام کا ڈنر تمہارے ساتھ ہو گا۔" ڈیڈ نے بیا کا دل توڑنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

"کیا میرے لیے وقت نکالیں گے۔" ارادہ نے بھی لگے ہاتھوں پوچھ لیا۔

"بالکل نکالیں گے۔ لیکن اگر تمہیں زیادہ جلدی ہے تو عاشر' ابوذر' بمن کو لے کر جاؤ اور جو جو یہ کہے دلوا دینا۔"

گاڑی یہ جا وہ جا۔

عاشر اب ٹھنڈی چائے کے ساتھ پاپے کھاتے ہوئے دس از مائی کوکنگ ٹائم کا نشر مکرر رات گئے تک دیکھتا۔ جہاں آئرہ امتیاز کے ہاتھ کے پکوان...

"اف اللہ۔"

وہ شیشے کے دیدہ زیب باؤل میں دودھ دلاری سجاتی۔ بریانی کی تہیں جماتی اور اٹھاتی۔

جب دال کو بگھار لگاتی 'تب عاشر ایسے سانس کھینچتا جیسے خوشبو اندر اتر رہی ہو۔

پزا میں کٹ لگاتی اور کیک پر چاکلیٹ کون سے ڈیزائن بناتی۔

تب عاشر کو آئرہ پر ٹوٹ کر پیار آتا اور اس کی مہارت پر اور زیادہ۔

عنقریب یہ ذائقہ دار پکوان 'پکانے والی سمیت اس کی دسترس میں ہوں گے۔

وہ ٹھنڈا اکڑا نان پورا زور لگا کر چباتا۔

"پھر زندگی میں کوئی غم نہ ہو گا۔"

"میری بھی..." ابوذر ہانک لگاتا۔" بیا نے بتایا ہے مجھے اس کی امی نے سب کام سکھائے ہیں اسے۔"

"اس روز آئرہ بھابھی نے کتنے مزے کی پیسٹریاں بھیجی تھیں۔"

"ہاں نا۔۔۔"

دونوں پاس بیٹھے تیمور کو جیسے بھول ہی جاتے اور وہ دانت سختی سے جمائے۔ لب بھینچے دونوں کی گفتگو سن کر اس دیوار کو ڈھونڈتا، جس میں سر مار سکے۔

اس گھر پر اچھا وقت آنے والا تھا یا۔۔۔

وہ آگے سوچ نہ پاتا۔



پہلے شادی، پھر ہنی مون کے بعد دعوتیں وغیرہ۔۔۔ خوب لمبی چھٹیاں اختتام کو پہنچیں۔ اپنی اپنی ڈیوٹیز پر جانے سے قبل ڈیڈ نے کھیر پکوائی کی رسم کا اعلان کر کے سب خاندان کی ایک گرینڈ دعوت رکھ لی۔

اماں جان کا اصرار روایتی بناؤ سنگھار کا تھا۔ جبکہ ڈیڈ کی ساری دلچسپی پکوانوں پر تھی۔

آئرہ سمیت تمام اہل خانہ بھی حیران رہ گئے کہ نام کھیر پکوانے کا تھا اور ڈیڈ کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا، کیا نہ پکوالیں۔

زعفرانی مغزیات کی کھیر۔ بادامی قورمہ۔ مغزیات والا بکرے کے گوشت کا پلاؤ۔ لب شیریں۔۔۔ مسالا چکن۔۔۔ پائن ایپل فریش جوس۔

دعوت شان دار رہی۔ آئرہ کی اپنی ذاتی ہیلپرز بھی کچن میں ساتھ ساتھ موجود تھیں اور سب ہی پسینے سے تر بتر۔

دعوت میں آئے سارے لوگوں کا اشتیاق دیدنی تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی پروفیشنل کوکنگ ایکسپرٹ کے ہاتھ کا کھانا کھانا تھا۔

آئرہ نڈھال ہو گئی۔ اماں جان کو تو غش آگیا۔

ساری تقریب میں ذائقہ کی واہ واہ ہوتی رہی۔ خوب سلامی ملی۔ عاشر سینہ پھلائے گھومتا رہا۔ نذیر کچن سمیٹ سمیٹ کر ہلکان ہو رہا تھا۔

اور آئرہ کی حالت سب سے تباہ تھی۔ اس کی کمر تختہ تھی۔ آنکھیں نیند سے پھٹ جانے کو تھیں۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اف ایسا پہلے کبھی ہوا تھا جو آج۔۔۔



"کیسی خوش گوار صبح آج فلیٹ میں اتری تھی۔" عاشر نے گیلری میں آکر انگڑائیوں اور جمائیوں کے درمیان سوچا۔ کچن سے اٹھتی چائے کی مہک۔۔۔ اور دھیرے دھیرے گفتگو کرتی آئرہ۔ عاشر پراٹھا آملیٹ کے مزے دار ناشتے کا منتظر تھا۔ مگر چائے کے ساتھ ابلا انڈا، سنکے توس اور جیم، وہ بھی یوں کہ آئرہ سلائس پر جیم لگا لگا کر بڑھاتی جاتی تھی۔

انسان اس سے زیادہ کی خواہش کرے تو ناشکرا نہ کہلائے۔ عاشر نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ الحمدللہ میرے مالک۔

شادی کی چھٹیوں کے بعد آج دونوں ہی کو آفس جانا تھا۔ عاشر کے نکلتے نکلتے شو میں آئرہ کی ہیلپر کی حیثیت سے کام کرنے والی ماسیوں کا بھی فون آگیا۔ آئرہ نے ان سے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے عاشر کو خدا حافظ کہا۔ عاشر کے ٹیک کیئر کہنے پر اسے بھی یہی ہدایت کچھ اس ادا سے کی کہ عاشر نے سوچا۔ نوکری کو لات مار کے باقی زندگی زلف جاناں کے سائے میں گزارنا کیسا آئیڈیا ہے؟ مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

اتنے دنوں کی غیر حاضری نے کام کا بہت سا بوجھ لاد دیا تھا مگر عاشر نے صبح کے پہلے ہی گھنٹے میں کتنے ہی فون کر ڈالے۔

"یہی کہ کیا کر رہی ہو۔ اچھا سا ناشتا کر لینا۔ بور تو نہیں ہو رہیں۔"

"میں سو رہی ہوں عاشر۔۔۔ پلیز اب کال نہ کرنا، میں فون بند کر رہی ہوں۔ اچھی نیند لوں گی تو فریش نظر آؤں گی نا۔۔۔ اتنے دنوں کی ایبسنٹ کے بعد لوگ ویسے ہی ہر چیز کو نوٹ کریں گے، میں نہیں چاہتی کہ۔۔۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ تم سو جاؤ، مگر یہ بتا دو پہن کیا رہی ہو؟"

"ابھی کچھ نہیں پتا دیکھ لینا نا۔" اس کی بڑی سی جمائی عاشر کے کانوں میں گونجی تو اسے اس جمائی پر بھی پیار آگیا۔

دن میں اس کا پورا ارادہ تھا کہ وہ آفس کا ٹی وی آن کر کے آئرہ کو دیکھے گا ضرور، مگر ایسا میٹنگز میں پھنسا کہ ہر

شے بھول گیا۔

شام آفس سے واپسی پر سیڑھیوں ہی سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا جب گنگنا رہا تھا تو اس بات سے بے خبر تھا کہ کئی لوگوں نے اسے معنی خیزی سے دیکھا تھا۔ نئی نویلی دلہن پہچانی جاتی ہے تو دولہے بھی کہاں چھپ پاتے ہیں۔

زیر لب مسکراتے، گنگناتے، کچھ کچھ بونگے سے لگتے نوجوان اگر آپ کو بھی کہیں ارد گرد نظر آئیں تو جان لیں کہ مرغا ابھی نیا نیا پھنسا ہے۔ ہی ہی ہی۔



پہلا جھٹکا جیب میں ہاتھ ڈالنے پر لگا۔ ارے صبح چابی لے جانا تو بھول ہی گیا۔ (کہاں تو یہ ارادہ تھا چپکے سے دبے قدموں اندر جا کر بجی سنوری منتظر بیگم کو ہاؤ کہے گا اور جب وہ سہم کر اس سے لپٹ جائے گی تب کہے گا "ارے یہ تو میں ہوں۔" مگر حسرت ان غنچوں پہ....)

سوچ ادھورے مصرعے پر ہی رک گئی اور انگلی بیل پر رکھ دی۔

مگر یہ کیا! کہاں تو بیل کو دھیرے سے چھوا تھا اور کہاں پورا ہاتھ جما دیا۔ مگر دروازہ کھل کر نہ دیا۔ ہاں سامنے دروازے سے ارداد کا مسکراتا چہرہ نمودار ہو گیا۔

"ہیلو عاشر بھائی.... آفس سے آ گئے؟"

"او ہیلو.... ہاں آ گیا۔" اس کے چہرے پر کچھ حواس باختگی تھی۔ "یہ آئرہ دروازہ نہیں کھول رہی۔ خیر.... خیریت ہے نا، میں فون ملا رہا ہوں تو بند جا رہا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات.... وہ آفس سے آ کر سوتی ہیں نا اور فون بند کر دیتی ہیں۔" ارداد نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں.... مگر...." عاشر کی سانس بحال ہوئی۔ "وہ بھی سوا سات بج رہے ہیں۔"

"ہاں تو کیا.... گھنٹے تک اٹھ جائیں گی۔ آپ اندر آ جائیں۔ میں نے چائے کے ساتھ پکوڑے بنائے ہیں۔ دراصل مجھے صرف پکوڑے ہی بنانے آتے ہیں۔ وہ بھی اس لیے کہ نا تو انہیں بیلنا پڑتا ہے، نہ گول کرنا پڑتا ہے۔ بس چمچے سے پکڑ کر تیل میں ڈالتے جاؤ، سمپل ہے۔"

چائے مزے دار تھی اور پکوڑے بہت بڑے بھی تھے اور چورے کی شکل میں بھی.... مگر ذائقہ دار تھے۔ عاشر کا ارادہ تو پیٹ بھرنے کا تھا۔ مگر پھر ڈنر کے وقت آئرہ برا نہ مانتی کہ شادی کے بعد کا پہلا ڈنر.... اور وہ پکوڑے کھا بیٹھا۔

"نہیں بس۔"

"ارے کیوں؟ لیں نا.... بھوکے پیٹ نیند کب آتی ہے۔"

عاشر کے جواب سے پہلے اپنے گھر کی بیل بجنے کی آواز آئی۔ پھر ساتھ چابیوں کی آواز اور دروازہ کھل گیا۔ یہ تیمور تھا۔ تھکا ماندہ.... شو کا ٹائم تو مخصوص تھا۔ لیکن اگلے دنوں کی تیاری کے لیے اسٹاف کو رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ عاشر گھر کی جانب تیزی سے آیا۔

تیمور واش روم میں گھس گیا تھا۔ عاشر بیڈ روم میں آ گیا۔ اے سی کی کولنگ، گرے پردے، نائٹ بلب کی روشنی.... کیا خوابیدہ خوابیدہ ماحول تھا۔

کہاں تو وہ نک سک سے درست بیوی کا سراپا سجا کر آیا تھا اور کہاں.... مگر اس پر بھی پیار آیا۔ مگر یہ پیار تشویش میں بدل گیا۔ جب آئرہ کو اٹھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔

"مجھے بھوک لگی ہے آئرہ! بے حد و بے حساب، پلیز اٹھو نا، ڈنر اکٹھے ہی کریں گے، کیا بنایا ہے تم نے؟"

"میں نے بنایا، کچھ بھی نہیں، میں تو سو گئی تھی۔ آفس سے آ کر سو جاتی ہوں۔"

"تو کھانا کب کھاتی ہو؟"

"رات کو میں ہیوی کھاتی ہی نہیں، بلکہ چھ بجے کے بعد کچھ بھی نہیں کھاتی، بہت ہوا تو فروٹ لے لیا۔ آپ بھی لے لیں۔" آئرہ کی آنکھیں اب تک نیند سے مندھی ہوئی تھیں۔ جبکہ عاشر کی پھٹ پڑنے کو تھیں۔

"تو کھانا.... کھانے کا کیا ہوگا، آئی مین ابھی ڈنر...."

بوکھلاہٹ میں جملے تک اٹک رہے تھے۔
"کوئی ڈیل منگوالیں' یا بریانی وغیرہ۔"
"تو وہ تو آج کا مسئلہ حل ہو گا نا' تو پھر کل... کھانا کون بنائے گا۔"
"ہاں نا... تو وہ بات۔ میرا مطلب ہے یہ بات تو میں آپ سے کرنا چاہ رہی تھی۔ کسی کھانا بنانے والی کا بندوبست کریں نا' ڈھونڈیے کوئی۔"
"کیا۔" عاشر کے سر پر چھت گری گویا۔
"تو... تم کھانا نہیں بناؤ گی میرے لیے... اپنے ہاتھوں سے۔ پیار سے محبت سے۔" آئرہ نے اب اس کے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ کو شاید سنا۔
"بناؤں گی نا... ایوری سٹرڈے' سنڈے۔" اس نے کسی بچے کو پچکارنے کے سے انداز میں عاشر کی ٹھوڑی کو چھوا۔
"تو باقی دن کیا کرو گی۔ تب کون بنائے گا۔ تم کیوں نہ بناؤ گی؟"
"تو باقی دن تو میں چینل پر کوکنگ کرتی تو ہوں نا۔ پہلے دو آئٹمز بنانے ہوتے تھے۔ اب ویورز کی خواہش ہوتی' دو گھنٹے میں' میں کوئی دسیوں چیزیں سکھا دوں۔ آج بھی چار آئٹمز تھے۔ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہی وں کک کا بندوبست کرلیں۔"
"یار! دوپہر کو بنالیا کرو۔" عاشر کو خیال سوجھا۔
"دوپہر کو تو میں پروگرام کی پری پریکٹس کرتی ہوں۔ وہ تو اتنا ٹف ٹائم ہوتا ہے کہ کچھ ہوش نہیں رہتا۔"
"تو ان دو لوں۔ کو بلوالو جو تمہاری ہیلپرز ہیں۔ تمہارے ساتھ شو میں جاتی ہیں' بی ہائنڈ دی کیمرہ۔ (کیمرے کے پیچھے)"
"انہیں کیسے بلوالوں... وہ بھی تقریباً" صبح سے میرے ساتھ ہوتی ہیں' انہیں اپنے گھر جا کر ہانڈی روٹی نہیں کرنی کیا۔" اس نے کچھ ڈپٹ کر پوچھا تھا۔
عاشر کے تو الفاظ ہی گم ہو گئے۔
"یار! ابھی تو کچھ کرو نا' سچ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ تب ہی ایک خوشبو کا احساس ہوا۔ سانس کھینچ کر محسوس کرنے کی کوشش کی' تو آئرہ نے جستجو کو جان کر اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے ہاتھ سے کھینچ کر چہرے کے سامنے کردیں۔
"میں نے مہندی لگوائی ہے۔"
عاشر کو بڑی خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹیوب لائٹس آن کردیں۔ گورے بے داغ نازک ہاتھوں پر سرخ بیل بوٹے اور ڈھکی ہوئی پوریں کیا خوب بہار دکھا رہی تھیں۔
"سب کہنے لگے' شادی کے بعد پہلا شو ہے۔ تھوڑا سا چینج تو ہونا چاہیے۔" اس نے وجہ بھی بتا دی۔
"تم نے پہنا کیا تھا؟" عاشر نے پوچھنے کے ساتھ ہی اسے بغور دیکھا۔
سیاہ ڈھیلے پلازو پر سفید ڈھیلا کرتا... دھلا دھلایا چہرہ۔ کہاں وہ سولہ سنگار کا سجا سراپا سوچتا آیا تھا۔
"ریکارڈڈ پروگرام میں دیکھ لیجئے گا نا۔" آئرہ کو ایک اور جمائی آئی۔
"مجھے بھوک لگی ہے آئرہ... پلیز ابھی تو کچھ کرو' بلکہ تیمور بھی آگیا ہے اور بھوک کا وہ بھی بہت کچا ہے۔"
"تیمور نے تو وہیں آفس میں کھالیا تھا۔ میں جو کچھ پکاتی ہوں' وہاں سب ہی لوگ تو کھاتے ہیں۔ آج تو ویسے بھی نہاری تھی۔ ڈھیروں نان باہر سے منگوالیے تھے۔"
"مجھ سے اچھا تو تیمور رہا۔" عاشر کا لہجہ حسرت زدہ ہو گیا۔ "یار! تم میرے لیے بھی لے آتیں۔"
"مائی گاڈ! شرم نہ آتی۔" آئرہ شرمندہ ہوئی سوچ کر ہی۔
"پر اب کیا کروں' بھوک لگی ہے۔"
"آپ سیب کیوں نہیں کھالیتے' یا پھر نوڈلز۔"
"مجھے ڈنر کرنا ہے آئرہ۔" عاشر کیسے سمجھاتا۔
"ہاں تو کیا ڈنر... رات کو ویسے ہی لائٹ کھانا کھاتے ہیں۔"
"تمہارے کھانوں کے اشتیاق میں دوپہر کو لنچ بھی

گول کیا۔ ارادکے پکوڑے بھی ٹھکرادیے‘اب....“
”پھوپھو سے نہ مانگ لوں ایک پلیٹ.... آپ کے لیے۔“
”نہ.... نہ یہ تو نہ کرو.... شرم نہ آئے گی۔“
”سینڈوچ بنادوں؟“ آخر آئزہ کو اندازہ ہوا کہ اسے کچھ بنانا ہی پڑے گا۔
”جب بنانے ہی لگی ہو تو کوئی کام کی چیز بنادو یار.... چکن یا قیمہ‘ یا چاول‘ چائنیز رائس بنادو۔“
”آپ کو پتا ہے‘ چائنیز رائس کی پری پریشن میں کتنا وقت لگتا ہے۔“ آئزہ کی آنکھیں پھیلیں۔
”اسکرین پر تو آدھے گھنٹے میں بن جاتے ہیں۔“
”وہ اسکرین ہوتی ہے جناب.... جہاں سب اچھا نظر آتا ہے۔“
”صحیح کہتی ہو۔“ عاشر نے تسلیم کر ہی لیا۔
”چلو چھوڑو.... کچھ بھی بنادو۔“ عاشر کمرے سے باہر نکلا اور تیمور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بڑے سے ڈونگے میں نوڈلز بھر کے کھا رہا تھا۔
عاشر کے چہرے کی ساری داستان کو پل بھر میں پڑھ لیا۔ پھر پیالہ نیچے رکھا۔ کچن سے ایک اتنا ہی بڑا تیار پیالہ بھائی کو بصد احترام پیش کیا۔
”میں نے بنایا تھا پہلے ہی.... آپ کے لیے۔“
(دراصل تیمور کو تو پتا تھی نا آف اسکرین والی بات۔)

☆ ☆ ☆

اور آف اسکرین والی بات۔
ہائے....
تیمور نے جو آئزہ کا ہونے والی بھابھی.... سن کر سر ہاتھوں پر گرایا تھا۔ وہ بلاوجہ تھوڑی تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ فطرتاً‘ ’عادتاً‘ ’مزاجاً‘ کیسی تھی۔ اس سے تیمور کو بھلا کیا غرض‘ مگر جو ایک مجموعی تاثر کیمرہ آف ہوتے ہی اس کا پیش ہوتا تھا۔ وہ تیمور ہی کو کیا ساری ٹیم کو سر پیٹ لینے پر مجبور کردیتا تھا۔
نت نئے پکوان بنانا‘ تجربے کرنا اس کا شوق تھا۔ کچھ قدرتی خوبی‘ کچھ اس نے سیکھ کر مہارت حاصل کی اور پھر اب جب پروفیشن بن گیا‘ تب تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوگئی جیسے۔
ایک سے ایک تجربہ کار مرد و زن شیف موجود تھے۔ جن کی مہارت اور ذائقہ انمول تھا۔ ہر ایک کی اسپیشلٹی.... مگر آئزہ امتیاز کے اپنے ہی انداز تھے۔ شخصیت کے بھی اور پکانے کے بھی۔
مگر اس سب سے پرے.... آئزہ کے دیگر کام بھی سب سے الگ تھے۔
چینل کی طرف سے ہر شیف کو ہر قسم کی فل ہیلپ میسر ہوتی تھی۔ بہترین بجٹ کے ساتھ ہر ریکوائرمنٹ پوری کی جاتی۔ پھر اسپانسر کی جانب سے ملنے والی فیسیلیٹیز‘ اسی طرح کوکنگ کرتے ہوئے ہیلپرز بھی مہیا کیے جاتے۔ اکثر شیف اپنی پسند کے اپنے ذاتی ملازم ہمراہ رکھتے۔
آئزہ کے پاس آفس کے ملازمین کے علاوہ اپنی دو ذاتی ملازمائیں بھی تھیں۔
شروع میں تو تیمور کے لیے ہر چیز نئی تھی۔ مگر پھر جب کچھ دن گزرے۔ تب اسے احساس ہوا کہ ان کی شیف کی ادائیاں اور ڈیمانڈز سب سے جدا ہیں۔
دراصل آئزہ وہی جوان تھی‘ جس کے بارے میں بڑے بزرگ کہہ گئے ہیں۔
”کام کرنا جوان کی موت ہے۔“
ٹی وی پر ڈیڑھ سے دو گھنٹوں میں پک جانے والے طرح طرح کے سادہ یا پھر بہت مشکل کھانے‘ ان کی آف اسکرین تیاریوں میں صبح سے لگنا پڑتا۔ خریدنے سے لے کر کٹنگ ٹیبل پر آنے تک۔
اور آئزہ کو صرف مطلوبہ سامان کی لسٹ دینی ہوتی۔ وہ خدا کی بندی وہ بھی خود نہ لکھ کر دیتی۔ صوفے میں دھنس کر لکھواتی جاتی۔ کٹواتی جاتی پھر لکھواتی جاتی۔ پروگرام کی ہر نوک پلک کے حوالے سے بہت پکی ہوتی۔ مگر کسی چیز کو ٹچ نہ کرتی۔ بس حکم صادر کرتی۔
چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی کٹائی دھلائی ناپ تول سب پہلے سے کرنی ہوتی تھی۔ تاکہ پروگرام میں وقت ضائع ہونے سے بچے اور یہ ایک

اصول بھی تھا۔ ہر کوکنگ شو کی تیاری ان ہی مراحل سے گزرتی تھی۔ مگر وہاں شو کا شیف پوری انوالامنٹ رکھتا۔ ہیلپرز کی موجودگی کے باوجود خود آگے بڑھ بڑھ کر کام کرتے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ بس ایک آئرہ تھی جو کلو بھر وزن بھی نہ اٹھا سکتی۔

بس ساری پھرتی کیمرہ آن ہوتے عود کر آتی اور کیمرہ آف ہوتے ہی ہاتھ یوں ڈھیلے کر دیتی کہ جیسے کیمرہ کا اور اس کا آن آف کا سوئچ ایک ہی ہو۔

اس بے حد لاپرواہانہ روش کے باوجود شو قسمت سے ہی نمبرون چل رہا تھا اور یہ چیز آئرہ کے نخروں اور ڈھیلے پن کو مزید بڑھاوا دیتی۔

نزاکت کا عالم یہ تھا کہ حلیم بناتے وقت جب آن اسکرین ڈوئی گھمانا پڑی۔ تب کیمرہ آف ہوتے ہی کلائی پکڑ کے ہائے ہائے کرنی شروع کر دی۔ ڈوئی گھمانے کا باقی کام ایک ہٹے کٹے لائٹ مین سے لیا۔

پروگرام ختم ہوا تو..... آئرہ امتیاز آیوڈیکس کی مالش کروا کے پٹ پلیٹ کے گھر کو نکلیں۔

ہری مرچیں تو کاٹتی ہی نہ تھی کہ بعد میں ہاتھ اور انگلیاں جلتی ہیں۔ "اگر کاٹوں گی تو گلوز پہن کر....."

اس نے ڈائریکٹر کے ٹوکنے پر کہا۔

"نہیں، نہیں ویورز کو ہضم نہیں ہو گا۔ بہت آرٹی فیشل لک آئے گی' ناٹ نیچرل۔" وہ بولا۔

ہری پتوں والی سبزی نہ کاٹتی کہ ہاتھ سبز کے بعد کالے ہو جاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے شیف کٹنگ بورڈ پر بڑی مہارت سے چوپنگ کا کام کرتے تھے۔ اس بے حد نان پروفیشنل رویے کے باوجود وہ پروفیشنلی بہت کامیاب تھی اور اسے یقیناً "قسمت ہی کہا جا سکتا تھا۔

وہ ببانگ دہل کہتی "کوکنگ اس کا پیشن ہے' شوق ہے۔" تجربات اسے بھاتے اور مزید کی جستجو رہتی ہے۔

تب سننے والے سراہتی نگاہوں سے سر دھنتے۔

اور ٹیم ممبر ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ جاتے کہ بولیں تو کیا بولیں۔

دوسری طرف یہی پیشن (شوق) جب اپنے گھر کے باورچی خانے میں آتا تب صورت حال الٹ ہو جاتی۔ وہ اپنے شو کے لیے تو صبح دس بجے سے گھر سے تیاری شروع کر کے ادھ پکے' کھانوں کو بصد شوق پیک کرتی۔ (ملازماؤں سے کروالیتی۔) مگر شو سے واپسی پر گدھے گھوڑے بیچ کر بے سدھ ہو جاتی۔ جب رات گئے فریش ہو کر اٹھتی' تو فریج سے ٹٹول کر کچھ بھی کھا لیتی۔ یوں بھی رات دیر سے کھانا کھانا صحت کے لیے کب درست ہوتا ہے۔

اور اسے گھر میں کوکنگ کرنے کو کوئی کہتا بھی نہیں تھا۔ روٹین کے کاموں کے لیے ماسی آتی۔ روٹیاں بھی ڈال جاتی۔ سالن شاہی پھوپھو بہت شوق سے بنایا کرتیں۔ بس ایک ایراد تھی جو اس سے فرمائش کر کے، ضد کر کے بلکہ دھونس جما کر نت نئے پکوان بنواتی اور کھاتی اور ایک نہ چلنے دیتی۔ یہ کبھی بنا دیتی' کبھی ٹال جاتی۔ تب ایراد فون کر کے ممی' پاپا کو شکایتیں لگاتی۔

"چھوٹی بہن کو بھوکا مارے گی' آپ کی کوکنگ ایکسپرٹ بیٹی میں نے لکھ رکھی ہے اپنی وصیت۔ وقت پر کھانا نہ ملنے کی وجہ سے میں مری ہوں۔

ایراد امتیاز۔

آئرہ امتیاز کی چھوٹی بہن..... آگے آئرہ کا تفصیلی تعارف۔

مرنے سے پہلے نیٹ پر یہ پیغام چھوڑ جاؤں گی' ہاں....."

تب دانت کچکچاتی آئرہ کو ہر وہ شے اسے بنا کر دینی ہی ہوتی' جو بھی اس نے شو میں بنائی ہوتی۔

مگر ایراد کے اس لاڈ یا دھونس سے پرے اب یہ شادی شدہ عملی زندگی تھی۔ جہاں عاشر کی بہت سی امیدیں تھیں اور کچھ دنوں کے ناز نخروں' حیلوں' بہانوں کے بعد آئرہ کو اندازہ ہو گیا کہ جان بخشی ممکن نہیں۔ اسے کچھ نہ سہی' عاشر کے کھانے پینے کی ذمہ داری لینی ہی ہو گی کہ وہ بھی اماں جان کی طرح سالن کم از کم اپنے ہاتھوں سے ضرور ہی بنائے اور یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ آخر کو وہ ایک شیف ہے۔

"تو کیا آپ نے مجھ سے اس لیے شادی کی کہ میں

ایک شیف تھی۔" آئرہ کے دل کو دھچکا لگا۔ "آپ نے مجھ سے 'میرے وجود سے 'میری شخصیت سے' میرے...."

"باس.... بس...." اس کی میں' میں' نے عاشر کو بوکھلا دیا کہ آنکھیں بھی ساتھ ہی بھر آئی تھیں۔

"ارے یار! ہم زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے' وہ تو بعد میں پتا چلا کہ حسن کے اس فل پیکج کے ساتھ کچھ دل فریب آفرز بھی موجود ہیں۔ جیسے کہ...." اس نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "چلو ایک آفر شیف ہونے کی بھی ایڈ کرلو۔" ذرا بے نیازی سے کہا۔

"مگر مرد' عورت کو چولہے ہانڈی ہی لگا کیوں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا یہ چاہیں کہ گھر آئیں تو بیوی گلی کے کھمبے کی بی ایم ٹی ٹھیک کررہی ہو۔ کے الیس سی کی گاڑی سے نکلی سیڑھی پر چڑھی۔" عاشر کے جواب نے آئرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلا دیں۔ جو جملے کے اختتام پر زور سے ہنس دیا تھا۔

"مرد ہمیشہ باتوں ہی سے چلاتے ہیں۔"

"عورت چلتی ہی باتوں سے ہے۔" عاشر نے محبت سے کہا۔ "میری جان! ایک فقط رات کے کھانے کا سوال ہے 'تمہارے ہاتھوں بنے۔ لاجواب ذائقے دار سالن اور تازہ پھلکے.... غریب اس سے زیادہ چاہتا ہی کیا ہے۔"

"یہ غریب ہے۔" آئرہ نے تیار شیار ڈیشنگ سے عاشر کو سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔

"صرف غریب کیوں.... بھوکا بھی ہے۔" اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"مگر مجھے پھلکے بنانے نہیں آتے۔" آئرہ نے ایک بڑا مسئلہ بتایا۔

"کیا....!" عاشر کی چیخ نکل گئی۔ "یار! پھلکے تو تیرہ چودہ برس کی بچیاں بھی اتار لیتی ہیں۔"

"بس میری یہی ایک کمزوری ہے۔ آتے ہی نہیں لاکھ کوشش کروں۔" آئرہ نے صاف انکار کیا۔

اور آنے والے دنوں میں عاشر پر ایک اور نیا مگر بے حد عجیب انکشاف ہوا۔

آئرہ چولہے کی اونچی لپٹوں پر فرائی پین کو اچھال اچھال کر پھلیاں فرائی کرسکتی تھی۔ کڑاہی کے اندر آگ لگا کر تھائی اسٹائل میں کھانا سرو کرسکتی تھی۔

بہترین پزا اور بیکری آئٹم بنا سکتی تھی۔

اعلا ترین انٹرنیشنل ڈیزرٹ۔

مگر.... مگر....

ایک خالص گھریلو ذائقہ کا آلو گوشت اس سے بنتا ہی نہ تھا۔

براؤن پکوڑے تو بنالیے' مگر پالک پیاز کے وہ سادہ پکوڑے جو عورتیں جھٹ پٹ تیار کرلیتی ہیں۔ آئرہ سے وہ ذائقہ نکل ہی نہ پاتا۔

دنیا کے ہر طرح کے سیلیڈ بنانے میں وہ ماہر تھی۔ مگر سادہ ٹماٹر' پیاز' ہری مرچ کا کچومر سلاد نہ بناتی کہ نام ہی سے دل کو کچھ ہوتا ہے۔

"کچووومر.... اوں ہوں...."

اس سے بگھار والی مونگ کی کھچڑی بھی نہ بنتی۔

عاشر کے پسندیدہ گڑ کے چاول بھی نہ بنا سکی۔

ہاں مشکل ناموں والی بھاری بجٹ کی جو شے مرضی بنوالو.... اس کے ذائقے اور مہارت میں کوئی شک نہیں۔

مگر خدا کے بندوں.... روز.... روز یعنی کہ دن میں تین بار تو انسان فل پروفیشنل ٹچ کے مشکل ناموں والے ہیوی کھانے تو نہیں کھا سکتا نا۔ آخر اسے زندہ رہنے کے لیے دال چاول بھی تو کھانے ہوتے ہیں نا' ہیں کہ نہیں۔

اور پھلکے بھی....

ہائے ہائے.... اسے کہتے ہیں حسرت ان غنچوں پہ.... یا چراغ تلے اندھیرا یا.... جیسے کہ ایک دن....

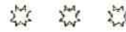
عاشر نے شدید گرمی سے آکر **سکنجبین** کی فرمائش کردی۔ کوئی زمانے گزرنے کے بعد آئرہ برآمد ہوئی۔ بہت خوب صورت چوکور پلیٹ میں وائن گلاس رکھا تھا۔ جس میں یقیناً "**سکنجبین** تھی۔ گلاس کے سرے پر لیموں کی باریک گول قاش اٹکا دی تھی۔ ایک

چھوٹی سی چھتری بھی ساتھ کھڑی تھی۔
ذائقہ بھی بہت اچھا تھا۔ پیاس سے اتاؤلے ہوتے عاشر نے لیموں کی قاش اور چھتری کو تیزی سے اتار کر پلیٹ میں رکھا اور ایک ہی سانس میں گلاس حلق سے اتار کر مزید کے لیے ہاتھ آگے کیا۔
"کیا...؟" آئزہ نہ سمجھی۔
"سکنجبین یار...."
"مگر وہ تو ایک ہی گلاس بنائی تھی۔" آئزہ نے معصومیت سے شوہر کو دیکھا۔
جگ کو منہ لگا کر ایک ہی سانس میں ڈکار جانے والے عاشر کو جھٹکا لگا۔ حلق کے بل چیخا۔
"کیا.... آآآ...." گونج نے آئزہ کے دل کو دہلا دیا۔
اچھا خاصا شوہر کبھی کبھار وہ لگتا.... وہی نا.... وہ جو کہتے ہیں۔ وہی.... ڈنگر.... ہاں ڈنگر ہی تو کہتے ہیں۔
آئزہ نے دونوں ہاتھوں کو سر پر گرائے عاشر کو دیکھتے ہوئے دقتوں سے موزوں خطاب سوچا تھا۔



بیا بڑے دنوں بعد آئی تھی۔ آج زمانوں بعد شاہی پھوپھو کے گھر سے اونچا جناتی میوزک اُبھرا تھا۔ اتنے عرصے بعد مل بیٹھنے کے لیے یہ تینوں بھی کامن میں آگئے کہ رت جگا کریں گے۔ بھلے سے اپنے گھر کے کامن میں بیٹھتے یا شاہی پھوپھو کے.... مگر اس وقت عاشر اور ابوذر حیران رہ گئے۔ بیا نے گرلز نائٹ میں ان کا داخلہ ممنوع کیا اور آئزہ محفل سجانے کے بجائے اپنا تکیہ اٹھا کر دروازہ پار کر گئی۔ یہ ارے ارے کرتے رہ گئے۔
"بیچلر لائف کی یادیں انجوائے کریں۔" اس نے انگوٹھا دکھاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔
"آپ بھی کریں انجوائے.... اپنی یادیں۔"
"ہوں.... وہ کون سی سہانی یادیں تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک مشکل۔"
"یار! تیری بیوی میری بیوی کو بھی ورغلا کر لے گئی۔" عاشر ابوذر پر چڑھ دوڑا۔
"تو یہ بھی ناشکری کی ایک صورت.... میں تو کہتا ہوں میری والی کو کوئی ایسا ورغلائے کہ واپسی کا خیال ہی بھول جائے.... یہ آزادی تو بس رات بھر کی ہے۔"
"اتنی جلدی.... تیمور اچھل پڑا۔" ایسے جملے گیارہ بچوں اور بائیس سالوں کے بعد کہے جاتے ہیں اور تو ابھی سے...."
"اور یہ بھوکوں کی طرح ہمارا فریج کیا ٹٹول رہا ہے۔" تیمور نے اسے مسلسل فریج کے اندر سر دیے ہوئے دیکھ کر اچنبھے سے سوال بدل دیا۔ "اب تو، تو شادی شدہ گھر بار والا ہے۔"
"ابے شادی کا نام نہ لے۔" ابوذر دھاڑ سے دروازہ بند کر کے پلٹا، جیسے کہ تڑپا۔ "شادی نے تو بھوکوں مار دیا یار!"
"تجھے بھی؟" عاشر نے اچھل کر بے ساختہ پوچھا۔
"کیا مطلب تجھے بھی، تم لوگ تو خوش قسمت ہو، آئزہ بھابھی جیسی خاتون...."
عاشر اور تیمور ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔
ہماری خوش قسمتی بتانے کا پیرا میٹر ہمیشہ دوسروں ہی کے ہاتھوں کیوں ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں پتا چلتا رہتا ہے۔ وقتاً فوقتاً کہ ہم خوش قسمت ہیں۔ خود سے بدقسمتی کا بتائیں تو لوگ یقین نہیں کرتے۔ ناشکرے ہونے کا خطاب دے دیتے ہیں۔ ارے ہے کوئی جو دل کے اندر جھانکے اور وہاں سے اٹھتی درد کی پکاروں کو سنے۔ عاشر اور تیمور کی سوچ یکساں تھی۔ ہاتھ دل پر دھرے تھے۔
"ویسے واقعی شادی کے چند مہینے اور یہ انداز.... ہوا کیا ہے؟" عاشر نے پوچھا۔ "تم تو ایسے ایکسائٹڈ تھے کہ جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔"
"یار! لوگ صحیح کہتے ہیں شادی سے پہلے کچھ ملاقاتیں اور باتیں مزاج آشنائی کے لیے ہو ہی جانی چاہئیں۔" ابوذر کسٹرڈ کا پورا ڈونگا لے کر بیٹھ گیا اور یہ بھاڑ سا بڑا منہ کھول کر ڈونگے ہی کے چمچے سے یوں کھانے لگا۔ جیسے غم غلط کر رہا ہو۔
(سارا ہی کھا جائے گا سالا.... عاشر نے سوچا.... دکھی

داستان سننے کی قیمت ایک ڈونگا۔)



سب سے پہلا تو اسے بیا کا وہ سہما سہما' ہراساں انداز ہی بھا گیا۔ وہ جس طرح اپنے کسی دشمن کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھی اور ملتجی نگاہوں سے اس سے مدد کی طالب تھی۔ یہ احساس برتری مردانگی کو جلا دینے والا تھا۔ پھر جب ذرا سا وہ اپنے خوف سے ابھری اور پُرسکون ہو کر بیٹھی۔ تب ابوذر پر اس کے سوہنے چہرے کی خوب صورتی پوری طرح واضح ہو گئی۔ ایک دوسرے میں پیوست اس کی انگلیاں گداز اور دلنشین تھیں۔

بے داغ ملائم گداز... مکھن سے بنے یا موم سے... یا پھر...

مکھن یا موم...

کوئی ہفتہ دس دن ہاتھوں نے بے چین رکھا۔ پھر اس کے بعد چہرہ اور پھر وہی ہراساں آنکھیں... لو جی... ابوذر صاحب کی ہمت جواب دے گئی۔

اپنی اماں کو فون کھڑکایا۔ بات آگے بڑھی تو اماں نے واحد اعتراض لڑکی کے بھاری ہونے کا کیا۔ تب ابوذر نے بھاری پن کو بھی ایک پلس پوائنٹ کہہ دیا۔ اماں کو کیا اعتراض...

دراصل ابوذر سے اندازے اور قیافے کی بڑی غلطی ہوئی۔

کچھ دوستوں کے تجربات' کچھ آنکھوں دیکھی کے باعث اور گردوپیش کی سنی سنائی باتوں کے زیر اثر بھاری بیوی سراسر فائدے کا سودا تھی' لیکن...

دبلی پتلی چھریری نظر آنے والی بیوی ساری زندگی ڈائٹ کانشس رہتی ہے۔ سونگھ سونگھ کر کھاتی ہے اور کھلاتی ہے۔ (ایک دوست کا قطعی فیصلہ...)

وہ شوہر بھی اپنے ہی جیسے وزن اور جسم کا چاہتی ہے اور ذرا سی بھی چربی چڑھ جائے تو برداشت نہیں کرتی۔ اتروانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگوا دیتی ہے۔ کھانا بند کر دیتی ہے اور بعض تو ناکامی کی صورت میں چھری پکڑ کر خود ہی اس بڑھے گوشت کو اتارنے کی خواہش کا اظہار کر دیتی ہیں۔

چونکہ اسمارٹ ہوتی ہیں' سلم ہوتی ہیں تو ہر آنے والے نئے فیشن کو با آسانی اپنا لیتی ہیں اور اس مقصد کے لیے میاں کی جیب کا کباڑہ کرنے کے لیے کسی بھی بوتیک میں گھس جاتی ہیں۔

اچھے فگر اور لباس کے بعد ریگولری بیوٹی ٹریٹمنٹ کے لیے پارلر کا خرچا گھر کا بجٹ بناتے ہوئے سب سے اوپر رکھتی ہیں۔

اگر کبھی بھی ذرا سا بھی ویٹ بڑھنے کا شک ہو جائے تو فوراً "سلمنگ سینٹر" جوائن کرتی ہیں' یا پھر واک پر صبح بھی اور رات کو بھی... اور بھلے سے سارا دن واک کرتی رہیں' مگر شوہر کو ساتھ کیوں گھسیٹتی ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر ڈائٹ کانشس خواتین کا کچن بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ جہاں گھی نہیں ہوتا۔ چاول نہیں ہوتے' آلو نہیں آتے' تلی ہوئی چیزیں' پائے' نہاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (کہ نہ نو من تیل ہوگا' نہ رادھا ناچے گی' جبکہ رادھا ناچتی کتنی پیاری لگتی ہے۔)

اب بندہ سوچے کہ تمام خوب پیسوں سے بننے والے آئٹمز جب کچن میں نہیں بنائے جائیں گے تو چلو کچن کا بجٹ کنٹرول رہے گا۔ تو یہ سراسر خوش فہمی ہے کہ...

چاول آئیں گے تو براؤن چاولوں... عام رائس سے مہنگے' بریڈ آئے گی تو براؤن بریڈ... آئل سب سے مہنگا جو وزن کو کم کرے۔

اور مہنگے سے مہنگے ڈائٹ پلان جو جیب کو اتنا ٹائٹ کر دیں گے کہ سانس رک جائے۔

لہٰذا ان تمام موٹی موٹی وجوہات کو دیکھتے ہوئے۔ بیا' ابوذر کو ایک بہترین پیکیج لگی۔ وہ ان تمام علتوں سے دور ہوگی جو ایک اسمارٹ عورت کی زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔ (اور اس عورت کے شوہر کی زندگی کو مشکل ترین)

ابوذر کو پہلے بیا کا چہرہ پیارا لگا۔ پھر ہاتھ اور پھر جب پورے سراپے کو دیکھا تو جیسے ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

"موٹی لڑکیاں کھانے پینے کی بے پناہ شائق ہوتی ہیں۔ ہاتھ روک ہی نہیں پاتیں۔ ہر شے کھا جاتی ہیں۔" (اسی لیے تو موٹی ہوتی ہیں)

ابوذر نے سوچا' وہ خود جی بھر کے کھائے گی تو اسے بھی تو کھلائے گی نا۔ یعنی خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے۔ (بسیا خورو.....)

لیکن.....

بیا موٹی تو تھی۔ مگر وہ کھانے پینے کے معاملے میں کتنی محتاط تھی' یہ اب بتانے کی بات تو تھی نہیں۔ دہرانے سے کیا فائدہ۔

ابوذر حق دق رہ گیا۔ اول تو وہ کچھ کھاتی ہی نہیں تھی اور اگر کھاتی بھی تو..... کھیرے ککڑیاں (لکڑیاں) گھاس پھونس..... ابلی ہوئی بے رنگ بے ذائقہ سبزیاں.....

ایک مخصوص ڈائٹ پلان پر چلتی ایک انچ نہ سرکتی اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اسے بھی چلاتی کہ اس کے خیال میں اسے بھی وزن کم کرنے کی ضرورت تھی۔ صرف وہ دن سکون کا ہوتا' جس دن چکن بروسٹ کھانے کی اجازت تھی یا پورا دن شامی کباب یا گرلڈ چکن پیس..... لیکن اس شان دار دن کے بعد سلاد ڈے بھی آتا' جس میں سارا دن جگالی کرنا پڑتی۔

گھی تو وہی تھا جو شادی کے بعد پہلی گروسری کے دوران خریدا گیا۔ دوبارہ خریدنے کا موقع ہی نہ بنا کہ پچھلا ختم ہوتا تو اگلا لیتے نا..... رس ملائیاں..... گلاب جامنیں..... شیرے میں لتھڑے رس گلے کھانے کا شائق ابوذر میٹھے کی نیچرل ڈیمانڈ پر کیلا کھاتا۔ سیب اور بیر..... اف.....

چائے میں وائٹ شوگر کے بجائے براؤن شوگر.....

بریانی کی ٹرے کھا جانے والے ابوذر کو ابلے ہوئے چاول کا ایک پیالہ ملتا۔

"اللہ جانتے آپ نے باڈی بلڈنگ کر کیسے لی۔ کس طرح سے کھاتے ہیں آپ؟" بیا کان پکڑتی۔

"وہ..... وہ زمانہ تھا اور اب یہ زمانہ ہے۔ تب بھی نہ کھایا' اب بھی نہ کھاؤں۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ تب بھی نہ کھایا ہوگا۔"

"تو کیا یہ جسم ایسے ہی بن گیا۔" ابوذر نے بازو اٹھا کر مسلز بنا کر دکھائے۔

"پتا نہیں کیسے بن گیا۔ بہر حال میرے گھر میں تو یہی سب بنے گا۔"

"میرا بھی تو ہے۔" ابوذر نے دہائی دی۔ "گھر....."

"ہاں تو میں کب انکار کر رہی ہوں۔ گھر کو گھر ہی رہنے دیں' برنس روڈ یا ناظم آباد کی فوڈ اسٹریٹ نہ بنائیں۔"

"اور کچن کی اس بدحالی سے برے۔"

اپنے پھلیے فگر کو قطعاً اگنور کر کے بیا کو کلفٹن اور طارق روڈ کی ہر بوتیک میں جانا ہوتا۔ اسے جو لباس پسند آگیا۔ وہ کتنے کا بھی ہو اور بھلے اس پر اچھا لگے یا نہ لگے' اسے لینا ہی ہے۔

"اچھا پہننا تو میرے بچپن کا شوق ہے اور اس پر کوئی کمپرومائز نہیں۔ اسی لیے تو میں وزن کم کرنا چاہتی ہوں۔ دوبارہ شیپ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"ہائے کیا دن تھے وہ بھی..... جب ہم آئرہ کے کپڑے چرا چرا کر پہنتے تھے' حق ہا!" سنہری یادوں نے چہرے کو جگمگا دیا۔ جبکہ ابوذر کے حلق میں سانس اٹک گئی۔

"چوری..... یعنی کہ چور..... نہیں چورنی۔" (ابوذر کی بیوی چورنی۔)

"ہاں نا..... یاد نہیں وہ دن جب..... میں نے آپ سے پناہ مانگی تھی۔"

"بھولا ہی کب۔" ابوذر تفصیلات سن سن کر غش کھا رہا تھا۔

اور ابوذر کی امیدوں کے محل پر آخری ضرب..... بیوٹی سیلون کا خرچا تھا۔

بیا ہر مہینے پارلر کا وزٹ کرتی اور.....

کٹنگ' ویکسنگ' ٹرمنگ' پیڈی کیور' مینی کیور اور تھرڈ فارم والے سارے آئی این جی کروا کر جیبیں جھاڑ کر آجاتی۔

"یار! تیری داستان تو ہم سے بھی زیادہ دکھی ہے۔"

عاشر اور تیمور دل و جان سے قائل ہو گئے۔
"آج ڈنر کیا کیا تھا؟"
"یخنی میں ابلے بھٹے تیر رہے تھے۔ کہیں کہیں بھولی بھٹکی بوٹی کا ریشہ۔"
"اسے چکن کارن سوپ کہتے ہیں۔" تیمور نے تصحیح کی۔
"نہیں۔۔۔" ابوذر کا سر زور زور سے نفی میں ہلا۔
"جب بیا بنائے گی تو وہ قسم سے وہی لگتا ہے۔ وہی جسے یار لوگ مرغی کا غسل میت کہتے ہیں۔"
کہنے کے ساتھ ابوذر نے بڑا سا سر ڈونگے ہی میں ڈال لیا۔ تاکہ دیواروں پر لگے کسٹرڈ کو چاٹ سکے۔ جبکہ غسل میت کی اصطلاح پر عاشر اور تیمور کے کلیجے باہر کو ابل پڑے تھے۔

✲ ✲ ✲

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے سرسری ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ مگر اس طرح فرصت سے رات گئے تک شاہی پھوپھو اور ارداد کے ساتھ رت جگا کرنے کا مزہ ہی جدا تھا اور آج کی اس بیٹھک کا کارن۔۔۔ پھوپھو اور ارداد کا دبئی جانا تھا۔ ارداد پیپرز کے بعد فارغ تھی۔ کچھ اسے ممی پاپا کی یاد بھی بہت شدت سے آرہی تھی۔
اور سب سے بڑھ کر آئرہ اور بیا کی ہنستی مسکراتی کامیاب زندگی سے بھی جل جل کر کباب ہو رہی تھی۔
اور اس نے اپنی ساری کیفیت ان دونوں کو تفصیل سے بتائی کہ کیسے اسے دونوں سے حسد محسوس ہوتا ہے۔
اور لفظ حسد سن کر تینوں ہکا بکا رہ گئیں۔ مگر جب کارن سنا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔
"ہاں نا آنٹی دست شناس نے آپ دونوں کے بارے میں جو جو پیشن گوئیاں کیں' وہ درست ثابت ہوئیں اور جو کچھ میرے لیے کہا' وہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔"
"تمہارے لیے کیا کہا تھا؟" آئرہ کے ذہن سے نکل چکا تھا۔
"وہی۔۔۔" ارداد نے ہچکی بھری۔ "میں اور شاہد آفریدی۔۔۔" اس کے تو حلق میں جیسے آنسو آن رکے۔
"میں تو اس علم پر یقین ہی نہیں کرتی۔ جو ہوتا ہے اللہ کی طرف سے۔" آئرہ نے کہا۔
"لیکن میں تو بھئی مانتی ہوں مجھے تو ملا تا خوابوں کا شہزادہ۔" بیا بھی سچی تھی۔
"خوابوں کا شہزادہ تو مل ہی جاتا ہے۔ ہو بہو نہ ملے تو جو ملتا ہے اچھی بچیاں اسے ہی شہزادہ مان لیتی ہیں۔ مان لینا چاہیے۔" شاہی پھوپھو نے اپنی عمر' رتبے اور تجربے کے حساب سے سونے میں تلنے والی بات کہی۔
آئرہ اور بیا قائل ہو کر سر دھننے لگیں۔



دبئی جیسے شہر میں پیدا ہونے اور پھر رہائش کے باوجود ایسا موقع پہلی بار بنا تھا کہ ارداد کسی کرکٹ میچ کو دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں آئی بیٹھی تھی۔ یہ انڈو پاک کا میچ تھا اور گراؤنڈ میں سنسنی کا جو عالم تھا' اسے ضبط تحریر میں لانا تقریباً" ناممکن۔ سانسیں تک رکی ہوئی تھیں جیسے۔
ارداد کی ایکسائٹمنٹ کا کیا کہنا۔۔۔ گراؤنڈ میں بیٹھ کر میچ دیکھنے کا پہلا موقع۔۔۔ اور میچ بھی وہ جس میں شاہد آفریدی موجود تھا۔ مگر وائے ری قسمت' پانچ میچوں کی اس سیریز میں آفریدی نہیں چلا تھا۔ اس کے باوجود دو میچ انڈیا نے جیتے تھے اور دو پاکستان نے۔
آج کے میچ کی گرمی ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ دونوں جانب ٹیموں میں خوب تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ مگر دونوں جانب ایک سوچ یکساں تھی۔ اگر آفریدی چل گیا۔
انڈیا کا دھڑکا۔۔۔ بھگوان نہ کرے۔
"اللہ کرے بس ایک بار آفریدی جم جائے تو بس پھر سے خیراں۔" پاکستانیوں کی امید انڈیا نے پہلے بیٹنگ لی' اور بولرز فیلڈرز کی مٹی پلید کرتے ہوئے رن ریٹ کو پونے تین سو سے اوپر لے گئے۔
آفریدی نے دو وکٹیں لے کر داد سمیٹی تو دو کیچ چھوڑ

کر خوب لعنتیں بھی سنی تھیں۔ انڈیا کے صرف تین کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے۔ میچ آخری اوور میں پہنچا تو بیٹسمین نے بلے کو کھلی چھوٹ دے دی۔ میدان کے چاروں جانب خوب صورت جارحانہ اسٹروکس۔۔۔ فیلڈرز دیکھتے رہ جاتے اور گیند کہاں سے کہاں۔۔۔ آفریدی بولنگ کے لیے آیا۔ تو عوام متزلزل تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔

لیکن آفریدی کو دیکھ کر جنونی ہو جانا جیسے فطری تقاضا ہو جاتا تھا۔ سو گراؤنڈ میں بوم بوم کا شور مچنے لگا۔ پاکستانی شائقین انگوٹھوں کو فاتحانہ اٹھانے لگے۔ جبکہ مخالفین انگوٹھوں کو نا صرف نیچے کی جانب دکھا رہے تھے، بلکہ منہ بھی چڑاتے تھے۔

ایراد اور شاہی پھوپھو پاکستانی ٹیم کے جیسے یونیفارم میں ملبوس تھیں۔ ایراد نے اپنے لمبے سیدھے بالوں کی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ کم حصے پر سفید رنگ پھیر رکھا تھا اور زیادہ بالوں کی لمبائی کے برابر سبز چاند ستارے والی پنیں خوب ساری ٹھوک رکھی تھیں۔ شاہی پھوپھو نے گھنگھریالے بالوں کا بہت بڑا سنہری گچھا سر پر پہن رکھا تھا۔ جو ان کے اپنے جسم سے دگنا تھا۔ گال پر انہوں نے بھی سفید و سبز رنگ پھیر رکھا تھا۔ ایراد نے انہیں سرخ رنگ کی گلیٹر والی اتنی لمبی پلکیں لگا دی تھیں جو نگاہیں اٹھانے پر بھنوؤں سے بھی اوپر چلی جاتی تھیں۔

ایراد نے بڑا خوب صورت چوڑا موٹا لمبا آئی لائنر لگا کر آنکھیں سجا رکھی تھیں۔ سرخ چمکتی لپ اسٹک، اس نے اپنے چہرے کو خوب صورت بنانے اور واضح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

آفریدی کے لیے ڈھیروں بینرز اور پلے کارڈ بھی پکڑ رکھے تھے۔

کیمرہ مین جب اچھی خاصی عمر والی کسی حد تک بزرگ نظر آتی خاتون (شاہی پھوپھو) کو بار بار فوکس کرتا جو حلیے میں سب سے جدا نظر آتی تھیں۔ تب ساتھ بیٹھی بے حد حسین چہرے والی کم عمر سی ایراد امتیاز کیسے نظر انداز کر دی جاتی۔ ایک کیمرہ مین کو تو اس کے علاوہ اور کچھ دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔ جو آفریدی کی پہلی گیند پر ہی وکٹ لے لینے پر اچھل اچھل کر بے حال ہو گئی تھی اور اب دونوں ہاتھوں سے اس کو وکٹری کا نشان دکھا رہی تھی۔

اگلی گیند خالی گئی اور اس سے اگلی پر ایک اور وکٹ۔۔۔

تماشائی پاگل ہو گئے۔ بوم بوم کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔

پوری دنیا کی ٹی وی اسکرین پر اچھلتی ایراد دکھائی دینے لگی۔ وہ تو شاید ہوش و حواس سے جا رہی تھی۔

اگلی گیند جارحانہ تھی اور بیٹسمین کچھ نروس بھی، اس نے مر جانے یا مار دینے والی پالیسی اپناتے ہوئے بلا ہوا میں اٹھا دیا تھا۔ گیند اتنی اوپر گئی کہ جیسے نظر آنا بھی بند ہو گئی۔

دونوں جانب کے شائقین کی توقعات بہت زیادہ تھیں۔

ایک جانب سے فیلڈر بھاگا اور دوسری طرف سے آفریدی خود۔۔۔ آسان کیچ تھا۔ مگر۔۔۔ مگر یہ کیا دونوں کھلاڑی آپس میں ٹکرائے۔

گیند باؤنڈری لائن کراس کر گئی۔ انڈین کراؤڈ کے شور نے گویا اسٹیڈیم کی چھتوں میں شگاف ڈال دیا۔ مگر ساتھ ہی اگلے پل ایک سناٹا ہر سو چھا گیا۔

آفریدی چت میدان میں پڑا تھا۔ بالکل ساکت۔

اور ایک ڈاکٹر بھاگا آ رہا تھا۔

نجانے کہاں کیا لگ گیا تھا جو وہ ایسے ایک دم ڈھیلا ہو کر پڑا ______ پتا چلا وہ سر کے بل گرا تھا تو کیا سر میں چوٹ لگ گئی؟ مگر کیسی چوٹ، کیا بہت خطرناک؟

پورے کراؤڈ کو سانپ سونگھ گیا۔

تب کیمرہ مین نے ایک بار پھر ایراد کو فوکس کیا۔

وہ اچھل اچھل کر، پیر پٹخ پٹخ کر اپنے صدمے کا اظہار کر رہی تھی۔ نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔ دونوں ہاتھ سر پر مار رہی تھی۔

پھر دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں ہونٹوں پر رکھے

ساکت ہوگئی۔ پھر جب آفریدی کو سہارا دے کر کھڑا کردیا گیا۔ تب وہ زیر لب کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی۔

آفریدی نے قدم بڑھائے تو اس نے ہاتھ دل پر دھر لیے۔ آنکھیں میچ لیں۔ آنسو جھر جھر گالوں پر بہہ رہے تھے اور بھیگے ہونٹ مسلسل حالت ورد میں تھے۔

شدت گریہ جب آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تان دیتی' تب وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھ رگڑ لیتی۔ ایسے میں لٹکے ہونٹ اس کے دلی جذبات کے ترجمان ہوتے۔

ساری دنیا کے ناظرین آفریدی کی چوٹ کو بھول کر... میچ کی گمبھیرتا کو فراموش کرکے۔

آنسو بہاتی غم سے نڈھال... ہچکیاں بھرتی ایراد کو دیکھ رہے تھے۔



پاکستان کی بیٹنگ آئی تو بیٹس مینز نے "تو چل میں آیا" کی پالیسی اپنالی۔ آتے دکھائی دیتے لیکن رکتے نہیں تھے۔ یعنی ہار یقینی... اور وہ جس پر امیدیں لگائی تھیں' وہ تو پہلے ہی چکرا کر گر گیا تھا۔ یعنی...

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

میچ کا نتیجہ واضح ہی تھا۔ سو پاکستانی شائقین ٹھنڈے بیٹھے تھے۔ مایوس دل گرفتہ اور انڈین شائقین پرسکون' بے فکر گاتے بجاتے۔

آفریدی آیا تو پاکستانیوں کی یخ بستہ سانسوں نے سارے اسٹیڈیم میں کپکپی دوڑا دی۔ دوسری جانب انڈین تماشائیوں کے تضحیک آمیز انداز اور جملے نعرے اور سیٹیاں۔

کچھ پاکستانی بھی دل جلے تبصروں پر اتر آئے۔

"آئے ہو ابھی' بیٹھو تو سہی... جانے کی باتیں جانے دو۔" تانیں اڑنے لگیں۔

"چلی گئی جان میری' دیکھتا میں رہ گیا۔" کسی انڈین نے گایا۔

ایراد امتیاز ایک بار پھر ساری دنیا کی اسکرینز پر جلوہ گر ہوئی۔ آنکھوں سے لائنر اتر گیا تھا اور اس نے شاید منہ بھی دھو لیا تھا۔ دھلا دھلایا نکھرا چہرہ سرخ پپوٹوں والی آنکھیں۔

وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر آنکھیں موند کر جیسے آفریدی پر حصار سا باندھ دیا۔

ہیلمٹ کو بار بار درست کرتا۔ ناک چڑھاتا۔ پلکیں جھپکتا۔ خود کو وارم اپ کرتا آفریدی اٹھک بیٹھک کررہا تھا۔

بہت بے فکر دکھائی دیتے بھارتیوں کے لیے بہرحال آفریدی کا پچ پر ہونا ایک خطرہ تھا۔ وہیں ایک بھرپور امید پاکستانیوں کے لیے بھی تھی۔

اگر آفریدی ٹک گیا تو...

سب کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ مگر ایراد کا بھولپن' بے ساختہ پن... چہرے پر پھیلی حسرت' دکھ' پریشانی سب سے جدا اور فطری نظر آئی تھی۔ اس کی جیسے جان پر بنی ہوئی تھی۔

پہلی گیند پر رن لیا گیا۔ دوسری خالی گئی۔ تیسری گیند پر رن اور آفریدی کریز پر۔

بلا اٹھاتا' سب نے دیکھا۔ مگر گیند کہاں گئی' پتا ہی نہ چلا۔ یہ ہوا پہلا چھکا' پھر دوسرا بھی چھکا' اور تیسرا چھکا' اگلی گیند پر رن...

جیت کے لیے رنز کا ڈھیر تھا اور گیندیں جیسے گنتی کی۔

ہاں اگر اسی طرح سے چھکے لگائے جاتے تو... اور اس کے لیے آفریدی کا ٹکنا ضروری تھا۔ جو کسی خاص موڈ میں ہی دکھائی دے رہا تھا۔

آفریدی کو ٹکانے کی دعا ایک ضروری کام تھا۔ سو ساری قوم جت گئی۔ مگر سب کو دکھائی صرف ایراد دے رہی تھی۔

کیمرامین اور کمنٹیٹرز کے درمیان جیسے کچھ طے پا گیا۔ وہ "آ گرل" کہتا اور اسکرین پر ایراد کا چہرہ جگمگا اٹھتا۔

جس کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھے تھے۔ ہلتے لب اور ہر شارٹ پر وہ خوف کے عالم میں آنکھیں بند کرلیتی۔ پھر چھکے یا چوکے کے نعروں پر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولتی اور اچھلنا شروع کردیتی۔

میچ مسلسل پاکستان کے حق میں جارہا تھا۔ اس دوران دو بیٹسمین بھی آؤٹ ہوئے۔ مگر آفریدی ہنوز پچ پر تھا۔

یہاں تک کہ بات تین گیندوں اور نو رنز پر آکر رک گئی۔ مجمع پر ہو کا عالم تھا۔ تخت یا تختہ۔۔۔

بالر نے فیلڈرز کی گھات لگائے چیتوں کی طرح جگہیں تقسیم کردیں۔ وہ کامیاب رہا۔ دوسرا بیٹسمین چھکے کے چکر میں آؤٹ ہوگیا۔ اب دو گیند پر نو رن رہ گئے۔

آنے والے بیٹسمین نے گیند کو دھیرے سے پیچھے کی جانب دھکیلا۔ یہ چوکا تھا' خود وہ رن کے لیے بھاگا۔

اب گیند کا سامنا آفریدی نے کرنا تھا اور اس نے۔۔۔

اس نے چھکا مار دیا تھا۔

یعنی کہ آفریدی چل گیا تھا۔

یعنی کہ پاکستان جیت گیا تھا۔

یعنی کہ۔۔۔ ایراد کی دعائیں' وظیفے رنگ لے آئے تھے۔

تماشائیوں کے ہلڑ کو دکھایا جارہا تھا۔ ایراد نے وہ جیکٹ پہن لی تھی' جس پر آفریدی کی شکل بنی ہوئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے رکوع کی سی حالت میں جھکی پورا منہ کھولے آنکھیں میچ کر مسلسل چیخیں مار رہی تھی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی اور اپنی اچھلتی پھوپھو کے گلے لگ گئی۔ اب دونوں پھوپھی' بھتیجی اچھل رہی تھیں۔

گراؤنڈ میں کھلاڑی بھاگ رہے تھے۔ کیمرے ٹھکا ٹھک چل رہے تھے۔

ہر چینل پر شور مچا تھا۔ نعرے' ملی نغمے۔۔۔ کھلاڑیوں کے مختلف شاٹس' خوب صورت کیچز' چھکے اور چوکے۔

روڈ پر برپا جشن۔۔۔ بگ اسکرینز پر دیکھتے لوگوں میں مٹھائی کی تقسیم' منچلوں نے جھنڈے اٹھا کر روڈ پر ون ویلنگ بھی شروع کردی تھی۔ جوش و خروش سے جیت کی اطلاع دیتے نیوز اینکرز۔۔۔

اور اس کے ساتھ آفریدی کی ہر شارٹ پر ایراد کی بدلتی حالت کی تصویریں۔۔۔ اس کی چیخیں' آنسو اور دعائیں۔

کپتان نے جیت کو عید کا تحفہ قرار دیا۔



دوسرے دن کے تمام ملکی و غیر ملکی اخبارات و میگزین کے کور پر آفریدی کی بڑی بڑی تصاویر شائع کی گئیں اور ایک بھی صفحہ ایسا نہ تھا جہاں آفریدی کی بڑی سی تصویر کے ساتھ۔۔۔ ایراد کی تصویر شائع نہ کی گئی ہو۔

دوران میچ اس کے مختلف پوزز کو چنا گیا تھا۔ آنسو بہاتی' دعا مانگتی' آنکھیں موندے ہوئے زیر لب کچھ پڑھتی۔

بعض نے آفریدی کے فل پوسٹر کے اوپر ایراد کی چھوٹی تصویر لگائی تھی۔ چند ایک نے برابر سائز کی لگا دی۔

"مجھے یقین ہے' وہ جب ان تصاویر کو دیکھے گا۔ میچ کی ریکارڈنگ دیکھے گا' تب اسے اندازہ ہوگا' وہ میرے لیے کیا ہے؟ کتنی امپورٹنس رکھتا ہے۔"

ایراد نے اس روز کا ہر ہر اخبار خرید لیا تھا۔

"تمہیں شرم نہ آئی ایسی حرکتیں کرتے ہوئے۔" بیا فون پر چیخ رہی تھی۔

"لو شرم کیسی؟ اپنے ملک کی جیت کے لیے کیا میں دعا نہ مانگتی۔"

"سب پتا ہے ہمیں' ملک کی جیت کی بچی۔"

"تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔" ایراد بھی ایک ڈھیٹ تھی۔

"اب جب وہ میری ان پکچرز سے میرے دل کا حال جان لے گا۔ تب لازماً" مجھ سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ بس وہیں سے ہماری ریلیشن شپ کا آغاز ہوگا۔ جس کا انجام۔۔۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم جان بوجھ کر یہ سب کررہی تھیں۔ ہم تو سمجھے یہ بے اختیاری ہے۔ دشمن

ملک سے نفرت اور جذبہ حب الوطنی ہے۔ مگر تم تو یہاں بھی گیم کر گئیں۔" بیا کی تاسف سے بھرپور آواز پر ایراد دل سے ہنس دی۔

"وہ سب کچھ جو گراؤنڈ میں ہوا' سب کچھ غیر ارادی اور قطعاً" فطری تھا۔ یہ فائدے نقصان تو میں اب سوچ رہی ہوں۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہی ہوں۔ قیافے اور اندازے لگا رہی ہوں۔"

"ارے اسے روز ہزاروں کے حساب سے فینز ملتے ہیں۔"

"مگر کوئی مجھ سا کہاں؟" ایراد کا اعتماد بہت اوپر جا چکا تھا۔

آنٹی دست شناس کی پیش گوئیاں... اور بدلتے حالات۔

اب بھلا کیا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ بس کچھ ہی دن بعد...



یہ پھپھی' بھتیجی میچ دیکھنے دبئی آئی تھیں۔ گھر پہنچیں تو ایراد ایک والہانہ استقبال کی منتظر تھی۔ اسے گلے لگایا جائے۔ پھولوں کے ہار پہنائے جائیں۔ جیسے وطن لوٹنے پر کھلاڑیوں کا کیا جاتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں اگر کوئی جوشیلا ملی نغمہ بھی لگایا جائے تو کیا ہی بات ہے۔

"یہ جو ابا آپ کو فون کھڑکا رہے ہیں نا۔ وہ میرے کارنامے پر مجھے سراہنا چاہتے ہیں کہ میں نے ملک و قوم کے لیے جو دعائیں کیں۔"

"ملک و قوم کے لیے دعا... یا اپنے لیے دوا... جیسے میں تم کو جانتی نہیں۔"

"اوہو..." ایراد کھلکھلائی۔

گھر پہنچے تو امتیاز صاحب سامنے لاؤنج ہی میں مل گئے۔ ممی بھی ساڑھی میں ملبوس صوفے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ایراد کے بے حد گرم جوش سلام دعا پر ایک سرد مہری سی شاہی کو فوراً" محسوس ہوئی۔ ایراد پہلے باپ سے لپٹ گئی اور پھر ماں کے گلے میں بازو حمائل کر کے لپٹ گئی۔

سینٹرل ٹیبل پر اخبارات کے پلندے تھے۔

اس سے پہلے کہ ایراد اچک کر انہیں کھولتی اور کہتی۔

"ڈیڈی! آپ نے میری پکچرز دیکھیں؟" وہ خود ہی اخبار اٹھانے کو جھک گئے۔ ایراد نے آنکھیں نچا کر اشارے سے شاہی پھوپھو کو دیکھا۔

بھابھی کڑے تیوروں سے شاہی کو گھور رہی تھیں۔ شاہی نے بمشکل ایراد کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ ساتھ ہی ذرا ٹیک کر رہنے کا اشارہ... ایراد نفی میں انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر یک دم اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی اور وہ ساکت ہو گئی۔ امتیاز صاحب نے اخبار کا پلندہ سا شاہی کی جانب اچھال دیا۔ ایک چہرے سے ٹکرایا۔ کچھ گود میں گرے۔ باقی پیروں سے ٹکرا کر زمین پر... اور زمین والے پر ہی شاہی کی گولڈن بالوں والی تصویر تھی۔

"یہ کیا ہے۔"

"یہ... یہ..." شاہی نے شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو کر اخبار سمیٹنے شروع کر دیے۔ جیسے یہی کام کرنے کو کہا گیا ہو۔

"یہ... ایراد! وہ میچ میں..."

"وہ بچی ہے۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں' یہ کیا ہے۔" بھائی نے ذرا سا جھک کر اپنی شہادت کی انگلی اخبار پر ٹک ٹک بجائی' جہاں شاہی کی ایک اور تصویر تھی۔

دونوں ہاتھ اوپر کر کے وکٹری کا نشان... نیم وا ہونٹوں سے پتا لگتا تھا وہ ہوٹنگ بھی کر رہی تھی۔

"وہ یہ سب ایراد نے کہا تو..."

"ایراد بچی ہے شاہ جہاں۔" بھابھی اٹھ کر آ گئیں۔ "تمہاری عقل کہاں گئی تھی۔ خود کہو تم بچ رہی ہو یہ سب کرتے ہوئے۔"

"میں نے کہا تھا اس سے... یہ مانی نہیں۔" شاہی نے تھوک نگلا۔ "آپ جانتے ہیں۔ میں اسے انکار نہیں کر پاتی' اس کی ضد..."

"بچے ضدیں کرتے ہی ہیں۔ بڑے عقل استعمال کرتے

ہیں۔" بھائی نے لفظ لفظ پر زور دیا۔
"ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔"
"سوری ڈیڈی۔۔۔ یہ سب میری وجہ سے۔۔۔ پھوپھو بالکل نہیں مان رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ مغربی ممالک میں چھوٹا' بڑا' جوان' بوڑھا سب ٹیم کو بک اپ کرنے جاتے ہیں۔ سو وہ بھی۔۔۔ کچھ ڈیفرنٹ۔۔۔ کچھ۔۔۔" ایراد تیزی سے اٹھ کر ماں' باپ کے بیچ آ کھڑی ہوئی۔
"تم بیچ میں مت بولو۔" ڈیڈی نے ہاتھ اٹھایا اور ایسی قطعیت۔ ایراد نے کب جھیلی تھی۔ فقط لہجے کی سختی پر اس کا دل بند ہو گیا۔ بولنے کی کوشش میں گلا رندھ گیا۔ ممی کے "تم جاؤ" والے اشارے پر جیسے جنبش کی سکت بھی نہ رہی۔
"پیدا کرنے والی ماں کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھوپھی کو چھوٹی سے عشق ہے۔ بڑی کو پھوپھی سے عشق ہے۔ اکلوتے بیٹے کو گوری سے عشق ہو گیا۔ ادھر ہم ماں باپ' نوکری کو لیے اکیلے بیٹھے ہیں۔"
ممی نے داستان کا رخ ہی بدل دیا۔
"یہ سب آپ پھوپھو کو کیوں کہہ رہی ہیں۔" ایراد نے رندھی ہوئی آواز میں منمنائی۔ "انہوں نے کیا کیا ہے۔"
"تو پھر کس سے کہوں۔۔۔ کس سے پوچھوں۔۔۔ ادھر وہ آئرہ بھی آ ہی کہہ رہی ہے۔ پھوپھو کو کچھ نہ کہیں۔ پھوپھو نے کچھ نہیں کیا۔ ساتھ ہی کہتی ہے پھوپھو کی زندگی سامنے تھی۔ پتا نہیں میں نے مردوں کے حوالے سے اپنی رائے کیوں بدلی۔ جبکہ مجھے شروع سے پتا ہی تھا۔ یہ عورتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے' دھوکا دینے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ مگر نہیں۔۔۔ قسمت خراب تھی جو باتوں میں آ گئی۔" ممی رٹو طوطے کی طرح شروع ہو گئی تھیں۔
"آئرہ۔۔۔" پھوپھو اور ایراد بری طرح چونکیں۔
"اس کا کیا ذکر۔۔۔ اس نے یہ سب کیوں کہا۔ کیا ہوا ہے؟"
"وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے۔" شاہ جہاں کھڑی ہو گئیں۔
"ہمیں کیا پتا' کیوں کر رہی ہے۔ بیٹھی ہے اندر پوچھو جا کر' تم ہی کو بتائے شاید۔۔۔ ہمیں کیوں بتائے گی۔ ہم تو صرف پیدا کرنے کے گناہ گار ہیں۔ پالا پوسا تو تم نے ہے نا۔" غصے میں ممی کے منہ سے سچ نکل رہا تھا۔
"آئرہ ادھر۔۔۔ وہ تو ادھر پاکستان میں تھی نا۔۔۔ وہ۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ تھی وہ پاکستان۔۔۔" امتیاز صاحب نے بہن کو گھورا۔ "کل شام ہی پہنچی ہے روٹھ کر' خفا ہو کر۔" شاہ جہاں کا ہاتھ دل پر جا رکا۔
"مثالیں۔۔۔ حکایتیں ایسی ہی تو نہیں بنتیں۔ پھپھی' بھتیجی ایک ذات۔"
ممی نے چڑ کا تو شاہی کو لگایا تھا۔ پھر سر پکڑ کر بھی بیٹھ گئیں۔



"مرد عورت کے کسی بھی ہنر کو ماننے کو تیار ہی نہیں۔ بلکہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نہ ہنر کا' نہ عقل کو بلکہ عورت کو بھی۔۔۔" آئرہ کا لہجہ رونے سے بھاری تھا مگر تلخی ہنوز تھی۔ وہ بات روک کر گالوں سے بہتے آنسوؤں کو بھی صاف کرتی تھی۔
"آئرہ! ہوا کیا ہے۔" شاہی پھوپھو جواب کے لیے بے تاب تھیں۔ ادھر تمہید ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔
"آپ کی ساری زندگی میرے سامنے تھی۔ پھر بھی پتا نہیں میں کیسے بے وقوف بن گئی۔ سارے تحفظات ذہن سے نکل گئے۔ باتوں کا جادو چلا دیا تھا۔ آج ملاقات۔۔۔ کل شادی۔۔۔ ایسے بھی کوئی کرتا ہے۔"
آئرہ خود پر متاسف تھی۔ "تھوڑا وقت لیتی۔ وہ مجھے جانتا' میں اسے سمجھ لیتی۔ لوگ مٹی کا برتن لیتے ہوئے بھی ٹھوک بجا لیتے ہیں۔ میں نے آخر کیا' کیا۔"
نجانے کیا منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا اس نے۔ میری جیسی عقل مند' پڑھی لکھی' ہنر مند لڑکی' آہ۔"
"منتر نہیں آئرہ۔۔۔ محبت' جو وہ تم سے بے حد و بے حساب کرتا ہے اور اب خدا کے لیے بتا دو۔ معاملہ کیا ہے جو تم ایسے' ایک دم اچانک اتنا بڑا فیصلہ کر کے۔۔۔

کٹ کتنا یہاں دبئی چلی آئیں اور وہ پیچھے وہ تمہارے
الیو شوز۔۔۔"
"وہ تو سیٹ چینج ہو رہا ہے نا شو کا۔ تو پچھلے سال کا
بہت ویک دکھایا جا رہا ہے۔" ایراد نے آئرہ کی آج
کل کی فراغت کا بتایا۔ پیارے سے دولہا بھائی نے آخر
بیا کر دیا تھا۔
"اوہ آئی سی۔۔۔" شاہی پھوپھو کے چہرے پر
طمانیت پھیلی۔ ایسی اچانک غیر حاضری کتنے بڑے
اسکینڈل کو جنم دے دیتی۔
"اس نے کہا کیا؟" پھوپھو نے دونوں ہاتھ جوڑ
دیے۔ آئرہ نے دونوں کو باری باری دیکھا۔
"اس نے۔" ہچکی بھری۔ "اس نے کہا کس بات
کی کوکنگ شو ایکسپرٹ بنتی ہوں۔ جب مجھے کسی بیمار
کے لیے کھچڑی بنانا نہیں آتی۔ میں آلو گوشت نہیں
بنا سکتی' میں دلیہ تک نہیں بنا سکتی اور۔۔۔"
"کھچڑی اور دلیہ۔۔۔ انہوں نے یہ بچوں والی
خوراک کیوں کھانی تھی۔" ایراد کی حیرت۔
"اسے ایک ہفتے سے بخار تھا۔ اس نے چکن والا
دلیہ مانگا۔ میں نے اتنا اچھا اسپائسی گرم مسالے اور
بھگار لگا کر بنا کر دیا اور۔۔۔ اور اس نے اسے پھینک دیا
اور اتنا اونچا اونچا بولا کہ نیچے سیڑھیوں تک آوازیں
جانے لگیں۔"
"آوازیں کیوں۔۔۔ بول تو وہ رہا تھا' آواز کہو۔"
"تو کیا میں منہ سی کر رکھتی' جواب نہ دیتی۔" وہ
چمک کر بولی۔
"تم نے اتنی سی بات پر گھر چھوڑ دیا آئرہ۔۔۔ اتنی
معمولی بات۔"
"یہ معمولی بات ہے پھوپھو۔۔۔ میرا کیریر۔۔۔ اگر کوئی
سنتا کہ آئرہ امتیاز کوکنگ ایکسپرٹ کامیاں ہی اس کے
سارے ہنر کو اس طرح ڈی گریڈ کر رہا ہے' تو۔۔۔ میرا
کیریر تو ختم ہو جاتا نا۔ اس نے مجھ سے شادی ہی اس
لیے کی تھی کہ میں اسے پکا پکا کر کھلاتی جاؤں۔" وہ حد
درجہ بدگمان تھی۔
"وہ تو آخری پل تک نہیں جانتے تھے کہ آپ
دراصل ہیں کون۔" ایراد کے منہ سے نکلا۔
"تم مرد کی چال بازیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ کہہ دیا
ہے میں نے اسے ڈھونڈے اپنے لیے کوئی آلو گوشت
اور کھچڑیاں بنانے والی خانساماں۔۔۔ مائی گاڈ جس طرح
وہ اونچا بول رہا تھا۔ اگر جو کوئی سن لیتا' میرا کتنا مذاق
بنتا۔ دنیا کیا کیا باتیں نہ بناتی۔"
آئرہ نے جھرجھری لی' ساتھ ہی لہجے میں طمانیت
اتر آئی کہ اچھی کر کے آگئی۔ وہ عاشر کے ساتھ۔ یاد
رکھے گا۔ اسے مارا اس نے طعنہ۔۔۔ ہونہہ۔
"تو تمہارا کیا خیال ہے گھر ٹوٹنے پر دنیا کوئی باتیں
نہیں کرے گی۔ شوبز کی لڑکیاں تو ویسے بھی بدنام ہیں'
اور تم ایک معمولی سی بات پر۔۔۔" شاہی پھوپھو نے
تیزی سے کہا اور یک دم جملہ ادھورا چھوڑ کر دونوں
ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔
ایراد اور آئرہ تیزی سے دائیں بائیں چپک گئیں تو
شاہی نے خود کو بجلی کی سی تیزی سے جھٹکا دے کر جیسے
انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔
"عورت بے قصور ہو یا قصوروار اسے ہر دو حال
میں سرنڈر کرنا ہی ہوتا ہے اور تم تو چلو خوش قسمت ہو
کہ شوہر نے ایک کوتاہی کمی بتا کر ناراضی کا اظہار کیا۔
اور یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ تم اپنے لیے اسٹینڈ لے
سکتی ہو اور ڈٹ سکتی ہو۔ ورنہ مجھے تو آج تک یہ نہیں
معلوم کہ کس کوتاہی اور کمی کی بنا پر جواد کے دل پر چڑھ
ہی نہ سکی۔ جیسے آج تم خود کو مکمل بے عیب سمجھتی
ہو۔ میں بھی تم سی ہی تھی۔ عاشر کو آلو گوشت اور
کھچڑی دلیہ پسند نہیں آیا' تم سیکھ سکتی ہو۔
جواد کو سب سے پہلے میرا نام ہی پسند نہ آیا۔ شاہ
جہاں' مردانہ نام۔۔۔ میں ان سے عمر میں بہت چھوٹی
تھی۔ خالہ (ساس) سب کو یہ بات فخر سے بتائیں' نام
کے بعد اگلا اعتراض عمر پر کر دیا۔ پہلے میں انہیں شوخ
وشنگ' بے دھڑک بولنے والی' کم عقل لگی۔ پھر جب
اس کا الٹ ہو کر جینے لگی۔ تب ٹھم ٹھم کہہ کر چڑ کے
لگاتے۔ جب ترنت جواب دیا تو منہ پھٹ ہو گئی۔ اٹک
کر ٹھہراؤ سے بولنا سیکھا تو کسی کے آگے بول نہیں

سکتی' نہ جواب دینا جانتی تھی دبو کم عقل۔۔۔
اور یہ شکایتیں۔۔۔ بلکہ شکایتیں بھی چھوڑ دیہ پریشانی جب اماں سے شیئر کی تو بولیں۔ اچھی بیٹیاں گھر بسانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر کیسے کرتی ہیں؟ یہ نہ بتایا۔ بھابھیاں مذاق اڑانے لگیں' میں آج کیا بک رہا ہے' جیسا سوال کرنے کے لیے منہ کھولتی۔ بھابھیاں۔۔۔ بھائی یک زبان بولتے لوجی کوئی اور شکایت یاد آگئی' کوئی اور گلہ۔۔۔

وہ جواد کو غلط مان ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنا بڑا بزنس مین۔۔۔ اسے پاکستان میں اپنے کام کو اسٹیبلش کرنے کے لیے ابا کا تجربہ درکار تھا اور ابا کے لیے وہ بیرون ملک تجارت و کاروبار کے لیے راستہ۔۔۔ دونوں اپنے اپنے مفاد حاصل کر لیتے۔ مگر خالہ کو میں اچھی لگ گئی۔ سچ بات ہے' ہمارا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ عمر میں بڑے' اتنے سارا پڑھے ہوئے آدمی۔۔۔ (رونے اور ہچکیاں لینے میں مزید شدت آگئی۔)

وہ امتیاز بھائی اور حسنین بھائی سے بھی بڑے تھے۔ ان کا رعب بھی بڑا تھا۔ میں نئے رشتے سے شرمسار رہتی' خالہ جان۔۔۔ خالہ زندہ تھیں تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہر شے کو ٹھیک ہی رکھتیں۔ ہمارے درمیان پل تھیں' جس پر چل کر ہم ایک دوسرے تک آتے تھے۔ انہیں اپنی امریکی کلاس فیلو پسند تھی' جو خالہ کو کسی بھی حال میں قابل قبول نہ تھی۔ وہ عیسائی تھی۔ خالہ اسے امریکی سفید بندریا کہتی تھیں' اسکرٹ سے جھانکتی لمبی ٹانگیں اور سنہرے بالوں سے گھن آتی تھی۔ مگر کیا کیجیے کہ وہ جواد کی پسند تھی اور خالہ پسند کی راہ میں حائل رکاوٹ' جب رکاوٹ دور ہو گئی تو راہیں بھی کھل گئیں۔

خالہ نے اور اماں نے اور بھابھیوں نے بھی کہا تھا۔ نک سک سے درست کھانے پر انتظار کرتی عورت مرد کا دل جیت لیتی ہے۔ اسے مائل کر لیتی ہے اپنی جانب۔۔۔ اور قائل کر لیتی ہے اپنے لیے' مگر میرے تجربے نے بتایا' مرد بے حس ہو تو پھر عورت نہ قائل کر پاتی ہے نہ گھائل۔

"تم یہ کیا اپنے پالک گوشت اور دال چاول کا ملغوبہ سا سجا کر رکھ لیتی ہو۔ میں ایسے کھانے نہیں کھاتا۔" وہ عجیب نظروں سے مجھے اور میرے دسترخوان کو دیکھتے' کس مشاقی سے چاپ اسٹک کا استعمال کرتے تھے۔

"اسے چاپ اسٹک کہتے ہیں' کہیں تم اپنی اماں کو فون کر کے کہو کہ جواد ڈنڈیوں سے کھانا کھاتا ہے' چمچ کے بجائے۔۔۔" پھر ہنس دیتے۔

میں کہہ نہ پائی کہ کراچی میں کھلنے والے جاپانی ریسٹورنٹ کی پہلی اور پھر مستقل گاہک میں ہی تھی۔

"وہ عورت اب گھر آکر گھنٹوں بیٹھی رہتی ہے اماں!" میں نے فون کھڑکایا۔ "دفتر میں راستے میں بھی ساتھ ہوتی ہے اور دل میں تو ہے ہی۔۔۔"

"تو تم نے کیوں نہ جگہ بنائی اب تک۔۔۔ تم کرتی کیا ہو' ایک بچہ بھی نہ ہوا کہ۔۔۔" سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اماں کا طعنہ دل چھلنی کر گیا۔ میں نے کہا۔

"بھلے سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہتی ہوں اماں۔۔۔ مگر بچہ یہاں کے بازاروں سے نہیں ملتا۔"

"اور اس روز مجھے سمجھانے کی اس مہم میں ابا پیش پیش تھے۔ میرا جملہ ان کی سماعتوں سے ٹکرایا تو بولے کہ انہیں نہیں پتا تھا میری زبان اتنی لمبی ہے اور جواد جیسا باوقار' سمجھ دار شخص۔۔۔ سارا قصور میرا ہی ہو گا' لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں ایسے شوہر اور زندگی کے۔"

پھر وہ بچہ۔۔۔ پتا نہیں کیسے آگیا۔ میں خوش زیادہ تھی یا حیران زیادہ۔۔۔ پتا نہیں چلا۔ مگر پھر پریشان ہو گئی' جب انہوں نے اسے نامنظور کر دیا۔ میں نے اس بار رو' رو کر اماں' ابا کو فون لگایا تو وہ پہلی بار میرے ہم نوا ہو گئے۔ میں سچی لگی انہیں۔ بھائی خوش تھے' مضبوط رشتہ۔۔۔ مضبوط ترین ہونے جا رہا تھا۔ مشترکہ بزنس کتنی کامیابی سے بڑھ رہا تھا۔

مگر اگلا رونا۔۔۔

"جب وہ راضی نہیں ہے۔۔۔ ابھی فی الوقت نہیں چاہتا تو تم۔۔۔ بھئی منہ پھاڑ کر کیا کہیں۔۔۔ بیوی کو میاں کی مرضی پر ہی چلنا چاہیے۔ یہی سنتے سمجھتے آئے

ہیں۔" بھائی کہہ رہے تھے۔
"ہاں شاہی! تمہیں کیا پڑی ہے ابھی اکیسویں برس میں لگی ہو۔ انجوائے کرو لائف۔۔۔ بلکہ وہ جو تم کالج میں داخلہ لے رہی تھیں وہ لو۔ امریکہ میں رہ کر چک بینس جیسی رشیداں والی سوچ۔۔۔ چچ چچ چچ۔۔۔"
بھابھیوں کے اپنے انداز تھے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا جواد کی خفگی کا ذرا سا بھی سامان ہو۔
اور میں جو ہر چھوٹے بڑے معاملے پر ان سب کی رائے لیتی تھی۔ جو کہہ دیتے "آمنا صدقنا" کہتی تھی۔ پہلی بار انکاری ہو گئی۔
ادھر سب لوگ حیران تھے۔ تو جواد بھی ششدر رہ گئے۔
اور انہیں تو جیسے ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔
بیٹے کی پیدائش کی اطلاع جب بھائی نے دی تب لمحہ بھر کے سکوت کے بعد وہ اس ٹینڈر کا پوچھنے لگے۔ جس کا ملنا بہت اہم تھا۔
ابا نے ایک بار اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی تو بولے۔
"کاروباری گفتگو میں گھریلو باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"
اور ابا نے بلکہ کسی نے بھی پلٹ کر نہ پوچھا کہ کیوں۔۔۔ ہاں سب مجھے موردالزام ٹھہراتے تھے۔ گھر والے 'باہر والے' ایک دنیا۔ گھر اُجڑ جائے تو قصوروار عورت ہی ہوتی ہے۔
آج تم لوگوں کا اپنے ابا کے سامنے بحث کرنا' دلائل دینا دیکھتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں۔ میں لب کھولتی تھی تو ابا ہاتھ اٹھا کر منہ سے کچھ کہے بنا "خاموش۔۔۔ ش ش ش۔۔۔" کا ایسا تاثر دیتے کہ دنوں بازگشت ہوتی رہتی۔
بھائیوں کے پاس گئی۔ انہوں نے کہا۔
"ایسے ہی سوال و جواب جواد کے آگے بھی کرتی ہو گی۔"
"ہاں جب ہی تو۔۔۔" بھابھیاں تائید کرتیں۔
اور دس سال بعد جب وہ شاہ میر سے ملنے آئے ہمیں لینے۔۔۔" وہ استہزائیہ ہنسیں۔ آنسو خشک ہو چکے تھے۔ سامعین کے بہہ رہے تھے البتہ۔



آگے کی کہانی آئرہ کو یاد تھی۔ اسے اتنے پڑھے لکھے پھوپھا پسند آئے تھے۔ سارا گھر خوش تھا' تجدید تعلق۔۔۔ اب پھوپھو اور شاہ میر اپنے گھر چلے جائیں گے۔ پھوپھا۔۔۔ شاہی پھوپھو سے کم گفتگو کرتے تھے۔ ہاں سب گھر والوں سے بڑا خوش گوار' ملنسار رویہ۔۔۔ نئے کاروباری تقاضوں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو۔۔۔ ایک جوش و خروش تبدیلی۔۔۔ وہ ہر ایک کے لیے تحفہ تحائف لائے تھے۔ سب خوش تھے۔ بالخصوص شاہ میر۔۔۔ وہ تو اپنے پاپا سے یوں گھلا جیسے ان ہی کے ساتھ رہتا ہو۔ دوستی' ساتھ' کوئی اجنبیت نہیں۔ گھنٹوں باتیں کرتے' گھومتے پھرتے' وہ پھوپھو کی اجازت سے شاہ میر کو اپنا آبائی گاؤں دکھانے تین دن کے لے گئے۔ اندرون سندھ شکار پر بھی ہوٹنگ کے لیے بھی۔
سب نے سن رکھا تھا۔ پھوپھو کے آنے کے بعد پھوپھا نے اپنی اسی دوست سے شادی کر لی تھی۔ آئرہ نے ماں کو یہ کہتے بھی سنا کہ اس عورت کے اولاد نہیں ہوئی۔ جب ہی شاہ میر یاد آ گیا اور امریکی خون کب ایک کھونٹے سے بندھا رہتا ہے۔ بھاگ گئی ہو گی اور خالہ زاد ہے شاہ جہاں۔۔۔ جواد کو لوٹنا تو تھا ہی۔۔۔ پھوپھا شاپنگ پر بھی لے کر جاتے۔ شاہی پھوپھو کو بھی لے گئے۔ کسی نئے پروجیکٹ کے لیے پورٹ قاسم کے علاقے جاتے تو شاہ میر تین تین دن کے لیے باپ کے ساتھ چلا جاتا اور واپسی پر بے انتہا خوش ہوتا۔ ایک ایک کو وہاں گزارے پل پل کی خبریں سناتا۔ پاپا کی تعریفیں الگ۔
اور ایسے ہی ایک وزٹ سے واپسی جب مقررہ وقت سے گزر گئی اور باپ بیٹا نہ لوٹے۔۔۔ تب۔۔۔ اس نے سو برے خیال سوچے' مگر وہی ایک نہیں جو ظہور پذیر ہوا تھا۔ باپ' بیٹا امریکہ جا چکے تھے۔
سو فون کالز کے بعد جواد کا خشک' روکھا' دوٹوک لہجہ

گھر والوں کے لیے اجنبی تھا' شاہی کے لیے نہیں۔

"ہاں۔۔۔ وہ میرا بیٹا تھا اور میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ برائے مہربانی اس معاملے کو یہیں ختم کردیں۔ ورنہ عمریں گزر جائیں گی۔ پیشیاں بھگتتے بھگتتے اور یہاں کسی کے اندر پیشیاں بھگتنے' مقدمے کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وقت نہیں تھا۔ لیکن اگر شاہی نے۔۔۔ وہ اتنی آسانی سے ٹھنڈی ہو کر کیوں بیٹھے گی۔ اتنا بڑا دھوکا' جان بند تھی اس کی بیٹے میں۔

اور شاہی پھوپھو کا چہرہ اس وقت ایک ایسی لاش کا تھا' جس کے جسم سے خون نچوڑ کر سفیدی رگوں میں انجیکٹ کردی گئی ہو۔ برفیلے عجائب گھر کے مجسموں کے جسموں میں بھی بنانے والوں کے ہاتھوں کی گرمی ہوتی ہے۔ شاہی اس سے بھی ٹھنڈی۔

اور ابا کے جملوں نے سب کو حیران کردیا۔ انہیں پہلی بار اپنے اردگرد سچائی رقص کرتی محسوس ہوئی۔ (جتاتی' ہنستی' منہ چڑاتی سچائی۔)

"میں کیس کردوں گا جواد پر۔۔۔ اس کی اتنی ہمت' اس نے۔۔۔ اس نے۔۔۔ ایسے کیسے آسانی سے وہ۔۔۔"

باپ کے دبنگ لہجے' اٹل ارادے نے دونوں بیٹوں کی رگوں میں بھی لہو کو گرمایا۔ "ہاں ایسے کیسے۔" تب شاہی کے ٹھنڈے ٹھار لہجے نے سب کو حیران و پریشان کردیا۔

"میں ایسا کچھ نہیں کروں گی بلکہ کوئی کچھ بھی نہیں کرے گا۔"

"مگر کیوں؟ شاہی ایسا کیسے کہہ سکتی ہے۔ اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"جواد سے ایسی وعدہ خلافی' دھوکا بازی' حیرانی کی بات نہیں' ناراضی کی بھی نہیں۔ وہ ایسا ہی تھا' بزدل شخص۔۔۔ ماں کے آگے اسٹینڈ لے کر اپنی من پسند عورت نہ اپنا سکا اور میری زندگی خوار کی اور اتنا ہی بزدل تھا کہ وہ ایسے چور راستہ سے آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے بیٹے کو لے کر جاتا۔"

"ہاں تو اسی بات کی تو اسے سزا دلوائیں گے' جواب طلبی کریں گے۔"

"میں نے کہا' ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ ایسا ہی منصوبہ ساز تھا۔ اس پر مقدمہ کروں تو جیت بھی جاؤں۔۔۔ مگر میں جیتنا چاہتی ہی نہیں۔ وہ جعل ساز تھا۔ دھوکے باز۔۔۔ مگر۔۔۔" شاہی کی آواز پہلی بار بھرائی۔

"میرے بیٹے کو کیا ہوا۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ اتنا بڑا فراڈ کیسے کیا۔ ایسے ایک دم تو ملک سے باہر نہیں چلے جاتے۔ بہت سے مراحل ہوتے ہیں۔ وہ سب سے گزرا اور ماں کو بتایا تک نہیں۔ آخری پل تک۔۔۔ جب نکل رہا تھا گھر سے' میں نے بال سنوارے' تب بھی نہ بولا۔ جلدی میں گلے ملنا بھول گیا اور پپی بھی نہیں دی۔ میں نے پکارا اسے تب بھی کچھ کہنا یاد نہ رہا' اور جب گاڑی میں بیٹھ کر جارہا تھا اور میں گاڑی سے اڑتی دھول تک کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتی رہی' تب اوجھل ہوتے ہوئے بھی نہ بولا کہ ماں آخری ملاقات ہے۔ جی بھر کے گلے لگالیں یا ایک پپی اور لے لیں۔

دفنانے سے پہلے چہرہ دکھا دینے کی رسم ہوتی ہے۔ مجھے مار کے جارہا تھا۔ دنیا داری ہی نبھالیتا۔ مجھے کسی پر مقدمہ نہیں کرنا۔ چلا گیا۔ چلو جہاں رہے' خوش رہے۔"

اور اس دن کے بعد کسی نے پھوپھو کے منہ سے جواد کا نام تک نہ سنا۔ شاہ میر کا تذکرہ نہ ہوا۔



"اس سب کے باوجود میں مردوں کو برا نہیں کہتی۔ بھابھیاں ایسے ہی بدگمان ہوتی ہیں اور پھر اس نے سب رابطے منقطع کردیے۔ بھائیوں کو کاروباری حوالے سے دھچکا لگا۔

میں مردوں کو برا نہیں کہتی' لیکن مجھے اب کوئی یاد نہیں آتا۔

دنیا میں کچھ مرد۔۔۔ مرد مومن بن کر آتے ہیں' تو کچھ مردود بن کے۔ نیکی اور بدی۔۔۔ ساتھ ساتھ چلتی ہے آئرہ! تم صرف آلو گوشت کے لیے گھر چھوڑ کر آگئیں؟"

اپنا رونا رو لینے کے بعد پھوپھو ایک دم پھر بہادر بن گئیں۔ جیسے ماضی پر لعنت بھیج دی ہو۔

"اس نے مجھے روکا بھی نہیں پھوپھو۔" آئرہ کو نیا دکھ یاد آیا۔

"اس نے جانے کو کہا تھا کیا۔" پھوپھو نے پوچھا۔

آئرہ نے ناک سکوڑتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"اسے بخار تھا نا۔ ڈاکٹر نے پہلے پٹیاں رکھنے کو کہا۔ پھر نہا لینے کا کہہ دیا۔ بخار پھر بھی کم نہ ہوا۔ دراصل وہ کچھا پہن کر لیٹا ہوا تھا نا.... میرا مطلب ہے۔ "دراصل ہم تو برمودا یا شارٹ کہتے ہیں۔ مگر یہ دونوں بھائی اسے کچھا کہہ رہے تھے۔ اس لیے میرے منہ پر بھی چڑھ گیا۔"

رنجیدہ روتے دھوتے ماحول میں شرمسار آئرہ کے منہ سے نکلنے والے جملے نے پھوپھو اور ابراد کے ہوش اڑا دیے۔ پھر جب معنی و تشریح کی گہرائی میں کودیں اور پھر یہ دقت ابھریں۔ تب ہنستے ہنستے مرنے کو ہو گئیں۔

"ہائے اللہ مر گئے۔"

خجل آئرہ دونوں کو دیکھتی رہی۔ ہنسی تھمی تو پوچھا۔

"اب میں اسے کیسے مناؤں گی پھوپھو؟ وہ مان تو جائے گا نا اور کیا آپ مجھے کھچڑی اور وہ بیماروں والا چکن کا دلیہ بنانا سکھا دیں گی؟"



دبئی سے واپسی پر....

ابراد کا تو خیال تھا کہ شام تک آفریدی بنفس نفیس خود آجائے گا۔ مگر ایک چھوڑ کتنی شامیں گزریں نہ وہ آیا' نہ اس کی کال آئی۔ یہاں تک کہ وہ اور شاہی پھوپھو کراچی لوٹ آئیں۔

زندگی اچانک کتنی اداس اور بے رنگ ہو گئی تھی۔ وہ ہر روز اپنا فیس بک اکاؤنٹ چیک کرتی۔ شاید شاہد آفریدی نے اسے جوائن کیا ہو۔

راہ چلتے بہت سے لوگوں نے پہچان لیا' پکار لیا۔ نہیں آیا اور نہیں بلایا تو اس بے درد نے۔ زندگی جن کے تصور میں.... حق ہا۔

لیکن آنٹی دست شناس نے کہا تو غلط تو نہیں کہا ہو گا نا۔ سوچ سوچ کر سر دکھ گیا۔

"مجھے ان کو کال کر کے ان سے آگے کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔" ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

اگلے روز شاہی پھوپھو کے پیچھے پڑ گئی اور چہرے پر جو امید اور مایوسی کا ملا جلا تاثر تھا' وہ پھوپھو کو مجبور کر گیا۔ دونوں نینی کے گھر پہنچ گئیں۔

آنٹی ابراد کو دیکھ کر ایسے خوش ہوئیں جیسے برسوں کے بچھوڑے کی ملن گھڑی ہو۔

دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں پھیلا کر ابراد کو ویلکم کیا۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے 'ایک وقت آئے گا۔ جب تم آفریدی کے نام سے اور آفریدی تمہارے نام سے پہچانا جائے گا۔ یعنی دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جائے گا۔ اس میچ کے بعد تم تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ تم دونوں ایک مضبوط رشتے میں بندھ گئے ابراد!

ان کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

"رشتہ...." ابراد نے ہونق پن سے پھوپھو کی صورت دیکھی۔

دونوں پھپھی' بھتیجی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کون سا رشتہ؟"

"ایک فنکار اور پرستار کا رشتہ.... ایک پاکیزہ اور انمول رشتہ.... ایک ایسا رشتہ جس پر کوئی حد نہیں لگتی۔ جسے ہر معاشرے میں عزت اور محبت ملتی ہے۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ جب جب آفریدی کی اس شان دار اننگ کو یاد کریں گے۔ تم لامحالہ یاد آؤ گی۔ تمہارے ذکر کے بغیر اس فتح کا ذکر ادھورا رہے گا۔ دراصل یہ رشتہ۔"

"کیا رشتہ.... کیسا رشتہ۔" ابراد کی آواز پھٹ جانے کو ہو گئی۔ "مجھے نہیں چاہیے ایسا رشتہ۔ مجھے تو...." وہ شدت غم سے مزید بول نہ سکی۔ آنٹی نے اچنبھے سے اس کی غم زدہ صورت دیکھی۔

"یہ رشتہ نہیں.... تو کون سا رشتہ.... کیسی شہرت'

تم چاہتی کیا تھیں؟"
"میں نے کیا چاہنا ہے۔" ارادا پنے ہاتھ چھڑا کر صوفے پر دھپ سے بیٹھی۔ "وہ تو میرا آئیڈیل تھا۔ مجھے شادی کرنا تھی اس سے۔"
"مگر اس روز تو تم کچھ اور ہی پوچھ رہی تھیں۔" آنٹی کو وہ دن من عن یاد تھا۔
"تو کیا دوستوں' بدتمیزوں کے سامنے منہ پھاڑ کر کہہ دیتی کہ....." اس نے ہائے کہہ کر سر پکڑا۔
"تو اب بھی تو کہہ دیا نا۔" پھوپھو کا صدمہ جاتا ہی نا تھا۔ دل کے حال کی تو انہیں بھی خبر نہ تھی۔



شاہی پھوپھو گیلری میں کھڑی نیچے سے گزرتی ٹریفک کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھیں اور مسلسل سوچ رہی تھیں۔ امتیاز بھائی نے کہا تھا" تمہارے یہ تماشے' حلیہ دیکھ کر لوگ کیا' کیا نہ سوچیں گے۔"
اور شاہ جہاں نے سوچا۔ لوگوں کو دوسروں کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے اور اگر سوچیں گے بھی تو بھلا کیا..... اور یہاں پر جوابات میں تضاد تھا۔ مگر ایک چیز یکساں تھی۔ سب مذاق اڑائیں گے۔ ٹھٹھا لگائیں گے کہ گھر اجاڑ کر کتنی خوش و خرم بیٹھی ہے۔ اسی کا قصور ہو گا۔ ہوتی ہیں بعض عورتیں اس فطرت کی جو اپنی آزادی و خوشی کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ بیٹے کے بغیر کیسی شاداں و فرحاں ہے۔ باپ' بھائیوں نے تو کہا تھا۔ ہم بیٹے کے حصول کے لیے کیس کر دیتے ہیں' مگر اسی نے منع کر دیا۔ تھی ہی سخت دل' جب ہی تو آزاد اکیلی رہتی ہے۔ اچھے لباس پہنتی ہے۔ میک اپ..... ہنسی مذاق.....
ہاں خوش ہوں تو بے حس..... جوگ لے لوں آنسو بہاؤں تو نحوست ڈال رکھی ہے' کا طعنہ سنوں۔ تو جب ہر دو صورت سننا ہی ہے' تو خوش کیوں نہ رہا جائے۔
بار بار سننے سے لطیفے سے ہنسی غائب ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک ہی غم کو زندگی بھر رویا کیسے جا سکتا ہے۔

ففتھ گریڈ کے پیارے سے بھولے بھالے بچے کی شکل کبھی بھولی ہی نہیں۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگا۔ اسے میں یاد بھی ہوں گی یا۔۔۔ کبھی دل چاہتا ہے' بس ایک بار مل جائے تو اتنا پوچھ لوں' میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ یا پھر شاید میں ہی غلط تھی۔ ساری کمیاں اور خامیاں میری ہی رہی ہوں گی۔ جب ہی تو سب مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور اتنے سارے لوگ ایک ساتھ تو غلط بھی نہیں ہوسکتے۔

وہ آنکھ سے جھر جھر بہتے آنسوؤں کو پونچھنے کا تکلف نہیں کررہی تھیں۔

نیچے سے دیکھنے والے کو ایک شان دار اپارٹمنٹ کی گیلری سے چائے کا مگ انجوائے کرتی' ہوا کھاتی عورت روتی کرلاتی' دکھائی دے بھی نہیں سکتی تھی اور آنسو بھی کب گواہی ہوتے ہیں دکھوں کی۔ کہنے والے ان کو بھی جھوٹا کہہ دیتے ہیں۔ ڈھکوسلہ۔

تو شاہ جہاں نے زندگی سے یہ بھی سیکھا کہ رونا اس بات کی ضمانت نہیں بن سکتا کہ آپ سچ مچ دکھی ہیں اور اسی طرح ہنسنا اس چیز کو ثابت نہیں کرسکتا کہ آپ واقعی خوش ہیں۔

اور وہ دیکھنے والے۔۔۔ وہ باتیں ہی بنائیں گے نا تو سن لوں گی۔ اتنے سال سے اور کر کیا رہی ہوں۔ زندگی میں مزید برا کیا ہوسکتا ہے یا اچھا۔ آخری سوچ نے دل کو طمانیت سی دی۔ بعض اوقات بے حسی اور لاتعلقی کتنی سکون بخش لگتی ہے۔

ڈور بیل کی آواز نے شاہی پھوپھو کو بالآخر آنسو پونچھنے پر مجبور کردیا۔ (وہی کوئی دیکھے گا تو۔۔۔ کیا سوچے گا۔)



سترہ یا اٹھارہ برس تک کا ایک لڑکا تھا۔ جو بیل بجانے کے بعد اپنی ایڑی پر گھومتا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔ خاکی پینٹ' خاکی بوٹ' خاکی جیکٹ اور ملے جلے ملگجے رنگوں کی شرٹ۔۔۔ اس کا جوتا اور گھڑی قیمتی تھی۔ لڑکے کے بالوں اور جلد میں بھی ایک سنہرا پن تھا۔ وہ ہونٹ کے کونے کو دانت سے بار بار پکڑ لیتا تھا۔

"یہ کون ہے۔" آئی ڈور سے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انہوں نے الجھ کر سوچا۔ دوبارہ بیل بجی۔ بیل کی آواز سے نووارد کے اضطراب کا پتا چلتا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس ایک کمانڈو اسٹائل کا بیگ بھی تھا۔

"کون ہو۔۔۔ کس سے ملنا ہے؟؟"

"میں۔۔۔ وہ۔۔۔ مجھے آئرہ امتیاز۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ آئرہ امتیاز کا گھر ہے نا۔" وہ دروازے سے بالکل منہ جوڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ آئرہ کا گھر وہ سامنے والا ہے۔" شاہی پھوپھو نے دروازہ کھول دیا۔ مگر حفاظتی چین لٹکتی رہی۔

"تم عاشر کے رشتے دار ہو؟" نوارد نے بیگ اٹھا کر اپنا رخ سامنے والے گھر کی طرف کرلیا۔

"نہیں' میں آئرہ امتیاز کا۔۔۔ وہ میری کزن ہیں۔ میں ان کی پھوپھو کا بیٹا ہوں۔"

جملہ مکمل کرتے ہوئے وہ عاشر کے گھر کی بیل بجا چکا تھا۔ رخ پھیر چکا تھا۔ جب شاہی نے اپنا دروازہ پورا کا پورا کھول دیا۔ شاہ میر کا دھیان ادھر نہیں تھا۔ وہ بہت عجلت اور بے چینی کے عالم میں بیل پر انگلی رکھ کے بھول گیا تھا۔

شاہی نے اس کا شانہ سختی سے پکڑا تھا اور پلک جھپکتے اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔

"اور میں آئرہ امتیاز کی پھوپھو ہوں۔"

شاہ میر کسی وہم میں مبتلا نہیں ہوا۔ رخ پھیرتے ہی پہلی نگاہ میں وہ پہچان کی تمام منزلیں طے کرچکا تھا۔ وہ کوئی انہیں بھولا تھوڑی تھا۔ نقش نقش ازبر تھا۔ کچھ بااختیار ہوکر انہیں ڈھونڈنے پانے کے لیے جانا سب مقاصد سے ہٹ کر بڑا مقصد تھا۔

وہ اس کے پیچھے کیوں نہ آئیں۔ اس سے اتنی محبت کرتی تھیں۔ اس سے لپٹے بغیر انہیں نیند ہی نہ آتی تھی۔ وہ سوچتا' وہ اتنے سالوں سے جاگ رہی ہوں گی کیا؟

اس نے باپ سے ان کے بارے میں پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے ہی نہ دیتے تھے۔

"تم میرے بیٹے تھے۔ اسی لیے میرے پاس ہو۔ یہ ساری جائیداد، بزنس سب تمہارا ہے۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ انجوائے کرو زندگی۔۔۔ تمہارے باپ نے تمہارے لیے سب کچھ جمع کرلیا ہے۔"

اور سب کچھ میں بس ماں نہیں تھی۔ ماں کا نام بھی نہیں تھا۔ لینا بھی منع تھا۔ وہ بس سوچتا، وہ جدائی میں اندھی نہ ہو گئی ہوں یا بولنا بھول گئی ہوں یا ہنسنا۔

امتیاز بھائی نے کہا تھا۔ شاہ جہاں کو یوں اچھل کود مچاتے اسکرین پر کس کس نے نہ دیکھا ہو گا۔ اللہ جانے کس کس نے دیکھا، نہ دیکھا۔

مگر شاہ میر نے دیکھ لیا، پہچان لیا اور حیران بھی رہ گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

وہ متزلزل سوچوں کے ساتھ جی رہا تھا۔ کبھی ان سے گلہ ہوتا کہ وہ اس کے پیچھے کیوں نہ آئیں۔ کبھی خود کو موردالزام ٹھہراتا۔ اسے جانا چاہیے تھا نا۔ وہ مرکز سے ہٹا تھا۔ وہ تو وہیں تھیں نا، مگر ہر بار رک جاتا۔

لیکن اب جیسے اضطراب کو کنارہ مل گیا۔ وہ اس کے بغیر اتنی خوش؟

ایک بار پوچھ تو آئے۔ بدگمانی سی بدگمانی۔ باپ کی کہی بہت سی باتیں درست لگنے لگیں۔

مگر ابھی جب۔۔۔ اس نے کہا "میں آئرہ امتیاز کی پھوپھو کا بیٹا ہوں اور پشت سے آواز ابھری۔

"اور میں آئرہ امتیاز کی پھوپھو ہوں۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"امی۔۔۔" وہ شاہ جہاں سے لپٹ گیا تھا۔ "میری امی!"



اور اس کے بے حد و بے حساب گلوں کے جواب میں شاہ جہاں نے اپنے دل کی ایک ایک بات اسے بتا دی جو کبھی کسی سے نہ کہی تھی اور یہ تو بالکل الگ داستان تھی اس سے۔

جس کی بنت خود اس نے کی تھی۔ کبھی کاٹ کر، کبھی اضافوں سے۔۔۔ اور اس سے بھی جو جواد اسے بتاتے تھے۔

وہ ان سے خفگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے خفا ہو کر بیٹھی تھیں۔

"پاپا مجھے امریکا لے گئے تھے۔ میں وہاں سے آنہیں سکتا تھا۔ پاپا نے مجھے وہاں کے اسکول اور ہاسٹل میں ایڈمیشن کرادیا۔ میں کہیں جا نہیں سکتا اور مجھ سے ملنے کے لیے ان کے علاوہ کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ جیسے میں کسی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ ہوں اور پھر انہوں نے آپ کو اتنا ڈی گریڈ کیا کہ۔۔۔" وہ لب بھینچ گیا۔

میں نے آپ تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کی ہے، شناختی کارڈ بننے کے بعد کرایہ جمع کرنا، ویزا حاصل کرنا یہ سب مشکل تھا امی! میں نے آپ سے رابطہ کرنے کے لیے کتنی کوششیں کی ہیں۔" وہ رو پڑا۔

کچھ دیر پہلے بھی شاہ جہاں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

اب بھی آنسو۔۔۔

تو طے یہ پایا آنسو کا رنگ ہونا چاہیے تھا۔ خوشی

کے لیے گلابی... سرخ... عنابی... نارنجی... دکھ کے... سیاہ... غم کے... سرمئی... اداسی کے... زرد... سکھ کے... سفید دودھیا...

اور آنسوؤں میں خوشبو بھی ہوتی تو کیا بات تھی۔

دل خوش ہو جائے نا تو ایسے اچھوتے خیال ہی آتے ہیں۔ کبھی آزما کر دیکھنا پڑے گا۔

☆ ☆ ☆

عین اسی لمحے بیا سر پکڑے بیٹھی تھی۔ آنٹی کی پیش گوئی کے مطابق اسے خوابوں کا شہزادہ تو مل گیا تھا۔ مگر یہ ایک بھوکا شہزادہ تھا جو ہر شے کھا جانا چاہتا تھا۔ کوئی نصیحت اس پر اثر نہ کرتی تھی۔

بیا کو اس کے لیے من پسند پکوان بنا کر دینا مسئلہ نہیں تھا۔ بات دراصل دکھ کی تھی کہ اگر وہ اتنے اچھے کھانے بناتی تو کیا خود نہ کھاتی۔ یہ ظلم ہوتا اس کی اپنی ذات پر... اس لیے ایسا کام کیوں کرے، جس سے دل اناد کھے۔

ہر لحاظ سے آئیڈیل شوہر میں اتنا بڑا فالٹ (خامی)... کاش کسی طرح پہلے پتا چل جاتا اور ایسا ہی ایک کاش... ابوذر کے پاس بھی تھا۔ بیوی دل و جان سے پیاری تھی۔ مگر اندازے کی اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی اور ہو گئی تو ہو گئی۔ مگر اسے سدھارا کیسے جائے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کو سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے اور خود کو ہی درست سمجھتے تھے۔ سو یہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کو کسی بھی فارمولے سے حل کیا جائے، جواب غلط ہی آتا ہے۔

اتنے اچھے میاں، بیوی... ہر لحاظ سے آئیڈیل

مگر.....

آہ...

☆ ☆ ☆

عاشر کو صبح صبح ایراد نے فون کر کے بتا دیا تھا۔ آئزہ آ گئی ہے۔ سو رہی ہے۔ عاشر کا دل بند ہوا۔ وہ ابھی تک خفا تھی۔ جب ہی تو اپنے گھر آنے کے بجائے پھوپھو کے گھر آئی۔ غلطی بھی تو اسی کی تھی۔ بس وہ بخار میں مبتلا ہو کر... سر پر چڑھ گیا تھا بخار، گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا۔

اب ایسا کیا کرے کہ وہ مان جائے... صبح ہوتے ہی ہاتھ پکڑ کر لے آوں گا۔ چیخے گی، چلائے گی، مگر میں منا لوں گا۔ اب یہ اتنا بھی مشکل نہیں۔ کان پکڑ لوں گا۔

وہ ہر طریقے سے خود کو قائل کر رہا تھا کہ کس کس طریقے سے اسے منا لائے۔ عاشر رومانٹک تھا۔ مگر آئزہ جتنی پریکٹیکل تھی۔ اتنا تو پریکٹیکل لیب میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ موم بتیوں اور گلاب کے سرخ پھولوں کے ساتھ منانا عاشر کو پسند تھا، مگر آئزہ نے پچھلی بار گلاب کے جا بجا پھیلے پھولوں کو دیکھ کر تاسف کا اظہار کیا تھا۔

''ایسے ہی پھول جا بجا بکھیر دیے۔ مجھ سے ایک کالر نے گل قند بنانے کی فرمائش کی تھی۔ ذہن ہی سے نکل گیا۔ اب پلیز یہ جو شاپرز میں موجود ہیں، ان کا حشر نہ کریں۔''

اور اس کے بعد عاشر نے کیا، کیا نہ سوچا، وہ جانے یا خدا جانے۔ لیکن ابھی ہاتھ پکڑ کر لانے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا کہ وہ سو تا رہ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دیکھا۔

وہ سیاہ جینز، لیمن شرٹ... وہی شاپرز کا ڈھیر اٹھائے اپنی مغرور ادا سے چلتی جا رہی تھی۔ گرد و پیش سے بے نیاز... بہت چوڑے گاگلز نے آدھے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اور میں نے اس ''بوجھ'' کو زندگی بھر اٹھانے کا عہد کیا تھا۔ عاشر کے دل پر اپنے اس ظلم و ستم پر آرے سے چل گئے تھے۔ یہ تو نے کیا، کیا عاشر... خود کو کوسنے کے بعد وہ آئزہ والا کوکنگ چینل کھول کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ شو شروع ہونے میں بڑا وقت تھا۔

پھر جب اسکرین پر تیار شیار بے حد پیاری آئزہ امتیاز جلوہ گر ہوئی، تب عاشر دل تھام کر رہ گیا۔ وہ اپنے وہی مخصوص پنیر پکوڑے، براؤن کڑی اور ڈیزرٹ بنا

رہی تھی۔ ساتھ ہی لائیو کالز کا سلسلہ بھی تھا۔
"آئرہ جی! کہتے ہیں 'مرد کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ میرے میاں مجھ سے خفا ہیں' پلیز کچھ ایسا پکانا سکھادیں 'وہ مان جائیں۔" ایک کالر بن بن کر کہہ رہی تھی۔
آئرہ نے پتیلی میں چمچہ لہرا کر آنچ دھیمی کی اور مسکرائی۔
"کھانے کے لیے آلو گوشت بنالیں اور خفگی کے لیے منالیں۔ جیسے کہ میں... سوری عاشر... غلطی میری تھی... پلیز۔"
عاشر کے سر پر چھت گر پڑتی 'تب بھی... کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بولتی آئرہ کے جملے سے جو تباہی دل پر بپا ہوئی۔
"بھئی 'میرے میاں خفا ہوں تو میں تو کم از کم ایسے ہی مناؤں۔ اگر آپ غلطی پر ہیں تو پہل کرلینی چاہیے اور اگر غلطی آپ کی نہیں ہو 'تب بھی آگے بڑھ کر کہہ دیں کہ چلیں اب بس بھی کردیں' دوستی کرلیں' انہیں خود احساس ہوجائے گا۔"
تسلی سے بیٹھا عاشر کھڑا ہوگیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ آئرہ اور ایسا انداز... اس نے کالر کا مسئلہ بھی حل کیا۔ معافی بھی مانگ لی اور بات کو سنبھال بھی لیا۔
وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر آئرہ کو سننے لگا جو کالر کی فرمائش پر کسی ڈش کے سکھا دینے کا وعدہ کررہی تھی۔
اور ابھی پروگرام کے آخری پانچ منٹ باقی تھے۔ جب تیمور نے بھابھی کہہ کر انگلی سے کچھ ایسے اشارے کیے جو آئرہ کے سر سے گزرے 'پھر اس نے دیکھا' کیمرہ مین سے بہت پیچھے وہ عاشر تھا۔ دونوں ہاتھ کان پر دھرے تھے 'چہرہ شرمسار۔
"ابراد کو سارا پروگرام دے دیا تھا۔ ناک سے لکیریں کھینچنے کی عملی پریکٹس بھی کی تھی' دیکھو میری سرخ ناک... مگر بس پھر میں سو تارہ گیا۔"

"مجھے کسی کی گواہی نہیں چاہیے۔" آئرہ مسکرائی۔ "کہانی ختم۔"
اور تیمور سوچ رہا تھا۔ زندگی میں ایک آہ 'کمی' کسک رہ جانی ہے' رہ جانی بھی چاہیے کہ پھر زندگی جمود کا شکار نہ ہوجائے۔ رواں مکمل چیزوں کو ان کے ذرا سے نقص کے ساتھ قبولنا چاہیے۔
کاملیت اور پرفیکشن ملنی ناممکن ہے کہ جب انسان خطا کا پتلا ہے۔
شاہ میر سوچ رہا تھا۔ باپ مل گیا تھا۔ اب ماں سے بھی مل لیا۔ مگر دونوں سے اکٹھے ایک جگہ شاید کبھی نہ مل سکے۔ وہی ایک کمی۔ ایک کسک 'آہ سینے میں دبی رہ جاتی ہے۔
ابراد کے دل سے بھی دھواں اٹھتا تھا۔ اتنی کامیابی' اور اتنی ناکامی 'کیا' کیا نہ سوچا تھا۔ ایک دوسرے کے نام سے مشہور تو ہوگئے۔ مگر دل پھر بھی خوش نہ ہوا' آہ ہاہ...
اور ان سب سے پرے شاہد آفریدی سوچ رہا تھا۔ اتنی کم عمر سی پیاری فین کا جاکر شکریہ ادا کرنا تو بنتا ہے۔
آپ جتنے بھی بڑے کھلاڑی ہوں 'کتنا بھی اچھا پرفارم کرلیں۔ اگر آپ کے کانوں میں ہمت بڑھاتے جملے اور نعرے نہ پڑیں تو مورال کیسے ڈاؤن ہوجاتا ہے۔
لیکن وہ بس تصاویر دیکھ کر ہی شکر گزار ہوسکتا تھا۔
اگر ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک ملاقات کو چلا بھی جائے تو میڈیا کا تو پتا ہے نا کیسے... پر کا کوا بنا لیتے ہیں۔
سو اس نے بھی ایک ٹھنڈی آہ بھری اور صفحہ پلٹ دیا۔



رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال، ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ، عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی





رخصتی کی بات کرتی ہیں۔وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔
حمیدہ خالہ 'عاصمہ' کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔لوگ باتیں بنارہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے 'سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہوجاتا ہے۔
رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہوجاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہوکر بشریٰ اور اس کے گھر والوں کو موردالزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔اس کا ابارشن ہوجاتا ہے۔عدیل شرمندہ ہوکر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔
اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہوکر پاکستان آجاتا ہے۔عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کرکے اس کے سارے راستے بند کردیے ہیں اور اب مفرور ہے۔بہت کوششوں کے بعد ہاشم 'عاصمہ' کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔
بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کردیتی ہے۔دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔عدیل سخت پریشان ہے۔عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروادیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔مثال بیمار پڑجاتی ہے۔بشریٰ بھی حواس کھودیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔عدیل 'عمران پر اغوا کا پرچا کٹوادیتا ہے۔
عاصمہ اسکول میں ملازمت کرلیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہوجاتا ہے۔
انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل 'مثال کو لے جائے' تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کرسکیں۔دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔
انسپکٹر طارق 'ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ذکیہ بیگم خوش ہوجاتی ہیں 'مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔
بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کرلیتا ہے 'پھر شادی کے ناکام ہوجانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔بشریٰ تذبذب کا شکار ہوجاتی ہے۔
بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی 'پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہوجاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال 'بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کرلیتا ہے۔والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشریٰ

اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال 'واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار' وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

۲۰

بیسویں قسط

سب کچھ ویسے ہی تو تھا۔

یوں جیسے وہ ابھی تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر کچن میں گئی تھی اور اب یہاں بیٹھی کسی مہمان کا انتظار کر رہی ہو۔

اسے لگا جیسے وقت کا پہیہ اسے بے آواز پروں پر اڑاتا بیس سال پیچھے لے آیا ہو۔

جب وہ اس گھر کی مالک تھی۔ گھر کے مالک کا سب کچھ اور سب کچھ' کتنی جلدی 'کچھ بھی نہیں' میں بدلتا ہے اس کا تلخ ترین تجربہ اسے ہو چکا تھا۔

وہ تجربے کی اس جلتی بھٹی سے گزر آئی تھی۔ اگرچہ فرنیچر بدلا جا چکا تھا۔ پردے بھی بیس سال پہلے والے نہیں تھے۔ دیواروں پر ہوا رنگ و روغن بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ مگر ڈرائنگ روم کی وسعت ابھی بھی اتنی ہی تھی جب وہ یہاں ہوا کرتی تھی اور سامان کی ترتیب بھی وہی تھی' جو اس نے شادی کے اولین دنوں میں عدیل اور فوزیہ کے ساتھ مل کر کی تھی۔

پھر بدلاؤ کہاں تھا؟

عجیب بھٹکے بھٹکے خیالات اسے آرہے تھے۔ اس نے زور سے دونوں کنپٹیوں کو دبایا۔ اسے چکر آرہے تھے۔

اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے بہت شدت سے احساس ہوا۔ جانے عدیل کیا سمجھتا۔ اس کی بیوی جس کا چہرہ اتنا' سپاٹ اتنا برفیلا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی الجھن کیسے بڑھی تھی۔

مثال یہاں اس گھٹے ہوئے گھر میں اس سخت رو عورت کے ساتھ باقی کی زندگی کیسے گزارے گی؟

عدیل.... یہ ہم دونوں نے اپنی بیٹی کو کس امتحان میں ڈال دیا۔ اس کی پوری زندگی کو ایک آزمائش بنا دیا اور خود اسے عبرت کا نشان.... دوسروں کے لیے مثال!

تم اس قسم کی مثال بنانا چاہتے تھے اسے سب دنیا کے والدین کے لیے۔

نہیں میری مثال جیسی قسمت تو کسی ماں باپ کی بیٹی کی نہیں ہو۔ کاش! اس وقت طیش غصے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ضد نے ہم دونوں کو یوں اندھا نہ کر دیا ہوتا۔

صرف ایک بار۔۔۔ ایک بار ہم دونوں رک کر اپنی اس معصوم بیٹی کے بارے میں کچھ تو سوچ لیتے کہ ہم دونوں الگ ہو جائیں گے تو اس کا کیا بنے گا۔

ہماری بیٹی تو رل گئی ہے اس کی زندگی تو عام لڑکیوں جیسی رہی ہی نہیں۔ اور جو کچھ اس رات اس کے ساتھ میرے گھر میں ہوا اگر وہ تمہیں بتا دیتی۔۔۔

مگر نہیں کیسے بتاتی۔۔۔ میں جانتی ہوں جیسی انجان ماں میں ہوں ویسے ہی بے خبر باپ تم بھی ہو۔

تم اپنی نئی بیوی اور دو بچوں کے سامنے جواب دہ ہو۔ چاہتے ہوئے بھی اپنی اس مظلوم بیٹی سے محبت پیار کے دو بول اکیلے میں بھی نہیں بول پاتے ہو گے۔ بالکل میری طرح جس نے ممتا کا گلا گھونٹتے گھونٹتے دیکھو بالکل ہی اس کی محبت کو ختم کر دیا۔

میری مثال۔۔۔

''مما آپ!'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے آواز سسکیوں سے روتے ہوئے خود احتسابی میں مصروف تھی۔

وہ قطعاً'' بھول چکی تھی کہ وہ کہاں موجود ہے۔ مثال کی مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ یونہی ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ذرا سا گھومی۔ بہت آہستگی سے اس نے اپنی بے کاجل آنکھوں کو مسلا۔

مثال ماں کے پیچھے بالکل ساکت کھڑی تھی۔

''بس گھنٹے بھر میں نکلنا تھا ہمیں' تو یونہی مجھے لگا مجھے جانے سے پہلے تم سے ضرور ملنا چاہیے۔ بھلے ذرا سی دیر کے لیے ہی۔۔۔ میں تم سے مل آؤں۔''

وہ رک رک کر خود کو سنبھالتے ہوئے بے ربطگی سے بول رہی تھی۔ منہ نیچے کیے پرس میں کچھ تلاشتی ہوئی مثال سے بہت کچھ چھپانے کی سعی کرتی بشریٰ۔ ایک دم سے مثال کو بہت مظلوم لگی۔

''آپ فون پر بات کر لیتیں۔'' وہ ماں کی حالت سے آنکھیں چرا کر بے تاثر لہجے میں بولی۔

بشریٰ نیا ٹشو نکال کر اپنی آنکھیں اور چہرہ خشک کر چکی تھی اور ایک مصنوعی سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر سجا چکی تھی۔

''جان! معلوم نہیں پھر کتنے عرصے کے بعد واپسی ہو۔۔۔ ہو بھی یا۔۔۔'' اس سے آگے وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پائی اور متجسس عفت باہر کھڑی کچھ اور بھی دروازے کے ساتھ چپک گئی۔

مثال کچھ بھی نہ بول سکی۔ اسے بھی امید نہیں تھی کہ اب اس کی ماں بھی واپس آسکے گی۔

وہ آنکھوں میں اترتی نمی کو چھپانے کے لیے ایک طرف پڑے بے ترتیب کشنز کو ترتیب دینے لگی۔

بشریٰ بے بسی سے مثال کے نازک جسم کو دیکھے گئی۔

''کتنی کمزور ہو گئی ہے مثال ان چند دنوں میں' اس خوفناک رات کا اس نے بہت اثر لیا ہے۔'' اس نے دل میں خود سے سرگوشی کی۔

''مثال!'' وہ اس کے پاس آکر بہت آہستگی سے بولی۔

''جی ماما!'' مثال خود کو سنبھال چکی تھی۔ مڑ کر نارمل لہجے میں بولی۔

''تم نے یہاں۔ میرا مطلب ہے گھر میں۔ اپنے پاپا سے کچھ کہا تو نہیں؟'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔

مثال نے الجھن بھری نظروں سے ماں کو دیکھا اور دوسرے لمحے جیسے سمجھ کر بے اختیار نظریں چرا گئی۔

''سیفی کے بارے میں؟'' بشریٰ سرگوشی میں بولی۔

مثال نے بمشکل نفی میں سر ہلایا۔ بشریٰ اسے دیکھتی رہ گئی اور پھر جیسے اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ مثال کو ساتھ لپٹائے بے آواز آنسوؤں سے روتی چلی گئی اور گھر میں داخل ہوتا عدیل' عفت کو دروازے

سے یوں چھپکے دیکھ کر متجسس انداز میں آگے بڑھا۔
اور کھلے دروازے سے بشریٰ کو مثال سے یوں لپٹ کر روتے دیکھ کر لحہ بھر کو چونکا اور پھر شکستہ قدموں سے واپس مڑ گیا۔
جیسے اس کے دل نے ابھی گھر کے راستے کی طرف مڑتے ہوئے اسے خبر کی تھی کہ گھر میں بشریٰ ضرور موجود ہو گی اور وہ جاتے ہی اسے دیکھ لے گا۔ اس کا گمان یا اس کی خواہش ضرور پوری ہوئی تھی۔
مگر یہ سب چند لمحوں کا کھیل تھا۔
ایک نہ کہہ سکنے والی حسرت...! اس کے واپسی کے قدموں نے عفت کو چونکایا۔ وہ عدیل کو جھکے کندھوں کے ساتھ واپس جاتے دیکھ کر کچھ چونکی، کچھ شرمندہ ہوئی۔
واپس مڑ جانے کے سوا اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا جبکہ دل خواہش مند تھا کہ ان ماں بیٹی کے اس جذباتی منظر کا پس منظر ضرور جان کر رہے۔
وہ عدیل کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔



دو بہت خوب صورت سونے کے جڑاؤ کنگن تھے، جو بشریٰ نے اپنی پرس سے نکالے تھے۔

ہاتھوں میں لیے انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ مثال ماں کے پاس بالکل خاموش بیٹھی تھی۔
بشریٰ نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی مگر پھر ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔
"یہ کنگن میرے تھے کبھی... تمہارے پاپا نے دیے تھے، مجھے شادی کے وقت۔" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی کہ کچھ ایسا اس کے منہ سے نہ نکل جائے جو اس کی ابھی بھی عدیل سے وابستگی کو ظاہر کرے۔
"میں اس گھر سے نکالی تو خالی ہاتھ گئی تھی لیکن بعد میں ڈائیورس کے بعد..." ایک دم سے بشریٰ کے سینے میں درد کی تیز لہر اٹھی تھی۔
اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی۔ چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے چھاتا اندھیرا... اسے لگا اس کی موت اسے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ درد کی لہر جیسے پورے سینے میں پھیلتی چلی گئی۔ وہ نڈھال سی ہو کر صوفے کی پشت سے لگ گئی۔ مثال نے پریشان ہو کر ماں کو دیکھا۔
ماما! آر یو آل رائٹ... کیا ہوا ہے آپ کو... درد ہو رہا ہے کہیں؟" وہ بے اختیار ماں کو کندھوں سے تھام کر کانپتی آواز میں بولی۔
بشریٰ زرد چہرے کے ساتھ آنکھیں بند کیے نفی میں سرہلاتی گئی۔
"آپ... آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ میں پاپا کو... ڈاکٹر کو بلا کر لاتے ہیں۔"
"نہیں مثال بیٹا... میری جان!" بشریٰ نے پورا زور لگا کر خود سنبھالا۔ اس کی پیشانی ٹھنڈے پسینے میں نہا گئی تھی۔ درد سینے میں ابھی بھی تھا مگر اس کی شدت کم تھی۔
"ماما پلیز! آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ میں پاپا کو بلاتی ہوں کال کر کے۔" مثال کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بشریٰ کو اپنی بیٹی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔
"مثال میری بیٹی! کاش میں امی کی بات نہیں مانتی۔ میں احسن کمال سے شادی نہیں کرتی تو آج مجھے یوں تمہیں خود سے جدا نہیں کرنا پڑتا اور اتنی دور کہ جہاں سے واپسی کی بھی کوئی امید نہیں۔ یہ دوری کا جان لیوا احساس جیسے مجھے ختم کر رہا ہے۔ کاش! میں نے احسن کمال پر بھروسا نہیں کیا ہوتا۔"

اتنے سالوں بعد گہرے ملال نے اسے آگھیرا تھا۔

"پلیز مما! ایسی باتیں نہیں کریں۔ یوں بھی یہ آپ کی تقدیر میں لکھا تھا آپ چاہتیں یا نہیں۔ اسی طرح ہونا تھا۔" مثال چہرہ جھکائے سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں اسی طرح ہونا تھا۔ دو بے حس' کٹھور مردوں کی زندگی میں مجھے ایک کٹھ پتلی کی طرح آنا تھا اور....." وہ تکلیف سے کراہی۔

"مما پلیز۔" مثال کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔

"نہیں مثال! میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ نہ تم یہ سمجھنا کہ تمہاری ماں خود کو ہر الزام سے بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔" وہ نقاہت زدہ لہجے میں رک رک کر بول رہی تھی۔

"میں نے آپ کو کوئی الزام نہیں دیا مما!" مثال بے تاثر لہجے میں بولی۔

"تمہاری یہ بے روح زندگی جس میں کوئی خوشی' کوئی ولولہ' کوئی امنگ نہیں ہے۔ ہم دونوں نے اپنی ضد اور خود غرضی میں ایک الزام بنا دیا۔ مثال! ہم دونوں چاہیں بھی تو خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔"

وہ کسی دائمی مریض کی طرح کمزور لہجے میں بول رہی تھی۔ مثال کو لگا۔ اس کی ماں شاید آخری دموں پر ہے۔ وہ ڈر کر اسے دیکھنے لگی۔

اسی وقت بشریٰ کا فون بج اٹھا۔ وہ بے تاثر آنکھوں سے احسن کمال کے بلنک کرتے نام کو دیکھتی رہی۔

"مما! فون سن لیں۔" مثال ایک بار فون بجنے کے بعد پھر بجنے پر آہستگی سے بولی۔

"میں آرہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں۔ راستے میں ہوں۔" اس نے میکانکی انداز میں فون کان سے لگا کر کہا اور فون بند کر دیا۔

کمرے میں فون کی رنگ ٹون کے بند ہوتے ہی گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی۔

"مثال! سیفی والے واقعے کے بعد میری بچی! تم اتنا تو سمجھ ہی گئی ہو گی کہ تمہیں اپنی حفاظت کس طرح کرنی ہے۔" مثال ناسمجھی سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"کاش! میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتی۔ لیکن نہیں اگر میں تمہیں ساتھ لے بھی جاتی تو بھی تمہارا خیال نہیں رکھ پاتی۔" وہ یونہی کرب سے ہنسی۔

مثال اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"اپنا بہت خیال رکھنا مثال! اور زندگی اس طرح سے نہیں گزارنا جیسے گزارتی آئی ہو۔ آنکھیں بند کر کے ڈر کر اور خوف زدہ ہو کر۔" معلوم نہیں بشریٰ اصل میں اسے کیا کہنا چاہتی تھی۔

"تھوڑا انڈی پینڈنٹ ہونا سیکھو..... یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ تمہارا حق ہے یہاں۔ میں تو اپنا حق ادا نہیں کر سکی مگر یہاں تم اس طرح سے رہنا جیسے کوئی بیٹی اپنے باپ کے گھر رہتی ہے۔ جو بھی مسئلہ ہو' پاپا کو سب سے پہلے باخبر کرنا۔ عدیل بہرحال تمہیں مجھ سے زیادہ چاہتا ہے۔"

پتا نہیں اس بات کو جاننے میں اس کا اقرار کرنے میں بشریٰ نے اتنے سال کیوں لگا دیے۔ اگر وہ یہ بات پہلے سمجھ جاتی تو مثال کی زندگی ایسی شٹل کاک جیسی نہیں ہوتی۔ وہ صرف عدیل کے ساتھ رہتی۔ بھلے ماں کو یاد کرتی مگر ایسی زندگی تو نہ جیتی۔

مگر اب اس گلے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ خاموش ماں کو دیکھتی رہی۔

"یہ کنگن بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھنا۔ یہ تمہارے لیے میں نے سنبھال کر رکھے تھے۔ میں فون کرتی رہوں گی اور تمہارے لیے بہت دعائیں بھی۔" وہ نم لہجے میں رخ پھیر کر بولی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ

چھپا رہی تھیں اور جب بشریٰ گاڑی میں بیٹھ کر جا رہی تھی۔ مثال کو لگا۔ وہ اپنے دل کی سب نہ سہی بہت باتیں تو کر گئی مگر مثال کے دل کی کوئی بات نہیں سن کر گئی۔

اس کے دل کی باتیں جو اسے اپنی ماں سے کبھی کرنا تھیں' سب دل ہی میں رہ گئیں۔

مثال کو لگا یہ ساری باتیں اب اس کے ساتھ ہی کہیں اندر فنا ہو جائیں گی۔

وہ بشریٰ سے اب کبھی نہیں مل پائے گی اور نہ وہ باتیں کر پائے گی۔

اس نے آنکھوں پہ تنتی دھند کی چادر میں شام کی مٹیالی روشنی میں دور جاتی بشریٰ کی گاڑی کو دیکھ کر ہاتھ بھی نہیں ہلایا۔

وہ یوں ساکت' بے حس اور غم زدہ کھڑی تھی جیسے کوئی اپنے بہت قریبی عزیز کو اس دنیا سے آخری بار جاتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔

اس کی کلائی میں بشریٰ کے ڈالے ہوئے کنگن تھے اور دل ان کہی باتوں کا بوجھ لیے بھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔



عدیل کھڑکی کا پردہ تھامے بے حس و حرکت کھڑا بوجھل قدموں سے جاتی بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔

جو گاڑی کے دروازے کے پاس پہنچ رکی تھی۔ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی' پھر جیسے اپنی ہمت جمع کر کے اس نے آخری بار مڑ کر گیٹ پہ کھڑی مثال کو دیکھا۔ اور جانے کیسے اس کی نگاہ پلٹتے ہوئے بے اختیار کھڑکی میں کھڑے عدیل پہ آکر ٹھٹک گئی۔

ایک پل.... دو پل.... بہت سے خاموش ساکت پل ان دونوں کے ارد گرد جیسے دھول اڑاتے گزر گئے۔

آج اتنے سالوں میں پہلی بار بشریٰ کی آنکھوں میں عدیل کے لیے شکایت' شکوہ' نفرت' حقارت' طنز کچھ بھی نہیں تھا۔ غصہ بھی نہیں۔ دکھ بھی نہیں۔

صرف جدائی تھی.... دائمی جدائی۔

اور عدیل کی آنکھیں تو جیسے برسوں سے کچھ بھی کہنا بھول چکی تھیں' قریب سے کوئی گاڑی ہارن بجاتی گزری۔

اور بشریٰ نے بے اختیار ان ان کہی آنکھوں سے نظریں چرائیں اور میکانکی انداز میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دونوں طرف کے شیشے چڑھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔

عدیل اسے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔

"کافی خوب صورت رہ چکی ہے آپ کی پہلی بیوی' بلکہ میں تو کہوں گی اس میں ابھی بھی ایک چھوڑ دو دو مردوں کو لبھانے بلکہ ٹھکانے کے لیے کافی حسن' پرسوز حسن موجود ہے۔"

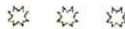
عفت جانے کب اندر آئی تھی۔ عین عدیل کے کندھوں کے پیچھے سے باہر کی طرف جھانکتے ہوئے سر سراتی آواز میں بولی۔

باہر بشریٰ کی گاڑی کی ٹیل لائٹیں مٹیالی روشنی میں گم ہو رہی تھیں۔

عفت کو کچھ عرصے سے نسیم بیگم کے لہجے میں بات کرنے کی عادت ہو چلی تھی۔ اگرچہ دونوں میں پیچھے سے بھی کوئی قریبی یا دور کا رشتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی عادتیں نہ سہی خصلتیں جہاں ملتی ہوں وہاں رشتوں کے قریبی یا دور ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"کیا ہمیشہ کے لیے چلی گئی وہ؟" عدیل کی خاموشی بہت گہری خاموشی عفت کو چبھ رہی تھی۔ وہ چائے میں چینی

گھول رہی تھی اور لہجے میں زہر۔
وہ جواب میں پھر خاموش رہا' صرف منتظر نظروں سے چائے کے ملنے والے اس کپ کو تکتا رہا جس میں عفت مسلسل چمچہ چلائے جا رہی تھی۔
"پری کی کلاسز کب سے اسٹارٹ ہو رہی ہیں۔" بہت دیر بعد جب عفت جی بھر کر اپنا جی جلا چکی تو عدیل نے بہت غیر ضروری سوال کیا تھا۔ بہت بے نیاز لہجے میں۔
"پری سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ جلے بھنے لہجے میں کلس کر بولی۔
کمرے کا ماحول بہت اجنبی سا ہو رہا تھا۔
ورنہ آج تو عفت نے سوچا تھا کہ وہ شام میں عدیل سے دانیال کے بارے میں بات کرے گی کہ اگر وہ اپنے بچپنے میں ضد پہ اڑ گیا ہے تو عدیل کو دل بڑا کر کے بچے کو خود سے بلا لینا چاہیے اور آئندہ اپنا زیادہ وقت دانی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ بہرحال وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔
مگر اس منحوس بشریٰ نے تو اسے جیسے سب کچھ بھلا ڈالا تھا۔
وہ تیز تیز گرم چائے پیتی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا کپ بھی بغیر شکر ڈالے پی گئی۔
عدیل تو وہاں موجود ہی نہیں تھا جو نوٹس کرتا کہ عفت کے چہرے پر غصہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔
"دانیال کو میرے پاس بھیجو۔" وہ جل کڑھ کر برتن اٹھا کر لے جا رہی تھی جب عدیل نے سرد لہجے میں کہا۔
عفت بے اختیار ٹھٹک کر رک گئی۔ عدیل کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگی کہ کہیں دانی کی کلاس تو نہیں ہونے والی۔
"اکیڈمی تو وہ جا نہیں رہا تو پھر گھر پر ہی ہوگا ناں تو بھیجو اسے میرے پاس۔" عدیل اسے یوں کھڑے دیکھ کر جتانے والے انداز میں بولا۔
"ہاں مگر...." عفت کچھ متذبذب سی ہوئی۔
"کیا وہ یہاں میرے پاس نہیں آئے گا؟" عدیل کچھ ترش سے بولا۔
"نہیں یہ بات نہیں ہے عدیل!" وہ اب کے کچھ صلح جو نرم لہجے میں بولی۔
"بچہ ہے تو...." وہ لجاجت سے کچھ کہنے جا رہی تھی۔
"تو کیا اس نواب کے پاس مجھے چل کر جانا چاہیے۔ یہ کہنا چاہتی ہو تم؟" عدیل نے اس کے لہجے سے اخذ کرتے ہوئے سخت انداز میں کہا۔
"اس وقت اسے کچھ بھی کہنا بے کار ہوگا۔" عفت اجنبی سے عدیل کو دیکھ کر رہ گئی۔
"بھیجتی ہوں میں ابھی اسے۔" وہ سر ہلا کر مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔
اور عدیل کے پاس تو اب جیسے سوچنے کو بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ خالی خالی سا بیٹھا سامنے کھڑکی سے باہر اندھیرے کی گود میں اترتی شام کو دیکھتا رہ گیا۔



"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ میرا تو بہت دل خوش ہوا ہے واثق۔ اس لیے کہ تمہیں اپنی جاب بھی پسند آگئی ہے اور کام کرنا بھی اچھا لگ رہا ہے۔"
عاصمہ بہت خوش تھی۔ واثق کے چہرے پر بھی ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ اس کے مطمئن ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

''اور میرے خیال میں پیکج تو ہے ہی بہت اچھا۔'' عاصمہ نے خوش گوار لہجے میں آخری بات کی۔
''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شہزاد اتنا ٹو کسڈ بزنس مین بن جائے گا۔ بہت محنتی اور کری ایٹو۔ مجھے بہت مزا آیا اس کے ساتھ کام کر کے۔ حالانکہ اسٹوڈنٹ تو وہ ایویں سا ہوتا تھا۔'' واثق کی ہمیشہ والی عادت کہ ہر بات عاصمہ سے شیئر کرنا۔
''ہوتا ہے۔ اکثر جو اسٹوڈنٹ بہت اچھے 'ذہین طالب علم نہ ہوں مگر عملی زندگی میں ان کا رویّہ بالکل مختلف ہو۔'' عاصمہ سر ہلا کر بولی۔
''افوہ بھئی! آپ دونوں کیا یہ بور باتیں کیے جا رہی ہیں آدھے گھنٹے سے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بھائی کو اتنی اچھی جاب مل گئی۔ دیٹس آل! اب کیا سارا وقت مسٹر شہزاد کو ہی یاد کرتے رہیں گے۔'' وردہ نے چائے ان کے آگے رکھتے ہوئے کوفت و بے زاری سے کہا تو عاصمہ اور واثق ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔
دونوں بہنوں کے چلے جانے کے بعد وردہ اب خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ بات دونوں کو محسوس ہوئی تھی۔
''اچھا تو آپ بتا دیں ہم کیا باتیں کریں۔ مثلاً'' آپ کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں اور ایگزام...'' واثق مسکرا کر چائے کا کپ اٹھا کر بولا۔
''فار گاڈ سیک بھائی! اس دنیا میں پڑھائی امتحان اور اس جیسے ڈرائی ٹاپک کے علاوہ بھی بہت سی اچھی اچھی چیزیں ہیں سوچنے کے لیے۔ بات کرنے کے لیے۔'' وہ بے اختیار اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی وہ دونوں ہنس پڑے۔
''اچھا تو کون سی اچھی اچھی چیزیں اور باتیں ہیں ایسی جن پر ہم بات نہیں کرتے' آپ بتا دیجئے۔''
واثق سر ہلا کر مزے سے بولا۔
''یہ بات!'' وہ جیسے منتظر تھی اس کی دعوت کی۔ فوراً'' ہی خوش ہو کر بولی۔
''مما... ویسے جس طرح بھائی کو جاب مل گئی بقول آپ دونوں کے بہت شان دار' زبردست وغیرہ وغیرہ تو ایسے میں کسی بھی ماں کو اپنے خوبرو' ہینڈسم بیٹے کے لیے پہلا خیال بھلا کیا سوجھتا؟''
وہ ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شوخی سے بولی۔
عاصمہ نے کچھ ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ واثق بھی کچھ چونکا تھا وہ کچھ سمجھ گیا تھا کہ وردہ کا اشارہ کس طرف ہے۔
''نہیں سمجھیں مماجان؟'' وہ پھر سے بولی۔
عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''افوہ! یہ بھی میں بتاؤں۔'' وہ جھلا کر بولی۔
''بھائی کے لیے بہت پیاری سی خوب صورت سی ان کے جیسی حسین و جمیل دلہن ہماری بھابھی اور آپ کی بہو ... کیا کہتی ہیں؟'' وہ خوب مزا لے کر بولی۔
عاصمہ نے بہت حیرانی سے واثق کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔
''ارے یہ اتنی قریب کی اتنی اچھی بات مجھے کیوں نہیں سوجھی بھلا؟'' وہ حیرانی سے بولی۔
''تو پھر مانتی ہیں ناکہ آپ کی بیٹی کتنی جینئس ہے۔ صرف تعلیمی قابلیت ہی ذہانت کی علامت نہیں ہوتی۔ پریکٹیکل لائف میں اس طرح کی باتیں سوچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔'' یہ وہ خود کو سراہتے ہوئے بولی۔
''جی یہ صرف بہت ہی نکمے لوگوں کا مشغلہ ہے ورنہ ذہین لوگ تو ایسی فضول باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔'' واثق

نے اسے چھیڑا۔
"مما!" وہ چڑ کر بولی "ایک تو ان کے فائدے کی بات کر رہی ہوں اور یہ آگے سے مجھے نکما کہہ رہے ہیں تو بیٹھے رہیں پھر اس فضول سے شہزاد کی تعریفیں کرنے۔" وہ ناراضی سے اٹھ کر چلی گئی۔
"ارے بات تو سنو جینئس صاحبہ! رکو تو۔" واثق نے اسے پیچھے سے چھیڑا۔ وہ ان سنی کرتے چلی گئی۔
"ویسے واثق! ورده نے بہت پتے کی بات کہی ہے۔ میرے دل کو بھی بہت لگی ہے یہ بات۔" عاصمہ بہت مگن سی مسکرا کر بولی۔
"افوہ، ماما! آپ بھی اس کے پیچھے چل پڑیں۔" واثق کچھ جھنجلا کر بولا۔
"چلوں گی تو میں ضرور اب تمہارے لیے پیاری سی من موہنی لڑکی دیکھنے۔" وہ اسی مسرور لہجے میں بولی۔
"یوں بھی اریبہ اور اریشہ کے جانے کے بعد گھر ایک دم سے خالی ہو گیا ہے۔ یہ ورده تو کالج چلی جایا کرے گی تو میں بالکل گھر میں اکیلی اور تم تو ابھی سے شام گئے آنے لگے ہو۔" عاصمہ خود ہی سب کچھ سوچ کر بولی۔
"لیکن مما پلیز! ابھی نہیں۔ ابھی تو میری جاب سمجھیں اسٹارٹ بھی نہیں ہوئی۔ میں ابھی ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا چاہتا ریئلی۔" وہ کچھ گھبرا کر بولا۔
"ابھی نہیں میری جان! لڑکی تلاشنے میں تو پھر بہت ٹائم لگے گا۔" عاصمہ نے جیسے اسے تسلی دی۔
"اب یہ تو نہیں کہ لڑکی سامنے پڑی ہے اور میں اسے اپنے شہزادے بیٹے کی دلہن بنا کر لے آؤں۔" عاصمہ کو اس نئی بات سے انوکھی سی توانائی ملی تھی۔ وہ اسی لائن پر چل پڑی۔
"پھر بھی مما! ابھی تو بالکل بھی نہیں۔ کم از کم چھ سات ماہ تو نہیں اور لڑکی تو...." وہ اپنی دھن میں کچھ بولتے بولتے رک سا گیا۔
"کوئی ہے تمہاری نظر میں.... آئی مین جو تمہیں پسند ہو۔" عاصمہ فوراً اس کی بات پکڑ کر بولی۔
واثق کچھ گڑبڑا سا گیا۔
"نہیں ایسا تو کچھ نہیں۔" وہ کچھ گھبرا سا گیا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔
"اگر ایسا ہو جائے واثق! تو میرے لیے، یہ بہت خوشی اور سکون کی بات ہو گی۔ بھئی میری جوتیاں گھسنے سے بچ جائیں گی لڑکی کی تلاش میں۔ اگر تم خود یہ نیک کام کر لو تو۔" عاصمہ نے فوراً ہی کہہ ڈالا۔ واثق کچھ نہیں بولا تو عاصمہ بھی چائے پینے لگی۔



"تو یہ کچھ پڑھ رہے ہو تم اسکول میں..... بولو۔" عدیل سخت غصے میں تھا۔
سامنے کھڑے لمبے تڑنگے دانی کو دیکھ کر گرج کر بولا اور ہاتھ میں پکڑی اس کی رپورٹ اٹھا کر اس نے دانی کے منہ پر مار دی۔
"میں پڑھنا نہیں چاہتا.... میرا دل نہیں لگتا اسٹڈیز میں۔" وہ بغیر ڈر خوف کے باپ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔
اور اندر آتی عفت وہیں ٹھٹھک کر رک گئی۔ وہ تو مثال کو کچھ طعنے مارنے جا رہی تھی کہ عدیل کی تیز آواز پر کچھ گھبرا کر ادھر آ گئی۔
بہت منتوں سے اس نے دانی کو باپ کے پاس راضی کر کے بھیجا تھا اور عدیل نے اسے بلا کر چیخ پکار شروع کر دی۔
وہ ناگواری سے اندر آئی اور دانی کی بات سن کر جیسے وہیں جم کر رہ گئی۔
یہ دانی کس وقت اتنا زیادہ بدل گیا۔ اسے پتا کیوں نہیں چلا.... وہ دل میں ڈر سی گئی اس کا بے خوف لہجہ سن کر۔

اچھا تو کیا کرنے کو دل کرتا ہے تمہارا۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔" عدیل ابلتے غصے کو دبا کر بولا۔
"کچھ بھی نہیں۔" وہ اسی بے خوفی سے کندھے اچکا کر بولا۔ عدیل اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر کچھ محسوس کر کے آگے بڑھ کر کچھ سونگھتے ہوئے بولا "تم اسموکنگ کرنے لگے ہو۔" وہ پریشان لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔
"کبھی کبھار۔" وہ بغیر ڈرے خوف کھائے اعتراف کرتے ہوئے بولا۔
اور عدیل کو لگا جیسے دانیال کو وہ کھو چکا ہے۔ وہ چودہ پندرہ سال کا لڑکا اس سے بہت دور جا چکا ہے۔ وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے کندھے کچھ اور بھی جھکنے لگے تھے۔
"بیٹھو۔" بہت دیر بعد وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا وہ ـــ ٹانگ سے کرسی اپنے آگے کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں کچھ تھا۔ عدیل کو لگا اب اسے سمجھانے کا یا کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔
"کیا چاہتے ہو تم۔" وہ بہت دیر بعد اس سے بولا۔



مثال ان کنگنوں کو ہاتھ میں لیے کمرے میں اندھیرا کیے گم صم سی بیٹھی تھی۔
اس نے بشریٰ کی کلائیوں میں یہ کنگن دیکھے تھے۔ جب تک وہ اس گھر میں پاپا کی بیوی بن کر رہی تھیں۔ بعد میں اس نے یہ کنگن بشریٰ کے پاس کبھی نہیں دیکھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر اس پھولے ہوئے لفافے کو دیکھا جس میں یقیناً" رقم تھی.... کتنی؟
مثال چاہتے ہوئے بھی نہیں گن سکی تھی۔
تو بشریٰ نے اس طرح ایک ماں ہونے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی تھی؟
یہ دو کنگن سونے کے اور یہ روپوں کا لفافہ!
بس یہی قیمت تھی مثال کی اس کی ماما کے نزدیک۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ان دونوں چیزوں کو آگ لگا دے۔
"میں یہ پاپا کو دے آتی ہوں' میں اس کو نہیں سنبھال سکتی۔" اس نے تیزی سے آنکھیں پونچھیں اور دونوں چیزیں سمیٹ کر جانے لگی۔
"تو تمہاری ماں آئی تھی تم سے ملنے آپی؟" پری اس کے سامنے دروازے میں کھڑی تھی۔
عفت اور پری دروازے میں کھڑے ہو کر ہی اس سے بات کرتی تھیں۔ جیسے اندر کمرے میں کچھ تھا انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے۔
مثال نے پھیلے ہوئے دوپٹے کو کچھ اور پھیلاتے ہوئے دونوں ہاتھ پشت سے پیچھے باندھ لیے۔ پری وہ دونوں چیزیں نہیں دیکھ سکی تھی۔
"تمہیں ملنا تھا میری ماما سے؟" وہ نارمل لہجے میں بولی۔
"تم نے نہیں ملایا تو مجھے لگا' خود سے آؤں گی تو شاید ان محترمہ کو بھی اچھا نہ لگے۔ ظاہر ہے تم ماں بیٹی میں بہت راز و نیاز کی باتیں ہوں گی۔ آئی مین کچھ سیکریٹس' جو شاید میرے سامنے نہ کہے جا سکتے ہوں۔"
پری چند ہی دنوں میں مثال کو اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔
"تم آجاتیں' میں ملوا دیتی۔" وہ سادگی سے بولی۔
"وہ پاپا سے بھی ملی ہیں نا؟" وہ متجسس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"مما بتاتی ہیں دونوں میں بہت محبت تھی کبھی۔" وہ عجیب چبھتے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

مثال کو اس کی بات بہت بری لگی۔
"بہتر ہے تم یہ ساری باتیں جا کر اپنی ماما سے ہی پوچھ لو کیونکہ وہ زیادہ جانتی ہیں اس بارے میں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اسے جیسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
"جھگڑے ہوتے تھے بہت دونوں میں سنا ہے' دادو بتایا کرتی تھیں کہ تمہارے لیے دونوں میں بہت لڑائیاں ہوئیں۔ سارا محلہ گواہ ہے پھر وہ کیسے آج تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ کر چلی گئیں۔ بس یہی تھی اس عورت کی دکھاوے کی محبت؟" وہ کڑوے کسیلے انداز میں کہہ رہی تھی۔
اف یہ پری کمینی..... مثال کا جی چاہا آگے بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔
"تمہیں اگر کچھ اور نہیں کہنا تو تم جا سکتی ہو کیونکہ مجھے پڑھنا ہے۔ کل میرا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے۔" اس نے کہہ کر تقریباً"پری کو دہلیز سے پرے دھکیل کر ایک دم سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ پری باہر کھڑی چیخ رہی تھی اور مثال جیسے اتنی دیر سے باندھا ضبط خود پہ کھو بیٹھی۔ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھے وہ بے اختیار روتی چلی گئی۔ جانے یہ آنسو بشریٰ کے چلے جانے کے تھے۔ اپنی بے وقعتی کے یا پری کی دل جلانے والی باتوں سے ہرٹ ہو کر وہ رو رہی تھی یا اپنے اکیلے پن کے لیے.....
وہ سمجھ نہیں سکی مگر روتی چلی گئی۔



"کیا.....؟" عدیل کے لیے دانی کی بات بالکل غیر متوقع تھی۔
وہ شاکڈ سا ہو کر بولا۔ دانی کے چہرے کے تاثرات ہنوز ویسے ہی تھے۔ عدیل اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
عفت نے بھی خود کو سہارا دینے کے لیے دیوار سے ٹیک لگائی۔
"تم یہاں نہیں پڑھ پا رہے اور تم کہہ رہے ہو تم باہر جا کر پڑھنا چاہتے ہو۔ ابھی تم نے کہا کہ تم پڑھنا ہی نہیں چاہتے تو پھر باہر جانے کا مطلب؟" عدیل کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا تھا وہ پھر بھی خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے بولا۔
"میں باہر جا کر پڑھ لوں گا۔ آئی پرامس۔" دانیال نے یوں مزے سے کہا جیسے "باہر" تو ساتھ والی گلی میں پڑا ہو۔
عدیل نے خود کو بہت سخت گالی دینے سے روکا۔
کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔
"کیسے پڑھو گے باہر جا کر' ابھی تو تم اولیول میں اٹکے ہوئے ہو۔ یہ کلیئر کر لو۔ اے لیول ہوتے ہی جہاں تم کہو گے بھجوا دوں گا۔" عدیل نے کچھ دیر بعد خود کو کمپوز کر کے قدرے نرم لہجے میں کہا۔
شاید وہ کسی غلط صحبت میں پڑ کر رستے سے بھٹک رہا تھا۔ عدیل کو لگا یہاں بھی غلطی اس کی ہے۔ اسے کچھ تو ٹائم بہرحال بیٹے کو بھی دینا چاہیے تھا۔
وہ کئی مہینوں بعد اسے یوں اپنے کمرے میں اکیلا لے کر بیٹھا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوتاہی تو بہرحال اس سے بھی ہوئی تھی بلکہ شاید زیادہ غفلت اس کی طرف سے ہوئی تھی۔
"میں نے کہا ناں میں یہاں نہیں پڑھنا چاہتا۔ مجھے آپ لندن بھجوا دیں۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ آئی مین! خوب جی لگا کر پڑھوں گا جیسا آپ چاہتے ہیں۔" وہ ایک دم سے ٹون بدل کر سعادت مند لہجے میں بولا۔
عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"مجھے کل ہی اس کے اسکول جا کر اس کے دوستوں کے بارے میں معلومات کرنا ہوں گی۔" عدیل اسے دیکھتے

ہوئے دل میں فیصلہ کر رہا تھا۔

" دانی! میں نے پرامس کیا ناں تم سے کہ جہاں کہو گے بھجوا دوں گا۔ ایٹ لیسٹ تمہیں او لیول تو کرنا ہو گا۔ تمہارے ڈاکومنٹس بنوانے میں کچھ ٹائم تو لگے گا۔ تمہیں خود کو پروف کرنے کے لیے یہاں او لیول مکمل کرنا ہو گا۔" وہ خود کو سمجھا چکا تھا کہ اب اسے دانی سے غصے میں بات نہیں کرنی' سو نرم لہجے میں کہا۔

"پاپا! ڈاکومنٹس کا مسئلہ نہیں۔ میرے دوست کے فادر ویزا آفس میں کام کرتے ہیں۔ بہت جلد وہ میرے ڈاکومنٹس بنا دیں گے۔ اگر آپ ان سے کہیں گے تو۔" وہ جوش بھرے لہجے میں فوراً" ہی بولا۔

عدیل اسے بغور دیکھتا رہ گیا۔

اس بات کے پیچھے کیا مقصد ہے اسے معلوم کرنا تھا' اس نے پل میں طے کیا۔

"او کے۔ میں کل آفس سے آتا ہوں تو تم مجھے اپنے فرینڈ کے فادر سے ملوا دو۔ میں ان سے بات کروں گا' جو وہ کہیں گے میں انہیں اتنی رقم دے دوں گا او کے!"

"رئیلی پاپا! آپ ایسا کریں گے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"آف کورس مائی سن! تمہارے ایگزام میں صرف تین ماہ ہیں۔ کل سے میں تمہارے لیے ٹیوٹر کا ارینج گھر میں کر رہا ہوں۔ وہ تمہیں گھر آ کر پڑھایا کریں گے۔ اب آپ اکیڈمی نہیں جاؤ گے۔ جیسے ہی آپ کے ایگزام ختم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو لندن بھجوا دوں گا۔ آپ کے ڈاکومنٹس بھی تو بن جائیں گے اس دوران۔ ہے نا۔" وہ اب کے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو دانیال نے پہلی بار بچوں کی سی مسکراہٹ کے ساتھ باپ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

"ویل اینڈ گڈ تو کل آپ ٹیچر سے گھر میں پڑھیں گے۔" اس نے کنفرم کرنے کے لیے پھر سے بات کی۔

"اکیڈمی بھی ٹھیک ہے پاپا!" وہ کچھ متذبذب ہو کر بولا۔

"آئی نو جان! لیکن آپ کی رپورٹ جیسی آئی ہے' آپ کو اب اسپیشل اٹین شن کی ضرورت ہے۔ وہ صرف گھر پر آنے والے ٹیوٹر ہی دے سکیں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

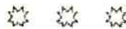
کچھ دیر پہلے والی تلخی اور بے یقینی ختم نہیں بھی ہوئی تھی تو کم ضرور ہو چکی تھی۔

عفت کو لگا جیسے اس کے کمزور پڑتے جسم و جاں میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔

بشریٰ اور مثال کتنی ہی عدیل پسندیدہ رہ چکی ہوں لیکن وہ دونوں اب ماضی کا قصہ ہیں۔ عدیل کا حال' اس کا مستقبل بہرحال دانی تھا۔ پری اور عفت یقیناً! وہ ایک دم سے مطمئن ہو گئی۔

جس خاموشی سے وہ کھلے دروازے سے کمرے کے اندر آئی تھی' اسی خاموشی سے باہر نکل گئی۔

عدیل ابھی بھی دانی سے باتیں کر رہا تھا مگر اب اسے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔



"نہیں ابھی جلدی ہے' بہت جلدی۔ مجھے جلد بازی نہیں کرنا چاہیے ان کو یہ سب بتانے میں' پھر پتا نہیں مثال۔۔۔ وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

وہ لیپ ٹاپ پہ کام کر رہا تھا مگر اس کی ذہنی رو بار بار بھٹک کر وردہ کے شام کے چھوڑے ہوئے شوشے کی طرف جا رہی تھی۔

مگر وہ اسے ناپسند بھی نہیں کرتی۔ یہ تو اسے معلوم تھا۔ اس نے تصوّر میں ہی اس کا صبیح چہرہ لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے سوچا۔

"اور امی سے بات کرنے سے پہلے مجھے مثال کو اعتماد میں لینا ہو گا۔ اس سے اس کی رائے معلوم کرنا ہو گی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ کسی اور میں انوالو ہو۔" دل شکن خیال۔
"نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔"
"کہیں وہ کہیں انگیجڈ ہو۔" دوسرا تکلیف دہ خیال!
"نہیں! میرے دل کو یقین ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ لڑکی اس کی بے ریا آنکھیں تو کوئی اور ہی کہانی کہتی ہیں۔ جیسے اس کی توقعات کے آئینے کو کسی نے بہت بُری طرح سے کرچی کرچی کیا ہو۔
جیسے وہ اس بھرے جہان میں بالکل اکیلی ہو۔۔۔ میں جب بھی اس سے ملا وہ اکیلی اور تنہا ہی تو تھی۔۔۔
"مجھے پھر اس سے ملنا چاہیے۔ اگر میرے پاس اس کا سیل نمبر ہوتا تو میں ابھی۔۔۔ ابھی میرا کتنا جی چاہ رہا ہے' میں اس سے بات کروں' اس کی آواز سنوں۔۔۔ اس کو دیکھوں۔" وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔
اس کی الماری کے لاکر میں وہ ادھورے اسکیچز پڑے تھے' جو وہ دو تین سال پہلے اسے دور سے دیکھ کر بنا تا رہا تھا۔ اس نے الماری کھول کر انہیں دیکھنا شروع کر دیا۔
مگر تھوڑی دیر میں بے چین ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔



"نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں کہا ماما نے مجھ سے۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔
وہ سر جھکائے اسی پلنگ کے کنارے پہ بیٹھی تھی' جہاں زندگی کے آخری کئی سال نسیم بیگم نے تنہائی اور اکیلے پن میں گزارے تھے۔
ان دنوں عفت اور بچوں کی مصروفیت بہت بڑھی ہوتی تھیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی نسیم بیگم سے کئی کئی دن ملنے کے لیے نہیں آپاتا تھا۔ بس دروازے میں ہی رک کر ماں کا حال احوال پوچھ کر زیادہ سے زیادہ دواؤں کے نسخے لے کر باہر سے نکل جاتا۔
کاش وہ دن لوٹ آتے اور وہ کچھ دیر کے لیے ماں کے پاس ساری دنیا کے غم بھلا کر بیٹھ سکتا۔
"تو پھر کیا کہا تمہاری ماں نے تم سے؟" بہت دیر بعد جب اس کی مسلسل خاموشی پہ مثال نے بے چین ہو کر اسے دیکھنا شروع کیا تھا' سر اٹھا کر کہا۔
"کچھ بھی نہیں پاپا! صرف ملنے آئی تھیں۔" وہ شرمسار سے لہجے میں بولی۔
جیسے اس میں بھی مثال کی غلطی ہو کہ بشریٰ بے وجہ اس سے ملنے کیوں آئی تھی۔
"اور آنے کا بھی کچھ نہیں بتایا؟" وہ مدھم لہجے میں سرسرایا۔ مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔
دونوں پھر خاموش ہو گئے۔
"یہاں رہو گی تم اس کمرے میں۔" وہ ذرا دیر بعد پھر سے بولا اور بولتے ہی اسے جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"ہاں اچھا ہے۔ یہ کمرا بھی برا نہیں صرف رات میں آکر سونا ہی تو ہوتا ہے تم نے یہاں۔۔۔ دن میں تو باقی گھر میں ہی ہوتی ہو۔" وہ پتا نہیں اسے سمجھا رہا تھا یا تسلی دے رہا تھا۔
"پاپا! آپ سے ایک بات پوچھنا تھی مجھے۔" وہ ذرا دیر بعد ہمت کر کے بولی۔
عدیل نے کچھ پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔ جانے کیوں عدیل کو لگ رہا تھا آج کل اس کے دن اچھے نہیں چل رہے۔ نہ آفس میں نہ گھر میں نہ ذاتی زندگی میں۔ کہیں بھی اچھی خوشی یا سکون کی کوئی خبر نہیں۔

"پاپا! میں کالج سے آنے کے بعد شام میں گھر کے کام کرنے کے بعد بھی دو تین گھنٹے فارغ ہوتی ہوں۔" وہ اٹک کر بولی۔
عدیل نے اسے کچھ ناگواری سے دیکھا۔
"میری ایک فرینڈ ایک اکیڈمی میں شام میں پڑھاتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں بھی اکیڈمی جوائن کرلوں۔ ایک تو ٹائم اچھا اسپینڈ ہو جائے گا۔ کچھ تجربہ ہو جائے گا اور تھوڑی انکم ہو جائے گی۔ آئی مین پاکٹ منی.... اگر آپ مجھے پرمیشن دیں تو۔"
لیکن اسے عدیل کا چہرہ دیکھ کر بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔ اس کے چہرے پر سرخی اور جذباتی پن تھا۔
"کیا جتانا چاہتی ہو تم مجھ پر اپنی ماں کی طرح کہ میں ایک بہت غیر ذمہ دار شخص ہوں۔ ساری فیملی کا بوجھ تو اٹھا سکتا ہوں صرف تمہارا نہیں اٹھا سکتا۔ یہ کہنا چاہتی ہو تم مثال؟" وہ ساری شام جس تکلیف اور کرب سے گزرا تھا۔ اس کا کتھارسس اسے ان ہی لمحوں میں ہوتا نظر آیا۔
"یہی.... یہی تمہاری ماں تمہیں سمجھانے آئی تھی کہ جی بھر کر اس شخص کو ذلیل کرنا اور ستانا کہ وہ جو بدلے مجھ سے نہ لے سکی' وہ تم لینا اس سے۔ اب میں سمجھا ہوں وہ کیوں تمہیں مستقل میرے پاس چھوڑ کر گئی ہے۔ صرف اس لیے کہ تم مجھے مسلسل ٹارچر کرتی رہو۔" وہ طیش میں بولتا چلا گیا۔
مثال آنکھوں میں نمی لیے بے یقین نظروں سے باپ کو دیکھتی رہ گئی۔
"آج تم نے یہ بے ہودہ بات کی ہے۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے نہیں سنوں۔" وہ کھڑے ہو کر کڑے تیور سے بولا۔
مثال سہم کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔
وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
مثال یک ٹک باپ کو جاتا دیکھتی رہی۔
"تو اس لیے ماما مجھے یہاں چھوڑ کر گئیں کہ مجھے جو پاپا پر اندھا اعتماد اور بھروسا ہے میں اس کا بھی اصل چہرہ دیکھ لوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا۔
"لیکن صرف میرے ساتھ ہی کیوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے تو ان دونوں میں علیحدگی نہیں کروائی تھی۔ میری وجہ سے تو ان دونوں کی زندگیاں مشکل میں نہیں' پھر یہ دونوں میرے ساتھ ہی ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے کیوں لگتا ہے کہ یہ دونوں میرے اصلی پیرنٹس نہیں ہیں۔" اس کے اندر جوار بھاٹا سلگنے لگا تھا کچھ اس شدت سے کہ اسے خود پر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
"ماما چلی گئیں اپنی جان چھڑا کر' اپنا دوسرا گھر بچا کر۔ میری وجہ سے ان کا گھر دوسری بار ٹوٹنے لگا تھا۔ اور پاپا کو بھی شاید یہی ٹینشن ہے کہ میں اب یہاں آگئی ہوں تو ان کی مسز' ان کے بچے مجھے برداشت نہیں کریں گے۔ ان کے گھر کا سکون تباہ ہو جائے گا۔ سب کچھ جو اتنے سالوں میں انہوں نے بنایا جوڑا' فقط میری وجہ سے برباد ہو جائے گا۔
یہی غصہ پاپا مجھ پر نکال رہے ہیں.... کیوں ہوں میں دونوں کے لیے ایک مسلسل عذاب ایک مسلسل اذیت کا باعث۔ دنیا میں آنے میں تو میرا اختیار نہیں تھا مگر یہاں رہنا اور رہتے چلے جانا ذلت اور لگاتار اذیت سہنا کیوں برداشت کروں میں۔
اور یہ سب کرنے سے بھی مجھے کیا ملے گا۔ نہ ان کی شاباشی نہ ان کی محبت نہ ان کا ساتھ۔ اور پاپا ان کی نظروں میں ان دو دنوں میں جتنی اجنبیت میں نے دیکھی ہے' انہیں اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کہ میں زندہ

رہوں یا مر جاؤں۔" وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔
اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنا چہرہ اور آنکھیں رگڑیں۔ پیروں میں چپلیں اڑسیں اور کسی بھی طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے گھر کے صحن اور بیرونی حصے سے گزرتی کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

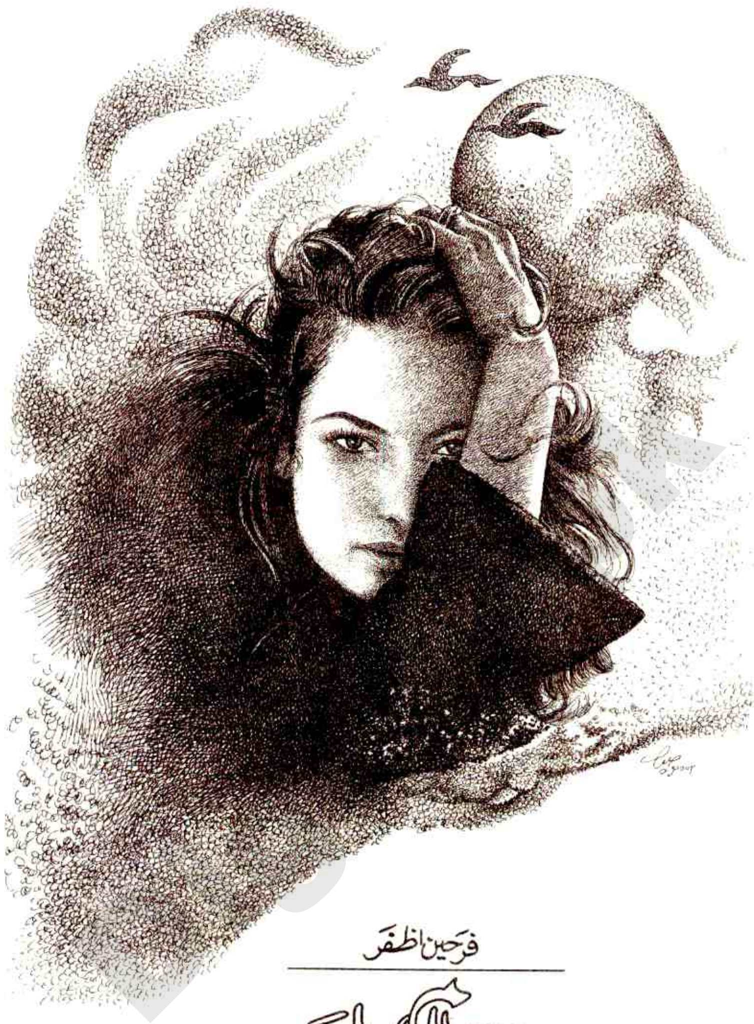


"آپ سو گئے ہیں عدیل؟" عفت۔ عدیل کے لیے گرم دودھ کا گلاس لے کر اندر آئی تو وہ کروٹ لیے شاید سو رہا تھا۔
"ہوں... نہیں۔" وہ اسی طرح کروٹ لیے ہوئے بولا۔
"یہ دودھ لائی تھی آپ کے لیے گرم ہے پی لیجئے۔" اسے لگا کہ عدیل آج بہت تھکا ہوا ہے۔ کھانا بھی اس نے دو چار لقموں میں ہی ختم کر دیا تھا۔
دانی والا معاملہ جس طرح عدیل نے ہینڈل کیا تھا۔ عفت کو بہت دنوں بعد عدیل پہ پیار آیا تھا۔
"رکھ دو ابھی جی نہیں چاہ رہا۔" وہ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹا رہا۔ وہ گلاس ایک طرف رکھ کر یونہی کھڑی رہی۔

"میں مین گیٹ لاک کر آؤں اور دیکھوں بچے سوئے یا نہیں۔" وہ کچھ دیر بعد کہہ کر باہر نکل گئی۔ عدیل اسی طرح لیٹا رہا۔ وہ مثال کے کمرے کے پاس آکر ٹھٹک کر رک گئی۔

کمرا خالی تھا۔ ملحقہ باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا تھا۔
"مثال!" عفت نے پکارا۔
جواب میں خاموشی تھی۔
عفت کے دل میں عجیب سا وسوسہ آیا۔
وہ تیزی سے پلٹی اور اگلے پانچ منٹوں میں اس نے گھر کی چھت سمیت ہر جگہ دیکھ لی۔ مثال کہیں بھی نہیں تھی۔
"میرے خدا! تو یہ لڑکی بھاگ گئی... حرام خوراں جیسی خصلت۔ ضرور کسی کے ساتھ لگا رکھی ہوگی اسی لیے تو ماں یہاں پھینک گئی اور اب سر پر الزام لگے گا کہ سوتیلی ماں کی وجہ سے نکل گئی کہیں منحوس!"
عفت کو سخت غصہ آرہا تھا۔
"عدیل... مثال پورے گھر میں نہیں ہے۔ میں سارے میں دیکھ آئی ہوں۔ آپ دیکھیں اٹھ کر۔" وہ اندر آکر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔
عدیل کو جیسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔ وہ ایک ہی جست میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ عفت کو غصے سے دیکھ کر چلایا۔ عفت کچھ بھی نہ بول سکی۔ عدیل کے چہرے پر سخت تشویش کی کیفیت تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



فرحین اظفر

صبح... صبح کا وقت تھا۔ میں نہا دھو کر تازہ دم سا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ سنیعہ کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔

ہری مرچ کے آملیٹ اور اصلی گھی کی خوشبو پورے گھر میں چکراتی میری بھوک بڑھا رہی تھی۔ گو کہ آج چھٹی کا دن تھا مگر ہم دونوں میاں، بیوی دن چڑھے تک سونے کے نہ عادی تھے نہ حامی۔ یہی وجہ تھی کہ صبح کے آٹھ بجے جب بلڈنگ کے آدھے سے

زیادہ فلیٹ سناٹے اور نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہمارے فلیٹ میں مزیدار خوشبوئیں چکرانے لگی تھیں۔

اسی وقت ایک مانوس نسوانی آواز نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ لوہے کی گرل والے دروازے سے گردن اونچی کرکے حیا جھانک رہی تھی۔

"حیا درانی۔"

میری باچھیں غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر مشرق سے مغرب تک چر گئیں۔

وہ دروازے کی گرل میں ہاتھ ڈال کر کنڈی کھول چکی تھی اور اب اندر آرہی تھی کیونکہ سنیعہ نے اسے کچن میں کھڑے کھڑے ہی اندر آنے کی دعوت دے ڈالی تھی جو حسب عادت اس نے فوراً" قبول بھی کرلی تھی۔

"کیا حال ہیں عماد بھائی!"

میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ ڈھیلی (مگر بہت زیادہ نہیں) آتشی گلابی قمیص میں اس کا گورا چہرہ بالکل اپنی شرٹ کی رنگت سے مشابہہ ہوگیا تھا۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ قمیص کا رنگ زیادہ آتشی ہے یا اس کا وجود۔۔۔

وہ دھم سے ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھی اور گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنے بھرے بھرے سڈول بازو ٹیبل پر پھیلا دیے۔

اب میری نظریں چوری چوری حسرت آمیز ستائشی انداز میں اس کے بازوؤں پر پھسل رہی تھیں۔ سیاہ چست پاجامے میں اس کا فیگر کسی حد تک نمایاں اور دعوت نظارہ دیتا ہوا تھا مگر اسے اس بات کی چنداں فکر نہ تھی کہ وہ کسی مرد کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

جانے وہ انجان ہی تھی یا جان کر انجان بنتی تھی مگر اسی جانے انجانے میں میرے دل میں دبی کئی خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوجاتی تھیں۔ شاید وہ ایسی ہی تھی 'جسے میرے جیسے شادی شدہ بیویوں سے چھپ چھپ کر اور کنوارے سرعام دیدہ دلیری سے لطف لیتے پھرتے۔

مجھے یقین واثق تھا کہ ایسی بیوی کی وجہ سے پوری بلڈنگ میں سب سے زیادہ عدم تحفظ کا شکار اس کا شوہر ہی ہوگا۔ اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے بلکہ پچھلے آٹھ سال سے شادی شدہ ہے۔ اس وقت صبح صبح اس کی آمد نے گویا میری چھٹی کے دن کو سوارت لگا دیا تھا۔

"کیسی ہو حیا!"

اسی وقت کچن سے ناشتے کی ٹرے لے کر سنیعہ باہر نکلی اور میرے اور اس کے درمیان موجود واحد رکاوٹ یعنی ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات رکھنے لگی۔ چند لمحوں کے لیے سنیعہ کا وجود میرے اور حیا کے بیچ میں حائل ہوا تو میں غیر ارادی طور پر دونوں کا موازنہ کرنے لگا۔

یکے بعد دیگرے تین بچوں کی پیدائش نے سنیعہ کی ساری جسمانی خوب صورتی کو گہنا دیا تھا۔ اسے خود پر توجہ دینے کا شوق بھی صرف چہرے اور ہاتھ پیروں کی صفائی تک ہی تھا۔ اپنے بڑھتے ہوئے پیٹ اور دن بدن نشوونما پانے والی ڈبل چن سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

بقول خود اس کے 'تین بچوں کی ماں بن جانے کے بعد اسے خود سے زیادہ بچوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ وہ یقیناً" جانتی ہوگی کہ میں جتنا شوقین مزاج تھا' اس حساب سے تو اسے خود پر عام خواتین سے زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی۔ بہرحال۔۔۔

کچھ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ میں صرف نظربازی اور سنیعہ کا دوسری عورتوں سے موازنہ کرنے کی حد تک ہی شوقین تھا۔ اس سے آگے کسی ماڈرن' بے باک' خوب صورت عورت کو دیکھ کر میرے دل میں کبھی برے خیالات نہیں آئے تھے یا اگر آ بھی جاتے تھے تو بس وہ خیالات تک ہی محدود رہتے تھے۔

مگر اب معاملہ تھوڑا سا بدلنے لگا تھا۔ سامنے بیٹھی حسن و خوب صورتی کا مرقع ہماری پڑوسن آنے بہانے

میری توجہ کھینچ لیتی تھی اور میں بے اختیار حیا درانی کے بارے میں سوچے چلا جاتا تھا۔

"سنیعہ جی۔۔۔ سنیعہ جی۔"

میں اب بھی جانے کب تک ناشتا کرنے یا شاید اس کے بعد بھی اپنی بیوی کے بجائے فرخ درانی کی بیوی کے بارے میں سوچتا' دل ہی دل میں اس کے بے داغ حسن کو سراہتا رہتا۔ مگر ایک بار پھر میری توجہ بٹانے والی یہ آواز ہماری دوسری پڑوسن کی تھی۔

"سمیتا پردیپ۔"

جیسا کہ نام سے ظاہر تھا کہ یہ خاتون مسلمان نہیں تھیں مگر ایک مسلمان گھرانے کا اہم حصہ ضرور تھیں۔

میں نے سنیعہ کے مسکراتے لبوں کو آن واحد میں سکڑتے دیکھا۔ وہ جیسے بادل نخواستہ اٹھ کر دروازے تک گئی تھی۔

"سنڈے میگزین دے دیجیے' کچھ کام ہے۔ ہمارے نیوز پیپر میں سے سنڈے میگزین مسنگ ہے شاید ہاکر کی لاپروائی کی وجہ سے۔"

وہ بولتے بولتے سنیعہ کے ساتھ ہی اندر آگئی تھی۔ حیا کی اس کی جانب پشت تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس کے آنے پر اس کا منہ بن گیا تھا۔

میں نے حسب عادت سر سے پیر تک اس نمکین حسن کو نگاہوں میں تولا اور پھر سنیعہ کو اور ہمیشہ کی طرح ہار سنیعہ کی ہوئی۔

سرخ بارڈر والی سیاہ ساڑھی میں سیدھی مانگ کے جوڑے اور ہلکے میک اپ میں سمیتا بہت نکھری سی لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہوئی ہے یا ابھی ابھی کہیں سے واپس آئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ اکثر و بیشتر یوں ہی نک سک سے درست ملتی تھی اور ایک یہ بے وقوف عورت۔"

میں نے گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوچا۔

"ایسا بھی کیا گھر داری میں خود کو غرق کرنا کہ بندہ خود کو بھول ہی جائے۔" آج دل میں سنیعہ کے غیر متناسب سراپے اور غیر مناسب رویے کا دکھ الگ ہی انداز میں ابھرا تھا۔ جبکہ میری نظریں مستقل سمیتا جی پر ہی ٹکی تھیں۔ جو سنیعہ سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا ٹیبل پر رکھ چکی تھی۔ معاً سنیعہ زور سے کھنکھاری اور میں چونک کر خفیف سا ہو گیا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میں کب سے سمیتا کو گھورے جا رہا تھا۔

"جا چکی ہے۔" سنیعہ نے میرے آگے ہاتھ لہرایا اور حیا درانی زور سے ہنس پڑی۔

"یہ سنیعہ بھابھی بھی نا! عماد بھائی کی اچھی خاصی مصروفیت میں خلل ڈال دیا۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنی بات مکمل کر کے میرے آگے ہاتھ پھیلایا اور میں نے اس کے ہاتھ پر تالی مار دی۔ وہ بلڈنگ کے سارے فلیٹ والوں سے ایسی ہی بے تکلف تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ عورتوں سے زیادہ مردوں سے بے تکلف تھی اور دن کے بیشتر وقت گھر سے باہر ہی پائی جاتی تھی۔ جیسے اس وقت جاگنگ کے بہانے نکلی ہوگی اور بیٹھ گئی ہمارے ساتھ ناشتا کرنے۔ گھر میں تھا ہی کون ایک بوڑھی ساس کے سوا۔ شوہر اس کا ریال کمانے پردیس میں بیٹھا تھا۔



"گاجریں سستی ہو رہی ہیں۔ سوچ رہی ہوں پانچ کلو منگوا کر حلوہ بناؤں' بہت دل چاہ رہا ہے۔"

رات کو بستر پر جانے سے پہلے وہ اپنے چہرے کا مساج کر رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ایسا اعتراض میری طرف سے پہلی بار آیا تھا۔ اس کا چونکنا بڑا فطری تھا۔

"ہیں۔۔۔ کیوں بھئی؟"

"سنیعہ! تم کتنی موٹی ہوتی جا رہی ہو دن بدن۔۔۔ اپنی پروا ہے' نہ خیال۔۔۔ وہ۔۔۔ سمیتا کو دیکھا ہے۔

کتنی اسمارٹ ہے۔"

"اچھا جی۔۔۔" چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد اس نے جیسے بات کا سرا پکڑلیا۔

"جب ہی آج اسے اتنا گھور گھور کر دیکھا جارہا تھا۔"

"ہاں تو کیا ہوا' تمہارا اور اس کا کمپیریزن کرنے کے لیے ہی دیکھ رہا تھا اور افسوس ہی ہوا۔ کیونکہ صبح تم' حیا اور سمیتا دونوں سے گئی گزری لگ رہی تھیں۔" سنیعہ رخ موڑ کر مجھے دیکھتی رہ گئی۔ شاید میں آج سے پہلے اتنا کھلم کھلا نہیں بولا تھا۔

"اور وہ لے کر کیا آئی تھی صبح صبح۔"

"رس ملائی لائی تھی۔"

"لو کمال ہے' تم نے مجھے دینے کے بجائے ماسی کو دے دی۔"

"تو اور کیا کرتی' غیر مسلم ہے وہ۔ ہندو عورت۔ یہ لوگ پاکی' ناپاکی کا کوئی خاص خیال نہیں کرتے۔ ویسے بھی مسلمانوں کو پتا نہیں ان کا کھانا' کھانا بھی چاہیے یا نہیں۔"

میں نے فقط کندھے اچکا دیے۔



انسان اپنے آپ کو خطا کا پتلا کہتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ غلطی کے بغیر بھلا کس کی زندگی گزر سکتی ہے۔ مگر اس جملے کی آڑ میں کچھ غلطیاں جان بوجھ کر بھی تو کی جاتی ہیں۔

ان کا کیا۔۔۔

حیا درانی جم جانے کے لیے اپنے فلیٹ سے نکل رہی تھی اور میں یوں ہی آوارہ گردی کرنے۔

میں اسے دیکھ کر بڑھتے بڑھتے رک گیا' جانے کیوں۔

وہ مجھے دیکھ کر رک گئی۔ پتا نہیں کس لیے۔

میں نے اسے دیکھا' اس نے مجھے۔۔۔ اور۔۔۔ ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔۔۔ معلوم نہیں کیوں؟

بس اک لمحہ سرعت سے ہمارے درمیان رکا۔ ٹھٹکا' مسکرایا اور آگے نکل گیا اور ہم دونوں شاید اس لمحے کے زیر اثر آگئے تھے۔



"سمیتا آئی تھی آج پھر۔" سنیعہ سرسری لہجے میں بتا رہی تھی۔

"کوئی خاص بات؟"

"نہیں بس۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ حیا کی سرگرمیاں کچھ مشکوک سی ہیں۔"

"اچھا مثلاً"۔" میں چوکنا ہو گیا۔

چند دن پہلے والا وہ ہلکا سا رومانوی صورت لیے مسکراتا لمحہ پھر سے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"بس یہی کہ اس کا گھر سے زیادہ باہر دل لگتا ہے اور وہ بلڈنگ کے مردوں سے کچھ زیادہ ہی فری ہونے لگتی ہے۔ آپ بھی اس سے ذرا بچ کے رہیں تو بہتر ہے۔"

"ہیں کیوں۔۔۔ میرا ذکر کہاں سے آگیا بیچ میں۔"

"بس۔۔۔ مجھے تو یہ عورت بھی ٹھیک نہیں لگتی۔ ایک تو چوبیس گھنٹے ساڑھی چڑھا کے رکھتی ہے اپنا فگر دکھانے کے لیے۔"

حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ سنیعہ بھی خواتین کا فگر دیکھتی تھی۔ وہ بات کرتے ہوئے بھول گئی کہ سامنے کوئی دوسری عورت نہیں "اس کا شوہر ہے اور وہ بھی ایک مرد ہے۔

"تمہیں کوئی عورت ٹھیک بھی لگتی ہے سنیعہ!"

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ حیا ہے تو۔۔۔ کتنی ملنسار اور خوش مزاج ہے۔"

میں اس کی دہری بیان بازی پر دنگ رہ گیا۔ اس نے اس تیزی سے حیا کے بارے میں یہ دوسرا بیان داغا کہ ملک کے سارے منجھے ہوئے سیاست دانوں کو مات دے دی تھی۔

"مگر ابھی تو تم اس کے بارے میں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔"

"ارے وہ تو اس کی مصروفیت اور اس کے ماڈرن لک سے جلنے والیاں اس کے خلاف ایسی ہی بھد اڑاتی رہتی ہیں۔ اس کی عادت ہے بے تکلفی کی' ورنہ کیا میں جانتی نہیں۔ وہ کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہے۔ ورنہ اتنی حسین بیوی کو کون آدمی یوں آسانی سے چھوڑ کر فرار جاتا ہے۔" اس نے کان پر سے مکھی اڑائی۔

"ہاں۔۔۔ مگر وہ سمیتا۔۔۔ بھئی سچی بات ہے۔ میرا دل نہیں ٹھکتا۔ میں تو کبھی اس کے ہاتھ کی لائی ہوئی کوئی چیز بھی نہیں کھاتی۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ بچے بلڈنگ کے احاطے میں ہی سائیکل چلانے باہر گئے ہوئے تھے۔ معاً" گرل میں ہاتھ ڈال کر کسی نے بیرونی دروازے کی کنڈی کھولی اور تینوں بچے ہاؤ ہو کرتے اندر آئے۔

"ارے تم تینوں اندر کیسے آئے؟" شنزا میری بیٹی آتے ہی میری گود میں چڑھ گئی۔ بچوں کا قد ابھی اتنا نہیں تھا کہ وہ گرل پر لگی لوہے کی پیٹوں پر سے ہاتھ ڈال کر اندر سے کنڈی کھول سکتے۔

"سمیتا آنٹی سے کھلوایا ہے۔"

ننھا احد اپنی دھن میں جلدی سے بول کر کمرے میں بھاگ گیا۔ میں اور سنیعہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔



اس دن میں آفس سے جلدی اٹھ گیا۔

موسم کے تیور ٹھیک نہیں تھے اور میں بارش شروع ہونے سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ذرا سی تیز گرج چمک کے ساتھ ہونے والی بارش تمام شہر کے راستے ایسے بند کر دیتی تھی۔ جیسے وادی کاغان کے راستے برف باری۔۔۔

جلدی جلدی کرتے بھی بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہوتے وقت ہلکی بوندا باندی نے تیز جھڑی کی شکل اختیار کر لی اور میں لفٹ میں داخل ہوتے ہوتے بھی مکمل طور پر بھیگ گیا تھا۔

ابھی لفٹ کے دونوں دروازے مکمل طور پر جڑ نہیں پائے تھے کہ میں نے حیا درانی کی جھلک دیکھی اور لفٹ کو روکنے کا بٹن دبا دیا۔ وہ تیزی سے لفٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سامان سے بھرے شاپرز تھے اور وہ بھی میری طرح بھیگ چکی تھی۔

گو کہ مجھے اپنے گیلے کپڑوں سے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ مگر اس کا حلیہ ایسا ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے گیلے جسم کے باوجود ماتھے اور ہتھیلیوں میں نئے سرے سے نمی اترتی محسوس ہوئی۔

وہ بے نیاز تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دونوں شاپرز فرش پر ڈالے اور کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر اسکارف میں لگا کیچر نکال کر لگایا۔

میں چور نظروں سے اس کے بازوؤں کی حرکت دیکھ رہا تھا۔

چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھا اور ہلکے سے ہنس دی۔ میں بھی مسکرایا مگر فوراً" ہی اس کے سراپے سے نظریں ہٹالیں۔

وہ ایک لمحہ جو ہمارے مابین ٹھہر کر کہیں چپکے سے آگے نکل گیا تھا۔ وہ شاید پھر کہیں سے جھانک رہا تھا۔

ایک' دو' تین۔۔۔ شاید دس سیکنڈ لگتے اور ہم اپنے فلور پر پہنچ جاتے۔ مگر۔۔۔

اوپر کی طرف سبک خرامی سے سفر کرتی ہوئی لفٹ اچانک جھٹکے سے رکی اور لفٹ کی چھت پر لگا بلب بجھ گیا۔

اندھیرا ہونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ جھک کر اپنی قمیص کا دامن جھاڑ رہی تھی۔ یوں جھٹکا لگنے سے جھکے ہوئے ہونے کی وجہ سے ذرا سا لڑکھڑا سی گئی۔

"اوہ سوری۔" اندھیرے میں اس کی کھسیانی آواز گونجی۔ "یہ کیا ہوا۔"

"پتا نہیں شاید کوئی خرابی ہو گئی ہے۔" میں نے جلدی سے اپنے سیل فون کی ٹارچ آن کی۔ لفٹ میں

مدھم اندھیرا ہو گیا۔
چند لمحے ہم دونوں نے ہی لفٹ کے دوبارہ چلنے کا انتظار کیا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور دیوار سے ٹیک لگالی۔
"آج آفس سے جلدی نکل آئے آپ۔"
"ہاں۔۔۔" میری ٹارچ کا رخ زمین کی طرف تھا۔
"اس رومانٹک موسم میں بھابھی کو سرپرائز دینے جارہے ہیں۔" اس کی آواز شوخی سے بھرپور تھی۔
مجھے سمجھ نہیں آیا' آگے کیا کہوں۔
"ہاہ۔۔۔ آ۔۔۔ ہمیں تو کوئی ایسا سرپرائز دینے والا بھی نہیں۔"
ہلکی روشنی میں اس کے لبوں سے نکلے الفاظ جتنے غیر متوقع تھے۔ اتنے ہی معنی خیز بھی۔ بے ساختہ اور بے ارادہ میں نے ٹارچ سیدھی اس کے چہرے پر ڈالی۔ یہ ایک بالکل غیر ارادی حرکت تھی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔
ٹارچ کی روشنی سیدھی آنکھوں پر پڑے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں مگر اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے پلک تک نہیں جھپکی۔ وہ سیدھا میری آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے فوراً ٹارچ اس کے منہ پر سے ہٹائی۔ کوئی لمحہ بھر کی بات تھی مگر وہ لمحہ۔۔۔ کتنا بھاری لمحہ تھا۔ جو میرے اعصاب پر اپنا بھاری بھرکم پیر رکھتا ہوا گزرا تھا۔
اس کی آنکھوں میں اس لمحے کیا تھا۔
کوئی حسرت' کوئی خواہش' کوئی جستجو یا اظہار۔۔۔ یا پھر۔۔۔ کوئی دعوت۔
لائٹ آنے اور لفٹ کے چلنے کے کوئی آثار نہ تھے۔
"کیا سوچنے لگے آپ۔۔۔ کچھ کہیں گے نہیں۔۔۔ عماد۔"
اس کا لہجہ گمبھیر بھی تھا اور سرسراتا ہوا بھی۔ مزید یہ کہ اس نے پہلی بار مجھے صرف میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا بھائی کا لاحقہ ہٹا کر۔۔۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے تھوک نگلا۔ چند لمحوں بعد پھر اس کی آواز آئی۔
"ایک حویلی میں اکیلی۔۔۔"
"اصل میں مجھے اندھیرے اور خاموشی سے گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔" میں جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بول پڑا۔ اندر کا ماحول کچھ زیادہ ہی عجیب سا ہو گیا تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ اس لیے گرمی تو نہیں' مگر عجیب سی گھٹن کا سا احساس ہونے لگا تھا۔
"ہاں ظاہر ہے' آپ اکیلے جو نہیں۔۔۔ مجھے تو اب عادت سی ہونے لگی ہے خاموشی اور تنہائی کی۔"
وہ اتنی بھی تنہائی کی ماری نہیں تھی۔ جتنا اس وقت ظاہر کررہی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیوں۔۔۔ اسے یہ سب کہنے کی ضرورت کیوں پیش آرہی تھی۔
میں دھیان بٹانے کے لیے اپنا والٹ نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ کیونکہ اس سوال کا جواب۔۔۔ شاید میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔
لیدر کا والٹ اوپر سے ہلکا سیلن زدہ ہو گیا تھا۔ مگر اندر کی چیزیں' میرا آئی ڈی کارڈ' اے ٹی ایم کارڈ' پیسے اور دوسرے ضروری کاغذات وغیرہ محفوظ تھے۔ میں نے سب چیزیں جیب میں ڈالیں اور والٹ ہاتھ میں لے کر یوں ہی ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگا۔
دفعتاً مجھے حیرت اور بے یقینی کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ حیا درانی نے والٹ میرے ہاتھ سے نرمی سے لے لیا۔ وہ میرے بالکل برابر میں آچکی تھی۔ میں نے اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس کیں اور پھر بلا ارادہ میرے لبوں سے بے آواز سرگوشی نکلی۔
"یا اللہ۔۔۔ خیر۔۔۔"



"بھائی جی۔۔۔ دروازہ کھولیے گا۔"
مترنم' خوب صورت آواز والی یہ کوئی اور نہیں' ہماری پڑوسن **سمیتا** ہی تھی۔ میں جو ڈائننگ ٹیبل پر رکھے گرم چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ کے مرغولوں میں جانے کیا کھوج رہا تھا چونک اٹھا' پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"بھابھی جی ہیں گھر پہ؟" اس کے قدم دہلیز پر تھے اور میری نظریں اس کے سراپے پر۔

حیران... حیران نظریں... وہ جھینپ سی گئی۔ آف وائٹ اسکارف سے اس کا سر ڈھکا ہوا تھا اور اس نے ساڑھی کے بجائے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

"کون ہے عماد!" پیچھے سے **سنیعہ** بھی آگئی۔ میں نے واپس پلٹ کر **سمیتا** کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

"یہ میں مٹھائی لائی تھی بھابھی جی!" اس نے مسکراتے ہوئے مٹھائی کی پلیٹ سامنے کی۔ تازہ گلاب جامنوں پر چاندی کے ورق اور پستے کی ہوائیاں سجی تھیں۔

"اچھا... بہت شکریہ، رکھ دو۔ میں بعد میں کھالوں گی، اصل میں آج میرے دانت میں درد ہے۔" **سنیعہ** نے ہمیشہ کی طرح بہانہ بنایا۔

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا بھابھی! آج تو میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے کھلا کر ہی جاؤں گی۔"

"اچھا... کیوں... کوئی خاص بات۔" **سنیعہ** اس کی بات سن کر تھوڑا گڑبڑا سی گئی۔

"بہت ہی خاص، بلکہ خاص الخاص... میں... بھابھی میں... مسلمان ہو گئی ہوں... میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔"

خبر واقعی خاص الخاص تھی۔ اب کی بار **سنیعہ** گڑبڑائی نہیں، بلکہ ٹھیک ٹھاک ہڑبڑا گئی۔

"اچھا... لیکن... ک... کیسے... میرا مطلب ہے کب۔" اس کے منہ سے بے ربط الفاظ نکلے۔

"آئیں نا **سمیتا** جی... اندر تو آئیں۔" میں اسے ہمیشہ انڈین اسٹائل میں **سمیتا** جی کہتا تھا۔ اس وقت بھی سکتہ ٹوٹا تو یوں ہی بول پڑا۔

"**سمیتا** نہیں بھائی جی... حاجرہ... حاجرہ ہاشم۔"

وہ **سنیعہ** کو مٹھائی کی پلیٹ پکڑا کر سامنے بیٹھی تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور لبوں پر مسکراہٹ۔

"ہاشم مجھے مسلمان کرکے شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی ہاشم کی خوشی کے لیے ہامی بھرلی تھی مگر یہ شرط رکھی تھی کہ میں مسلمان اسی صورت میں ہوں گی، جب دین اسلام کو خوب اچھی طرح پڑھ کر سوچ سمجھ کر اپنے دل کو اس کی جانب مائل پاؤں گی اور دیکھیں... میں نے صرف ارادہ ہی کیا اور اللہ رب العزت میرے لیے راستے کھولتا چلا گیا۔ میں نے ایک قدم بڑھایا اور اللہ نے مجھے تھام لیا، بھٹکنے سے بچالیا۔"

وہ اپنی آنکھیں صاف کررہی تھی۔ اس دن **سمیتا** دیر تک بیٹھی **سنیعہ** سے باتیں کرتی رہی اور **سنیعہ** کے حواس بحال ہوئے تو اس نے خود **سمیتا** یعنی حاجرہ کے ہاتھ سے مٹھائی کھائی۔

"کہہ رہی تھی آج وہ اور ہاشم بھائی تجدید نکاح کے لیے جائیں گے۔ اس نے کلمہ تو تب بھی پڑھ لیا تھا مگر دل سے مسلمان نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے ابھی تک بچے بھی نہیں۔"

بعد میں **سنیعہ** نے تفصیلاً مجھے بتایا۔ اس بات سے بے خبر کہ میں اس کی بات ڈھنگ سے سن بھی رہا تھا کہ نہیں۔ میرا ذہن تو حاجرہ کے ان ہی جملوں کی دھمک سے گونج رہا تھا۔

"اللہ نے مجھے تھام لیا، بھٹکنے سے بچالیا۔"



انسان کی زندگی بھی کیا ہے۔ پانی کا بلبلا... سمجھوتوں کا سفر... مشکلات کا پہاڑ، جدوجہد مسلسل، یا عجیب و غریب مسائل کا منبع... ہر شخص کے نزدیک اس کی زندگی کے معنی، اس کے برتاؤ کے حساب سے الگ ہوتے ہیں اور اس لمحے مجھے آخر الذکر مفہوم ہی بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔

عجیب و غریب مسائل کا منبع۔

کبھی کوئی رشتہ ایسا مسئلہ بن جاتا ہے کہ نبھانا مشکل ہوجاتا ہے۔ کبھی کوئی کردار ایسا مسئلہ بنتا ہے کہ ادا کرنا مصیبت۔ کبھی کوئی فرض مسئلہ بن جاتا ہے، قرض کی طرح شانوں پر دھرا تو کبھی اپنا ہی حق اپنے سامنے مسئلہ بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ مانگے نہیں ملتا اور چھیننے کی نوبت آجاتی ہے اور کبھی... کبھی کبھی... کوئی وقت،

کوئی پل 'کوئی لمحہ مصیبت بن جاتا ہے۔ کاٹے نہیں کٹتا۔۔۔ جیسے اس دن۔۔۔ بند لفٹ میں۔۔۔ جس کے کھلنے کے آثار نہ تھے اور جن کے کھلنے کا گمان تک نہ تھا۔ وہ۔۔۔ وہ پوشیدہ رازینا خواہش کے کھلنے کو بے تاب تھے۔

وہ کیسی کیفیت تھی۔ کیا شعور تھا۔ کون سی آگہی تھی۔ جس نے میرے ہوش و حواس پر اپنے پنجے گاڑتے شیطان کو جھنجوڑا۔

کتنا اچھا موقع تھا' دل میں چھپی لاشعور میں دبی بظاہر بے ضرر سی خواہشوں کو عملی جامہ پہنانے کا۔ وہاں خاموشی تھی۔ تنہائی تھی اور وہاں رضامندی بھی تھی۔ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور کوئی کسی کو بتانے والا بھی نہیں تھا۔ تب۔۔۔ ہاں تب ہی جب میرے لبوں سے خیر کا کلمہ نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ خیر اتر گئی۔ میرے دل پر' میری سوچ پر اور میرے شعور پر دستک دی۔

"کس سے چھپ رہا ہے تو۔۔۔ دنیا والوں سے؟ کس کے پوچھنے اور بتانے سے ڈر رہا ہے 'اس فانی جہان میں رہنے والے خاکی 'خطا کے پتلوں سے؟" سوال ادھورا تھا' مگر جواب مکمل 'ٹھوس۔

وہ ایک لمحہ۔۔۔ جو بے حد بھاری تھا' میرے اعصاب پر بوجھ کی طرح سوار۔۔۔ یوں لگا چاروں طرف سے بند کیبن میں ہر جگہ آنکھیں ابل آئیں۔ گھورتی' متنبہ کرتی آنکھیں' تمسخر سے مجھے دیکھتی' مذاق اڑاتی۔

"بے وقوف۔۔۔ دنیا والوں سے ڈرتا ہے' اللہ کے بندوں سے خوف کھاتا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اللہ سے نہیں۔"

قریب تھا کہ خرد اور خیر ہار جاتے' شر جیت جاتا' مگر پھر بالکل اچانک ہی ایک جھماکا ہوا اور ہر طرف روشنی ہو گئی۔ لفٹ میں لگا سنہری روشنی والا بلب جل اٹھا اور وہ برائی جو اندھیرے سے فائدہ اٹھاتی میرے اس قدر نزدیک تھی' جس کا تصور بھی محال تھا۔ یکدم دور چلی گئی۔

شاید جنریٹر چلا دیے گئے تھے۔ فوراً" ہی لفٹ کا دروازہ کھلا۔ یہ میرا مطلوبہ فلور نہیں تھا' مگر میں یوں نکل کر بھاگا جیسے لفٹ میں حیا درانی نہیں کوئی بدروح تھی۔ ہاں۔۔۔ لیکن اس قدر تیزی میں بھی' میں اسے کہنا نہیں بھولا۔ "کم سے کم اپنے نام کی لاج تو رکھیں۔۔۔ مسز حیا درانی!"



رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اس واقعے کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ابھی ابھی ایک طویل اعصابی جنگ لڑ کر تھکا ہارا بیٹھا ہوں۔ شام میں کسی وقت **سمیتا** نے حاجرہ بن جانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ جب سے **سنیعہ** مسلسل اسی کا ذکر کر رہی تھی' ذکر خیر۔۔۔

ڈور بیل بجی۔

"اس وقت کون آگیا۔ تم ہی دیکھ لو' میں تو بہت تھک گیا ہوں۔" میں نے کسلمندی سے **سنیعہ** سے کہا اور محسوس ہوا' میں واقعی کتنا تھکا ہوا ہوں۔

سنیعہ تھوڑی دیر میں واپس آئی۔

"حیا آئی تھی۔ میں نے بہت بلایا۔ پر اندر نہیں آئی۔ یہ تمہارا خالی والٹ دے کر گئی ہے۔" میں جانتا تھا۔ وہ اب شاید ہی کبھی میری موجودگی میں گھر آئے۔

"بتا رہی تھی۔ تم دونوں کل لفٹ میں پھنس گئے تھے۔ تم نے تو نہیں بتایا۔ کافی ٹائم ضائع ہو گیا ہو گا۔"

میں نے جواب نہیں دیا۔

حاجرہ نے ٹھیک کہا تھا۔

اللہ رب العزت واقعی تھام لیتا ہے۔ سنبھال لیتا ہے۔ بھٹکنے نہیں دیتا۔ بس۔۔۔ سچے دل سے پکارنے والا ہونا چاہیے۔ جیسے اس دن بالکل انجانے میں' میں نے اللہ کو پکارا۔۔۔ اور۔۔۔ وقت تو کافی ضائع ہوا مگر صد شکر کہ۔۔۔

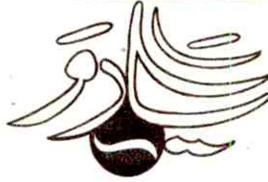
اس نے تھام لیا تھا۔




English
ANTI - LICE
SHAMPOO


English
ANTI - LICE
SHAMPOO
PRO-V CONDITIONER
جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات

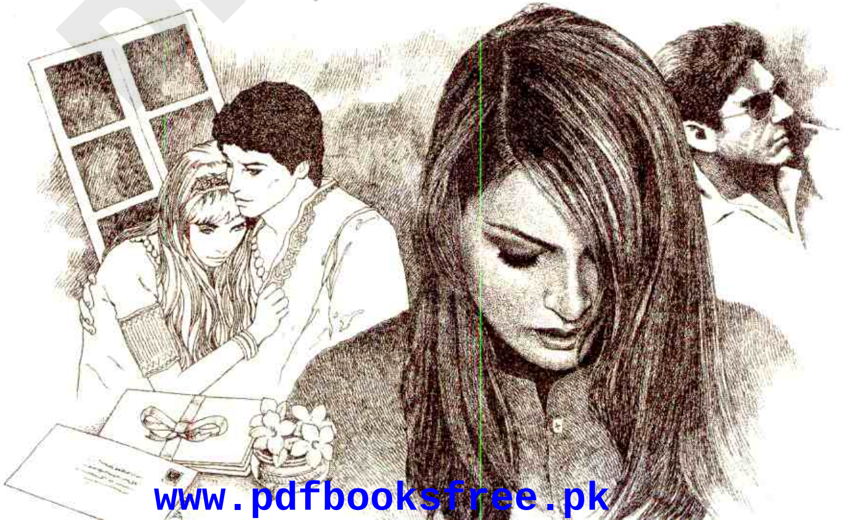
سمیرا حمید

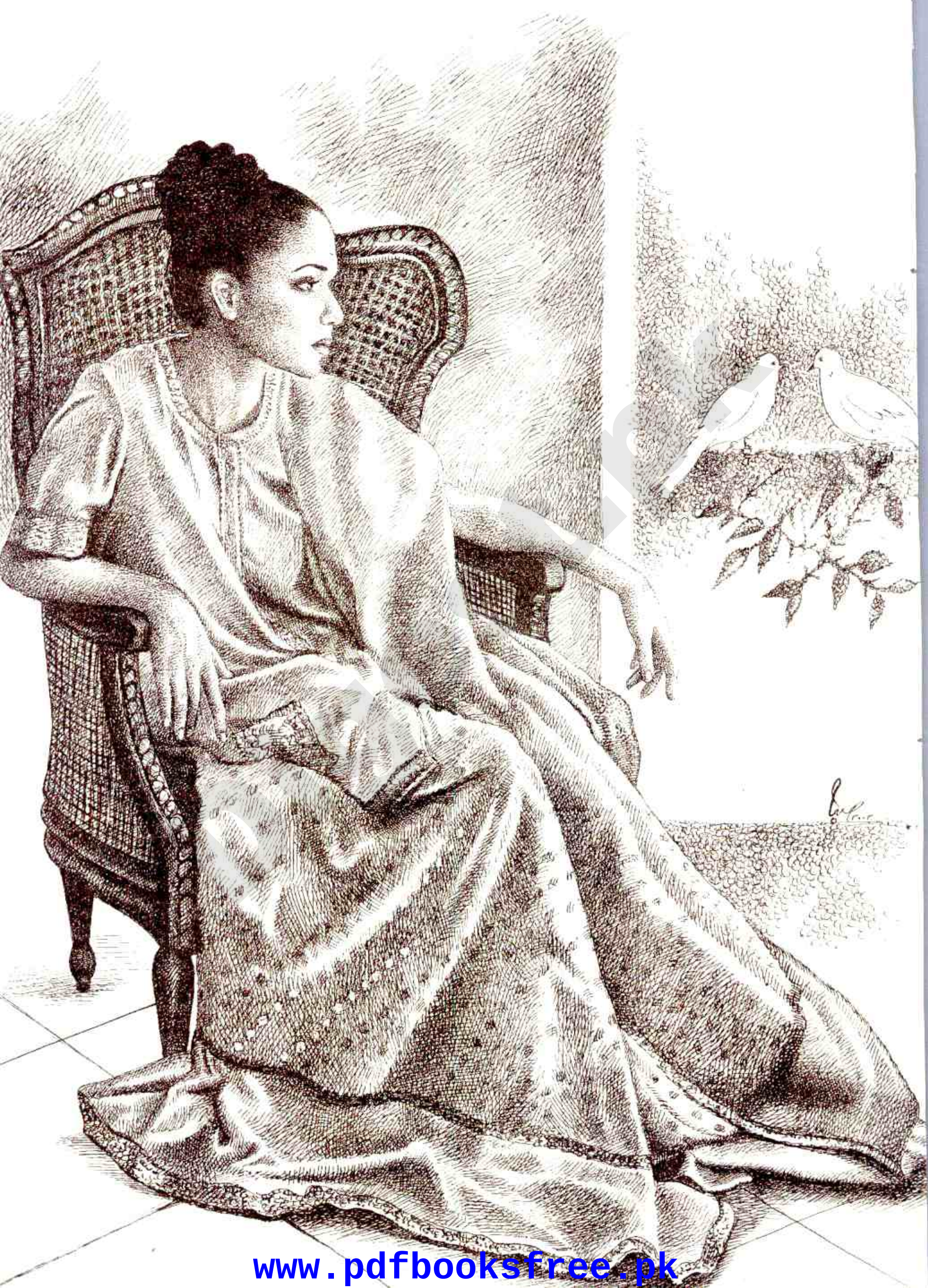


امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں ”منحوس“ مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا، اماں، دادی اور تینوں بہن بھائی دانیہ، حماد اور علی اسے اکثر جنم جلی، منحوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب بنتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پر دھیان دو اور اسکالر شپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر مانچسٹر یونیورسٹی سے اسے اسکالر شپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلبا سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائی ان کی طرف سے ہو گی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ناول





بعد امرحہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دائم بتاتا ہے۔ دادا جی امرحہ کے لیے پیسے اکٹھے کرکے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا' شرلی' بیٹی لو اور للی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرحہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے شنل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا' ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹری فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرحہ کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے 'آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس، پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں اٹیک ہو جاتا ہے۔ امرحہ انہیں تسلی دیتی ہے اور ڈاکومنٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرحہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرحہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرحہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرحہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے 'یہ اس کا گھر ہے' وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا' تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرحہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا' ناجائز؟

دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی' جو ان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرحہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دہی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرحہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرحہ کو احساس دلا رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرحہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا' وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی مور گن کی شادی میں امرحہ اور سادھنا شہ بالیاں تھیں۔ کالے سوٹ میں ملبوس عالیان کی نظریں امرحہ پر مرکوز تھیں۔

مانچسٹر میں ڈریگن پریڈ (نئے سال کی پریڈ) تھی امرحہ کی چینی کلاس فیلو چی من نے امرحہ کو پریڈ میں حصہ لینے کا کہا۔

امرحہ ڈریگن کے لباس میں تھی عالیان نے پریڈ کے دوران امرحہ کو پرپوز کیا۔

اس نے صاف انکار کر دیا اور جھوٹ بولا کہ اس کی پاکستان میں منگنی ہو چکی ہے اور اس کی واپسی کے بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ عالیان یہ سن کر شدید صدمہ کا شکار ہو گیا۔

امرحہ انکار کرکے خوش نہیں تھی۔ ویرا نے اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔

ہارٹ راک کیفے میں ڈی جے ایک خاص ڈسک جو کارل نے دی تھی لگاتا ہے۔ کیفے میں عالیان بھی موجود ہوتا ہے۔ ڈسک کے چلتے ہی ____ کیفے میں موجود تمام اسٹوڈنٹس عالیان کو دیکھنے لگے ہیں۔ یہ وہ گفتگو ہوتی ہے جو امرحہ نے ویرا سے عالیان کے بارے میں کی تھی۔ اسے ناجائز ہونے کی گالی دی تھی۔ اس کی ماں کے کردار پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ عالیان کی ماں۔ اس کی اب تک کی زندگی کی واحد محبت "مارگریٹ جوزف"

عالیان کی ماں مارگریٹ جوزف اپنی لبنانی شوہر کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مارگریٹ گویا جیتے جی مر گئی اور جب اس کے شوہر نے اسے لعنت قرار دیا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

مارگریٹ جوزف کے مرنے کے بعد عالیان کو بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال کے ایک پرائیویٹ ادارے میں داخل کروا دیا

گیا۔ اس ادارے سے لیڈی مہر عالیان کو گود لے لیتی ہیں۔ لیڈی مہر عالیان کی زندگی میں اپنی ماں کے بعد دوسری عورت تھی جس نے اسے پیار دیا۔ بےلوث محبت کی۔

عالیان کی زندگی میں آنے والی تیسری عورت "امرحہ" تھی جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا اور اس کے ہاتھوں ذلت سہی۔ وہ امرحہ اور ویرا کی باتوں کا ٹیپ سن کر بری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔

بہت دنوں تک عالیان یونیورسٹی نہیں آتا۔ کارل امرحہ کے پاس آکر اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ عالیان کو ڈھونڈ کر نہیں لائی تو وہ اپنا سامان باندھ کر رکھے پھر ملکہ الزبتھ بھی اسے برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔

امرحہ کارل کی باتیں سن کر حیران ہوتی ہے۔ کارل امرحہ کو بتا دیتا ہے کہ اس کے اور ویرا کے درمیان ہونے والی تمام باتوں کی ریکارڈنگ اس کے پاس ہے اور اس ریکارڈنگ کو عالیان نے بھی سن لیا ہے۔ امرحہ کو کارل کی بات سن کر ایسا لگتا ہے اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے اور اسی کیفیت میں گھری وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگتی ہوئی جاتی ہے عالیان کو ڈھونڈتی ہے لیکن وہ اسے نہیں ملتا۔ امرحہ سوچتی ہے کہ عالیان تو کہا کرتا تھا کہ وہ خود کو مار ڈالے گا لیکن کلاس نہیں چھوڑے گا تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا....؟

— ۴ —

چوتھی قسط

لرزنے کی ایک پردرد کیفیت امرحہ کے وجود میں جاگی اور اسے گرنے سے بچنے کے لیے قریبی دیوار کا سہارا لینا پڑا.... اس کے چار اطراف کی ہوا نے اپنا رخ اس سے پھیر لیا' اور ہوا کی اس خود غرضی پر اس کا دم گھٹنے لگا۔

کراس بیگ بہت وزنی ہو چکا تھا۔ اس کا وزن امرحہ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ وزنی تو اس کا اپنا وجود بھی ہو چکا تھا۔ امرحہ کے لیے اسے قائم رکھنا محال ہو رہا تھا کہ عزت بھی رہ جائے اور چوٹ بھی نہ لگے۔

اسے یاد ہی نہ رہا کہ اسے اپنی پہلی کلاس لینی ہے۔ اگر کوئی اسے اس وقت پکارتا تو اسے یہ بھی یاد نہ آتا کہ امرحہ نامی لڑکی خود وہی ہے۔

ایسے چلتی جسے چلنا تو ہرگز نہیں کہتے' وہ باغ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی' چپ.... خاموش۔

"دنیا میں اتنا سناٹا کیوں ہے۔"

"نہیں! یہ شور.... اتنا شور.... یہ کہاں سے پھوٹا پڑتا ہے....؟ کان پھٹ رہے ہیں.... کچھ سنائی نہیں دے رہا.... کان بہرے ہو چکے ہیں۔"

اب وہ گود میں ہاتھ رکھے بیٹھی ہے جیسے دائرے کی صورت اس کے گرد الاؤ بھڑکانے کی تیاریاں کی جاتی ہوں اور وہ اس پر راضی ہو۔

ہونی ہو چکی ہے مطلب.... اس کی سب تدبیریں حساب کتاب الٹا ہی ہوا.... وہ نالائق کی نالائق ہی رہی۔

اسٹوڈنٹس آ جا رہے ہیں.... برفیلی ہوا چل رہی ہے.... دھند ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور ایسا کرتے بہت خوفناک لگ رہی ہے۔

آکسفورڈ روڈ ایسے رواں دواں ہے جیسے ابھی ابھی وہاں سے شور مچاتی چیختی چنگھاڑتی پرانے انجن کی ریل گاڑی قطعاً "نہیں گزری....

باغ کے ایک کونے میں وہ اکیلی بیٹھی ہے.... جیسے ساری دنیا تباہ ہو چکی ہے.... اور اب وہ.... اب وہ اکیلی رہ گئی ہے.... بالکل اکیلی.... جسے باغ میں بچھی گھاس خزاں میں پیوست بہار سے دور اکیلی۔

سیاہ بلوری پیالے آنسوؤں سے بھر بھر گئے.... گود میں ہاتھ رکھے وہ اتنی بڑی یونی میں.... اتنی بڑی دنیا میں اکیلی ہوئی بیٹھی ہے.... افسوس.... برائے نام حصے میں آتے ہی سہی وہ عالیان کو کھو چکی ہے۔ اور محبت کا ایک ہی پنجرہ ہے "دنیا" اس کا ایک ہی قصور ہے۔ "دنیا دار ہونا" اس پنجرے پر ایک ہی تالا لگتا ہے "روایات

کا..... اس سوال کا' اس سوال کا..... اس خوف کا۔ اس انجام کا..... یہ وہ..... بس سب سوالیہ..... سرکشی کی اجازت نہیں..... بغاوت کا حکم نہیں.....

اس پنجرے کی سلاخوں کی بنیادیں 'خود غرض معاشرے کے کھوکھلے' بھُربھُرے اصولوں سے ہری بھری دھرتی کے سینے سے پھوٹتی ہیں..... اور اصول و ضوابط کی فضا میں غرور و تکبر سے تن جاتی ہیں۔

یہ پنجرہ..... اس پنجرے کا قیدی حساب کتاب کیوں نہ کرے..... وہ سارے سوالوں کا جواب نکال لے گا تو ہی تالا کھلے گا.....

اور سب سوالوں کے جواب کون فاتح ہے جو نکال پاتا ہے.....

امرحہ اتنی عقل مند تھی کہ عالیان کو پہچان گئی تھی اور اتنی ہی بے وقوف کہ اسے پانہ سکی۔

اور ذرا بتائیے مشرق میں وہ قلم دوات کہاں ملتی ہے جو ایسی "محبت" کرنے کی تحریری اجازت دیتی ہے..... ایسی محبت جس کی اہمیت مٹی کے کچے ٹوٹے ہوئے گھڑے سے بھی گئی گزری ہوتی ہے..... وہ اٹھی اور گھر آگئی۔

"آپ کی عالیان سے بات ہوئی؟" اس نے آتے ہی لیڈی مہر سے پوچھا۔

"دو دن سے اس نے مجھے فون نہیں کیا..... اس کا فون بند ہے..... کل تم اس سے یونیورسٹی میں مل سکتی ہو..... پوچھنا اس کے موبائل کے ساتھ کیا ہوا ہے..... کل ضرور وقت نکال کر اس سے مل لینا....."

وہ زندگی کا سارا وقت نکال کر اس سے مل لیتی "اگر اجازت دے دی جاتی..... اس پر یہ اجازت جائز کردی جاتی.....

وہ لیڈی مہر کو بتا نہ سکی کہ وہ یونیورسٹی نہیں آیا..... اور یہ بھی کہ ان کے فرماں بردار 'لاڈلے بیٹے کے منہ پر اس نے تھپڑ دے مارے ہیں "اب دکھ اور شرمندگی کو لیے وہ خود کو چھپا رہا ہے..... خود کو گم کر کے وہ تلاش کرتا پھر رہا ہے.....

"اگر اسے کہیں جانا ہو تو وہ کہاں جاتا ہے..... اس نے مجھے نوٹس دینے کے لیے کہا تھا اور اب..... اس کا کچھ اتا پتا ہی نہیں....." اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی آواز کو کس ردھم پر لے آئے کہ اس کی چوری نہ پکڑی جائے" آتش دان کے قریب آکر وہ سلاخ سے آگ کو بلاوجہ کریدنے لگی۔

"جائے گا کہاں..... وہ مجھے بتائے بغیر شہر نہیں چھوڑا کرتا۔"

آگ کو کریدتے اس کے ہاتھ رک سے گئے "یعنی اس بار وہ یہ نافرمانی کرچکا ہے وہ اپنی ماں کو بغیر بتائے کہیں جاچکا ہے۔"

"تم یونیورسٹی سے کیوں آگئیں؟"

"بس ایسے ہی..... دل نہیں چاہ رہا تھا کلاسز لینے کا۔"

"اچھا..... تم نے تو ایک بار کہا تھا تم مرجاؤ گی اپنی کلاسز نہیں چھوڑو گی۔" لیڈی مہر نے ہنس کر کہا۔

اس نے آتش دان کی کارنس پر اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ گاڑ دیا..... عالیان سے سیکھ کر اس نے یہ بات دو تین لوگوں سے کی تھی..... وہ گردن اکڑا کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کے لیے اس کی تعلیم کس قدر اہم ہے اتنی زیادہ کہ صرف موت ہی درمیان میں حائل ہو کر روک سکتی ہے..... تو کیا موت حائل ہو چکی تھی؟..... ایسا ہی ہوا ہے **یقینا**" پھر تو.....

"جاب پر جانے سے پہلے تم Anselm ہال چلی جانا....."

"میں چلی جاؤں گی..... آپ پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہو گا۔"

"وہ میرا بیٹا ہے' وہ اپنا خیال رکھنا جانتا ہے "اپنے لیے نہیں..... میرے لیے۔"

امرحہ کو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے آگ کے اتنے قریب کھڑی ہے 'لیڈی مہر کی اس بات نے اسے چونکا دیا تھا..... ہاں وہ ٹھیک ہو گا..... کسی کے لیے نہیں..... صرف ماما مہر کے لیے.....

"دیکھو' دھند نے آج مانچسٹر پر کیسی یلغار کی ہے۔"

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی مانچسٹر پر اترنے والی دھند پر نثار ہو رہی تھیں۔

امرحہ نے ان کی پشت سے ان کے چہرے پر چھائی معصومیت کو پچھتاوے کے احساس میں گھر کر دیکھا اس کا جی چاہا وہ ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور عالیان سے پہلے ان سے معافی مانگ لے۔۔۔ انہیں بتائے کہ ان کا بیٹا نہ جانے کہاں چلا گیا ہے اور ایک صرف اس کی وجہ سے۔۔۔

پہلی بار وہ عالیان کے ہال ST - Anselm آئی۔ پر جو دن میں یونیورسٹی نہیں آیا تھا' وہ شام تک ہال کیسے آتا۔۔۔ وہ اپنی جاب پر آگئی۔ کسٹمرز صبر سے اس سے اپنا بل بنواتے رہے۔ اس کی دس انگلیاں جامد تھیں' وہ حرکت کرنے سے انکاری تھیں۔۔۔ ایک معمولی سے جوتے کا اس نے دس ہزار پونڈ کا بل بنا دیا۔۔۔

"امرحہ۔۔۔! میں آچکی ہوں۔" ویرا اس کے سر پر کھڑی تھی' پچھلے دس منٹ سے کھڑی تھی۔

امرحہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے سنا ہی نہیں کہ اسے مخاطب کیا گیا ہے۔

"امرحہ!" ویرا نے دس منٹ مزید صبر سے کھڑے رہنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔

"میں فارغ نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ایک گھنٹہ ہے تمہارا دورانیہ ختم ہونے میں۔۔۔ میں کیفے میں۔۔۔"

"میرے لیے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم جا سکتی ہو۔۔۔"

"تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"مجھے تمہارے ساتھ اب نہیں جانا۔۔۔"

"یہ فیصلہ ہم بات کرنے کے بعد کریں گے۔"

"فیصلہ ہو چکا ہے۔۔۔" وہ ویرا کے کمرے کی ایک ایک چیز تہس نہس کر آئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اسٹور سے نکلی تو ویرا جو اسٹور کے ایک طرف ٹہل رہی تھی۔ اس کے پیچھے لپکی۔

"تم اتنی تیزی سے کہاں جا رہی ہو۔۔۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

اس نے جیسے سنا ہی نہیں اور وہ اپنی بس میں بیٹھ گئی۔ ویرا اپنی سائیکل پر آتی رہی بس کے پیچھے پیچھے کہ کہیں وہ درمیان میں ہی اتر کر کہیں اور نہ چلی جائے۔۔۔ اس نے آتے ہی اپنا کمرہ لاک کر لیا' ویرا نے لیڈی مہر کی پروا کیے بغیر اتنی زور زور سے دروازہ بجایا کہ اسے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔۔۔ وہ لیڈی مہر کو کس منہ سے اس سارے تماشے کی تفصیل بتاتی جو اس کے اور ویرا کے درمیان ہوتا۔۔۔

"دو بالغ افراد' غصہ کرنے لڑنے سے پہلے آرام سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔" ویرا نے اپنے قد کی طرح لمبے ہاتھوں کو اس کے شانوں پر رکھ کر نرمی سے کہا۔

"بالغوں میں سے ایک بالغ کچھ بھی کر سکتا ہے۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ خاص کر اگر وہ چھپا رستم بھی ہو تو۔۔۔" شانوں پر سے اس کے ہاتھ جھٹک کر اس نے تیز آواز میں کہا۔

ویرا کو اس کے انداز پر ایک جھٹکا لگا اس کی گلابی رنگت پھیکی سی پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا ملال چھلکنے لگا۔

"تم اتنی سی بات پر ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو؟" اس نے یہ کہتے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلی بار اس کی آواز ایسے ارتعاش کا شکار ہوئی ہے۔

"اتنی سی بات۔۔۔ تم نے میری ساری باتیں ریکارڈ کر کے عالیان کو دے دیں۔" کس قدر شرمناک حرکت ہے۔۔۔ جانتی ہو۔۔۔ اسے کارل نے بھی سنا اور کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس نے بھی۔۔۔"

ویرا کی آنکھوں میں ملال کی جگہ خوف نے لے لی۔ کمانڈو کی طرح ساری دنیا کو اپنے پیچھے رکھنے والی نے کسی قدر سہم کر امرحہ کو دیکھا۔۔۔ ایسا کرتے ویرا بلاشبہ بہت بدہیئت لگی۔

"عالیان کو نہیں۔۔۔ کارل کو امرحہ۔۔۔!"

امرحہ کو بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا "کیوں۔۔۔ کیوں کیا ایسا۔۔۔ کیا مصیبت آئی تھی تم پر ویرا۔۔۔؟"

"کارل نے مجھ سے کہا تھا۔۔۔ اس نے عالیان اور تمہیں پریڈ میں باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔۔۔ تھوڑا بہت سن بھی لیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تم سے پوچھوں۔۔۔ وہ عالیان کا دوست ہے۔۔۔ عالیان بہت اپ سیٹ تھا پریڈ کے بعد سے۔۔۔ کارل جاننا چاہتا تھا اس کی وجہ۔۔۔"

"وہ عالیان کا دوست نہیں ہے۔۔۔" امرحہ کس قدر سہم کر چلا اٹھی۔

"وہ عالیان کا دوست ہے امرحہ۔۔۔ صرف وہی ایک دوست ہے۔"

"دوست ایسا کرتے ہیں جیسا اس نے کیا۔۔۔ جیسا تم نے کیا۔۔۔" امرحہ کو یقین سا ہونے لگا کہ وہ اپنا چین و قرار تا عمر کے لیے کھو دے گی۔۔۔ اور پھر کبھی نہیں پا سکے گی۔

"امرحہ! اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھیک سب جاننا چاہتا ہے۔ جب میں تم سے بات کر رہی تھی تو فون پر وہ سن رہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ فون کال ریکارڈ کر لے گا۔۔۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہارٹ راک میں وہ ڈسک چلوا دے گا۔۔۔"

امرحہ نے ویرا کی شکل کو پہچاننے کی کوشش کی۔۔۔ مکڑی کے جالے سی بینائی نے پھر سے امرحہ کو اندھا کرنے کی کوششیں کی۔۔۔ پلکوں کی جنبش امرحہ پر گراں گزری۔۔۔

"ہارٹ راک۔۔۔ ڈسک پر۔۔۔؟"

امرحہ کی شکل کی طرف دیکھتے ویرا رو دینے کو ہو گئی وہ تو اتنی بہادر تھی، پھر اب کیسے وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"ہاں! کارل نے وہاں ڈی جے سے چلوا دی۔۔۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس بھی تھے وہاں۔۔۔ اور عالیان بھی۔۔۔ مجھے بھی آج ہی یونیورسٹی سے معلوم ہوا ہے۔"

"اور عالیان۔۔۔؟" امرحہ بڑبڑائی۔

اس کا خیال تھا یہ سب ST- Anselm ہال میں ہوا ہو گا، پر وہ تماشا تو ہارٹ راک میں لگا تھا جہاں یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کا جم غفیر ہوتا ہے۔۔۔ تو اس کی زبان سے کی گئی ہتک سب نے سن لی۔۔۔ جس کی وہ عزت کرتی تھی اس کی سر عام بے عزتی کر دی۔۔۔

"ویرا! تم نے کیا کیا؟" اس کی آواز میں آنسو پھنسنے لگے۔

"کیا کیا تم نے۔۔۔ تم مجھ سے کرید کرید کر وہ سوال پوچھتی رہیں۔۔۔ وہ سب۔۔۔ وہ سب جو سچ بھی تھا۔۔۔ اور جو جھوٹ بھی تھا۔۔۔ تم مجھ سے وہ کیوں پوچھتی رہیں۔ تم۔۔۔ تم تو کہتی ہو کہ تم میرے ملک کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔۔۔ وہاں کے میدان، پہاڑوں، سمندروں، موسموں، تاریخ کے بارے میں۔۔۔ اتنا کچھ جانتے تم نے وہاں کے لوگوں کے بارے میں کیوں نہ جانا۔۔۔ تم نے یہ جاننا کیوں ضروری نہ سمجھا کہ مشرقی لڑکیوں کا جھوٹ کیسا سچ ہوتا ہے۔۔۔ سچ کو کیسے خفیہ تابوتوں میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے کہ کوئی ان کی خوشبو نہ پالے۔۔۔ ویرا تم تو کہتی تھیں تم مجھے سمجھتی ہو۔۔۔ اب تم مجھے کیوں نہ سمجھیں۔۔۔ میں تو تمہاری دوست تھی۔۔۔"

ویرا کو "دوست تھی" کے لفظ کی ادائیگی نے تکلیف دی۔۔۔

"تم میری دوست ہو امرحہ۔۔۔! اسی لیے مجھے وہ سب برا لگا جو تم نے عالیان سے کہا اور اس کے لیے سوچا۔۔۔ تم نے اسے انکار کیا۔۔۔"

"انکار!" امرحہ کو پھر سے زیر لب دہرانا پڑا۔

"تمہیں چند سال ہمارے معاشرے میں گزارنے ہوں گے ویرا۔۔۔ میرے خاندان میرے بابا، اماں، ان سب لوگوں کے ساتھ۔۔۔ امرحہ کی جگہ آ کر۔۔۔ کسی بھی مشرقی لڑکی کی جگہ آ کر۔۔۔ تم سمجھ جاؤ گی۔ انکار کیوں ضرور ہو جاتا ہے۔"

"میں نہیں جانتی یہ سب۔۔۔ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔۔۔"

امرحہ ایسے استہزائیہ ہنسی کہ ویرا کو سب جواب مل گئے جیسے۔۔۔

"وہ میرا دوست تھا ویرا۔۔۔ باتیں کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک وقت تھا۔"

"وہ دوست بنانے کے لیے جائز ہے۔۔۔ وہ لائف پارٹنر بنانے کے لیے ناجائز کیوں ہے؟"

"میں نے اس کی بے عزتی کردی۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔"

"تمہیں اس کی ناراضی کی فکر کیوں ہے؟"

"وہ مجھے ناپسند کرے گا اب۔۔۔ وہ مجھے منافق سمجھے گا۔"

"تم نے منافقت کی ہے۔"

"میں نے منافقت کی ہے؟" سرگوشی کی صورت اس نے خود سے سوال کیا۔۔۔ اور ملنے والے جواب نے اسے شرمندہ کردیا۔

"وہ تمہارا دوست ہے تو ٹھیک۔۔۔ کچھ اور بنے تو غلط۔۔۔ ایک ہی انسان کو اچھا اور برا بنا رہی ہو۔۔۔ منافقت نہیں ہے کیا یہ۔۔۔ وہ تمہیں برا سمجھے گا۔۔۔ تمہیں اس بات کا خوف ہے اور تم اسے برا سمجھتی رہیں۔"

"تم نے میرے ساتھ ٹھیک نہیں کیا ویرا۔۔۔!"

"تم نے خود اپنے ساتھ ٹھیک نہیں کیا امرحہ۔۔۔ اسی لیے کہتی ہوں عقل سے۔۔۔"

"عقل ہے میرے پاس۔۔۔ لیکن اس عقل سے پہلے خوف ہے۔۔۔ بڑا۔۔۔ ہیبت ناک اژدھا جیسا۔۔۔"

"اس خوف کو دبا دو۔۔۔ برف میں گردن تک دھنسا دو اسے۔۔۔"

امرحہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

"اسے حد درجہ تکلیف پہنچی ہے تو وہ یوں گم ہو گیا ہے نا؟"

اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔۔۔ جس وقت وہ امرحہ سے وہ سب باتیں کر رہی تھی اس وقت اسے گمان بھی نہیں تھا کہ صورت حال ایسی

ہو جائے گی۔۔۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ امرحہ کے انداز اور جوابات سے چڑتی چلی گئی اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردی اور اس دوران وہ یہ بھی بھول گئی کہ کارل یہ سب سن رہا ہے۔۔۔ کارل نے اس سے کہا تھا کہ عالیان کے ساتھ کچھ تو ایسا ہوا کہ وہ اس قدر اپ سیٹ ہے۔۔۔ اور یہ بات امرحہ سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ اب تو سب ہی جان گئے تھے کہ عالیان کیسے سائے کی طرح امرحہ کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا۔۔۔

"عالیان ٹھیک ہوگا امرحہ۔۔۔ وہ واپس آجائے گا۔۔۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ ایسی ویسی کوئی حرکت تو نہیں کر سکتا نا۔۔۔"

امرحہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔۔۔ وہ اپنے بستر میں گھس گئی اور خود کو لحاف میں دبا لیا۔۔۔ ویرا کمرے سے چلی گئی تو وہ لحاف سے نکلی۔ اب وہ جہاں کہیں بھی ہوگا۔۔۔ کتنا بھی ٹھیک ہوگا۔۔۔ لیکن تکلیف سے انجان نہ ہوگا۔۔۔ وہ کتنا بھی بہادر ہوگا ایک بار تو ٹوٹا ہی ہوگا۔۔۔ اس نے محبت کی۔۔۔ اس کا اقرار کیا۔۔۔ اور اسے ایسے دھتکار دیا گیا۔

اس کا سارا علم بھی اسے یہ سمجھا دینے سے قاصر رہا ہوگا کہ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔۔۔

☆ ☆ ☆

مزید دو دن گزر گئے' عالیان یونیورسٹی نہیں آیا۔ وہ ہال بھی نہیں گیا تھا۔ کارل ایک بار پھر اسے سنجیدگی سے دھمکا گیا تھا۔ ویرا لے نے وہ ریکارڈنگ لا دی تھی جو ہارٹ راک میں چلائی گئی تھی۔ ساری رات امرحہ اس ریکارڈنگ کو سنتی رہی تھی۔ وہ عالیان کی جگہ خود کو کھڑا کر لیتی اور امرحہ کا ہتک آمیز' تلخ انداز سنتی۔۔۔ اور بے مول سی ہو جاتی۔۔۔

عالیان کی جگہ۔۔۔ وہ کبھی بھی عالیان کی جگہ نہیں آسکتی تھی۔

اس کے لیے باغ سے پھول توڑ کر لاتا ہوا۔۔۔ ہزاروں کے مجمع میں اسے پہچان کر اس کے پاس آنے والا۔۔۔ صرف اس کے پاس۔۔۔ بہانے بہانے سے اس کے ساتھ رہنے والا۔

"یہ تمہیں لائبریری میں ملے گا ورنہ کہیں نہیں۔"

"اب یہ تمہیں امرحہ کے آس پاس ملے گا ورنہ کہیں اور ہرگز نہیں۔"

اس کی آنکھوں کی پہیلی بوجھ لینے والا۔۔۔ عالیان۔۔۔

اس کی پیدائش کے بعد سب اس سے دور دور رہنے والے تھے۔ دادا کے بعد ایک وہی تھا جو بھاگ بھاگ کر اس کے پاس آتا تھا۔ تھا کیا امرحہ میں کہ وہ اس کے لیے ایسا مقناطیس بن چکی تھی۔۔۔ وہ اس سے خفا نہیں ہوتا تھا۔۔۔ وہ اس پر خفا نہیں ہوتا تھا' وہ اس کی باتوں پر ایسے ہنستا تھا جیسے ہنسنا اس نے ابھی ابھی اس کی باتیں سن کر ہی سیکھا ہے۔۔۔

اگلے دن وہ پھر یونیورسٹی نہیں آیا۔۔۔ جاب پر جانے سے پہلے وہ ہارٹ راک کیفے آگئی۔ اس کے پوچھنے پر اسے بتایا گیا کہ وہ اندر اپنی ڈیوٹی پر ہے۔

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔ میرا نام امرحہ ہے۔۔۔ آپ اس سے کہہ دیں۔" اس نے کاؤنٹر بوائے سے کہا۔

کاؤنٹر بوائے واپس آیا تو اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کیا وہ آرہا ہے؟" امرحہ کو خود ہی پوچھنا پڑا۔

"معلوم نہیں۔۔۔ وہ تو خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔" البانوی کاؤنٹر بوائے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"میرا نام بتایا؟" امرحہ کو یقین تھا وہ ٹھیک تلفظ سے اس کے نام کی ادائیگی نہیں کر سکا ہوگا۔

البانوی کو جیسے برا لگا۔ "ظاہر ہے۔"

امرحہ نے ایک گھٹن زدہ سانس لیا اسے اپنے دل کی کھال سکڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"مطلب کہ وہ نہیں آرہا۔۔۔ لیکن شاید آہی جائے۔"

وہ ہارٹ راک سے باہر آگئی۔ وہ اپنی جاب پر جائے

یا نہ جائے۔ شاید عالیان باہر آ ہی جائے۔۔۔ ابھی بس کچھ ہی دیر میں۔۔۔

وہ ہارٹ ڈاک کے باہر کھڑی ہو گئی۔۔۔ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے۔۔۔ مفلر کے کونے سے آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے۔۔۔ بے بسی سے پرنٹ ورک کے میلے کو دیکھتے، اور حیرت زدگی سے ہنستے مسکراتے چہروں کی مسکراہٹ پر دکھ کا اظہار کرتے اس نے خود کو پایا۔۔۔ کھڑے کھڑے اس پر کئی موسم آکر گزر گئے۔۔۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔۔۔

عالیان باہر نہیں آ رہا تھا۔۔۔ یعنی وہ نہیں آنے والا تھا۔۔۔ اس نے اپنے اسٹور فون کیا کہ وہ نہیں آسکتی جاب پر۔۔۔ وہ چھٹی نہیں کرتی تھی۔ ایسے پہلی بار فون کر کے اس نے کہا۔

منیجر نے تشویش سے پوچھا "تم ٹھیک ہو۔۔۔ گرم خطے کے لوگوں کو ٹھنڈ کا بخار بہت جلدی چڑھتا ہے۔"

اس کا منیجر ایک نیم مزاحیہ انسان تھا وہ کسی نہ کسی طرح ہر بات میں مذاق کا پہلو ضرور نکال لیتا تھا۔

"نہیں بخار نہیں ہے۔" اس نے بمشکل کہا۔

"بخار نہیں ہے تو آ کیوں نہیں رہیں۔۔۔ کیا گھر کی یاد کا نزلہ ہوا ہے؟"

"وہ میرے درد ہے۔۔۔"

"درد ہے، سر میں؟" امرحہ کے انداز پر وہ سنجیدہ ہوا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بس بہت درد ہے۔۔۔" اس نے جھٹ فون بند کر دیا۔

کراس بیگ کی اسٹریپ میں ہاتھ دیے وہ ٹہلنے لگی، بہت سے ہائے ہیلو دوستوں نے رک کر پوچھا کہ وہ وہاں ایسے کیوں کھڑی ہے۔۔۔ اندر کیوں نہیں آ رہی۔۔۔ یا جا کیوں نہیں رہی۔۔۔

وہ شرمندہ ہو رہی تھی بہانے بناتے، جھوٹ بولتے۔۔۔ لیکن ظاہر ہے یہ شرمندگی اس شرمندگی کے آگے بہت معمولی تھی جو اسی کیفے میں عالیان نے جھیلی ہو گی۔۔۔ پہلی بار تھپڑ اور دوسری بار تذلیل۔

اور پانچ گھنٹے بعد وہ باہر آیا۔۔۔ وہ۔۔۔ اگر وہ عالیان مارگریٹ ہی تھا تو۔۔۔ امرحہ کو اسے پہچاننے میں کچھ وقت لگا۔۔۔ اس کی شبیہ وہی تھی۔۔۔ وہی ناک نقشہ، وہی صورت۔۔۔ پھر بھی وہ عالیان نہیں تھا۔۔۔ وہ شرط لگا لیتی اور جیت جاتی وہ عالیان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔

اس کی آنکھوں میں سارے جہاں کے اندھیرے آن بسے تھے۔۔۔ وہ عالیان ہی ہوتا تو ایسے اندھیروں کو اپنے اندر پڑاؤ کی اجازت دیتا۔۔۔؟ نہیں کبھی نہیں۔۔۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر امرحہ پر پڑی اور وہ پھر بھی نہیں رکا۔۔۔ دیکھا وہ عالیان نہیں تھا۔۔۔ رات کے اس وقت۔۔۔ ایسے امرحہ کو انتظار کی حالت میں کھڑا دیکھ کر بھی وہ نہیں رکا تھا۔۔۔ تو وہ عالیان کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔؟

"عالیان!" اسے لپک کر اس تک جانا پڑا۔

اس نے رکنے میں تامل کیا۔۔۔ عالیان نے امرحہ کے لیے رکنے میں تامل کیا اور امرحہ کو ایسے دیکھا جیسے کہتا ہو۔

"خاتون میں اچھے مزاج کا مالک انسان نہیں رہا۔۔۔ مجھ سے دور رہیں۔۔۔ مجھ سے دور رہا جائے۔۔۔"

اس کے اتنے قریب جا کر امرحہ کو اس سے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔۔۔ اس کے اعصاب ایسے تنے ہوئے اور ٹھنڈا کر دینے والے کیوں ہیں۔۔۔ روشنی جو اس کے وجود سے آرپار ہوئی لگتی تھی وہ کہاں ہے۔۔۔ اس کے آس پاس اتنا اندھیرا کیوں ہے۔۔۔ وہ تو عالیان سے بات کرنے آئی تھی۔۔۔ وہاں کہیں عالیان تھا ہی نہیں تو اب وہ کس سے بات کرے۔۔۔ اور۔۔۔ اب وہ روشنیاں منعکس کرتے عالیان کو کہاں ڈھونڈے۔۔۔

"تم کہاں تھے؟" جس شدت سے وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی اس شدت سے پوچھ نہ سکی، سوال اس نے پوچھا تھا جبکہ سوالیہ وہ اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میں بہت دیر سے یہاں کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے اس بات کو جان بوجھ کر اس انداز میں بتایا کہ ترس کھا کر پرانا عالیان واپس آجائے۔

"کس کا انتظار کر رہی تھیں؟"

سوال میں لپیٹ کر کیا جواب دیا تھا اس نے، وہ ابھی

بھی لاجواب کردینے پر قدرت رکھتا تھا۔ امرحہ اس کی شکل دیکھتی نہ رہ جاتی تو کیا کرتی؟
"ویرا اور کارل نے مل کر..... عالیان..... وہ سب..... کارل نے اپنی مرضی سے ایڈیٹنگ کی....."
"میں جانتا ہوں....."
"تم پھر بھی مجھ سے ناراض ہو؟" وہ پھر سے یہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکی کہ تم کہاں چلے گئے تھے اور کیوں؟
"نہیں..... ناراض ہونے کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے..... تمہارے اور میرے درمیان اب کوئی وجہ نہیں رہی۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا امرحہ کے قرب سے دور ہو جانے کی آج اسے کتنی جلدی تھی۔
جو "ہم" کہہ چکا تھا' وہ اب تم اور میں کہہ رہا تھا۔
"عالیان! میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے لپکی۔
"وہ سب ویسے نہیں تھا..... وہ تو....."
"کیا سب ویسے نہیں تھا..... جو تم نے کہا وہ سب..... کیا وہ سب تم نے نہیں کہا تھا؟"
"میں نے کہا تھا لیکن۔"
"تو تم کس بات کی وضاحت کے لیے اس وقت یہاں کھڑی میرا وقت برباد کر رہی ہو؟"
یکدم خون نے اپنی رفتار کو خطرناک حد تک بڑھا کر خود کو جامد کر لیا..... امرحہ اسے اسی جامد حالت میں سن ہی دیکھتی رہ گئی..... اس کی قسمت خراب..... بہت زیادہ خراب کہ وضاحت وہ اب بھی نہیں دے سکتی تھی..... اتنی ذہین تھی ہی نہیں..... اتنی بہادر تو کبھی بھی نہیں رہی تھی..... اب وہ کسی بھی چال پر کوئی بھی پتا پھینکے گی بازی مات ہی رہنے والی تھی.....
"میری ماں ایک بری عورت تھی..... ایک آزاد معاشرے کی دلدادہ..... گناہ گار اخلاقی مذہبی حدود کو پھلانگنے والی اور کیا کیا کہتے ہیں تمہارے مشرق میں ایسی عورت کو..... یقیناً" بہت سے نام ہوں گے ایسی عورتوں کے لیے..... جو تم بھول جانے کی وجہ سے کہہ نہ سکتی ہو۔ لو اب کہہ لو..... میں سن رہا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور مکمل فرصت اور کامل توجہ سے امرحہ کو دیکھنے لگا۔
ہارٹ راک کیفے کے آس پاس..... اتنے بڑے دی پرنٹ ورک کی حدود کے اندر کھڑے امرحہ کو کوئی ایک بھی چیز ایسی نہ ملی جس پر وہ اپنی نظریں ٹکا سکتی.....
"میں جانتا تھا کہ میں کسی خاندان کا حصہ نہیں ہوں۔ میرا کوئی باپ نہیں ہے' لیکن اس حقیقت سے صحیح معنوں میں مجھے تم نے روشناس کروایا۔"
وہ خاموش ہوا.....
امرحہ نے چاہا کہ وہ خاموش ہی رہے اگر وہ ایسے ہی بولتا رہا تو وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کیسے گزارے گی.....
"مجھے اتنا خراب سمجھتی تھیں تم..... مجھے ترس آتا ہے خود پر' جب جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم اتنی ناپسندیدگی اپنے اندر رکھ کر بار گریٹ جیسی عورت کے بیٹے سے ملتی رہیں۔ تم واقعی ایک انسان دوست لڑکی ہو..... بہت رحم دل..... جو کسی کو کتنا بھی ناپسند کرے اس پر ظاہر نہیں کرتی..... تم نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا..... لیکن شکریہ کارل کا۔"
"جو تم نے سن لیا وہی سب نہیں ہے۔" عالیان کو دیکھے بغیر اپنے آنسو روک کر اس نے کہا۔
"جتنا سن لیا ہے اس نے میرے لیے میرا سب ختم کر دیا ہے۔ میں ایک ناجائز بچہ ہوں۔ ناجائز..... میری ماں ایک بری عورت تھی..... جو تم کہہ چکیں وہ بھی اور جو تم نہیں کہہ سکیں وہ بھی میں سب سن چکا ہوں..... سمجھ چکا ہوں..... میرا مذہب کیا ہے..... میں عیسائی ہوں' یہودی یا کچھ بھی نہیں..... میں وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھتا اور تمہیں تو بالکل بھی نہیں۔"
"عالیان!" اس کے آنسو نکل ہی آئے اور آواز رندھ گئی..... اور اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا..... عالیان کے آگے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی اور اس نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے.....
"تم مسلمان ہو۔" امرحہ نے تیزی سے اس کے آگے آکر کہا۔
"جب میرے باپ کا ہی نہیں پتا تو میرے مذہب کا کیسے پتا ہوگا..... اور اگر میں مسلمان ہوں بھی تو تم جتنا

اچھا مسلمان نہیں ہوں..... میں نے بہت ایسی رپورٹیں اور فیچر پڑھے ہیں جن کے مطابق کسی غیر مسلم کے اسلام کو اپنا لینے پر اسے مسلمان تو مان لیا جاتا ہے لیکن معاشرے میں اسے وہ درجہ نہیں دیا جاتا جو ایک پیدائشی مسلمان کو دیا جاتا ہے..... ایک عربی تاجر نے ایک نو مسلم کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت تو دی لیکن، تاجر کے خاندان میں شادی کی خواہش کے اظہار پر اسے ملک بدر کروادیا..... مجھے پوچھ لینے کی اجازت دو کہ تم سب لوگ جائز..... اچھے شریف خاندان والے..... نیک بیویوں والے..... تم کتنے اچھے مسلمان ہو..... تم حلال فوڈ کھاتے ہو..... حرام سے پرہیز کرتے ہو..... تم جن کے اسلامی نام ہوتے ہیں..... دور دور تک جن کی نسلوں میں کسی مشرک کا خون شامل نہیں ہوتا..... کتنے اچھے مسلمان ہوتے ہو؟"

ہاتھ باندھے عالیان اس کے معاشرے پر طمانچے مار رہا تھا۔ وہی معاشرہ جہاں امرحہ کو منحوس ہونے کا لقب ملا۔ وہ اتنے اچھے مسلمان تھے کہ اس کی پیدائش کو لے کر توہمات کا شکار تھے۔ اور کوئی ایک دو نہیں۔ ہر ایک..... جس سے اسلام نے سختی سے منع کیا تھا۔ اس کے خلاف وہ سختی سے عمل پیرا تھے۔ اس کے ماموں جو کئی حج کر چکے تھے انہوں نے اس کی نحوست کی وجہ سے اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ لینے سے انکار کردیا تھا۔ اور اس کی دادی جو تہجد گزار تھیں، اور فارغ وقت میں تسبیح پڑھا کرتی تھیں، وہ اس کی موجودگی میں کوئی خوشی کی بات نہ کیا کرتی تھیں کہ مبادا خوشی دکھ میں بدل جائے۔

اس کے کئی خالہ زاد، ماموں زاد، خاندان کی تقریبات میں چھپ کر —— پیا اور پلایا کرتے تھے۔

امرحہ کے بھائی جنہوں نے رمضان کے علاوہ بھی نماز کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ انہیں سنت اور فرائض کے بارے میں برائے نام معلومات تھیں..... اور یونیورسٹی کے مشرق وسطی اور دوسرے خطوں کے مسلمان لڑکے لڑکیاں جو آزادانہ کلبوں اور باروں میں جاتے، ناچتے، گاتے، شراب نوشی کرتے۔

وہ خاندان کی حیثیت سے ایک فرد کی حیثیت سے کسے مثال بنا کر پیش کرتی کہ دیکھو کتنے اچھے مسلمان ہیں..... وہ قوم کے نام پر کس قوم کو اس کے آگے کرتی کہ دیکھو ہم کیسے کامل ہیں..... ہمارے ظاہر و باطن میں تضاد نہیں ہے..... یا چھوٹی موٹی برائیاں الگ، لیکن ہم میں کوئی بڑی برائی نہیں ہے..... ایک جائز بچہ جو مسلمان خاندان میں پیدا ہوتا ہے وہ شراب پیے، حرام کھائے اور تمام مذہبی اصولوں کو توڑ ڈالے، پھر بھی وہ ایک "مسلمان" ہے کیونکہ ایک تو وہ مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہے دوسرا وہ "پیدائشی مسلمان ہے۔"

"میرے دادا ایک اچھے انسان ہیں..... اچھے مسلمان۔" مثال بنا کر پیش کرنے کے لیے اس کے پاس صرف ایک دادا ہی تو تھے۔

عالیان نے اسے ایسی نظر سے دیکھا کہ امرحہ جان پائی کہ بنا ایک لفظ کہے افسوس کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے..... اس نے جانا کہ اگر دادا اتنے ہی اچھے ہیں تو وہ کیوں ان جیسی اچھی نہیں ہے..... عالیان نے اس ایک نظر میں اتنا کچھ کہہ دیا کہ امرحہ پر چپ کا گہرا تالا لگ گیا۔

"مجھے تم پر یہ ثابت نہیں کرنا کہ میں کتنا اچھا انسان ہوں..... برائے نام ہی سہی اپنا ماضی بھی مجھے تم پر نہیں کھولنا..... کیونکہ اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی..... کیوں نہیں رہی یہ تم بہتر جانتی ہو..... اب تم ایک کام کرنا..... جو تجھے بھی کرنا ہے یونی میں..... مانچسٹر میں کوئی عالیان نہیں ہے..... اس زمین پر کوئی امرحہ نہیں ہے..... میں تمہیں نہیں جانتا....."

وہ ایسی باتیں کرتا بھی جانتا ہی تھا.....

جس کے لیے وہ "سب" تھی اب وہ اس کے لیے "کوئی امرحہ نہیں" ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

تف ہے نامحبت پر جو اپنی پیشانی پر یاں کے پتے کا

نصیب کند کروالیتی ہے لھایا... چبایا... تھوک دیا۔
محبت شروع ہونے میں وقت لیتی ہے، ختم ہونے میں کیوں نہیں لیتی...؟ یہ محبت ہو جانے کے بعد خود کو مہربند کیوں نہیں کر لیتی... سختی سے کسی مضبوط تابوت میں... فرعونوں کے خفیہ معبدوں کی مانند... زمین کی تہوں میں جگہ بدلتے قارون کے خزانے کی طرح...
یہ محبت اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں اتنے دشمن لیے کیوں چلتی ہے؟
یہ بجھ بجھ کیوں جاتی ہے... صرف روشن، روشن، روشن ہی کیوں نہیں رہتی...
اس دیپ کی لو پر ہوائیں نحس جادوگرنیوں کی طرح کیوں منڈلاتی پھرتی ہیں... اپنی راجدھانی میں یہ ایسے دشمنوں کو جگہ کیوں دیتی ہے؟ اگر ایسی ہی بات ہے پھر تو جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے...
اگر یہی سب ہے تو بس پھر کچھ بھی تو نہیں ہے... ہاں کچھ بھی تو نہیں، عالیان جا رہا ہے... اس کے آگے... اس سے دور... مگر وہ ایسے چل رہا ہے جیسے اپنے مرکز سے بچھڑ چکا ہو... اس کے وجود میں جڑ پکڑ چکے ارتعاش کو کم بینائی والے بھی دیکھ سکتے ہیں... چال کو مضبوط بنانے کے لیے اسے تردد کرنا پڑ رہا ہے۔
گھوڑے کا شہسوار منہ کے بل
زمین پر گرا ہے... اس کا وجود اس خاک سے اٹا پڑا ہے جسے سوار تاعمر اپنے وجود سے جھاڑ نہیں پاتا...
وہ شدت سے مانگی جانے والی دعا کو درمیان میں ہی چھوڑ دیے جانے کی عملی صورت لگ رہا تھا... اس کے وجود سے پھوٹتے سب ہی اشارے پاتال کی طرف بڑی وضاحت سے ایستادہ تھے۔
امرحہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی... وہ چلا گیا تب بھی... جانا تو اسے بھی تھا بس وہ قوت جو چلنے، پھرنے، بولنے کے لیے ضروری ہوتی ہے، وہ قوت وہ ساتھ لے گیا تھا...
عالیان مارگریٹ... وہ کیسا انسان تھا... وہ اس کی جان نکال کر لے گیا تھا... کیا وہ ایسا ہی تھا... کتنا برا تھا وہ... بہت برا... اسے بس سے واپس گھر آنا تھا... لیکن وہ پیدل چلنے لگی... منہ سے بھاپ نکالتے... پیروں کو برف پر گھسیٹتے...
اگر ان کے درمیان یہ سب نہ ہو چکا ہوتا تو اس وقت اس کے ساتھ، اس کے پیچھے، اس کے پہلو میں عالیان چل رہا ہوتا... جو اس کے ساتھ رہنے کے لیے فضول فضول بہانے گھڑ لیا کرتا تھا۔
امرحہ نے دونوں ہاتھ رگڑے کتنی ٹھنڈ تھی مانچسٹر میں... اف... اتنی ٹھنڈ... اتنی ٹھنڈ کہ وہ زندہ کو مردہ کر رہی تھی... ایسا غضب کا موسم... جو زندوں کو مردہ کر دے... ایسے موسم سے خدا بچائے...
ایسے موسم سے خدا کی پناہ...

گھر آتے ہی اس نے ویرا کے کمرے کے دروازے کو دھکے سے کھولا۔ ویرا لیپ ٹاپ پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گلابی گال پر دیا۔
"تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ جو میں نہیں چاہتی تھی، وہی ہوا۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔" وہ پوری شدت سے دھاڑی۔
گال پر ہاتھ رکھ کر ویرا اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھنے لگی۔
"مجھے نہیں معلوم تھا امرحہ کہ یہ سب ایسے... اتنا پیچیدہ ہو جائے گا۔" ویرا نے اسے شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ کارپٹ پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔
"تم تو میری دوست تھیں۔ اب تم نے کسی کو بھی میرا دوست نہیں رہنے دیا۔"
"امرحہ... ویرا بری نہیں ہے۔ تم..." ویرا اس کے قریب بیٹھ گئی۔
"تم بری نہیں ہو۔ پر میرے ساتھ تو برا کر دیا نا۔ کر دیا نا برا... اب اچھا کون کرے گا۔"

"وہ پھر سے تمہارا دوست بن جائے گا امرحہ!"

"دوست... اب میں مانچسٹر میں ہوں یا نہیں ہوں' اسے اس سے بھی فرق نہیں پڑے گا اور تم دوست ہونے کی بات کر رہی ہو۔ وہ میرا دوست بھی نہیں رہا ایسی باتیں سن کر کون کسی کو دوست رکھے گا۔"

"وہ غصے میں ہے امرحہ! غصے میں انسان بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔"

"صرف غصہ نہیں تھا' کاش یہ میرا وہم ہی ہو۔ یہ صرف غصہ ہی ہو۔"

"کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟" ویرا نے ہاتھ کی پشت سے اس کی آنکھیں صاف کیں۔

امرحہ ویرا کی شکل دیکھنے لگی۔ اور خاموش رہی۔

"تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ نہیں کر سکتیں' تمہیں اس کی دوستی کی قدر تھی اور یقین جانو امرحہ! میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس کے بارے میں ایسے سوچتی ہو گی۔ میری غلطی بے شک ہے۔ لیکن بے قصور تم بھی نہیں۔"

امرحہ جانتی تھی ویرا ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"ابھی وہ ناراض ہے۔ زیادہ دیر تک تم سے ناراض نہیں رہ سکے گا۔ تم دونوں پھر سے دوست بن جاؤ گے' پھر سے۔" ویرا دھیمی آواز سے اسے سمجھا رہی تھی اور وہ ویرا کی باتیں ایسے سن رہی تھی۔ جیسے یہی آخری تریاق بچا ہو اس کے لیے۔ خوش فہمیاں اور تسلیاں...

وہ اپنے کمرے میں آگئی اور چپ چاپ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ رات کا دوسرا پہر بھی بیت گیا۔ وہ ویسے ہی گم صم بیٹھی رہی... اس میں حرکت کرنے کی جستجو نہ رہی تھی' زندگی اس میں صرف سانس کی صورت باقی تھی' ایک چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے گھوم رہا تھا۔ الفاظ اس کے ذہن میں پھرکی کی صورت چکرا رہے تھے۔

رات کا آخری پہر شروع تھا۔ وہ اٹھی اور الماری تک آئی۔ اس نے بہت اندر تقریباً" چھپا کر رکھے ایک باکس کو نکالا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے وجود میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے باکس کو کھولا۔

اور یہ رات کے آخری پہر کا قصہ ہے۔

چھپا ہوا... چھپایا ہوا... سربمہر بند... اس پر بات ابھی ممکن نہیں۔

آخری پہر کی پہلی بات ابھی نہیں۔



"اور خوش فہمی بڑے کام کی چیز ہے' یہ زندہ رہنے کے لیے کچھ اسباب بڑے اہتمام سے پیدا کر ہی دیتی ہے۔" ان خوش فہمیوں کو امرحہ نے گلے سے لگا لیا' مٹھی میں دبا لیا۔

دوسرا سمسٹر شروع تھا' اور جیسا کہ یونیورسٹی میں کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے پہلے سال یا پہلے سمسٹر میں چالیس فیصد رزلٹ حاصل کر لیا تو حقیقتاً" آپ نے تیر مار لیا۔ اور امرحہ نے یہ تیر مار لیا تھا اس نے ساٹھ فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔

اور یونی میں ہی مشہور ایک اور مقولے کے مطابق آپ کو پہلے سمسٹر میں یونی میں موجود سب اسٹوڈنٹس لائق فائق' ذہین فطین نیوٹن' آئن اسٹائن ثانی یا پھر اسٹیفن ہاکنگ' رائٹ برادران یا الیگزینڈر گراہم بل کے جانشین یا لے پالک لگتے ہیں' جب کہ حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ گول فریم کی بڑی عینک لگائے اسٹیفن نظر آنے والا اور مکمل توجہ سے لیکچر کے دوران گردن ہلانے والا اسٹوڈنٹ دراصل ایک درمیانے درجے کا اسٹوڈنٹ ہے جس کی حقیقت رزلٹ کے بعد کھلتی ہے۔

یہ مقولہ بھی ٹھیک تھا' امرحہ کو اپنے علاوہ وہاں سب ذہین فطین نظر آتے تھے۔ لیکن رزلٹ کے بعد اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ سب ذہین فطین اس سے تقریباً" پیچھے ہی رہے تھے' یہ وہی لوگ تھے جنہیں فریشر فلو پوری آب و تاب سے چڑھا تھا۔ رات کو یہ خود سے "ایک گھنٹے" صرف ایک گھنٹے کا وعدہ کر کے نکلتے اور ساری رات گھوم پھر کر' ناچ گا کر' ڈگمگاتے ہوئے صبح کی کرنوں کے ساتھ واپس آتے۔

پہلا لیکچر کٹی پتنگ کی طرح ان کے ہاتھ آنے کا نام نہ لیتا اور اگر یہ پتنگ کود پھاند کر ہلڑ مچا کر ان کے ہاتھ آ ہی جاتی تو کلاس میں بیٹھ کر ان کے لیے آنکھیں کھول کر کانوں کو ہمہ تن گوش کر کے یا چنا منا گوش کر کے لیکچر سننا ایسے ہوجاتا جیسے ہوا میں اونچائی پر تنی رسی پر نو آموز کا چلنا۔۔۔ اوہ میں گرا۔۔۔ آ۔۔۔ آمیں گرا اور لووہ گر گیا۔۔۔ بے چارہ۔۔۔

رزلٹ پر امرحہ کی آنکھیں کھل سی گئیں۔ یعنی اس کا تو خیال تھا کہ سارے گورے ایسے ہوتے ہیں۔ ایسے کیسے؟

یہی بیٹھے بیٹھے راکٹ بنا لینے والے 'دریائے ٹیمز میں کود کر دریائے سین سے نکلنے والے 'سپر سیکرٹ کمپیوٹرز کے چٹکیوں میں پاس ورڈز توڑ ڈالنے والے' روبوٹ سے کم ایجاد نہ کرنے والے اور شیر سے کم شکار نہ کرنے والے۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ وغیرہ

ویسے امرحہ نے سنا تھا کہ پہلے سمسٹر میں ایسا رزلٹ آجانا ایسی کوئی پریشان کن بات نہیں۔ سب سے شان دار رزلٹ کرناٹک (انڈیا) کی منجلا کا رہا تھا جو اتنی کمزور تھی کہ کلاس کا ہر اسٹوڈنٹ اسے ٹویٹ دینے کے لیے بے تاب رہا کرتا تھا۔ اور اسے ٹویٹ دے کر بھول جانے کی نیکی سمجھا کرتا تھا۔ ایک بار کلاس میں سر کین کلارک نے ایسے ہی کہا کہ منجلا ضرور گولڈ میڈل لے گی تو کلاس کے اسٹوڈنٹ ڈیوڈ نے بھرپور سنجیدگی سے سر ہلا کر کہا۔ ''ضرور۔۔۔ اگر یہ مانچسٹر کی سردیاں نکال سکی تو۔۔۔''

''سردیاں نکال سکی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' ساری کلاس کی دبی دبی کھی کھی سے یہ واضح تھا کہ وہ بات سمجھ چکے ہیں لیکن یہ پروفیسرز بھی نا۔۔۔

''پہلے سمسٹر کی پہلی برف باری میں ہی منجلا کا دیہانت ہوجائے گا نا۔۔۔''

منجلا سمیت کلاس ہنس ہنس کر پاگل ہوگئی۔ منجلا اسکالر شپ جیت کر مانچسٹر یونی پڑھنے آئی تھی۔ ایگزامز کے دنوں میں امرحہ نے ایک دوبار اس کے ساتھ بھی گروپ اسٹڈی میں شرکت کی تھی وہ انتہائی بے ضرر اور ہر وقت مدد کرنے کے لیے تیار رہنے والی لڑکی تھی' اپنی معصومیت میں وہ -- عالمگیر سی حیثیت اختیار کر چکی تھی کہ ویلم جو موقع ملتے ہی بیگز میں سے **چاکلیٹس** کو کیز نکال لیا کرتا۔ منجلا کے نام ہر قسم اٹھا کر خود پر کیے جانے والے شبے سے جان چھڑواتا۔۔۔ بعد ازاں وہ منجلا کو ٹویٹ دیتا ہوا نظر آتا ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ جھوٹی قسم کے ہرجانے کے طور پر۔۔۔ ضمیر کی آواز۔۔۔

امرحہ کی کارکردگی اچھے اسٹوڈنٹس کی طرح تسلی بخش رہی تھی اور ظاہر ہے وہ پروفیسرز کی نظر میں آچکی تھی۔

سر رابرٹ نے یاد سے کلاس میں وہ کارڈز پڑھے جو پہلی کلاس کے دن انہیں لکھ کر دیے گئے تھے اور جس میں اپنے موٹو کے نیچے انہوں نے خود کو سو فیصد کا چیلنج دیا تھا۔ سر رابرٹ نے جو طنز کیے وہ سننے سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے ہیگ کا کارڈ لہرایا۔

ہیگ ہو یونی میں ہر ایک کو کمپیوٹر گیمز کے چیلنج دیتا ہوا پایا جاتا تھا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی گیم ہوگی جس میں اس نے رات دن لگا کر ریکارڈ نہیں بنایا ہوگا۔

''تم ماسٹرز ان انگلش لٹریچر کیوں کر رہے ہو۔ تھری ڈی میں ہی کوئی ڈگری لے لو۔۔۔ بہت نام اور پیسہ کماتے ہیں تھری ڈی گیم ڈیزائنر۔۔۔''

اس کی شکل پر بے چارگی چھا گئی۔

''طنز نہ کرو او مرا۔۔۔ مجھے تو خود نفرت ہے اس سب سے۔ لیکن کیا کروں یہ لت جان ہی نہیں چھوڑ رہی تمہارے پاس کوئی ترکیب ہے اس سے جان چھڑانے کی۔''

''امرحہ ۔۔۔ امرحہ سمجھ میں آیا۔۔۔ تمہاری دیکھا دیکھی بہت سوں نے مجھے او مرا کہنا شروع کر دیا ہے۔ تم اپنا لیپ ٹاپ توڑ ڈالو۔۔۔'' امرحہ نے ''او مرا'' کا غصہ نکالا ''نہ رہے گا لیپ ٹاپ نہ کھیلو گے گیمز۔''

''کیا ہمیشہ ہی تمہارا دماغ ایسے شاندار انداز سے کام کرتا ہے۔ او مرا۔۔۔؟''

''چلتا تو نہیں تھا لیکن تم سب کے درمیان آکر

چلنے لگا ہے۔ ہو ہیگا۔"
یہی ہو ہیگا چھوٹی سی مانو بلی کی طرح آنکھیں جھپکتے اپنی چیئر پر خود کو کس طرح سے غائب کرنے کی کوشش میں تھا۔ اور ظاہر ہے وہ ناکام تھا۔
ہیگ... چیلنج سو فیصد... موٹو "ایسے پڑھنا ہے کہ حیران کر دینا ہے۔"
"ویل ہیگ آپ کامیاب رہے۔ ہم سب کو حیران کر دیا آپ نے... ہیگ کی حیران کن سو فیصدی کار کردگی پر پلیز ٹیبل بجائے جائیں۔"
زور شور سے ٹیبل بجائے گئے۔
زور و شور سے ٹیبل وقفے وقفے سے بجتے رہے۔
جن کے رزلٹ اچھے رہے تھے ان کے کارڈز پر روشن ستارے بنا دیے گئے۔
"تمہیں عالیان پڑھاتا رہا ہے نا... شکل سے تو تم لوئر مڈل کلاس سے بھی نیچے کی مخلوق لگی ہو... اردو میڈیم میں پڑھتی رہی ہو' ایسا رزلٹ لینا تمہارے بس کی بات تو نہیں تھی پھر...؟" شزا نے اپنی ری بونڈ بھنوؤں کو کسی مستول کی طرح تان کر پوچھا۔
"ٹھیک کہا میں اردو میڈیم میں ہی پڑھتی رہی ہوں۔ اچھا ہوتا تم بھی پڑھ لیتیں۔ تو تمہارا شمار بھی چالیس فیصد والوں میں نہ ہوتا اور تمہیں کس نے کہا کہ عالیان مجھے پڑھاتا رہا ہے؟؟"
پتا نہیں پاکستانی اردو میڈیم میں پڑھنے کو گالی کیوں سمجھتے ہیں۔ انگریز تو انگریزی پڑھنے میں ہتک محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ انگریزوں کو اس وقت شرم آیا کرتی تھی جب انہیں خود پر جبر کر کے لاطینی پڑھنی پڑتی تھی۔ دوسری اقوام اپنی مرضی سے ساری دنیا کی زبانیں سیکھ لیں گی لیکن جہاں کوئی زبان ان کی زبان کی جگہ لینے کی کوشش کرے گی وہیں وہ اپنی واضح ناپسندیدگی ثابت کر کے اپنی زبان کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ دنیا کی کوئی زبان ان کی زبان سے اچھی ہے نہ ہو گی۔
"علی کامنز میں وہ گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا۔" ری بونڈ۔ بالوں کو شزا نے ہاتھ لگائے بغیر گردن کے جھٹکے سے شانوں سے پرے کیا۔
امرحہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یعنی پاکستانی خواتین دنیا کے کسی بھی کونے میں رہیں۔ خصلت عظیم "ٹوہ" پر دل وجان سے نثار رہتی ہیں۔ کسی تمغے کی طرح سجائے... فخر و غرور سے سرشار پھرتی ہیں۔
"وہ بزنس کا اسٹوڈنٹ ہے میں انگلش لٹریچر کی۔"
"وہ اتنا لائق ہے کہ پروفیسر سے اچھا انگلش لٹریچر پڑھا سکتا ہے۔"
"وہ اتنا لائق ہے آخر سب کو کیسے پتا تھا۔" امرحہ دنگ سی رہ گئی۔
"تم اس سے ٹیوشن لیتی رہی ہو؟" امرحہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔
"تم اس کی جان چھوڑ تیں تو وہ کسی اور کو ٹیوشن دیتا نا۔" ہونٹوں کے کونوں کو استہزائیہ اچکا کر وہ کڑوی گولی کی طرح بد مزا سی دکھائی دینے لگی۔
امرحہ شزا کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ "سر رابرٹ سے اچھا کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ میں نہیں مانتی" امرحہ کو یہی جواب سوجھا۔
"نہ مانو... وہ یونی کا راجر فیڈرر ہے۔ ساری ٹرافیاں اکٹھی کر لائے گا وہ... ویسے تم آج کل اس کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔ وہ بھی ڈپارٹمنٹ نہیں آتا۔" شزا نے مکمل ایمان داری سے "ٹوہ" کی ڈیوٹی سرانجام دی تھی اور وہ اس میں غفلت کا شکار قطعاً" نہیں ہوئی تھی۔
امرحہ کوئی بھی جواب دیے بغیر چلی گئی۔
شزا اس کی کلاس فیلو تھی جو Gravity Falls کی Pacifica کے نام سے زیادہ جانی جاتی تھی' اسے عجیب و غریب ملبوسات پہننے پر لیڈی گاگا بھی کہا جاتا اور شوں شوں بھی' یعنی جب وہ قریب سے گزرتی تو شرارتی اسٹوڈنٹس مکھی اڑانے کے انداز سے ہاتھ لہرا کر "شوں شوں" کر دیتے۔
شزا پاکستان کے ایک بڑے وزیر کی بیٹی تھی' جن کے وزیر اعظم بننے کے امکانات کافی روشن تھے۔ وہ اسٹوڈنٹس اور پروفیسر سے ایسے مخاطب ہوتی جیسے

کرپشن کے پیسوں سے لیے اپنے پاپا کے محل نما گھر کے گھریلو ملازم سے مخاطب ہو۔ جو لباس وہ ایک بار پہن لیتی دوبارہ کوئی اسے اس لباس میں نہ دیکھ سکتا۔ اس کے جوتے بیگز، قلم، نوٹ بکس، ملبوسات اور ایسی ہی دوسری چیزیں اتنی مہنگی ہوتیں کہ انہیں دیکھ کر حقیقتاً "اسٹوڈنٹس کو ہول اٹھتے کہ....

"اف کیا اس نے انہیں خریدنے کی جرات کی۔ کیا واقعی.... اس نے انہیں خرید لیا۔ اور یہ کیا یہ تو اس کے ہاتھ میں بھی ہیں۔"

"اسی لیے پاکستان میں غربت کا یہ عالم ہے۔ سارے بجٹ سے تو لیڈی گاگا کے کپڑے جوتے ہی آجاتے ہیں۔"

جرمن جوئیل نے بڑی جرات سے اس کے منہ پر کہہ دیا تھا اور اس لیڈی گاگا نے پاک افواج کے ذخیرے میں موجود سارے بارود کو آنکھوں میں بھر کر اسے گھورا.... اور بس.... ایسے ویسوں کے منہ لگنا اس کی شان کے سراسر خلاف تھا۔

ایک دن لیکچر کے دوران وہ اپنے آئی فون کے ساتھ مصروف تھی۔ اسے کئی بار اس حرکت پر سرزنش کی جا چکی تھی۔ پر کیا کیا جاسکتا تھا وہ اتنا بارود اپنے ساتھ رکھتی تھی کہ کوئی کچھ کہہ بھی دیتا تو بھی فائدہ نہ ہوا کرتا۔

مزید اس نے یہ کیا کہ مزے سے پچھلی رو میں بیٹھے جونا تھن کی تصویر کلک کی۔ نیند کی وجہ سے جونا تھن کے لیے مشکل تر ہو رہا تھا سر کو ڈھلکنے سے روکنا اور آنکھیں پوری کھول کر متوجہ رہنا۔ لیڈی گاگا نے باقاعدہ کرسی سے کھڑے ہو کر پیچھے جونا تھن کی طرف رخ کر کے یہ حرکت کی۔

کلاس دنگ رہ گئی۔

"اگر آپ کو لیکچر نہیں سننا تو آپ کلاس سے آؤٹ ہو جائیں۔ اور باہر نکل کر مانچسٹر کی تصویریں اتاریں۔" سر جین نے کسی قدر تحمل سے کہا۔

"سننا ہے اگر کسی کام کا ہوا تو...." اس نے بے نیازی سے شانے اچکا کر کہا۔

سر جین کئی لحظے اس کی شکل دیکھتے رہے۔ یہ بدتمیزی کی انتہا تھی بلاشبہ....

"آپ کے ملک میں نہیں لیکن یہاں گرومنگ کورسز ہوتے ہیں۔ کلاس کے اسٹوڈنٹس آپ کو فنڈز جمع کر دیں گے آپ گرومنگ کلاسز لیں.... جب بات کرنا سیکھ جائیں تو آجائیے گا۔ ہم آپ کو ڈگری دے دیں گے۔"

"تو آپ گرومنگ کلاسز لے کر آئے ہیں؟"

"اگر آپ کے ساتھ میرے دو تین مزید مکالمے ہوئے تو یقیناً" مجھے بھی لینی پڑیں گی۔"

امرجہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ سارا وقت کلاس میں سر جھکا کر بیٹھی رہی بعد ازاں وہ سر جین کے آفس گئی اور ان سے معذرت کی۔

"آپ کیوں معذرت کر رہی ہیں؟" وہ مسکرانے لگے۔

"سر! ہمارے ملک میں سب شنزا جیسے نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ استاد کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔ اگر پروفیسر میرے آگے چل رہے ہوں تو میں نے کبھی قدم بڑھا کر ان سے آگے نکل جانا نہیں چاہا۔ میرے دادا کہتے ہیں تمہاری زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے کبھی استاد سے آگے ہو کر نہ نکلو، استاد محترم کو اپنی پشت نہ دکھاؤ۔ یہ انتہا درجے کی بے ادبی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"میں ان خوش قسمت پروفیسرز میں سے ہوں جنہیں ہر سیشن میں ایسے اسٹوڈنٹس ضرور ملتے ہیں جن کے لیے ہم، ہمارا احترام فرض کی طرح ہوتے ہیں۔

جھنگ پاکستان کا طالب دو سال پہلے میرا اسٹوڈنٹ تھا، جہاں کہیں مجھے دیکھ لیتا اپنی رفتار آہستہ کر لیتا، وہ گناہ سمجھتا تھا میرے آگے چلنا، میرے سر پر اپنی چھتری تان کر خود گیلا ہو جاتا تھا۔ میری چھتری کو پکڑ کر مجھے کار تک چھوڑ کر آتا، ایک بار ٹشو سے اس نے میرے گیلے جوتے صاف کیے اور یہ کام اس نے بغیر کسی شرم کے کئی سو اسٹوڈنٹس کی موجودگی میں کیا۔

اور مجھے یہ بھی بتا لینے دو کہ وہ ٹشو وہ اپنے ساتھ پاکستان لے گیا۔

میں ایک استاد ہوں امرحہ 'استاد میں تعصب نہیں ہوتا۔ تمہاری غلطی تمہاری ہوگی تمہاری قوم کی نہیں' ہم تعصب کو ختم کرنے والے ہیں 'تعصب پھیلانے یا پالنے والے نہیں۔ میں مانتا ہوں پاکستان میں کئی شنزا ہوں گی 'لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ پاکستان طالب غفور جیسے لوگوں سے بھی بھرا پڑا ہوگا۔"

امرحہ لاجواب ہوگئی۔

ایک بار شنزا کے پاپا یونیورسٹی آئے تو وہ انہیں ایسے یونیورسٹی دکھاتی رہی جیسے کہتی ہو۔

"اگلے چند سالوں میں یہ بھی ہماری ہو جائے گی نا۔۔۔ ہے نا پاپا؟"

اور سویٹ پاپا کہتے ہوں۔

"کوئی شک۔۔۔؟"

تو یہ شوں شوں شنزا ابھی عالیان کے بارے میں خبریں رکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی اور یقیناً" اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ لیکن وہ رسائی صرف امرحہ کی ہو سکی تھی۔

علی کامنز کے باغ میں بیٹھے وہ خود کو اداس ہونے سے روک رہی تھی۔ اس کا رزلٹ اچھا رہا تھا اور ظاہر ہے وہ خوش ہو کر بھی خوش نہیں تھی۔ ایگزامز کے دنوں میں عالیان نے اسے یونی کون (Uni cron) دیا تھا۔ جس کی پیشانی کے سینگ پر سفید چٹ بھی تھی اور عالیان کی لکھائی میں۔

Keep calm and ride a unicron into exams.

لکھا تھا۔ ایگزامز کے دنوں میں کم و بیش ہر اسٹوڈنٹ کے اسٹڈی ٹیبل پر یہ یونی کون نظر آتا ہے۔ کچھ سینیئرز فریشرز کو دیتے ہیں۔ کچھ گھروں سے لے کر نکلتے ہیں۔ لیکن اس بے خبر امرحہ کو علیان نے دے دیا تھا۔ ایگزامز کی تیاری کے دوران وہ تھک جاتی تو اس چٹ کو دیکھ لیتی اور جیسے اس میں ایک نامعلوم سی طاقت عود کر آجاتی اور وہ تن دہی سے پھر سے پڑھنے لگتی۔

اگر سب کچھ پہلے جیسا ہوتا تو عالیان شاید اس کے پاس آتا۔ نیلے پیلے سفید پھول لے کر اور کہتا۔

"اگلی بار اس سے بھی اچھے رزلٹ پر تمہیں اس سے بڑا پھولوں کا گملا ملے گا' تیسرے سمسٹر میں پھولوں کا گودام ملے گا۔ اور چوتھے اور فائنل میں۔۔۔" وہ شرارت سے مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

سارے مرجھائے پھولوں نے امرحہ کے گرد ڈھیر لگا لیا۔ وہ اٹھ کر لائبریری آگئی۔

"کیسی ہو مینڈکی؟"

وہ اپنی کتابیں ایشو کروا چکی تھی اور یونیورسٹی کا منحوس ترین انسان کارل اپنی کتابیں ایشو کروا رہا تھا۔ چیونگم سے وہ ایسے پٹاخے پھوڑ رہا تھا اور اتنی تیزی سے جیسے اسے جلد از جلد اس چیونگم سے ننھا منا بم تیار کرنا ہو اور وہ بم اس کے منہ میں ہی تیار ہوتا ہو۔ اور پھر اس نے وہ بم کسی پر دے مارنا ہو۔

امرحہ سے بہترین کون مستحق ہوگا کارل کے بم کا۔۔۔

کچھ شنزا کا غصہ۔۔۔ کچھ سے زیادہ اپنے اندر کا دکھ اور کچھ ہارٹ راک میں ڈسک کا چلایا جانا' اس نے ہاتھ میں پکڑی تین وزنی 'موٹی کتابوں کا سیٹ اس کے سر پر دے مارا۔

"مجھ سے دور رہا کرو۔ مینڈک ہوگے تم' تمہارا خاندان اور آگے پیچھے کے سب فلاں فلاں اور فلانی فلانیاں۔۔۔" "تم سے آگے کا فقرہ اس نے اردو میں کہا اور آنکھوں میں آگ بھر کر اسے گھورنے لگی۔

کاؤنٹر پر کھڑے تین لائبریرین کے ہاتھ کام کرتے رک گئے۔ پچاس ساٹھ کے قریب ادھر ادھر کھڑے' آتے جاتے اسٹوڈنٹس نے باقاعدہ رک کر اس منظر کو دیکھا۔ ذرا دور کھڑی منجلا کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں۔ بھلا منجلا کو کیا ضرورت پڑی تھی اپنے وزن سے زیادہ کتابیں اٹھانے کی۔

اور کارل۔۔۔؟

کارل کا چیونگم چباتا جبڑا رک گیا' بم اس کے جبڑے

کے اندر ہی پھٹا اور دھواں 'کانوں' آنکھوں 'ناک سے نکلا' اس نے گردن کو خم دیا اور آنکھوں کو ذرا سا پھیلا کر امرحہ کو دیکھا' اسے دیکھا' یعنی تم۔۔۔ تم مینڈکی۔۔۔ دی لاسٹ ڈک۔۔۔ تمہاری اتنی جرائت ۔۔۔ آہاں۔۔۔ ہم ۔۔۔ اوہ۔۔۔ آہاں۔۔۔ ناؤ ب آئی سی۔

زیر لب مسکراتا دو انگلیاں اس کی طرف اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر ایران کے لیے امریکی مارکہ واچنگ یو (watching you) کی دھمکی ایران کو۔۔۔ امرحہ کو دیتا لائبریری سے باہر چلا گیا۔

لائبریری کا ماحول جو اس کے سر پر کتابیں پڑھنے سے وہیں فریز ہو گیا تھا۔ پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ وہ اپنی کتابیں سنبھالتی باہر نکلی اور یہ کیا؟ کارل ایک دم سے کسی چھلاوے کی طرح اس کے سامنے آیا اور اس کے ہاتھ سے کتابیں چھین کر لے گیا۔ دو سیکنڈ بھی کم ہوں گے اس نے اس سے بھی کم وقت لیا یہ کام کرنے میں' تالیاں کارل کے لیے اور امرحہ کے لیے ایک عدد ٹشو پیپر۔۔۔

"لائبریری کی کتابیں لے گیا۔" فریز سی حالت میں امرحہ خوف سے بڑبڑائی۔

"اوہ۔۔۔!" امرحہ کا سر گھوم گیا 'یہ اس نے کیا کیا۔ اس نے کارل کے ساتھ پنجابی پنگا کیوں لیا اوہ' وہ لائبریری کی ملکیت کتابیں لے گیا تھا۔ وہ انہیں ضائع کر دے گا۔ اور اسے جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ اتنا جرمانہ اس نے تو اتنی مہنگی اور تاریخی کتابیں نکلوائی تھیں۔

اللہ امرحہ سے پوچھے اس نے اتنی فاش غلطی کیوں کی۔ جب وہ کارل کے دماغ جیسا دماغ نہیں رکھتی تو کارل کے غصے جیسا غصہ بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی کارل کو ڈھونڈنے 'پر اب تو جیمز بونڈ' انڈیانا جونز' سی آئی اے کے آگے پیچھے کے سب ہی رشتے دار بھی آجاتے تو بھی کارل کو نہ ڈھونڈا جا سکتا۔

وہ بزنس اسکول کے کاریڈور میں کھڑی تھی اور بے بسی سے عالیان کے پاس جانے کا سوچ رہی تھی 'لیکن آخری بار جو اس کی آنکھوں سے چھلکتی سرد مہری دیکھ لی تھی۔ اس کی کپکپی ہی نہ تھمی تھی تو پھر سے کیسے اس کے پاس چلی جاتی۔ اسے ویرا کے پاس جانا پڑا۔

"تم اس سے کیوں الجھیں؟"

"دماغ چل گیا تھا میرا۔۔۔"

"کچھ کرتی ہوں۔ پر سکون رہو تم۔۔۔" ویرا کارل کو فون کرنے لگی۔

"وہ کہہ رہا ہے وہ تمہیں کل دے دے گا۔"

"آج ہی کیوں نہیں؟" اس کی شکل پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"تم نے اس کے سر پر کتابیں دے ماریں۔ ایک دن کی خواری تو وہ تمہیں دے گا نا۔۔۔" ویرا نے اسے ہلکا پھلکا کرنے کے لیے بات کو مزاح کا رنگ دیا۔

"اگر یہ ایک دن کی خواری ہے تو میں ہو جاتی ہوں خوار۔۔۔"

"اگر تم کہو تو میں ہال سے جا کر لا دوں اس کے روم سے۔۔۔" ویرا پچھلے واقعے سے اس قدر شرمندہ تھی کہ کوشش کرتی تھی کہ اس کا زیادہ خیال رکھ سکے۔ اس کی کوئی بھی پریشانی ختم کر سکے۔

"نہیں کل تک انتظار کر لیتی ہوں۔"

لیکن ۔۔۔ لیکن یہ ایک دن کی خواری ہرگز نہیں تھی۔ اسے ویرا سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ ہاں چھاپہ مار کر اس کے روم سے کتابیں لے آؤ۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اگلے دن کارل کتابیں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ لو امرحہ دی مینڈکی۔۔۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن پہلے مجھے سوری بولو۔" کتابیں اس نے سینے کے ساتھ دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں تھام رکھی تھیں۔ حفاظت سے۔۔۔ محبت سے۔۔۔

"سوری۔" امرحہ کی مری مری آواز نکلی۔

جس وقت تم نے مجھے کتابیں ماری تھیں اس وقت کم سے کم دو سو لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا۔ یعنی میرے پاس دو سو لوگ گواہ تھے۔ چشم دید گواہ۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ اس سے کیا کیا ہو سکتا تھا۔ تم یونیورسٹی سے بے دخل ہو تیں پھر میں تم پر پورے دس لاکھ پاؤنڈ کا ہتک

عزت اور قاتلانہ حملے کا ہرجانے کا دعوا کرتا۔ لیکن ایک تو میں رحم دل بہت ہوں۔ چھوٹا سا میاؤں میاؤں سا دل ہے میرا۔ اور پھر تم سے پرانی دوستی بھی ہے۔ اب تمہارے سوری کو کم سے کم چار سو لوگوں کو تو سننا چاہیے نا۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بلاشبہ میں انصاف پسندی سے کام لے رہا ہوں۔"

دونوں انگلش ڈپارٹمنٹ کے باہر کھڑے تھے اور وہاں اور قریب و جوار میں اتنے اسٹوڈنٹس تو تھے کہ کارل کی حسرت پوری ہو جاتی۔ امرحہ نے پھر سے اس وقت کو کوسا جس وقت اس نے دکھ اور غصے سے بھڑک کر کتابیں مارنے کی خوفناک غلطی کر ڈالی تھی۔

لب بھینچ کر اس نے آس پاس دیکھا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ "سوری"

کارل سینے سے کتابیں لگائے ذرا سا کمر اور سر کو خم دے کر کھڑا رہا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں قہقہوں کے جوار بھاٹا پھٹنے لگے۔ بڑی ادا سے اس نے کسی ملکہ عالیہ کی طرح گردن کو گھما کر آس پاس دیکھا، پھر ہونٹوں کو ارادتاً "بگاڑ لیا" جیسے اس صورت حال نے اس کے قومی وقار اور باعزت شخصیت کو صدمہ پہنچایا ہو اور اس کی ساکھ متاثر ہوئی ہو....

"کوئی متوجہ ہی نہیں ہوا...." بگڑے ہونٹوں کے ساتھ اس نے انگلی سے اشارہ کر کے امرحہ کو گردن گھما کر دیکھنے کا اشارہ کیا۔

امرحہ نے قطعاً "گردن نہیں گھمائی.... وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ ماسٹرز کر کے کیا کرے گی۔ یعنی اگر وہ یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور واپس چلی جائے تو کیسا رہے گا۔ اس کارل سے کہیں زیادہ رحم دل اسے منحوس کہنے والے تھے۔

"مجھے چلے جانا چاہیے۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں پورے پندرہ لاکھ پاؤنڈ کا دعوا کروں گا۔" کارل جانے لگا۔

"سوری" امرحہ نے پوری شدت سے چلا کر کہا۔ ہرجانے کا دعوا تو وہ کیا کرتا اسے لائبریری کی کتابوں کی فکر تھی۔

کافی سے زیادہ فرق پڑا اس بار.... سب نے حیرت سے امرحہ کو دیکھا۔ ماحول ایک بار پھر سے فریز سا ہو گیا۔ گردنیں امرحہ کی طرف مڑ گئیں۔ آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔

کارل نے ادائے بے نیازی سے کہ وہ تو امرحہ کے کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس کے پاس کھڑا ہے آنکھوں کی پتلیوں کو گول گول گھما کر "فریز" ہو چکے اس منظر کو دیکھا۔ جیسے شانت سا ہو گیا۔

"یہ کچھ بہتر رہا ہے۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی کہ رونے کے علاوہ بھی تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ یعنی کمال کر سکتی ہو۔ یہ لو اپنی کتابیں ... میں ہنٹ (Hint) دیتا تو نہیں ہوں، لیکن تمہیں دے رہا ہوں۔ پھر ملتے ہیں۔"

دو انگلیوں سے اچانک وی کا اشارہ دیتا وہ عالیان کی طرح ہی ہوا میں اچھل کر پیروں کی تالی بجاتا غائب ہو گیا۔ اور امرحہ کا جی چاہا کہ وہ واپس کتابیں اس کے سر پر دے مارے۔

مارتی رہے۔ مارتی رہے کہ آخر کار اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے، ساری کتابیں تیز بلیڈ سے کاٹی ہوئی تھیں۔ صفحات درمیان سے دو حصوں میں کیے تھے۔ وہ کبھی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ یہ کارل نے کیا ہے۔ اسے اپنی محنت کی کمائی سے جمع کیے گئے پاؤنڈز میں سے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

کارل زمین پر موجود سب سے زیادہ منحوس انسان....

دو دن وہ کھانا نہیں کھا سکی، سو نہیں سکی، اس کے جی میں آیا کہ وہ کارل کو وہ ساری بددعائیں دے ڈالے، جو پنجاب کی خواتین روایتی خاندانی لڑائیوں میں دیتی ہیں۔ لیکن وہ اسے چند امرحہ ٹائپ بددعائیں ہی دے سکی۔ جیسے کہ مانچسٹر میں جب بادل چھائیں تو آسمانی بجلی تم پر ٹوٹ پڑے اور ایسے گرے کے تمہیں سیاہ بھوت بنا دے۔ تم زندہ رہو لیکن مردوں کی طرح یونی کے سب اسٹوڈنٹس تمہیں دیکھتے ہی چیخیں مارنے لگیں۔ دل برداشتہ ہو کر تم یونیورسٹی ہی چھوڑ جاؤ اور یا یہ کہ تم

رات کو سوؤ تو کارل ہو صبح اٹھو "ڈی ترنیا" کے لومڑ بن چکے ہو۔

اس واقعہ کے بعد وہ زمین پر موجود سب سے زیادہ دکھی لوگوں میں سے ایک ہو گئی۔ اسے پوری شدت سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اکیلی ہو گئی ہے۔ عالیان اسے کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار وہ اسے دکھائی دیا بھی تو اپنے آپ کو سیاہ ہڈ میں چھپائے۔

"اگر میں کہیں گم ہو جاؤں تو تم مجھے کیسے ڈھونڈو گی؟" ایک بار وہ امرحہ سے پوچھنے لگا۔ وہ کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ وہ گم ہونے جا رہا تھا۔ اور اسے یہ انتظام بھی رکھنا تھا کہ اسے ڈھونڈ لیا جائے۔

"تمہارے ان لمبے کانوں سے...." اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن ساتھ ساتھ سیاہ پتلیاں بھی مٹکائیں۔

"میری شناخت کے لیے یہ اتنا اہم کردار ادا کریں گے مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ لمبے ... اور ... اور لمبے ہو جائیں تاکہ مجھے جلدی سے ڈھونڈ لیا جائے۔"

اب تو وہ جلدی سے گم ہو گیا تھا۔ امرحہ اسے ان بڑے اور لمبے کانوں سے پہچان کر ڈھونڈ نہ نکالے وہ انہیں ہوڈی میں چھپا کر رکھتا تھا کیا۔ معمولی بات تھی لیکن کافی تکلیف دہ بات تھی۔

ہارٹ راک کے باہر آخری ملاقات کے بعد امرحہ نے اسے بہت سارے دنوں کے بعد آکسفورڈ روڈ پر تیزی سے سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔ امرحہ بس میں تھی۔ کاش بس کی جگہ وہاں کوئی لاہوری رکشا ہوتا تو وہ رکشے والے سے کہتی کہ بھائی ذرا اس سرمئی ہوڈی والے کا پیچھا کرنا۔

وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر اب وہ کہاں اتنا مصروف رہتا ہے کہ دکھائی بھی نہیں دیتا۔ اسی روڈ پر اس کے ساتھ چہل قدمی کرنے والا اسی روڈ سے اس سے دور بھاگ رہا تھا۔

وہ چپکے سے بزنس اسکول کے کتنے ہی چکر لگا لیتی وہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ واقعی میں ذہین تھا۔ چھپ جانا جانتا تھا۔ امرحہ تو ناکارہ تھی اور وہ اسے اتنی بڑی یونی میں ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اکثر وہ یونی میوزیم کے کسی کونے کھدرے میں چھپی سی کھڑی ہوتی اور وہ پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا جیسے چلتے چلتے اسے خواب آجاتے ہوں کہ امرحہ اس وقت کہاں ہے۔ جیسے وہ ریڈار ہو اور اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو کہ امرحہ نامی جہاز مانچسٹر یونی کے آسمان پر کس طرف کو محوِ پرواز ہے امرحہ کو یہ خواب نہیں آتے تھے کہ وہ کہاں ہے؟ سارے خواب عالیان کو ہی کیوں آئے؟ سب ہی الہام عالیان کو ہی کیوں ہوئے؟

اس مغرب میں رہنے والے کو مشرقی آداب کس نے سکھائے؟

ڈھونڈ نکالتا اور ظاہر بھی نہ کرتا۔ ان گروں کا بادشاہ وہ کب بنا؟

دوبارہ وہ عالیان سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ وہ اسے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان جو کچھ ہو چکا تھا اسے ٹھیک ہونے میں وقت بھی لگنے والا تھا اور مرہم بھی....

مرہم وقت کے تھال پر تھا اور وقت قسمت کی مٹھی میں.... امرحہ کے ہاتھ میں تو اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔



دی بگ بین (The big ben) لندن ڈبل ڈیک بس اور لندن ٹیکسی برطانیہ کے لینڈ مارک مانے جاتے ہیں اور "سائی" کو مانچسٹر یونی کے اسٹوڈنٹس کا لینڈ مارک مانا جاتا ہے۔ بنا کسی شک و شبہ کے Say it all (سب کہہ ڈالو) یعنی سائی....

"پیلے رنگ کے بورڈ پر نارنجی روشنائی سے یہ الفاظ سائی کی لکھائی میں لکھے ہیں۔ یونی میں شاید ہی کوئی ایسا بد نصیب ہو گا جو اس بورڈ کے مالک کو نہیں جانتا ہو گا۔"

سائی سیاہ فام نسلاً "امریکی لیکن برطانوی شہری ہے۔ اس کا اصل نام ایڈی ہے۔ ہلکے گھنگھریالے بال، پتلا سا جس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لمبا دکھتا ہے۔

آنکھیں گول گول اور نمایاں اور ان پر ہلکے فریم کا نظر کا چشمہ.....

اپنے بیگ کو دونوں کندھوں پر پھنسائے کمر پر پیچھے لٹکائے۔وہ مانچسٹر یونی کا زمینی فرشتہ ہے۔یونی کا دادا' دادی 'نانا' نانی جی' چچا 'ماموں 'خالہ 'بھائی بہن اور دوست.....وہ سب تھا...وہ سائی تھا۔

"یونیورسٹی میں اس کے بیٹھنے کی ایک ہی مخصوص جگہ تھی۔علی لرننگ کامن کے باغ کے درخت تلے' ویسے اسے کہیں بھی روک کر بٹھایا جاسکتا تھا 'وہ اعتراض نہیں کیا کرتا تھا۔کیونکہ وہ تو فرشتہ تھا اس تک رسائی بہت آسان تھی۔جب وہ فارغ ہوتا درخت تلے آکر بیٹھ جاتا اور بیگ میں سے بورڈ نکال کر رکھ لیتا.....مطلب۔"

"میں فارغ ہوں۔ہمہ تن گوش ہوں آؤ میں سب سنوں گا اور تم سب کہہ ڈالو۔اپنے درد...اپنی تکلیفیں....وہ سب فضول کی باتیں جو کوئی اور نہیں سنتا۔تمہارے رونے کے قصے 'تمہارے نہ ہنسنے کی وجوہات' تمہاری خالی جیب کی بدقسمتیاں 'تمہارے کمروں سے کھانے کی اشیا کا غائب ہوجانا' شیمپوز پرفیومز' اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی گمشدگی کا 'آئے دن وقوع پذیر ہونا۔اسائنمنٹس کا مکمل نہ ہونا۔پڑھائی ایک بوجھ لگنا' پرانی کتابوں کا نہ بکنا نئی کتابوں کے پیسوں کا بار اور کیفے میں اڑجانا' لیکچر سے زیادہ تمہارا دھیان پارٹی میں لگے رہنا 'گھر کی یاد ستانا۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں۔میں تو سب سننے کے لیے دل وجان سے تیار ہوں۔" ایڈی یعنی کہ سائی یونی کا چار سالہ پرانا اسٹوڈنٹ ہے۔اس کی تاریخ کے بارے میں مختلف باتیں گردش کرتی رہتی ہیں۔

کچھ کہتے ہیں کہ جب وہ نیا نیا یونی آیا تھا تو کچھ معاملات کو لے کر اتنا پریشان رہا کرتا تھا کہ فلاں فلاں درخت تلے بیٹھ کر رونے لگتا۔اس نے ایک دو اسٹوڈنٹس کو اپنی بات سنانے کی کوشش کی 'لیکن کچھ کے پاس وقت نہیں تھا اور کچھ کا کہنا تھا کہ وہ بے کار باتوں کو لے کر پریشان ہے۔اب اگر کسی پروفیسر نے اس کے آگے کی رو میں بیٹھے لڑکے کو مسکرا کر دیکھ لیا' اور بعد ازاں سائی کو ذرا سی ترچھی نظروں سے دیکھ لیا تو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔پروفیسر کو تو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ آخر کر کیا رہے ہیں۔اور اگر کاریڈور میں چلتے شرارتی لڑکیوں نے ایک دم سے اس کے سامنے آکر دائرہ بنا کر اسے چٹکیاں بھر کر اس کا چشمہ اتار کر بھاگ بھی گئیں تو اسے تو انجوائے کرنا چاہیے کہ ایسی تتلیاں لڑکیاں صرف اس کے ساتھ شرارت کرتی ہیں۔مزید یونی میں چلتے پھرتے کوئی اسے پین کی باریک نب چبھو دیتا ہے اور متواتر ایسا کر رہا ہے تو یہ تو ایسی خاص بات نہیں۔وہ بھی ایک پین خرید لے باریک نب کا 'بلکہ پین ہی کیوں ایک چھوٹا سا خنجر ...اوہو...ورنہ وہ اپنے پھل کاٹنے والی چھری ہی بیگ میں رکھ کر لے آئے۔اس میں مسئلہ کیا تھا آخر.....

چھ مہینے بعد سائی نے محسوس کیا کہ بہت سی باتیں دوسروں کے لیے بہت معمولی اور غیراہم ہوتی ہیں جبکہ وہی باتیں کسی ایک کے لیے بہت اہم اور غیر معمولی ہوجاتی ہیں۔اس نے ایک بورڈ بنایا اور اس پر say it all لکھا اور اسے لے کر یونی میں گشت کرتا رہا۔جہاں کوئی اس سے اس کا مطلب پوچھتا تو وہ بتادیتا۔پہلے پہل اس کے say it all کی ضرورت کسی کو محسوس نہ ہوئی۔بلکہ یہ ایک مضحکہ خیز خیال لگا۔

ظاہر ہے ہم اپنی باتیں اپنے دوستوں سے شیئر کرتے ہیں ___ خوف سے کسی سے بھی نہیں کرتے۔ویسے دوستوں کے ساتھ شیئر کردینے سے ہی وہ بی بی سی نیوز سروس کی طرح سارے میں نشر ہوجاتی ہیں تو ایک انجانے انسان کے ساتھ شیئر کرنے کا رسک کوئی کیوں کرلے گا۔بلکہ نتیجے کے طور پر ان کا کیا حال ہوگا۔نہ ختم ہونے والی لڑائیاں...اور تاریخی عظیم اسٹوڈنٹس اسکینڈلز کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز...یعنی انجام...یہی سب نا؟ لیکن آہستہ آہستہ لڑکے لڑکیاں اس کے پاس آنے لگے۔خاص کر

وہ جن کی نئی نئی کسی دوست سے لڑائی ہوئی ہوتی یا پروفیسر نے دبے دبے لفظوں میں کلاس میں ان کی بے عزتی کردی ہوتی۔۔۔ کچھ صرف اسے لطیفے سنانے کے لیے آتے۔ وہ لطیفے جو بعدازاں انہوں نے کلاس میں کریک کرنے ہوتے کہ کلاس ہنسنے لگی بھی یا نہیں۔ کچھ گروپ کی صورت آتے۔

"سائی! دیکھو ہم میں سے کون سب سے زیادہ کیوٹ لگتا ہے۔"

سائی انگلی اٹھاتا اور ایک ایک کی طرف اشارہ کردیتا یعنی تم پانچوں کیوٹ ہو زیادہ تر اس کے پاس لڑکیاں آتیں۔

اب یہ سائی کا اصول تھا کہ برطانیہ امریکا بلکہ پورے یورپ کی فوج بھی اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو جاتی تو بھی وہ کسی کا بتایا ایک لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ اسے بم سے اڑا دو یا توپ سے اگر کوئی اسے کچھ بتا گیا ہے دل کا حال سنا گیا ہے تو بس اب وہ سائی کے سینے میں دفن ہو چکا ہے سوئس بینکوں کے سب ہی پیسے نکال کر بھی اس کے آگے ڈھیر کردیے جائیں تو بھی اس کا منہ نہیں کھلے گا۔

یونی کے بہت سے اسٹوڈنٹس اسے رازوں کا ایٹم بم کہتے۔ ایک صرف اس کی زبان کھل جاتی تو وہ برباد ہو جاتے۔

اب کوئی لائبریری کی کتابیں چرا بیٹھا ہے۔ جیسے لائبریری سے کسی نے کتابیں ایشو کروائیں اور باغ میں بیٹھے یا کینٹین میں کافی چائے پیتے وہ ذرا سی دیر کو اپنی کتابوں سے غافل ہو گیا تو یہ کتاب چور بھائی صاحب یا بہن جی اس غافل اسٹوڈنٹ کو سبق سکھانے کے لیے فوراً" کتابیں لے کر غائب اور اب اس کا ضمیر اسے سونے نہیں دے رہا یا اسے پولیس کے سائرن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو وہ سائی کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے۔

"میں نے کتابیں چرالیں۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی سائی! پچھلے دو ہفتوں سے میں دی پرنٹ ورک نہیں گیا کوئی فلم نہیں دیکھی۔ کرسٹن کی پارٹی میں وہی پرانی شرٹ پہن جاتا گیا۔ میں نے اس کے لیے گفٹ بھی نہیں لیا۔ گفٹ میں نے اسے دینا بھی نہیں تھا وہ کون سا دیتی ہے۔ گفٹ نہ بھی دینا ہو پیسے تو چاہیے ہوتے ہیں ناسائی! جب میں امیر آدمی بن جاؤں گا تو پوری ایک لاکھ کتابیں لائبریری کو چندے میں دوں گا۔ چلو دو لاکھ۔۔۔ میرا خیال ہے چار لاکھ ٹھیک ہے۔ یونی کی لائبریری بھی تو اتنی بڑی ہے۔"

اگلا آتا۔ "میں کل رات نشے میں تھا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گھونسا مارا وہ بے چارہ کوئی غریب افریقی تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے کے بیڈ تک لٹا کر گیا اور دروازہ ٹھیک سے بند کر گیا۔ اس نے میری جیبیں بھی نہیں ٹٹولیں۔ میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ جلد ہی مجھے مل جائے گا۔ میں اسے معاف کردوں گا نہیں۔۔۔ یعنی میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ مجھے کل رات نیند نہیں آئی۔ دعا کرنا آج آجائے۔ میں زمین پر سو رہا ہوں۔ بیڈ پر افریقی ڈرائیور سوتا ہے۔۔۔ ہاں آج کل اس کا بھوت ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ وہ مجھے کچھ کہتا نہیں ہے پھر بھی مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

کوئی اور آتا۔۔۔ "لزا میری گرل فرینڈ ہے لیکن۔۔۔ لیکن مجھے اب اس کی دوست وی وی آن اچھی لگنے لگی ہے۔ میں کیا کروں سائی۔۔۔ لزا بھی اچھی ہے اور وی وی بھی اچھی ہے۔ میں بھی اچھا ہوں۔ ہم سب اچھے ہیں پھر میں کیا کروں سائی؟"

تو اب یہی سائی اگر جا کر لزا کو بتا دے کہ پیاری دوست اور ننھی بھولی بھالی لڑکی تمہارا بوائے فرینڈ جوناتھن تمہاری دوست وی وی کو ہالیڈے ان میں دوبارہ ڈنر کے لیے لے جا چکا ہے۔ ہاں ہاں ان ہی پیسوں سے جو اس نے گلے میں سوزش کے علاج کا بہانہ کر کے تم سے لیے تھے۔

تو لزا کو اتنی سی بات بتا دینے پر کیا چھوٹا سا کترینا طوفان لاڈ پارٹمنٹ کی دیواروں سے نہ ٹکراتا۔۔۔

پھر سائی لائبریری اسٹاف کے پاس جاتا اور کہتا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی کتابیں چرانے والوں میں سے

ایک یہ رین بھی ہے۔ اسے پکڑوا سے جرمانہ کرو۔ بلکہ یونی سے ہی باہر کرو۔ اور یہ بریڈ ڈینیل' یہ ہر رات نشے میں دھت ہو کر کسی نہ کسی کو مار آتا ہے۔ ایک رات وہ دیوار پر بنے کارٹون کو دیر تک مارتا رہا اگر ریسٹورنٹ کی دیوار ٹوٹ جاتی تو ریسٹورنٹ انتظامیہ یونی پر ہرجانے کا دعوا کر دیتی۔ پیسوں کے لیے نہیں شہرت کے لیے تو برائے مہربانی اس محمد علی کلے کو سنبھالیں۔

یعنی ایک ساتھی کی وجہ سے آدھی یونی جرمانہ بھرتی یا یونی خالی کرتی.... لیکن وہ سائی تھا سنتا تھا بتاتا نہیں تھا... ہاں تو زیادہ تر اس کے پاس لڑکیاں آتیں۔ جو لڑکی سائی کے پاس بیٹھی نظر آجاتی۔ اس کے بوائے فرینڈ کو بہت تشویش ہوتی.... یا اس کے دوستوں کو.... اور اگر وہ ساتھ ساتھ ٹشو سے آنکھیں بھی رگڑ رہی ہوتی۔ تو بس پھر خیر نہ ہوتی اور سائی بڑی شفقت سے اس ننھی منی چڑیا کے آنسو ٹشو سے صاف کر رہا ہوتا۔

"سائی.... میں نے اتنا مہنگا ڈریس لیا.... دو گھنٹے لگا کر میک اپ کیا' تیار ہوئی' بالوں کو کرل بھی کیا.... اور اس نے کہا۔ کاش تھوڑے سے ہی سہی پر تمہارے دانت صاف ہوتے جب تم چھوٹی تھیں تو تمہاری ماما تمہارے دانتوں پر لگتا کیڑا کیوں نہیں دیکھ سکیں.... اتنی غافل ماما ہیں تمہاری.... سائی اسے صرف میرے دانت نظر آرہے تھے... گلابی میک اپ سے سجی میری آنکھیں نہیں.... اور میں تو ہنس بھی نہیں رہی تھی.... بول بھی کم رہی تھی پھر بھی اس کی ماما میرے دانتوں کو ہی گھورتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں دانتوں کا کینسر تو نہیں .... بیٹھے بٹھائے انہوں نے میرے دانتوں کو کینسر کروادیا.... پھر اس کا بھائی آیا.... جس کے آتے ہی گھر بدبو سے بھر گیا.... وہ مجھے دیکھتا رہا اور جانتے ہو اس نے مجھے کیا کہا۔ "میرا ایک دوست ہے ڈینٹسٹ.... اس نے دانتوں کے پیچیدہ ترین کیس نپٹائے ہیں۔ وہ تمہارے لیے بھی ضرور کچھ کردے گا.... اگرچہ میں اسے ناکام ہوتے دیکھ رہا ہوں...." پھر وہ منہ کھول کر ہنسنے لگا اور بدبو سے میرا دم گھٹنے لگا.... پہلے وہ اپنی بدبو کا علاج کیوں نہیں کروالیتا.... سائی ایسی محبت کا کیا فائدہ کہ آپ اس کے سامنے اس لیے کم بولیں کہ وہ پھر سے آپ کے دانتوں کو لے کر بیٹھ جائے گا.... وہ ہر ملاقات میں میرے دانتوں کا ذکر ضرور کرتا ہے.... کیوں کرتا ہے وہ ایسا.... میں اسے چھوڑ رہی ہوں سائی.... میں بہت روؤں گی.... پر یہ روز روز کے رونے سے اچھا ہے...."

سوں سوں کرنے.... آنسو بہانے اور صاف کرنے کا وقفہ....

جب میں کیمسٹری کا نوبل انعام لے رہی ہوں گی تو اپنے بدبو دار بھائی کے ساتھ بیٹھے مجھے ٹی وی پر براہ راست دیکھتے اسے ضرور دکھ ہوگا.... لیکن اس وقت کچھ نہیں ہو سکے گا' میری زندگی میں مارک زیک برگ آچکا ہوگا.... اور میں اپنا نوبل انعام اسی کے نام کروں گی.... ہاں ٹھیک ہے.... میں یہی کروں گی...."

یونی میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا تھا سنا تھا ST.Anselm جہاں وہ رہتا تھا اکثر رات گئے اسے اٹھایا جاتا اور کمرے میں کہیں رکھا اس کا Say it all بورڈ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے پاس رکھا جاتا اور پھر اس پر اپنی فرسٹریشن نکالی جاتی وہ ہیڈ گراؤن سے ٹیک لگا کر یا زمین پر اسٹوڈنٹ کے ساتھ ہی بیٹھ جاتا اور رو رو کر ستایا جانے والا حال سنتا....

"مجھے گھر جانا ہے سائی.... میری ماں کیا کھانے بناتی ہے.... یہاں کے کھانوں میں بالکل مزہ نہیں ہے میری تائی کے ہاتھوں میں تو بالکل ذائقہ نہیں ہے.... ہفتے میں ایک بار ان کے گھر جاتا ہوں.... سارے ہفتے کا بچا ہوا کھانا مجھے کھلادیتی ہیں.... پاپا کہتے ہیں تجھے زہر ہی کیوں نہ کھلادے.... ہفتہ اتوار تو ان ہی کے گھر رہے گا.... پاپا جی.... نہیں مجھے صرف اپنی ماں کے پاس جانا ہے...."

جالندھر کے رہائشی پرتاپ سنگھ کو رونا بڑا اچھا آتا تھا بے چارہ سائی بھی رونے لگتا تھا۔

"یونی میں سب اتنے اچھے اچھے کپڑے پہن کر آتے ہیں.... ایک میں ہی کیوں غریب ہوں سائی....

میرے پاس صرف ایک اچھی سی جینز ہے میں کب تک اسے ہی پہنوں۔۔۔ میرا آئی فون پرانا ہوچکا ہے۔۔۔ چھ مہینے سے میں نے وہی پرانا ہیر اسٹائل اپنا رکھا ہے تم کہ مجھے لگنے لگا ہے کہ میں سترھویں صدی کا کوئی جوکر ہوں جسے دیکھ کر بچے بھی نہیں ہنستے۔۔۔۔"

آرٹ اسکول کا ٹونی۔۔۔

میں پاستا بنا کر رکھ گیا‘ آیا تو پلیٹ غائب۔ کمرہ لاک تھا سائی۔۔۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کمرہ لاک تھا‘ یہ پانچویں بار ہوا ہے میرا پاستا غائب ہوا ہے۔۔۔ سنا ہے Oak ہاؤس میں جن وِن کا سایہ ہے؟ وہ پوچھا بتا رہی تھی کہ کمرے میں ایک لڑکا ٹھنڈ سے مر گیا اور وہ بھوکا بھی تھا۔۔۔ سائی میں کیسے پتا کروں کہ وہ کس کمرے میں بھوک سے مرا۔۔۔ یا ٹھنڈ سے۔۔۔ کیا میرے کمرے میں۔۔۔ کوئی مجھے کچھ بتا تا ہی نہیں ہے میں انتظامیہ کے پاس گیا تو اس نے بڑے ٹھنڈے ‘لیکن جلے ہوئے انداز میں کہا وہ تو شاید ٹھنڈ اور بھوک سے نہ مرا ہو‘ لیکن تم یقیناً ”خوف سے مرنے والے ہو۔ چلو میں تمہارا کمرہ نمبر نوٹ کرلیتا ہوں۔۔۔ ”وجے پنڈت کمرہ نمبر 302۔۔۔ Oak ہاؤس۔۔۔ بے جا خوف اور خدشات کے باعث کمرے میں مردہ پایا گیا۔۔۔ اس کے بھوت سے بچنے کے لیے اپنی ذمہ داری پر کمرہ لیا جائے۔۔۔ سن 2014 شکریہ۔“

میں نے اپنی وارڈ روب دیکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے نئے جوتے جو ماما نے میری سالگرہ پر مجھے دیے تھے اور جنہیں میں نے ایک بار بھی استعمال نہیں کیا تھا‘ وہ تو کوئی دس بار پہن کر وہاں رکھ چکا ہے۔۔۔ اوہ سائی میں کس قدر لاپروا ہوں۔۔۔ میں نے روز اپنے جوتے کیوں چیک نہ کیے۔۔۔ میں کمرہ لاک کرنا کیسے بھول گیا آخر۔۔۔ لیکن سائی۔۔۔ آخر کبھی ہم کمرہ لاک کرنا بھول ہی جاتے ہیں نا۔۔۔ ہم سب ہی۔۔۔"

تو مانچسٹر یونی میں جو بارہ لڑکے لڑکیوں کے گروپ کو دوست رکھتے تھے یا صرف ایک کو ‘سائی کی ضرورت کبھی نہ کبھی سب کو پڑتی تھی۔۔۔ ایک سننے والا کان سب کو چاہیے ہوتا ہے۔۔۔ پروفیسر تک اس کے پاس پائے جاتے۔۔۔

سائی سے بات کرنے کے چند طریقے تھے۔

”آپ صرف بولیں وہ صرف سنے۔۔۔“ زیادہ تر یہی کرتے۔

”آپ بولیں ساتھ وہ بھی بولے۔۔۔ آپ کی اجازت ہو تو۔۔۔“

”آپ بولیں۔۔۔ پھر وہ سوالات کرے۔۔۔ آپ بول چکے ہوں تو وہ آپ کو اچھی یا جیسی کیسی رائے دے۔۔۔ آپ کی اجازت ہو تو۔۔۔“

امرحہ سائی کے پاس دو چار بار آچکی تھی‘ ایک بار جب اسے جاب نہیں مل رہی تھی اور ایک بار جب عالیان نہیں مل رہا تھا۔۔۔ اب کارل والے واقعے کے بعد وہ پھر سے اس کے پاس رونے کے لیے آئی تھی لیکن ایک ہندوستانی لڑکا راما اس کے پاس بیٹھا تھا وہ جانے لگی تو راما نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

وہ ہاتھوں کو گود میں رکھے سر جھکائے ایسے بیٹھا تھا جیسے مانچسٹر یونی میں اس کی مہندی کی رسم ادا کی جارہی ہو۔۔۔ آپ ہنس سکتے ہیں لیکن یہی سچ ہے۔۔۔

”وہ میری دوست ہے۔۔۔ بہت اچھی دوست۔۔۔ ہاں صرف دوست۔۔۔ وہ مجھ سے ایک سال سینئر ہے یہ اس کا آخری سمسٹر ہے۔۔۔ پھر وہ چلی جائے گی۔۔۔ فرانس۔۔۔ اس نے کہا کہ میں فرانس آسکتا ہوں اسے ملنے۔۔۔ ہاں میں چلا جاؤں گا اس سے ملنے۔۔۔ ایک سال بعد جاؤں گا۔۔۔ پھر شاید پانچ چھ سالوں بعد جاؤں۔۔۔ پھر شاید آٹھ دس سالوں بعد۔۔۔ پھر میں بوڑھا ہو جاؤں گا اور ظاہر ہے مر جاؤں گا۔۔۔ ظاہر ہے ہمیں مرنا بھی تو ہوگا نا۔۔۔ شاید وہ بھی کبھی آئے اترپردیش مجھ سے ملنے۔۔۔ میں اسے اپنا گاؤں دکھاؤں گا۔۔۔ لیکن سائی! یہ سب سوچتے میں رونے جیسا کیوں ہو جاتا ہوں۔۔۔ اور سائی وہ ابھی گئی نہیں۔۔۔ اور میں ابھی سے اسے بری طرح سے یاد کرنے لگا ہوں۔۔۔ ابھی تو وہ میرے پاس ہی ہے۔۔۔ اسے دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔۔۔ یہ اس کا آخری سمسٹر ہے۔۔۔ پھر

میرا بھی آخری سمسٹر آجائے گا میں بھی چلا جاؤں گا۔۔۔ مانچسٹر میں مل کر۔۔۔ دنیا میں بکھر کر ہم کھو جائیں گے ناسائی۔۔۔"

امرحہ گود میں ہاتھ رکھے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے سر جھکائے بیٹھے اتر پردیش کے راجا کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا کہ اس لڑکی کے چلے جانے کے بعد وہ سیدھے سیدھے مر جائے گا۔۔۔

"اسے روک لو راما!" سائی کو مشورے کی اجازت دی گئی۔

"روک لینا اتنا آسان نہیں۔۔۔ وہ فرنچ ہے۔۔۔ خاندان کے نام پر اس کے پاس ایک ماں اور ایک سوتیلی بہن ہے۔۔۔ اس کی ماں پہلے ڈانسر رہ چکی ہے۔۔۔ میرا خاندان۔۔۔ میں۔۔۔ میرا کلچر۔۔۔"

"کوئی ترکیب نکالو لیکن روک لو اسے۔۔۔ وہ گئی تو تم بھی اپنی اصل حالت میں نہیں رہ پاؤ گے۔۔۔ تم مر جاؤ گے راما۔۔۔ اپنے زندہ رہنے کے لیے کچھ کرو۔۔۔"

امرحہ ایک ٹک راما کو دیکھ رہی تھی جس فرنچ لڑکی کی بات وہ کر رہا تھا' کافی مہینوں سے گاہے بگاہے شلوار قمیص' ساڑھی' چولی میں ملبوس نظر آتی رہی تھی۔ ماتھے پر چھوٹی سی بندی بھی لگا لیتی۔۔۔ منے سے بالوں کو چوٹی کی صورت گوندھ کر رکھنے کی کوشش کرتی۔

جس قصے کو راما بیٹھا رو رہا ہے' ایسے ہزاروں قصے مانچسٹر یونی کی دھرتی سے شروع ہو کر ختم بھی ہو جاتے تھے۔ اور صرف خوش قسمت ہی ہوتے تھے جو آہیں اور یادیں نہیں ایک دوسرے کا ساتھ لے کر نکلتے تھے۔ مختلف ملکوں' سماجوں' روایتوں کے حامل اسٹوڈنٹس کا ایک جگہ اکٹھے ہو کر پڑھنا۔۔۔ دوست بننا۔۔۔ محبت میں مبتلا ہو جانا۔۔۔ اور روایات کے نام پر الگ ہو جانا اور پھر بڑھاپے میں آہیں بھرنا۔۔۔ یہ سب کڑوی ہی سہی' لیکن حقیقت تھی۔ راما کے بارے میں سوچتے اس نے اپنی نیند گنوائی۔ وہ اپنی بات بتائے بغیر ہی پلٹ آئی تھی۔



کتابوں والے واقعے کو بمشکل چند دن ہی گزرے تھے کہ صبح وہ یونیورسٹی آئی تھی اور اپنی کلاس کے لیے جا رہی تھی کہ اس کے قریب سے گزرتی ایک لڑکی نے اسے روک لیا۔

"ہے۔۔۔ تمہارا جوتا بہت خوبصورت ہے۔۔۔ کہاں سے لیا ہے؟"

وہی عظیم عادت تعریف پر پھول جانا۔۔۔ تو وہ بھی جھٹ پھول سی گئی اور بھول ہی گئی۔

"اپنے اسٹور سے جہاں میں کام کرتی ہوں۔"

"بہت خوبصورت ہے۔۔۔ اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں پہن کر دیکھ لوں۔۔۔ میں آؤں گی تمہارے اسٹور اسے لینے۔۔۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔" اس نے جھٹ جوتا اتار کر اس کے آگے کیا اور اس گلابی اسکرٹ اور گلابی گالوں والی لڑکی نے جوتے کو پہننے کے بجائے اسے جھٹ اٹھایا اور یہ جا وہ جا۔

"ہے۔۔۔(Hey)" امرحہ حیرت زدہ اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی' لیکن وہ رکی نہ پلٹی۔۔۔ لیکن رک رک کر چلتا کوئی اور اس کے پاس آرہا تھا۔۔۔

"کون۔۔۔ ہو جیسے کون۔۔۔؟"

کارل اور کون۔۔۔

اس کے ہاتھ میں اس کا گلابی باربی جوتا تھا۔

"یہ آج کے دن کے لیے میرے پاس رہے گا۔۔۔ تمہاری یاد دلائے گا۔" جوتا اس کے آگے لہرا کر وہ چلا گیا' ہاں وہ ہنٹ دے کر تو گیا تھا کہ میں آؤں گا۔۔۔ بھلے سے وہ تفصیلات دے دیتا' ہونا یہی تھا۔۔۔

"اف!" اس نے آس پاس دیکھا' بمشکل ایک جوتے سے چلتی بینچ پر بیٹھی۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی کوئی۔۔۔ یہ کارل اس کی جان کو آگیا تھا۔ اب ایک جوتے کے ساتھ وہ اندر جا سکتی تھی نہ باہر۔۔۔ اس نے ویرا کو فون کیا' لیکن اس کا فون بند تھا وہ کلاس میں جا چکی ہو گی۔۔۔ این اون کا بھی بند تھا' سردی کے دن تھے زمین پر پیر رکھنے کے لیے جرات چاہیے تھی اور پھر یوں لنگڑا کر چلنا۔ ناچار وہ اٹھی دوسرا جوتا بھی اتار اور صرف جرابوں کے ساتھ چلتی بس اسٹاپ تک

آئی۔
اور کیا۔۔۔
جی کارل۔۔۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کی تصویریں لے رہا تھا۔۔۔ بس آگر ہی نہیں دے رہی تھی' وہ اسٹاپ پر صرف جرابوں کے ساتھ ننگے پیر کھڑی تھی۔ دوسرا جوتا ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔۔۔ اس نے گھور کر کچھ دور موجود کارل کو دیکھا۔۔۔ اس کے جی میں آئی کہ ہاں بس اب۔۔۔ اب اسے قاتلہ بن جانا چاہیے۔۔۔ اگر اب بھی نہیں بنے گی تو آخر کب بنے گی۔۔۔؟ کارل کا خون اس پر جائز تھا۔ اسے ساری زندگی اتنی کوفت اور شرمندگی نہیں ہوئی تھی جتنی یونی سے ایسے آتے اور پانچ منٹ بنا جوتوں کے ایسے کھڑے ہو رہی تھی۔ تیزی سے اپنی کلاس کے لیے بھاگتے اسٹوڈنٹس بھی گردنیں موڑ کر اسے دیکھنا نہیں بھول رہے تھے۔
گھر آئی' جوتا تبدیل کیا۔۔۔
"کیوں آگئیں اتنی جلدی؟ نشست گاہ میں ٹی وی دیکھتے لیڈی مہر نے پوچھا۔
"میرا جوتا۔۔۔" غصے کی شدت سے وہ اتنا ہی کہہ سکی۔
"کیا ہوا جوتے کو۔۔۔ اوہ ٹوٹ گیا۔"
"ایک منحوس انسان ہے یونی میں' وہ لے گیا۔"
"وہ چیل کوا ہے کیا۔" وہ ہنسیں۔
"نہیں۔۔۔ ڈائن۔"
"ڈائن تو فی میل نہیں ہوتی امرحہ۔۔۔؟"
"وہ میل ڈائن ہے۔" وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہی ہے وہ جو اس کے اور عالیان کے درمیان ایسی دوری کا باعث بنا ہے۔ یہ بات وہ اکثر خود کو تسلی دینے کے لیے سوچ لیا کرتی تھی۔ اپنے کیے کا الزام ویرا اور کارل پر ڈال دیا کرتی تھی' جبکہ ویرا اور کارل سے زیادہ وہ خود قصوروار تھی۔
جب وہ یونی واپس آئی' اس کی پہلی کلاس ہو چکی تھی۔ باقی کی کلاسز لے کر وہ واپس جا رہی تھی کہ بندر کی طرح قلابازیاں لگاتا وہ اس کے سامنے آیا۔
"یہ لو اپنا جوتا۔"
اس نے جوتا آگے کیا' جس کے گلابی چمڑے کو بلیڈ سے لمبی لمبی لکیریں دے کر کاٹ دیا گیا تھا اور اس کی جھالر سی بن گئی تھی۔ اب اس جوتے کو کسی ریسرچ کے لیے تو استعمال کیا جا سکتا تھا کہ اس کی ابتدائی شکل آخر کیا رہی ہوگی' لیکن پاؤں میں پہننے کے لیے ہرگز نہیں۔۔۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔
"اچھا جوتا تھا۔۔۔ لیکن زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ تم مارکیٹ سے نیا لے لینا۔"
وہ تیزی سے اس سے آگے چلنے لگی' ورنہ آج اسے قاتلہ بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔
"تم اب تک کہاں تھیں امرحہ دی مینڈکی۔۔۔ ٹرٹرٹر۔۔۔ میں کب سے ہوں اس یونی میں۔۔۔ تم تب سے کیوں نہیں آئیں۔۔۔ اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ کیسے بے کار اور فضول گئے وہ سب سال۔۔۔ بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ لیکن اب تو تم یہاں ہی ہو نا۔ مجھے وقت کو جمع اور ضرب دینا آتا ہے' اور دیکھو' تمہاری جتنی بھی دوستیں ہیں اور بہنیں جیسا کہ میں نے سنا ہے ایشیا میں بہت بڑے بڑے خاندان ہوتے ہیں۔ یعنی جو تمہاری چھ' سات' آٹھ دس بہنیں ہیں۔ ہاں جو بالکل تم جیسی ہیں' انہیں بھی مانچسٹر بلالو۔۔۔ اسی یونی میں۔۔۔ میں کچھ بھی کر کے فنڈز اکٹھے کروں گا' تاکہ انہیں آنے میں آسانی رہے۔ لیکن برائے مہربانی تم اپنے جیسی ایک ایک کاربن کاپی کو یہاں لے آؤ۔"
وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے مزے سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے دونوں میں کتاب بدل دوستی ہو۔۔۔ جی۔۔۔ پنجاب کی دوپٹا بدل دوستی کو میں نے مانچسٹر میں کتاب بدل دوستی کا نام دے دیا ہے۔۔۔ ٹھیک کیا نا۔
امرحہ رکی اور شرارے اگلتی آنکھوں سے کارل کو تاڑا۔
کارل بھی رک گیا اور بہت مزے سے امرحہ کو دیکھنے لگا' پھر اپنی ناک پر انگلی رکھ لی۔
"تم ایکس مین سیریز میں کام کرتی رہی ہو کیا۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ میری کھال جل کر پھٹ رہی ہے۔"
امرحہ نے کانوں میں ایئر فون لگایا اور میوزک تیز

کردیا۔ کارل کا قہقہہ اس کی پشت پر دیر تک فضا میں منتشر رہا۔

بس میں بیٹھ کر اس نے ایسے دانت پر دانت جمائے جیسے ان دانتوں تلے کارل کی گردن ہو.... آ.... خ تھو.... کیا سوچ رہی تھی وہ....

کاش میں بھی کارل جیسی ہوتی یا ویرا جیسی، پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی.... دوبدو جنگ ہوتی۔

''اللہ جی میرے بھی ذہن میں کوئی ترکیب ڈال دیں کہ اس کارل 'فال' شال کو ہی سب عطا کیا ہوا ہے۔''

کارل عالیان سے متعلق دھمکی دے کر تقریباً غائب ہی ہو گیا تھا۔ شاید وہ عالیان کو ڈھونڈتا رہا تھا اور جب عالیان واپس آگیا تو دوبارہ امرحہ سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ اسے لائبریری میں چھیڑ بیٹھا اور امرحہ نے پھر سے جیسے اسے اپنے پیچھے لگوا لیا۔

ویسے بھی اس کے بارے میں مشہور تھا کہ الٹے کام کیے بنا اسے نیند آیا کرتی تھی، نہ کھانا ہی کھایا جاتا تھا اس سے.... اس کے انسانی ڈھانچے میں سپر اسپرنگ فکس تھے جو اسے کسی پل چین سے رہنے نہ دیتے۔ یہ اسپرنگ اس قدر کارآمد تھے کہ دس قدم انسانوں کی طرح چلنے کے بعد وہ گیارہویں قدم پر چھلانگ یا چھلانگ نما چال ضرور اپنا لیتا۔

آتے جاتے اسٹوڈنٹس کے ہاتھوں سے کھانے کی چیزیں اچک لینا تو اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا کام تھا.... یعنی دو ہاتھوں سے برگر پکڑے، منہ کھولے کھانے والا ایک بڑی سی مزے دار سی بائیٹ لینے کے چکروں میں ہے اور جب وہ کترتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ برگر تو ہاتھ میں رہا ہی نہیں.... عینی شاہدین برگر شکار کی طرف ہنس کر دیکھتے ہیں اور اشارے سے بتاتے ہیں۔

''کارل!''

اب برگر شکار کارل کو بمشکل ڈھونڈتا اس کے پاس جاتا ہے اور اسے شرم دلاتا ہے، تو الٹا کارل اسے انتظامیہ کے پاس جانے کی دھمکی دیتا ہے کہ آخر ایک بزنس اسٹوڈنٹ پر ایسا گھٹیا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے، آخر کیسے۔

رات کو ویرا آئی اپنی ہنسی دباتی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے آئی فون اس کے آگے کیا، وہاں اس کی بس اسٹاپ پر ننگے پیروں کھڑی تصویر تھی اور ٹائٹل تھا۔

''مانچسٹر میں سو سالہ سردی کا ریکارڈ ٹوٹنے پر دور جدید کی نیلسن منڈیلی کا احتجاج۔''

ویرا کارپٹ پر پیٹ پکڑے کسی افغان بلی کی طرح لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے اس سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ تھپڑ کھانے کے بعد آج وہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور ایسے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی.... امرحہ ویرا کو دیکھ رہی تھی۔

شاید واقعی آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے.... کارل پھر سے پہلے جیسا کارل بن گیا تھا تو عالیان بھی پہلے جیسا ہو ہی جائے گا۔

امرحہ فون ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی اور بس بیٹھی ہی رہ گئی۔ کارل نے آدھی یونی کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں اس کی تصویر پر ٹیگ کر دیا تھا۔ امرحہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آدھی یونی کے کمنٹس اس نادر و نایاب تصویر کے نیچے پڑھتی۔ اپنی ایسی مضحکہ خیز تصویر دیکھ کر ہی اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ اسے رونا بھی آرہا تھا اور ویرا کو دیکھ دیکھ کر ہنسی بھی۔

ویرا پاگل ہوئی جا رہی تھی.... وہ زندگی سے بھرپور غبارے چھوڑ اور پھوڑ رہی تھی۔ چینی پریڈ کے بعد سے امرحہ مسکرا نہیں سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ تاعمر نہیں ہنس سکے گی۔ لیکن ویرا کی ہنسی جیسے اسے اشارے دے رہی تھی کہ ''سب ٹھیک ہو جائے گا پیاری.... ایک نہ ایک دن آخر سب ٹھیک ہو ہی جاتا ہے۔''

''تم جانتی ہو، مانچسٹر نے تمہیں کیا تحفہ دیا ہے۔'' اپنی ہنسی کی چھکڑ ریل کو بمشکل روک کر ویرا بول پائی۔

''کارل.... تمہیں کارل سے نوازا گیا ہے۔ خوش قسمت ہو تم۔''

کھلی کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا نے امرحہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اب... ہاں اب... اسے یہ ہوا نرم لگی... سرگوشیاں کرتی... اس کے دل کو تھوڑا قرار سا آیا... سکون کی ایک لہر اٹھی۔

"مانچسٹر یونی میں تعلیمی دورانیے سے متعلق جو ڈائریز ہم لکھ رہے ہیں نا امرحہ! وہ سب ایک طرف ہوں گی، لیکن جو یادیں تمہاری اسٹوڈنٹ ڈائری میں رقم ہوں گی نا وہ نوبل انعام وننگ ہوں گی۔ تم اپنے پوتے، پوتیوں کو ہنسا ہنسا کر مار ڈالوگی۔ ہر طرح کی یادوں سے تم مالا مال ہو چکی ہو۔ کتنی خوش قسمت ہو نا تم... مقناطیس کی طرح تم اپنی طرف کھینچتی ہو کہ آؤ... مجھے ستاؤ، رلاؤ۔"

ہنستے ہنستے ویرا کو پھندا لگ گیا تو امرحہ نے جھک کر اس کی کمر میں زوردار گھونسا مارا... ویرا منہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی کہ کیوں مارا۔ وہ بھی اتنی زور سے...

"کچھ تمہاری ڈائری میں بھی لکھا جانا چاہیے تھا۔ میں تمہارے پوتے، پوتیوں کو بور ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔" امرحہ نے معصومیت سے کہا۔ ویرا نے اس کے بال مٹھیوں میں بھر لیے اور اس کے سر کو جھٹکے دینے لگی۔ یہی کام امرحہ نے کیا۔

دونوں کارپٹ پر لوٹ پوٹ گتھم گتھا ہو گئیں۔

"میرے پوتے، پوتیاں بور نہیں ہوں گے۔ میں انہیں تمہارے قصے سنا سنا کر ہنسا، ہنسا کر خوش گفتار گرینڈ مدر ہونے کا خطاب حاصل کرلوں گی۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ چپکے رہا کریں گے کہ گرینڈ ماں پلیز اس امرحہ دی لاسٹ ڈک کی باتیں سنائیں نا۔"

"میں بھی تمہارے قصے سنایا کروں گی۔ Ball Ginger فکر نہ کرو۔"



"مانچسٹر کے راج ہنس! تم نے مسکرانا کم کر دیا ہے یا کفایت کر رہی ہو؟" دادا پوچھ رہے تھے۔ بہت بار پوچھ چکے تھے۔

"تھک جاتی ہوں نا... مشکل ہے زندگی؟"

"مشکل تو ہے۔" وہ دادا کو بتا نہ سکی کہ کیا مشکل ہے۔

"اگر مجھے نہیں بتا سکتیں تو سائی تو ہے نا۔"

"آپ سائی سے پہلے ہیں میرے لیے دادا۔"

"پھر بھی... کچھ رشتے کتنے بھی قریبی ہوں، ان سے سب نہیں کہا جا سکتا۔"

دادا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ عالیان کی بات کو لے کر وہ سائی کے پاس ہی گئی تھی۔ دادا سے وہ سب کہنا چاہتی تھی پر کہہ نہیں سکی۔

"تمہاری اماں اور دادی دانیہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن تمہارے ماموں نہیں مان رہے، کہتے ہیں شادی بہت دھوم دھام سے کرنی ہے، ابھی تم لوگوں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بات کی انہوں نے دادا؟"

"یہی تو میں نے کہا تمہاری اماں سے کہ پوچھو اپنے بھائی سے، ہم کیا بھوکے مر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ واجد کی دکان ٹھیک ہو رہی ہے۔ منافع آنے لگا ہے۔ وہ تمہارے دیے قرض کو جمع کر رہا ہے۔ خاندان کی ایک تقریب میں اس نے کسی سے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی میں فضول خرچی نہیں کرے گا۔ تمہارے ماموں کو اس بات کی خبر ہو گئی۔"

"بابا کیا کہتے ہیں دادا؟"

"واجد کا کہنا ہے کہ اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے فضول پیسے ہیں ہی نہیں، پہلے کی بات اور تھی، اب جو کچھ جمع تھا، وہ سب دکان میں لگ گیا۔ واجد نے برا وقت دیکھا ہے۔ کسی نے اس برے وقت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ خاندان میں کسی نے قرض کے نام پر چند ہزار بھی نہیں دیے۔ واجد بہت بددل سا ہو گیا ہے سب سے۔ مشکل ہے یہ منگنی رہے۔ واجد نے تو دانیہ سے یہ تک کہہ دیا ہے کہ وہ پڑھنے کے لیے تمہارے پاس چلی جائے۔ ہوتی رہے گی شادی سال دو سال میں... امرحہ، واجد کہہ رہا تھا کہ اس کا وہی سکہ اس کے کام آیا، جسے اس نے اور خاندان والوں نے کھوٹا سمجھ

لیا تھا۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں۔ بار بار میرے پاس آتا ہے۔ کہتا ہے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوتی رہی۔"

امرحہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔ "تو بابا کو احساس ہو گیا۔۔۔ دانیہ کیا کہتی ہے۔"

"صاف کہہ دیا ہے اس نے مر جاؤں گی کسی دوسرے ملک نہیں جاؤں گی۔ وہاں پڑھو بھی کام بھی کرو' کیا ضرورت ہے اتنے وبال پالنے کی' مجھے کون سا منسٹر بننا ہے کسی ملک کا۔" یا فون پر لگی رہتی ہے یا سوتی رہتی ہے۔ اتنی آرام دہ زندگی چھوڑنے کی اسے کیا ضرورت ہے بھلا۔"

آرام دہ زندگی تو امرحہ کی تھی۔ زندگی کی روح کام ہے۔ صرف کام۔۔۔ چلتے رہنا۔۔۔ حرکت میں رہنا۔۔۔ علم کے کام میں مصروف۔۔۔ عمل کے کام میں مصروف۔۔۔ اتنی سی زندگی میں انسان کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ ضائع کرتا پھرے۔۔۔ سو کر۔۔۔ رو کر یا موج مستی میں۔

یہ زندگی انسان کو بھلائی کے کام کرنے کے لیے عطا کی گئی ہے۔ خیر اکٹھا کرنے کے لیے اسے کھیل تماشے کی نظر نہیں کیا جا سکتا۔ شفاف' میٹھا پانی بھی ٹھہر جائے تو بدبو دینے لگتا ہے۔ کیچڑ میں بدل جاتا ہے' انسان کیوں کر خود کو ٹھہرا کر برباد کر سکتا ہے۔ کائنات کی ہر شے۔۔۔ ہر شے ہمہ وقت حرکت میں ہے اور تاقیامت رہے گی۔ انسان ساکن ہو کر گناہ کبیرہ کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو انسانی رتبے کے منافی ہے۔ سراسر منافی۔

"ہنستی رہا کرو امرحہ! تمہاری خاموشیاں اتنی گہری کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟" دادا کو ایک بس اس کی ہی فکر تھی۔

امرحہ نے دادا کو ہنس کر دکھا دیا۔ ٹھیک اسی وقت کارل اس کے قریب سے استہزائیہ ہنس کر گزرا۔۔۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ ابھی تمہاری یہ ہنسی بھی غائب کرتا ہوں۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔

امرحہ کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ دادا کو اس نے بائے کہا اور سائی کے پاس آئی۔ جوتے والے قصے کے بعد اس نے لاکھ ذہن لڑایا' لیکن کارل کو مزا چکھانے کی کوئی ایک بھی ترکیب نہیں سوچ سکی۔

"مجھے مشورہ دو۔" سائی کو ساری بات سنا کر اس نے مشورہ مانگا۔ "تھوڑا بہت بدلہ تو جم سے بھی لیا جا سکتا ہے۔" سائی ہنسنے لگا۔

"ہنستے ہوئے تم بالکل میرے دادا جی جیسے لگتے ہو۔"

"کیا تمہارے دادا میرے جیسے جوان ہیں یا میں ان جتنا بوڑھا ہوں۔"

"ہنستے ہوئے تم ان جیسے معصوم اور سادہ لگتے ہو۔"

امرحہ نے ہونٹ سکیڑے۔ وہ سائی کے مشورے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آخر اسے جم کا خیال کیوں نہیں آیا۔ گو اینٹ کا جواب پتھر تو ہرگز نہیں تھا' لیکن اینٹ کا جواب کچھ تو تھا' وہ بھی صرف پانچ پونڈ میں۔

امرحہ جم کے پاس جائے' پہلے ہمیں اس کی تاریخ تک جانا چاہیے۔

تو جم کی تاریخ کچھ یوں تھی کہ وہ اکثر کلاس میں اونگھتا ہوا پایا جاتا تھا۔ اب پوری یونی میں وہ اکیلا تو نہیں تھا جو یہ کرتا تھا۔ کم و بیش یونی کا ایک ایک اسٹوڈنٹ اپنے پورے تعلیمی سال میں چالیس سے پچاس بار اس عظیم سانحے سے ضرور گزرتا۔ کچھ اس سانحے سے زیادہ گزرتے۔۔۔ کچھ کم' لیکن فیض یاب سب ہی ہوتے۔

کچھ کلاس میں اونگھتے پائے جاتے۔ کچھ ہر جگہ اور بہت سے کسی بھی جگہ۔۔۔ مطلب کسی بھی جگہ۔۔۔

آپ بس میں بیٹھے ہیں' آنکھ کھلی۔

"اوہ میں تو بہت آگے آگیا۔" جلدی سے بس بدلی۔۔۔ بس چلی۔۔۔ آنکھ پھر سے لگی۔

"اوف میں تو بہت پیچھے آگیا۔" پہلا لیکچر گیا۔

جولی کافی لینے گئی ہے۔ جولی واپس نہیں آئی۔ جولی کافی کے مگ جو بعدازاں ایک ہوش مند رحم دل اسٹوڈنٹ نے صرف اس خیال سے اٹھا لیے ہیں کہ کافی ٹھنڈی ہو کر بے کار ہو جائے گی اور جولی کو سوتے

سے اٹھا دینا تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔۔ بے چاری سو ہی تو رہی ہے نا اور سوتے ہوئے کتنی پیاری بھی تو لگ رہی ہے۔ خیر جولی کینٹین کاؤنٹر پر سر رکھے اونگھ رہی ہے اور کاؤنٹر مین اس پر پانی کے چھینٹے بھی مار چکا ہے۔ لیکن جولی بدستور اونگھ رہی ہے۔ کاؤنٹر کی طرف آتے کسی مہمان نے اس کے کھلے منہ کی تصویر لے کر The Tab بھیج دی ہے۔

یعنی یونی کے باغوں میں، درختوں تلے، کلاس کے دوران، کوریڈور میں، باتھ رومز، واش رومز، بس، ٹیوب، بارز، کیفے، ریسٹورنٹ، لائبریری میں تو خاص کر اور کینٹین میں تو ضرور ہی۔۔۔ کون تھا جو منہ کھول کر اونگھتا پایا نہیں جاتا تھا۔ ایگزامز کے دنوں میں تو ٹیبل اور کرسیوں کے نیچے بھی اور تو اور کوڑا دان کی آڑ میں چھپ کر بھی۔

جب کوئی اس اونگھ سے محفوظ نہیں تھا تو سزا صرف ایک جم کو ہی کیوں۔۔۔ اور وہ تو تھا بھی دوسری قسم والوں میں سے۔

پہلی قسم آنکھیں بند کر کے قدرتی اونگھ لینے والی۔۔۔

دوسری قسم آنکھیں کھول کر خود پر جبر کر کے غیر قدرتی اونگھ لینے والی۔۔۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے تعلیمی ریکارڈ کو بہتر بنانے کے لیے اور ایک اچھے اسٹوڈنٹ کا خطاب پانے کے لیے آنکھیں میچ کر نہیں انہیں کھول کر سوئے ہیں۔ جی ہاں۔۔۔ ایسا ممکن ہے۔

مارٹن لائبریری سے کتابیں ایشو کروا رہا ہے۔

"برائے مہربانی ذرا جلدی کریں اور مجھے یہ ایشو کر دیں۔" ہاتھ کو کتابوں پر رکھتے ہوئے۔

"یہ میرا ہاتھ ہے۔" لائبریرین۔

"اوہ۔۔۔ میں مذاق کر رہا تھا۔" آنکھیں مسل کر۔

"یہ رہیں میری تین کتابیں۔۔۔ انہیں ایشو کر دیں۔"

"معذرت کے ساتھ۔۔۔ یہ لائبریری کی ملکیت ہے۔۔۔ ہم اپنے زیر استعمال کمپیوٹر اور دیگر مشین ایشو نہیں کر سکتے۔ آپ کو صرف کتابیں ہی ایشو کی جاسکتی ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ آپ سمجھے نہیں، میں آپ کو ہنسانا چاہ رہا تھا۔" مزید سختی سے آنکھیں مسلتے ہوئے۔

"ویل۔۔۔ تمہارے جیسے دو، تین پہلے ہی مجھے بہت ہنسا گئے ہیں۔ مجھ میں مزید سکت نہیں رہی ہنسنے کی۔۔۔ اب یہ کام تم اپنے پروفیسرز اور یونی ڈین کے ساتھ جا کر کرو۔"

"آپ برا مان گئے، میرا مقصد تو محض تفریح تھا۔"

"میں اس طرف دائیں رخ کھڑا ہوں اور میرے کافی مگ پر سے بھی ہاتھ اٹھالو۔۔۔ یہ بھی ایشو نہیں ہوگا۔"

اب جیکب لائبریری آیا ہے۔

"مجھے میری مطلوبہ کتابیں نہیں مل رہیں۔"

"ملیں گی بھی کیسے۔۔۔ ہم کینٹین میں کتابیں نہیں رکھتے۔۔۔ ڈین کا آرڈر نہیں ہے نا۔"

زونی کینٹین گئی ہے۔

"ایک ونیلا کوک۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے مجھے کریم کافی لے لینی چاہیے۔ ایک کریم کافی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ کتابوں کی الماریوں میں ڈھونڈ لو۔۔۔ دو ونیلا کوک اور ایک کریم کافی میرے لیے بھی۔"

جانسن اپنے دوست کی کمر میں زوردار گھونسا مار کر کہتا ہے۔

"تم نے مجھ سے بیس پونڈ لیے تھے، میرے مرنے کے بعد واپس کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ ایگزامز میں تمہارے پیپرز چیک کرنے کے بعد۔۔۔" پروفیسر ولیم کی آواز گونجتی ہے۔۔۔ کوریڈور جو پروفیسر کو گھونسا پڑنے پر ساکت سا ہو گیا تھا۔ فلک شگاف قہقہوں سے گونج اٹھتا ہے۔۔۔ اوہ بے چارے جانسن کا اب کیا ہو گا۔۔۔ خدا پوچھے اس نیند سے۔

تو ہمارا جم ان دوسری قسم والوں میں سے تھا۔۔۔ بے چارا۔۔۔ پروفیسر کا ماننا تھا کہ وہ رات بھر آوارہ گردی کرتا ہے اور پھر ان ہی کی کلاس میں ایسے اونگھتا ہے جیسے ان کا لیکچر اس قابل ہی نہیں کہ اسے سنا جائے۔ یہ تو سراسر بے عزتی ہوئی نا۔ جبکہ جم جاب کرتا تھا اور رات گئے تک پڑھتا، آوارہ گردی کا تو اس کے پاس

وقت ہی نہیں تھا۔ ایسے میں بے چارہ کبھی کبھار کلاس میں اونگھنے لگتا تھا۔

اسی معاملے کو لے کر دونوں کے درمیان سرد جنگ سی شروع ہو گئی۔ اب وہ مکمل ہوش و حواس میں بھی ہے تو پروفیسر پارکر اسے ایسے دیکھتے ہیں جیسے کہتے ہوں۔

"ہاں... ہاں اونگھ لو جم چوزے... میں لوری ہی تو سنا رہا ہوں... چلو دیر نہ کرو اور اونگھ لو۔"

اس خاموش، سرد، طنزیہ جنگ سے تنگ آ کر ایک دن جم باقاعدہ خراٹے لے کر اونگھنے لگا۔ اسے جھنجھوڑنے کے بعد پروفیسر پارکر نے اسے جن نظروں سے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ گریجویشن کرنے کے اپنے خواب کو آگ لگائے اور گھر چلا جائے۔ لیکن پھر اس نے ہمت کی اور اپنے اور پروفیسر کے درمیان کی سرد جنگ کو ختم کرنا چاہا، لیکن کوئی فائدہ نہیں... پھر اس نے ایک عملی صورت اختیار کی کہ پروفیسر کو سمجھا سکے کہ ایسی طنزیہ اور سرد جنگ ایک اسٹوڈنٹ کے ساتھ رواں رکھنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

اس نے پورے پانچ دن پروفیسر کو دیکھنے میں گزارے۔

پروفیسر پارکر کوریڈور سے گزر رہے ہیں۔ اپنی کلاس لینے جا رہے ہیں، جم ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھے ان کے ساتھ ساتھ چلتے انہیں اس افریقی قبائلی کی طرح دیکھ رہا ہے جو یورپ کی گوری میموں کو دیکھ کر منہ بند کرنا اور آنکھیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔

جم مکمل سنجیدہ ہے... جم خاموش گھور رہا ہے۔

"What" پروفیسر پارکر چلا کر پوچھ رہے ہیں۔

نو جواب... بس گھورنا... مسلسل گھورنا۔

پروفیسر کلاس سے باہر آ رہے ہیں، جم ساتھ ساتھ... گھورنا جاری... گردن کا زاویہ ایک سا... جیسے شکنجے میں کس دیا گیا ہو، عین پروفیسر کے منہ کی سمت، نہ کم ادھر نہ زیادہ ادھر۔

پروفیسر اپنے آفس میں بند، آفس کے باہر جم کھڑا ہے۔ پروفیسر اگلی کلاس کے لیے آفس سے باہر... جم ساتھ... خاموشی سے... استقامت سے...

پروفیسر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی بھگا لے گئے ہیں۔ اگلے دن پارکنگ میں جم پھر سے موجود ہے۔ گردن کا ٹھیک وہی زاویہ، نہ کم نہ زیادہ... بالکل زومبی کی طرح۔

پروفیسر پارکر نے انتظامیہ سے رابطہ کیا... انتظامیہ نے جم سے...

"وہ میرے پروفیسر ہیں، مجھے ان سے پیار ہے، میں انہیں دیکھ سکتا ہوں، یہ کوئی قابل اعتراض بات یا جرم نہیں ہے۔"

"واقعی یہ کوئی جرم نہیں تھا۔" انتظامیہ ٹھنڈا سانس ٹھہر کر رہ گئی۔ پروفیسر نے دو دن کی چھٹی لی... تیسرے دن آئے... جم پھر سے پارکنگ سے ان کے ساتھ۔

"کیا چاہتے ہو مجھ سے تم؟" پروفیسر پارکر کے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔

جم خاموش... گھورنا جاری... ان کے ساتھ ساتھ... سائے کی طرح... اللہ ایسی کڑی آزمائش سے بچائے... دنوں میں پروفیسر پارکر اور جم یونی میں مشہور ہو گئے۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس سے اسٹوڈنٹس آ رہے ہیں، یہ تماشا دیکھتے، تصویریں لے رہے ہیں۔ ویڈیو بنا رہے ہیں۔ گروپ کی صورت اسے زیر بحث لا کر قہقہے لگا رہے ہیں۔ لیکن جم خاموش ہے۔ سنجیدہ ہے اور اپنے کام سے لگا ہے۔

تو کوئی ہفتے بعد جم نے پروفیسر پارکر کی جان چھوڑی... ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس کے بعد پروفیسر نے کلاس میں یہ معلوم کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی ہو گی کہ "آخر یہ خراٹوں کی آواز آ کہاں سے رہی ہے۔"

نیا نیا جم اور پروفیسر پارکر کا واقعہ ہوا تھا تو ایک لڑکا جم کے پاس آیا اور اسے پانچ پونڈ دیے۔ "جو پروفیسر کے ساتھ کیا ہے وہی مسز بینڈ آف اسٹیون کے ساتھ بھی کر دو۔" جم نے پانچ پونڈ رکھے اور ایک دن کے لیے مسز بینڈ آف اسٹیون کے پیچھے ہو گیا۔ آہستہ آہستہ جم

کی خدمات دوسرے اسٹوڈنٹس نے بھی حاصل کرنی شروع کردیں تو جم نے کچھ اصول وضع کرلیے۔۔۔ اب جب کام کرنا ہی تھا تو ذرا طریقے سے کرلینا چاہیے تھا نا۔

ایک دن کے یونی کے صرف پانچ پونڈ۔۔۔ بس' ٹیوب سے شکار کے پیچھے پیچھے رہائش گاہ تک دس پونڈز۔۔۔ درمیان میں دو گھنٹے کا بریک۔۔۔ رات اور چوبیس گھنٹے کے بیس پونڈ۔۔۔ یعنی شکار کے پیچھے پیچھے جم بازاروں' گلیوں' ریسٹورنٹس' شاپنگ سینٹر تک جائے گا۔۔۔ صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھ کر۔۔۔ زومبی۔۔۔ اسٹائل میں گردن کو ایک ہی زاویے پر اکڑائے جم از گھورنگ۔

زیادہ تر صرف یونی کا ہی پیکیج لیتے۔ بہت کم دوسرا بیس پونڈ کا پیکیج بھی لیتے۔ جم کے فن کے دوسرے رہنما اصول۔

"اسے رشوت نہیں دی جاسکتی' بے شک شکار اسے اپنا کریڈٹ کارڈ پکڑا دے یا پچاس ہزار پونڈ ہاتھ سے دے۔"

شکار کا کوئی قصور ہونا ضروری ہے۔ معصوم لوگوں کو وہ تنگ نہیں کرے گا اور اگر بعد ازاں ثابت ہوگیا کہ شکار معصوم تھا تو اسے پانچ پونڈ دینے والے کے ساتھ وہ یہی سب مفت کرے گا۔ تو جب جم ڈیوٹی دیتا تو یونی میں قہقہے بلند ہوتے۔

"جم از آن ہز ورک (جم اپنے کام پر)۔"

مشن از بیلا۔۔۔ ڈیپارٹمنٹ بیالوجی۔۔۔ عمر بیس سال۔۔۔ انتہائی تیز طرار بد تمیز نمک مرچ لڑکی' قصور۔۔۔ اپنی کلاس فیلو روزلین کے لمبے قد پر پھبتیاں کسنا اور اسے مسز ایفل کے نام سے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور کردینا۔

ہاتھ میں پانچ پونڈ لے کر امرحہ جم کے پاس آئی۔

کارل' بزنس ڈیپارٹمنٹ' بدتمیز' انتہائی بدتمیز' میرے ہاتھ سے کتابیں چھین کرلے گیا' پھر انہیں ضائع کردیا۔ مجھے بھاری جرمانہ بھرنا پڑا۔ پھر میرا جوتا کاٹ دیا۔ پورے ڈیڑھ سو پونڈ کا تھا میرا جوتا۔"

ڈیڑھ سو پونڈ کے لفظ پر جم نے اسے بڑے غور سے دیکھا کہ "میں! اتنے پیسے خرچ کرلیتی ہو۔۔۔ ہارٹ فیل نہیں ہوتا تمہارا؟"

امرحہ نے جوتے کی قیمت حسب زنانہ عادت بڑھا چڑھا کر بتائی تھی۔ ورنہ وہ دور' دور تک اتنے کا نہیں تھا۔ اتنے کا ہوتا تو امرحہ کی پہنچ سے دور ہی رہتا نا۔

جم نے سر ہلا دیا' یعنی ہاں۔۔۔" ویسے امرحہ کا دل بیس پونڈ پیکیج لینے کو چاہ رہا تھا۔ پر کارل پر وہ اتنے پیسے لگانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی دو کلاسز لینے کے بعد امرحہ کا دل کارل کا حال دیکھنے کے لیے چاہا۔ وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اسے آرٹ اسکول کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ کارل کا آرٹ اسکول میں کیا کام' یعنی جم بھی وہیں ہوگا۔ جب وہ آرٹ اسکول داخل ہوئی تو کوریڈور میں اسے تین لوگ نظر آئے۔ کارل۔۔۔ جم۔۔۔ آنا۔۔۔ آنا جم کی منگیتر ہے۔

اف وہ کارل تھا۔ امرحہ اسے ہرا نہیں سکتی تھی۔ منظر کچھ یوں تھا کہ جم اپنے انداز میں گردن کو کارل کی طرف فکس کیے گردوپیش سے بے گانہ ہوئے' گھور رہا تھا اور ٹھیک جم کے ہی انداز سے کارل جم کی بھولی بھالی' سرخ گالوں والی پیاری سی منگیتر آنا کو گھور رہا تھا۔

اب جہاں جہاں آنا' وہاں وہاں کارل اور ساتھ جم۔

آتے جاتے سب اس ڈرامے کو دیکھ رہے تھے' بلکہ جاتا تو کوئی نہیں رہا تھا۔ پلٹ پلٹ کر واپس آرہے تھے۔ دیکھنے کہ اس براہ راست شو کا کیا اینڈ ہوتا ہے۔

آنا خون خوار نظروں سے جم کو گھور رہی تھی' ساتھ اسے کھری کھری سنا رہی تھی۔ اسے دھمکی دے رہی تھی۔

"میں نے کہا جم بند کرو' اپنی یہ فضول حرکت ابھی۔"

"جم۔۔۔ ابھی کوئی رد عمل نہیں۔"

"جم۔۔۔ اگر تم نے ابھی کے ابھی یہ سب فضولیات نہیں چھوڑیں تو میں بہت برا کر گزروں گی تمہارے ساتھ۔۔۔ جم۔۔۔" آنا چلائی۔

جم ہتوز اپنے کام میں مصروف۔

غصے اور شرمندگی سے آنا کے گال اور کان اور سرخ ہو گئے۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی' سب انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ جم کارل کے پیچھے پڑا تھا تو بدلے کے طور پر کارل جم کی منگیتر کے پیچھے۔

آنا نے غصے سے ابلتے ہوئے جم کے ہاتھ پر زوردار چٹکی بھری' یہ مجال ہے، جو جم نے سی بھی کی ہو۔

"یعنی تم میری بات نہیں مانو گے۔" اب آنا بے چاری کی آواز بھیگ گئی۔ امرحہ کی قسمت ہی خراب۔ کیا ضرورت تھی جم کو یونی میں اپنی منگیتر رکھنے کی۔ اس طرح بزنس تو نہیں ہوتے نا۔ اس کے پانچ پونڈ ضائع گئے۔ کارل کو کیا کوفت ہوئی' الٹا جم کوفت کا شکار ہو رہا ہو گا اندر ہی اندر... اب پانچ پونڈ کے لیے وہ اپنی سویٹ ہارٹ کو ناراض تو نہیں کرے گا یقیناً"

اور پھر کوریڈور میں موجود اسٹوڈنٹس نے دیکھا کہ پندرہ' بیس منٹ تک مزید جم کو بے نقط سنانے اور نم آنکھیں رگڑنے کے بعد بھی جم کے انہماک میں فرق نہ آیا اور وہ مکمل توجہ اور ایمان داری سے ڈیوٹی ہی کرتا رہا تو آرٹ اسکول کی سب سے خوب صورت لڑکی آنا نے انگلی سے انگوٹھی اتار کر جم کی جیب میں ڈھونس دی۔

"پاپا ٹھیک کہتے تھے' تم انسان کے نام پر ایک بن مانس ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

سوں سوں کرتی آنا چلی گئی۔ سب تو یہ توقع کر رہے تھے کہ آنا جم کو ایک تھپڑ سے نوازے گی' لیکن وہ تو اسے بن مانس ثابت کر کے چھوڑ ہی گئی تھی۔

امرحہ دور سے بھی دیکھ سکتی تھی کہ کارل زیر لب ہنسا ہے۔ امرحہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی آئی۔ کیونکہ جم آخر کار سوں سوں کرتی آنا کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اگر دادی یہ منظر دیکھ لیتیں تو جم اور آنا کے پاس جاتیں اور کہتیں۔

"بیٹا جم! مل گیا سبق... اب اس امرحہ سے دور رہنا۔ کہو تو میں تمہیں اس کی ہسٹری شیٹ سنا دوں۔ لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے ساتھ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا اور کافی برا ہو چکا۔"

کارل پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا مانچسٹر یونی کو انگلی پر فٹ بال کی طرح گول گول گھما کر اپنی فتح کا واضح اعلان کرے اور کہے کون ہے، جو مجھے زچ کر سکے۔



مانچسٹر یونی اسٹوڈنٹ سوسائٹی اور چند دوسرے ملکوں کے اسٹوڈنٹس کی سوسائٹیوں نے مقامی برطانوی خاندانوں سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ ان ملاقاتوں کا مقصد ایک دوسرے کے معاشرے' رسم و رواج' تاریخ' عادات و اطوار' رجحانات وغیرہ کے بارے میں جاننا تھا۔ ایسی ملاقاتیں قربت کا باعث بنتی ہیں۔ دوریاں کم ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

امرحہ نے اپنا نام دائم کو پہلے سے ہی دے دیا تھا اور امرحہ کو اوکے کر دیا گیا تھا۔ مختلف ملکوں کے اسٹوڈنٹس کا بیس رکنی گروپ مسٹر اینڈ مسز پاول کے گھر پہنچ گیا جہاں پاول خاندان کے ساتھ دو اور خاندان موجود تھے۔ مسٹر اینڈ مسز ایڈم اور مسٹر اینڈ مسز گڈل او ران تین خاندانوں کے چار عدد شرارتی اور ایک سیکنڈ میں ساٹھ سوال پوچھنے جیسے بچے۔

ملاقات کے لیے لان میں نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ دھند سے اٹے لان میں کوئلے کی دو بڑی بڑی انگیٹھیاں رکھی گئی تھیں۔ اس کے چار اطراف نشستیں لگائی گئی تھیں۔ پھولوں کے گلدستے جا بجا رکھے گئے تھے۔ بھالو سے سفید کتے بھی ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ گھر کی عمارت دھند میں لک چھپ جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی جزیرے پر آ چکے ہوں۔ انہیں اتنے اچھے خیر مقدم کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ امرحہ کے پاس صوفے پر ایک نو سالہ بچی اسکرٹ میں ملبوس بیٹھی تھی اور امرحہ حلف اٹھانے کو تیار تھی کہ بچی بہت ہی معصوم نظر آ رہی تھی۔

"تم کس نسل سے ہو؟" یہ اس کا پہلا سوال تھا' وہ

اتنی معصوم تھی۔

امرحہ نے تم کس شہر سے ہو۔ کس مذہب' کس ذات کی ہو' جیسے سوالات تو سنے تھے' یہ نسل والا سوال اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"میں پاکستان سے ہوں..... پاکستانی مسلمان ہوں۔" امرحہ نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اور تو ان کی گفتگو نہیں سن رہا۔ وہ کیا گھوڑا تھی جو اپنی نسل کا اتا پتا رکھتی۔

"وہ تو ٹھیک ہے' میں نے تعارف میں سن لیا تھا۔ میں نسل کا پوچھ رہی ہوں۔"

"تم کس نسل سے ہو؟" امرحہ خاک نہ سمجھی۔ الٹا اس سے ہی پوچھ لیا۔

اس کا منہ بن گیا۔ "میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں' میں نے ابھی اپنا ڈی این اے نہیں کروایا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ میں ریڈ انڈین نسل سے ہوں۔"

"اوہ مجھے یاد آگیا۔ میں بھی ریڈ انڈین..... نسل سے ہوں۔"

"تم نے اپنا ڈی این اے کب کروایا تھا۔ کس عمر میں؟" بچی جو ہیری پورٹر کی خالہ تھی نے شک سے اسے گھورا۔

"دو سال پہلے۔"

"تم ریڈ انڈین نہیں ہو سکتیں۔" بچی نے باقاعدہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی ایکس ریز پتلیاں گاڑ کر یقین سے کہا۔

"کیوں نہیں؟"

"تم اپنی بھنوؤں کی بناوٹ دیکھو..... تم سکندر کی نسل سے ہو سکتی ہو' لیکن ریڈ انڈینز سے ہرگز نہیں' میرا مشاہدہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

امرحہ گھوم کر رہ گئی۔ "بھنوؤں سے کیا ہوتا ہے۔ میری رپورٹ یہی کہتی ہے کہ میں ریڈ انڈین نسل سے ہی ہوں۔"

بچی نے اپنی پتلیوں کے ایکس ریز تیز کر دیے۔ "تم ہو ہی نہیں سکتیں۔ میں نے بہت ریسرچ کر رکھی ہے۔ ایشیا میں ریڈ انڈینز کے جینز نہیں ملتے۔"

ماشاء اللہ جس بارے میں امرحہ پہلی بار سن رہی تھی' نو سالہ بچی اس پر تحقیق بھی کر چکی تھی۔

"بس میں تو ریڈ انڈین ہی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری ریسرچ کیا کہتی ہے اور تم بھول رہی ہو تمہارے بڑے سو سال تک ہندوستان رہے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔"

"میرے بڑے رہے ہیں' لیکن ریڈ انڈینز نہیں۔ تم مجھے اپنی رپورٹ دکھا سکتی ہو۔"

"وہ پاکستان میں ہے۔" امرحہ کو یقین تھا کہ بچی کو ٹالنا ناممکن سا تھا۔

"تم اپنے خاندان سے کہو' تمہیں میل کر دیں۔ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"میں اپنے سب کام خود کرتی ہوں۔ اتنے معمولی سے کام کے لیے بھی میں اپنے خاندان والوں کو زحمت دینا نہیں چاہتی۔" امرحہ تو ایک جھوٹ بول کر پھنس گئی۔ بھلا کہہ دیتی مجھے نہیں معلوم میں کس نسل سے ہوں۔

بچی شک سے اسے دیکھتی رہی اور اگلا سوال اس کے منہ سے نکلتے دیکھ کر امرحہ نے انگلی سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کورین لڑکے کی طرف اشارہ کیا' جو کسی ایک مسز کی فرمائش پر اپنا دیسی گانا سنانے جا رہا تھا۔ ایڈم خاندان کے گیارہ سالہ جیری نے گٹار بجایا۔ ساتھ وہ سب چائے کے ساتھ فش اینڈ چپس کاٹج پائی کھاتے رہے۔ برطانوی لوگوں کو پائی کی نت نئی قسمیں بہت مرعوب ہوتی ہیں' چائے تو ویسے ہی ان کا مشروب ہے۔

کورین کا گانا ختم ہوا تو انہیں ایسٹر پر نت نئے انداز سے پینٹ کیے جانے والے انڈوں کے بارے میں بتایا گیا اور ٹوکری بھر کر انڈے ان کے آگے پیش کیے گئے۔ انہیں کچھ خاندانی البمز دکھائے گئے۔ ساتھ انہیں موقع دیا گیا کہ ان کے خاندان' رہن سہن اور دیگر باتوں کے بارے میں وہ سب سوال جواب کریں۔ اس دوران ڈی این اے بچی مسلسل امرحہ کا جائزہ لیتی

رہی کہ وہ کیسے ہنس رہی ہے' کیسے کھارہی اور کس قسم کے سوالات پوچھ رہی ہے۔ اس نے چپکے سے امرحہ کی ایک تصویر بھی لے لی۔

یقیناً" امرحہ کی یہ تصویر اس کی ذاتی ریسرچ گاہ۔ اس کے اساتذہ اور اس جیسے ہی دوسرے بچوں کے سامنے ہوگی کہ معلوم کیا جائے کہ یہ لڑکی ریڈ انڈین امریکن ہے۔ آسٹریلین یا ریڈ انڈینز افریقین.... ہے بھی کہ نہیں۔

بنگالی مالا سے لوک کہانی سننے کی فرمائش کی گئی اور اس نے سنادی۔ امرحہ کو اپنی فکر لگ گئی۔ یہ برطانوی لوگوں کو آخر کہانیوں کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بچے بھی اتنے شوق سے نہیں ہنستے جتنے شوق سے ان کے بڑے بوڑھے سنتے ہیں۔ لوک کہانی تو امرحہ کو بالکل ہی نہیں آتی۔ کبھی اس کے گھر میں ایسی باتوں کا تردد ہی نہیں کیا گیا تھا۔ وہاں تو سب ادھر والوں کی باتیں' ادھر والوں کی باتیں' فلاں کی شادی' فلاں کا رشتہ' فلاں کپڑے جوتے' یہ وہ.... سب بے کار کی باتیں ہوتی تھیں۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ پنجاب کی لوک کہانیاں ہیں' کون کون سی۔

تھوڑی سی دیر کو ایک طرف کو ہو کر اس نے دادا کو فون کیا۔

"تم ہیر رانجھا سنادینا۔" دادا نے مشورہ دیا۔

یہ تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے فلم دیکھی تھی' اسے کہانی یاد بھی' لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ انہیں لوک کہانی سے زیادہ صوفی ازم میں دلچسپی تھی اور وہ امرحہ سے مختلف صوفی بزرگوں کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے دیسی کھانوں کے بارے میں معلومات لیں۔

"سنا ہے.... ہندوستان میں زبردستی شادیاں کروادی جاتی ہیں۔" مسز ایڈم نے پوچھا۔

"میں ہندوستانی نہیں' پاکستانی ہوں۔" امرحہ بڑی جز بز ہوئی۔

مسز ایڈم ہنسنے لگی "تم سب پاکستانی انڈین ہندوستانی کہلائے جانے پر اتنا چڑتے کیوں ہو۔ ہندوستانی سے مراد ہماری برصغیر ہوتا ہے۔ تم لوگ ہمیں یورپین کہتے ہو۔ ہم نہیں چڑتے' جبکہ برطانیہ اور امریکہ میں بھی کبھی ایسا ہی ماحول تھا جیسا انڈیا اور پاکستان میں ہے۔ ہندوستان سے مراد ایک خطہ ہے جو بلاشبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جسے یورپ میں "جادو نگری" کہا جاتا ہے۔ میرے رشتے کے چچا جب اپنے کاروبار میں دیوالیہ ہوگئے تو انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا۔ پہلے وہ بنارس گئے اور پھر سندھ.... واپسی پر ان کا کہنا تھا کہ ان شہروں کے سفر نے انہیں پاگل ہونے سے بچالیا۔ بنارس میں وہ سادھوؤں کے ساتھ وقت گزارتے رہے اور سندھ میں پیروں' فقیروں کے ساتھ۔"

امرحہ خاموش ہوگئی اور مسز ایڈم کے پوچھے گئے سوال کے بارے میں سوچنے لگی۔ امرحہ کو ڈر تھا کہ اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا اور وہ پوچھ لیا گیا۔

"ایسا نہیں ہے۔ جہاں تعلیم اور سوچ کی کمی ہے۔ وہاں یہ سب ہوتا ہے' اسلام نے تو سختی سے لڑکا لڑکی کی مرضی پوچھنے کا حکم دیا ہے۔ معاملہ کوئی بھی ہو اسلام جبر کا مخالف ہے۔ جبر کی کوئی گنجائش نہیں اسلام میں۔"

"اور یہ جو غیرت کے نام پر قتل کیے جاتے ہیں۔ لندن میں ایک پاکستانی لڑکی کو اس کے باپ اور بھائی نے مار کر تہ خانے میں دبادیا تھا۔" مسز ایڈم بولیں۔

امرحہ کے ہونٹ خشک ہوگئے۔

"جس نے ایک انسان کا قتل کیا' وہ کل انسانیت کا قاتل ہے۔ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے۔ زور زبردستی کی کوئی گنجائش نہیں' تو قتل کی کیسے ہوگی' وجہ کچھ بھی ہو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اسلام کے دائرے سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے ذہنی جنون ہیں' ہمارا مذہب' ہمارا قانون' ہمارا معاشرہ نہ اس کی اجازت دیتا ہے' نہ ہی تعلیم' یہ اپنے گناہوں کے خود ذمہ دار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ خود کو مسلمان کہلواتے ہیں' ایک اچھا مسلمان ہر حال میں وہی کرتا ہے جو چودہ سو سال پہلے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ نہ کم نہ زیادہ' ٹھیک ٹھیک وہی۔ ہم سب بھی ایسے لوگوں کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں' جتنا آپ لوگ کرتے

ہیں۔"

سب اس کی باتوں کو بغور سنجیدگی سے سنتے رہے اور سرہلاتے رہے۔

باری باری پھر سب کے خاندانوں کے بارے میں پوچھا گیا۔

"یعنی تمہارے وہاں ابھی بھی خاندان بڑے ہی ہوتے ہیں۔ گڈ۔۔۔ کیا گھر بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں رہنے کے لیے؟" امرحہ نے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا تو اس سے پوچھا گیا۔

امرحہ گڑبڑا گئی' یعنی کچھ کنبے جتنے زیادہ بڑے تھے۔ گھر اتنے ہی چھوٹے تھے۔ ان کے اس سوال کا مقصد طنز نہیں تھا۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا لوگوں کے پاس اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ بڑے کنبے بنا کر انہیں پال بھی لیتے ہیں۔ امرحہ کہاں سے چھوڑتی اور کہاں سے بتاتی' ان کے گھر صفائی کرنے والی آپا کے گیارہ بچے تھے اور وہ ایک کمرے کے کرائے کے گھر میں رہتی تھیں۔

دادا کے ایک دوست کے سات شادی شدہ بیٹے پانچ کمروں کے ایک گھر میں رہتے تھے۔

"سب مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔" سو باتوں کی ایک بات امرحہ نے کردی۔

"اگر کسی خاندان میں چار پانچ' بیٹے ہوں تو۔۔۔ کیا وہ ایک ہی گھر میں ہمیشہ رہیں گے۔"

"گھر کی سربراہ ماں پانچوں بیٹوں کو ایک ہی گھر میں اپنے پاس رکھنا چاہیں گی۔"

"ایک ہی گھر میں۔۔۔ پانچوں کو ان کی بیویوں اور بچوں کو؟"

"جی سب کو۔۔۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کسی وجہ سے کہیں الگ رہائش اختیار کرنا چاہے گا تو والدہ رو' رو کر اپنا برا حال کرلیں گی۔"

"کیوں' وہ روئیں گی کیوں؟" تینوں خواتین نے مشترکہ AWW (آو) کیا۔

"وہ کسی ایک کو بھی خود سے جدا نہیں کرنا چاہیں گی۔"

"بچے بڑے ہوجائیں' خاص کر ان کی شادی ہوجائے تو انہیں الگ زندگی شروع کرنی ہی ہوتی ہے۔ ہر ایک کو پرائیوسی چاہیے ہوتی ہے۔ یو نو پرسنل اسپیس۔"

"کیا بات کررہی تھیں مسز گڈل۔۔۔" امرحہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ "پاکستانی مائیں کیا جانیں' پرسنل اسپیس یا پرائیوسی۔۔۔ انہیں تو اپنے لال اپنی آنکھوں کے آگے چاہئیں۔"

"بس وہ انہیں اتنا پیار کرتی ہیں کہ ان کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتیں۔"

"اور بیٹے۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں؟" مشترکہ آو کے بعد پوچھا گیا۔

"بیٹے بھی وہی چاہتے ہیں' جو ماں جی چاہتی ہیں۔"

AWW (آو) تینوں خواتین اپنی نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ پاکستانی مشترکہ خاندانی نظام سے متاثر نظر آرہی تھیں۔ امرحہ انہیں دادا' دادی' نانا' نانی وغیرہ کے کرداروں کے بارے میں مزید بتانے لگی کہ کیسے وہ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں اور خاندان کو جوڑے رکھنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"اسی لیے مشرقی لوگ' جو مغرب کا سفر کرتے ہی تو اپنے گھروں کو یاد کرکے روتے ہیں۔" مسز ایڈم ٹشو سے آنکھیں رگڑنے لگیں۔

امرحہ ترچھی نظروں سے تینوں خواتین کو دیکھتی رہی۔ اس نے یہاں اپنی بہترین پرفارمنس دی تھی۔ ڈی این اے بچی خاموشی سے امرحہ کے پاس بیٹھی اسے ہمہ تن گوش سن رہی تھی۔ امرحہ کو صرف ایک اس بچی سے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے غلط ثابت نہ کردے۔

"تم اپنے گھر کو یاد کرکے روتی ہو؟" ڈی این اے بچی نے پوچھا۔

اب امرحہ اسے کیا بتاتی کہ اسے تو اس خیال سے ہی رونا آجاتا تھا کہ اسے کبھی تو واپس گھر جانا ہی ہے۔

"نہیں۔۔۔ ابھی مجھ پر یہ نوبت نہیں آئی۔"

"پاکستانیوں کی کوئی ایک بڑی خوبی بتاؤ؟"
"وہ بدترین حالات میں بھی زندہ رہنا جانتے ہیں۔"
امرحہ نے جھٹ کہا۔
"مانچسٹر والوں کی کوئی ایک بڑی خوبی بتاؤ؟" امرحہ نے پوچھا۔
"ہم بدترین حالات کو بدلنا جانتے ہیں۔" اس نے مضبوط قوت ارادی کے تاثر کے ساتھ کہا۔
امرحہ دنگ سے دیکھتی رہ گئی۔
ان سب کے ساتھ گروپ فوٹولی گئیں۔ مسٹر ایڈم نے ان کے لیے ایک چھوٹی سی تقریر کی، جس کے آخری جملے کو امرحہ نے ڈی این اے بچی کی طرح نوٹ بک میں نوٹ کرلیا۔

Thereare never any winners or any looser participation is Remember that and enjoy the
challenge of each moments

as it arises now

امرحہ اپنے ساتھ اپنی غیر استعمال شدہ ایک گرم شال اور ایک کشمیری طرز کا شولڈر بیگ لے گئی تھی اور ایک چوڑیوں کا سیٹ تھا اس کے پاس۔ یہ تینوں چیزیں اس نے تینوں خواتین کو پیش کیں اور ان تینوں کے چہرے ایسے دمکنے لگے جیسے انہیں بیش قیمت جواہر پیش کردیے گئے ہوں۔ جاتے ہوئے ان سب کو ہوم بیک پائی دی گئی۔ ڈی این اے بچی نے اسے اپنا ای میل ایڈریس دیا کہ امرحہ ہر صورت اسے اپنی رپورٹ بھیج دے۔
امرحہ اسے ضرور بھیج دے گی، اگر وہ اپنا ڈی این اے کروانے میں کامیاب ہوگئی اور خوش قسمتی سے وہ ریڈ انڈین بھی نکل آئی تو۔

☆ ☆ ☆

مانچسٹر پکاڈلی گارڈن میں 230 فٹ اونچا اسٹار فلائر (Star-Flyer) جھولا تھا۔
"امرحہ... دیکھو گی کہ دو سو تیس فٹ کی بلندی سے مانچسٹر کیسا لگتا ہے؟" یونی کے باغ میں گم صم بیٹھا دیکھ کر ویرا نے قریب آکر اسے لالچ دی اور زبردستی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پکاڈلی گارڈن لے آئی... کچھ وہ اداس تھی کہ قریب سے گزرتے عالیان سے اس نے ہائے کہا تو وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے وہ اس سے کوئی خیرات مانگ رہی ہو اور وہ اسے خیرات دیتے دیتے تھک گیا ہو... اور کچھ وہ اپنے ذہن کو کہیں اور لگانا چاہتی تھی، تاکہ کم سے کم سوچ سکے کہ وہ مانچسٹر کو 230 فٹ کی بلندی سے دیکھنے کے لیے جھولے میں بیٹھ گئی۔
لیکن دو سو تیس فٹ کی بلندی سے اسے مانچسٹر تو کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا... وہاں سے تو موت نظر آرہی تھی... موت...
ویرا نے اس کی کمر میں گھونسا جڑا۔ "خاموش بیٹھو امرحہ"۔
لیکن امرحہ نے دور... بہت دور دھندلے ہوتے مانچسٹر کو جیسے آخری بار دیکھا اور سارے مانچسٹر کو گواہ بنایا کہ میں مرنے جارہی ہوں... آؤ اور مجھے بچالو... ہائے مجھے بچالو..."
وہ ایسے چلائی... ایسے چلائی اور چلاتی ہی رہی کہ بہت سے وقتی بہرے ہوگئے ہوں گے یونی کے کئی اسٹوڈنٹس اسٹار فلائر میں موجود تھے۔ گول گول گھومتے جھولے میں بیٹھے انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ویرا نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے بھلا۔ وہ مرنے جارہی ہو اور چلائے بھی نا۔ دادا۔ دادی جی۔
وہ تو اس لیے بھی اسٹار فلائر میں بیٹھ گئی تھی کہ روسی کمانڈو ویرا کے آگے اس کی سبکی نہ ہو... پر سبکی بہتر تھی... بہ نسبت موت کے ہے نا "تم اتنا ڈرتی ہو۔"
زمین پر آتے ہی ویرا نے اس کے بازو میں زوردار چٹکی بھری "امرحہ سن سی نہ ہوچکی ہوتی تو اس چٹکی پر چلا

اٹھتی۔

"مجھے نہیں پتا تھا میں اتنا ڈروں گی۔۔۔ ویسے ایسے ڈرتی نہیں آج نجانے کیوں ڈر سی گئی۔۔۔" امرحہ صاف جھوٹ بول رہی تھی۔

"مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ اسٹار فلائر کا آخری رائڈ (Ride) تھا تم مرجاتیں اوپر ہی تو حکومت اسے بین کردیتی۔۔۔"

شکر تھا وہاں کارل نہیں تھا۔۔۔ امرحہ آس پاس شرمندہ شرمندہ سی دیکھ رہی تھی۔ جو لوگ ان کے ساتھ جھولے میں بیٹھے تھے وہ بھی کڑے تیوروں سے دونوں کو گھور کر گزر رہے تھے یعنی ہمارا تو مزا خراب کردیا نا "یو یونی چک" (You Uni Chick)۔۔۔ Huh۔۔۔

امرحہ رات کو سوئی تو پھر سے دو سو تیس فٹ کی بلندی پر تھی۔۔۔ آنکھ کھلی تو سادھنا اور این اون اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔۔۔ ویرا نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی آنے کی۔۔۔

"کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے؟" سادھنا اسے پانی پلانے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ شکریہ آپ دونوں جائیں۔"

این اون اس کی ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

"جب تم ٹھیک ہوتی ہو تو ایسے چلاتی ہو؟" این اون نے اپنے دل پر رکھ کر کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

"کوئی پریشان ہے تمہیں امرحہ؟" سادھنا اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"نہیں۔"

"تم پہلے جیسی نہیں رہیں۔"

"پہلے جیسی کیسی۔۔۔؟"

"تم مرجھا سی گئی ہو۔۔۔ ایسے لگتا ہے تمہارے اندر کچھ سوکھتا جارہا ہے۔"

"تھک جاتی ہوں میں۔"

"کاش یہ تھکن ہی ہو۔۔۔ اور تم بالکل ٹھیک ہو۔۔۔" سادھنا اس کے بال چھو کر چلی گئی۔

"کاش یہ خواب ہی ہو۔۔۔ اور کھڑکی کے پیچھے عالیان کھڑا ہو۔" کروٹ بدل کر اس نے سونے کی کوشش کی۔۔۔

اگلے دن شروع کے دو لیکچرز چھوڑ کر اسے ایک پاکستانی گھر جانا پڑا۔۔۔ سادھنا کی کمر میں بہت درد تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی دینے نہیں جاسکتی تھی، لیکن خاتون بضد تھیں کہ ان کے گھر شام کو پارٹی ہے اس لیے سادھنا ہر صورت اپنا کام کرکے جائے۔۔۔ سادھنا کو کمر پر ہاتھ رکھے کراہتے ہوئے دیکھا تو امرحہ نے اس کی جگہ جاکر کام کی پیش کش کی، جو سادھنا نے بہت مشکل سے مانی۔۔۔ خاتون نے اس سے سارے گھر کا اتنا کام لیا کہ وہ واپس یونیورسٹی جانے کے قابل ہی نہیں رہی۔

یونیورسٹی۔۔۔ جاب۔۔۔ پڑھائی۔۔۔ اسے یہ سب پہلے مشکل لگتا تھا۔ لیکن اب وہ اس کی عادی ہوچکی تھی۔۔۔ زندگی تھوڑی سی مشکل تھی بدترین نہیں۔۔۔ ہاں جو سکون اس کے پاس ہوا کرتا تھا اب وہ کہیں نہیں رہا تھا۔۔۔

اسی دوران اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس کے ساتھ شیکسپیئر کے اسٹیج ڈرامے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔۔۔ شیکسپیئر کے لکھے ڈرامے اچھے تھے، باکمال ہوتے تھے، لیکن اسٹیج پر آکر تو انہوں نے حد ہی کردی تھی۔۔۔ اتنے زبردست کہ آنکھ جھپکے بنا دیکھتے جاؤ۔

دوسرے سمسٹر میں کورس کی نوعیت بدل گئی تھی اور وہ مشکل لگنے لگا تھا۔۔۔ یونیورسٹی میں مشہور ہے کہ جب تک پہلے سمسٹر کی کتابوں کے ساتھ جان پہچان اور دوستی ہونے لگتی ہے سمسٹر ختم ہوجاتا ہے اور دوستی جو ہوتے ہوتے رہ چکی ہوتی ہے وہ ایگزامز میں دشمنی نبھا کر جاتی ہے۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس میں بے چارے اسٹوڈنٹس کا تو قصور نہیں وہ تو کتابوں کو بھی ایسے ہی سر پر سوار کرتے ہیں جیسے فیس بک، ٹوئٹر، یوٹیوب کو۔۔۔ انہیں انہیں پڑھنے کی بھی اتنی ہی بے قراری ہوتی ہے جتنی لاگ ان ہونے کی۔۔۔

امرحہ کو ٹرافورڈ شاپنگ سینٹر میں بالی ووڈ ڈھابہ میں اچھے معاوضہ پر جاب آفر ہوئی تھی لیکن اس نے انکار

کردیا۔۔۔ اس کا دل نہیں چاہا اپنا اسٹور چھوڑ کر جانے کے لیے۔۔۔ وہاں سات سیلز مین اور دو منیجر تھے وہ ان سب کی عادی ہو چکی تھی۔ بغیر کسی وجہ کے ان سے وابستگی محسوس کرتی تھی۔

امرحہ تبدیلی کو پسند بھی کرتی تھی اور تبدیلی سے خائف بھی رہتی تھی۔۔۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک چیز کے لیے پوری شدت سے تبدیلی کی خواہش کی تھی۔ اپنے ماحول کے بدل جانے کی۔۔۔ پاکستان میں اس کے لیے بنا دیے گئے ماحول میں اس کا دم گھٹتا تھا۔۔۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔

اور اب یہاں۔۔۔ یہاں اسے ہر چیز کے ساتھ گہری وابستگی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ یونیورسٹی کے ساتھ۔۔۔ اپنی کلاس۔۔۔ کلاس میں موجود اپنی نشست کے ساتھ، کلاس ڈور تک کے ساتھ۔۔۔ یونی کے ایک ایک درخت، گھاس کے ایک ایک قطعے کے ساتھ۔۔۔ یونی میں جا بجا ایستادہ خاموش مشہور شخصیات کے مجسموں تک کے ساتھ بھی۔۔۔ ہر چیز اسے اپنا آپ محسوس کرواتی تھی۔۔۔ اس سے باتیں کرتی تھی۔۔۔ وہ جانتی تھی وہ مانچسٹر میں مہمان ہے اور یہی چیز اسے کرب میں مبتلا کر دیتی تھی۔۔۔ آکسفورڈ روڈ پر واقع چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ کبھی کبھی دادا سے بات کر لیا کرتی تھی ورنہ خاموش بیٹھی آتی جاتی ڈبل ڈیک بسوں کو تکا کرتی تھی اور ہنستے مسکراتے باتیں کرتے اسٹوڈنٹس کو کس قدر حسرت لیے دیکھا کرتی تھی۔۔۔ کبھی وہ بھی ہنسنے والوں میں شامل رہی تھی۔۔۔ بے فکری تھی۔۔۔

چرچ کی سیڑھیوں پر اکیلے بیٹھنے کی نوبت وہ خود پر خود لے آئی تھی۔۔۔ اور اکثر وہ وہاں پائی جاتی۔۔۔ اور سوچا کرتی کہ اگر اسے پاکستان جانا ہے تو ان سب چیزوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا ہے۔۔۔ یہ سب جو اس کا اپنا نہیں تھا لیکن جس نے اسے اپنا بنا لیا تھا۔۔۔

یہ سب اپنا ہے۔۔۔ یہ سب اپنا نہیں رہے گا۔۔۔ یہ یہیں رہ جائے گا۔۔۔ اگر یہ سب یہیں رہ جائے گا تو وہ تو خالی ہاتھ رہ جائے گی نا۔۔۔ تو کیا مانچسٹر اسے سب دے کر سب واپس بھی لے لے گا۔۔۔

دوسرے سمسٹر نے اس پر خوف طاری کر دیا تھا۔ دوسرا سمسٹر بھی ایک دن ختم ہو جائے گا، تیسرا اور چوتھا بھی۔۔۔ بس پھر سب ختم۔۔۔ چلو گھر واپس۔۔۔ اسی ماحول میں جس میں وہ نحس تھی۔۔۔

وہ رات کو مانچسٹر میں سوتی۔۔۔ صبح آنکھ کھلتی تو لاہور ماڈل ٹاؤن اپنے گھر میں ہوتی۔۔۔ دادا کے کمرے کی کھڑکیوں سے روشنی لکیر بناتی عین اس کی آنکھوں پر برس رہی ہوتی۔ تلملا کر وہ آنکھ کھولتی سامنے ہی دادا اور اس کی مشترکہ تصویر دیوار پر جگمگا رہی ہوتی۔۔۔ وہ چیخ مار کر اٹھ جاتی۔

"میں لاہور کب آئی۔۔۔ مانچسٹر کہاں گیا؟"

اس کے دل کے دھڑکنے کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ جاتی، شٹل کاک کے نیم اندھیرے کمرے میں وہ گہری گہری سانسیں لے رہی ہوتی، اٹھ کر کھڑکی تک جاتی، باہر مانچسٹر پر نظر دوڑاتی۔۔۔ اسے پھر بھی لگتا یہ خواب ہی ہے۔۔۔ حقیقت میں تو وہ ماڈل ٹاؤن اپنے گھر کے بیڈ پر سوئی یہ خواب دیکھ رہی ہے۔۔۔

وہ ویرا کو فون کرتی۔۔۔ "ویرا! صبح یونیورسٹی جانا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ صبح تمہیں الیکٹرک چیئر پر بٹھایا جانا ہے۔۔۔ صبح تمہاری موت کا دن ہے۔۔۔" ویرا چلا کر کہتی۔

وہ کئی بار اس بے چاری کو ایسے تنگ کر چکی تھی۔

"تمہیں یہ راتوں کو کیا دورے پڑتے ہیں امرحہ۔۔۔" ویرا صبح پوچھتی۔

اب وہ اسے اپنے دوروں کی کیفیت کیا سمجھاتی کہ اس کی آنکھ جب لاہور میں کھلتی ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔۔۔

وہ سائی کے پاس اگلی صبح آئی۔۔۔

"سائی! میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔"

"اچھا!" وہ مسکرانے لگا "کیا مجھے اب یہ نہیں پوچھ لینا چاہیے کہ کس کے ساتھ؟"

"ہاں پوچھ لو۔۔۔ لڑکی کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن اس

نے چولی پہن رکھی تھی ہاتھوں میں گول گول مہندی لگا رکھی تھی۔"

بسنت بہاری رنگوں نے سائی کے وجود کا احاطہ کیا۔

"سنا ہے خواب الٹے ہوتے ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں اس سے....."

"یہ الٹ نہیں ہوگا..... میرے دادا کہتے ہیں فجر کے وقت دیکھے گئے خواب سچے ہوتے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" بسنت بہاری رنگ پھر سے اس کے وجود کے گرد اڑانیں بھرنے لگے۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے میرے لیے خواب دیکھا۔"

"مجھے حیرت نہیں ہے..... ہم باقاعدہ دوست نہ سہی ہم میں ایک تعلق تو ہے..... تم نے کتنی بار سنا ہے مجھے....."

سائی کی آنکھیں نم ہو گئیں وہ Say it all تھا۔ پوری یونی اس کے پاس آتی تھی..... اور وہ..... اس کے پاس کوئی نہیں ہوگا شاید۔

"میں جذباتی ہو رہا ہوں، مجھے تمہارا خواب اچھا لگا۔"

"کیا تم مجھے اپنی شادی میں بلاؤ گے؟"

"کیا تم میری شادی میں آؤ گی..... ہاں ضرور آنا..... عالیان کے ساتھ ..... اوہ....." اس نے اپنی زبان پکڑی..... وہ واقعی جذباتی ہو رہا تھا اس کی زبان پھسل گئی تھی..... مطلب عالیان بھی اس کے پاس آیا تھا..... شاید آدھی رات کو آیا ہو..... اسے جگا کر بورڈ کو اس کے پاس ٹکا کر..... یا اسے اپنے ساتھ چہل قدمی پر آمادہ کر کے.....

بہار سے پہلے اور بہار کے بعد نجانے وہ کتنی بار آچکا ہوگا سائی کے پاس..... امرحہ سے ملنے کے بعد اور امرحہ کو چھوڑ دینے کے بعد.....

سائی کے سامنے قہقہے لگاتے ہوئے..... سائی کے سامنے آنسو چھپاتے ہوئے..... ایک بار امرحہ نے عالیان سے پوچھا تھا۔

"تم کبھی سائی کے پاس گئے ہو؟"

"ہاں!" وہ شرارت سے مسکرانے لگا..... مسخری ہنسی.....

"تم ایسے کیوں ہنس رہے ہو؟"

"ایسے کیسے؟"

"مسخری سے....."

"مجھے تو پتا بھی نہیں کہ میں مسخری ہنسی ہنس رہا ہوں۔"

"ایک بار میری بہن بھی ایسے ہی ہنسی تھی میں نے اس کے بال پکڑ لیے تھے..... دوبارہ نہیں اس نے مجھے چڑایا تھا....."

"میں تمہیں چڑا تو نہیں رہا۔ البتہ تم میرے بال پکڑ سکتی ہو..... ویسے بال پکڑ کر تم کیا کرتی ہو.....؟"

"میں نے اس کا سر دیوار میں دے مارا تھا....."

غیر ارادی طور پر عالیان اس سے ایک قدم دور ہوا..... اپنا سر بچانے کے لیے..... امرحہ نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"مجھے یقین دلاؤ کہ تم مذاق ہی کر رہی ہو....." وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے ایسا کیا ہے....." امرحہ کو اس کی حیرت اچھی لگی۔

"تم بہت چھوٹی ہو گی تب نا....." حیرت سے اس کی آنکھیں امرحہ پر ٹھہری گئیں۔

"نہیں..... میں فرسٹ ایئر میں تھی تب....."

"اور اس کا کیا بنا؟" بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کو اس نے بائیں آنکھ کے کنارے رکھا۔

"کس کا میری بہن کا؟" امرحہ کو اس کی حیرت اچھی لگی۔

"نہیں اس کے بے چارے سر کا.....؟"

"ٹھیک ہی رہا..... بس اب وہ ذرا سی تیز آواز میں بات کرے تو اس کے سر میں ٹیس اٹھتی ہے....."

امرحہ نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اب بھی تم تیار ہو اپنے بال پکڑوانے کے لیے۔"

"نہیں..... بالکل نہیں....." وہ اپنے سر کو اس سے

اور دور لے گیا۔

"پھر بتاؤ تم نے سائی سے کیا کہا۔۔۔ میرے بارے میں ہی کچھ کہا ہوگا۔۔۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ تمہارے بارے میں ہی کچھ کہا ہوگا۔۔۔"

"تمہارے ہنسنے کے انداز سے۔۔۔ کیا تم نے اسے یہ بتایا ہے کہ میں بھیں بھیں کر کے روتی ہوں اور ایسا کرتے کس قدر بری لگتی ہوں۔۔۔ یا تم نے اسے یہ بتایا ہے کہ میں نے تمہیں تھپڑ مار دیا تھا۔۔۔؟"

عالیان لب دبائے اپنی ہنسی دبانے کی کوششیں کرتا رہا اور جب مذاقاً" صرف اسے ڈرانے کے لیے امرحہ نے ہاتھ اس کے بالوں کی طرف بڑھائے تو وہ قہقہہ لگاتا ہوا بھاگ گیا۔

"میں اب اسے یہ بتانے جا رہا ہوں کہ وہ تم جیسی خوں خوار جنگلی بلی سے بچ کر رہے۔۔۔" جاتے ہوئے وہ کہہ گیا۔

سائی دیکھ رہا تھا کہ امرحہ چپ کی چپ ہی رہ گئی ہے۔۔۔

"امرحہ۔۔۔" سائی نے اسے متوجہ کیا۔

خاموشی سے سائی کو دیکھ کر امرحہ اس کے پاس سے چلی آئی۔۔۔ اور بزنس ڈیپارٹمنٹ آگئی۔

کاش آج تو اسے عالیان نظر آجائے۔۔۔ اور کوریڈور میں دیوار کے ساتھ سر ٹکائے' ایک سیدھی اور ایک ترچھی ٹانگ کھڑی کیے اپنے آئی فون کے ساتھ مصروف وہ اسے نظر آگیا۔۔۔ امرحہ کو خود کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اتنے بڑے مانچسٹر میں اکیلی رہ گئی ہے۔۔۔ جبکہ اسے دیکھ کر اس نے جانا کہ اکیلا ہونا کسے کہتے ہیں۔۔۔

وہ ایسے خاموش کھڑا تھا جیسے اس کی زبان نے کبھی کلام کی زحمت ہی نہیں اٹھائی' نہ وہ یہ خواہش رکھتی ہے۔۔۔ کوئی اتنا خاموش ہو سکتا ہے کہ اس پر یہ گمان گزرے۔۔۔ عالیان پر یہ گمان پختہ ہو رہا تھا۔۔۔ جن بہاروں کو ساتھ لیے وہ چلا پھرا کرتا تھا' ان سب بہاروں کو خفا کیے ان سے خفا ہوئے وہ بے نور سا کھڑا تھا۔۔۔

اسے دیکھ کر مسکرانے پر مائل لوگ مسکراہٹ روک لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔۔۔ امرحہ کو اس کی اس شبیہ نے ساکت و جامد سا کر دیا۔۔۔ کیا یہ عالیان تھا؟

"تم یہاں ایسے کیوں کھڑی ہو؟" ویرا پیچھے سے آئی اس کے ہاتھ میں دو کافی مگ تھے۔

"میں۔۔۔ میں تمہیں ڈھونڈنے آئی تھی۔"

"کیا میں گم ہو چکی ہوں۔۔۔ کب؟"

"مجھے تمہارا فون چاہیے تھا' دادا سے بات کرنی ہے۔۔۔ میرے فون میں کچھ مسئلہ ہے' لاؤ اپنا فون دکھاؤ۔۔۔" وہ ویرا تھی۔۔۔ ویرا۔۔۔ زیرو۔۔۔ زیرو' سیونٹی (0070)

"تم اپنا فون دے رہی ہو یا نہیں۔۔۔" امرحہ نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

"اپنا فون دو' میں ٹھیک کر دیتی ہوں پاگل۔۔۔"

"وہ خراب تھا میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔۔۔" امرحہ کی قسمت خراب کہ اسی وقت اس کے بیگ کی اوپری جیب میں رکھے فون پر کسی کا میسج آیا۔۔۔ کس پاگل نے اسے اس وقت میسج بھیجا تھا۔۔۔ یہ کوئی وقت تھا بھلا۔۔۔ ویرا نے دائیں آنکھ کی کمان اچکائی "یعنی فون تو گھر ہے نا امرحہ۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟"

"اوہ یہ تو میرے پاس ہی ہے۔۔۔" امرحہ کی اداکاری عروج پر تھی۔

"اور بھی دیکھ لو۔ کیا کیا تمہارے پاس ہی ہے جسے تم گمشدہ سمجھے بیٹھی ہو۔"

"یہ کافی کس کے لیے ہے؟"

"میرے اور عالیان کے لیے۔"

نجانے کیوں لیکن اسے لگا کہ گرم کافی ویرا نے اس پر انڈیل دی ہے۔۔۔ وہ ہے کون عالیان کے لیے کافی لے جانے والی۔۔۔ اور عالیان کیوں پیے گا اس کی کافی۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ نہیں پیتا وہ ایسے ویسوں کی کافی ٹوئیٹ۔۔۔ سوچ کا یہ ریلہ ایک دم سے اس کے ذہن میں آیا۔۔۔ وہ تیزی سے جانے لگی اور جاتے جاتے اپنے ایشین فلیگ کے نام سے مشہور ہو چکے دوپٹے کو تیزی سے سنبھالنے کی آسکر ایوارڈ اداکاری کرتے ویرا

کی کافی گرا بیٹھی۔

"اوہ سوری۔۔۔۔" کریمی ایوارڈ اداکاری۔

ویرا کی دائیں آنکھ کی کمان پھر سے اچکی "امرحہ۔۔۔۔"

ویرا نے اتنا ہی کہا تھا کہ امرحہ جلدی سے واپس پلٹ آئی۔۔۔۔ عالیان اس سے ناراض ہے۔۔۔۔ ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔

خیالات کا ہجوم اس کے دماغ میں جھکڑ کی طرح چلنے لگا۔۔۔۔ وہ عالیان کو دیکھنے کیوں گئی تھی۔۔۔ کیوں۔۔۔۔؟ یہ سوال اس کے اندر باز گشت بن گیا۔۔۔۔

سب ٹھیک ہو جائے گا یا بس سب ختم ہو جائے گا۔۔۔۔؟ امرحہ بلاوجہ یونیورسٹی میں چکر لگانے لگی۔۔۔۔ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔۔۔۔ سو جھوٹ سچ بول کر اس نے اپنے آپ کو تسلی دے لی تھی۔۔۔۔ تو وہ تسلی قائم کیوں نہیں رہ رہی تھی۔۔۔ وہ پاگل بنی بلاوجہ یہاں سے وہاں گھوم رہی ہے۔۔۔۔

"یہ کیا تم تتلی بنی چکرا رہی ہو۔۔۔۔؟" کسی نے بھی اس کے پیچھے آکر کہا تھا۔۔۔۔

"میں یونہی گھوم رہی ہوں۔۔۔۔"

"میں تمہیں روز ہی یونہی گھومتے دیکھتا ہوں۔۔۔۔ کتنا گھومنا ہے تم نے۔۔۔۔؟"

"مجھے ایسا کرنا پسند ہے۔۔۔۔ لیکن ٹھہرو۔۔۔۔ تم روز میرا پیچھا کرتے ہو؟"

ایک دم اس کے چہرے کے رنگ بدلے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔۔۔۔

"ایسی باتیں معلوم ہو ہی جاتی ہیں۔۔۔۔"

"تم میری جاسوسی کرتے ہو نا۔۔۔۔؟"

"اسے جاسوسی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔۔۔۔" بیگ میں سے اس نے دو لولی پاپ نکالے ایک خود کھانے لگا ایک اس کے آگے کیا۔

"کیا تم دائم کے لیے کام کر رہے ہو۔۔۔ اسے یہ خوف رہتا ہے کہ یونیورسٹی میں، میں ضرور کچھ الٹا سیدھا کر کے پاکستان کا نام لے ڈوبوں گی۔۔۔ اسے میری سمجھ داری پر شک کیوں ہے آخر۔۔۔۔؟"

لولی پاپ منہ میں دبائے وہ جی جان لگا کر ہنسا "تم باتوں کو کتنے رخ دے ڈالتی ہو امرحہ۔۔۔۔! تم ایسی باتیں کرنا کہاں سے سیکھتی ہو۔۔۔۔ نہ میں تمہاری جاسوسی کر رہا ہوں۔۔۔۔ نہ ہی دائم نے مجھے تمہارے پیچھے لگایا ہے۔۔۔ ویسے پاکستان میں تم کافی مقبول رہی ہو گی۔۔۔۔"

امرحہ سناٹے میں آگئی۔۔۔۔ اسے کیسے معلوم یہ۔۔۔۔ "اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے آخر۔۔۔۔؟" اس کا رنگ فق ہو گیا۔

لولی پاپ منہ سے نکال کر وہ بلند بانگ قہقہے لگانے لگا۔۔۔۔ "تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ میری بات کو پھر سے تم نے اپنی مرضی کا رنگ دے ڈالا ہے۔۔۔۔ تم باتوں کو اپنی مرضی کے رنگ دیتی ہو۔۔۔۔ اور ایسے غصہ کرتی ہو۔۔۔۔ بھڑکتی ہو۔۔۔۔ اور چڑ جاتی ہو۔۔۔۔ کتنا زرخیز دماغ ہے تمہارا امرحہ۔۔۔۔ میں نے آج تک اتنا زرخیز دماغ کسی کا نہیں دیکھا۔۔۔۔ امرحہ نت نئی سوچوں کی عظیم کاشت کار۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔"

"یہ پکڑو اپنا لولی پاپ۔۔۔۔ میں نہیں کھاتی یہ۔۔۔۔ بچی نہیں ہوں میں۔۔۔۔" وہ برا مان گئی اور آگے بڑھ گئی اور وہ لولی پاپ ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے ہو لیا۔۔۔۔ اور تب تک اس کے پیچھے ہی رہا، جب تک اس نے وہ لولی پاپ کھا نہیں لیا۔

خود سے اور سوچوں سے تھک کر امرحہ نے خود کو تھکا ڈالا۔۔۔۔ ایسی تھکن جو کسی آرام اور دوا سے جانے والی نہ تھی۔۔۔۔



"کھیل تماشا" کتاب دس بار سے زیادہ لیڈی مہر کو سنائی جا چکی تھی۔ ماسٹر بالی اور رجنی نے شٹل کاک میں دیر تک راج کیا تھا۔ لیڈی مہر کا دل ہی نہیں بھرتا تھا اس کتاب کو سن سن کر۔۔۔۔ اور امرحہ کو ایسے یاد ہو گئی تھی کہ وہ آرام سے شروع سے آخر تک تقریر کی طرح اسے سنا سکتی تھی۔۔۔۔ دسویں بار تو امرحہ نے کتاب پکڑنے کی زحمت ہی کی تھی ورنہ کتاب تو اسے ازبر

ہو چکی تھی۔

پھر امرحہ انہیں ایک محبت سو افسانے سنانے لگی..... نہیں نہیں اشفاق احمد کے لکھے نہیں یونیورسٹی میں لکھے جانے والے چلتے پھرتے افسانے۔

"سائی کی طرف سے تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا لیکن ویرا گجرات سے ہے۔ اور سنا ہے اس کے خاندان والے خاصے روایتی ہیں..... انہیں اگر معلوم ہو جائے کہ ویرا ایک سیاہ فام عیسائی کو پسند کرنے لگی ہے تو مشکل سے ہی اسے ایک بھی دن یونی میں رہنے دیں....."

لیڈی مہر سر ہلاتی رہیں انہیں سائی کی کہانی نے جذباتی کر دیا تھا۔

"مجھے تو عالیان کی فکر ہونے لگی ہے تمہاری کہانیاں سن سن کر....."

امرحہ نے لیڈی مہر کو دیکھ کر نظریں چرالیں۔

"شارلٹ بھی آنے والی ہے فون آیا تھا اس کا..... عالیان بھی شاید کسی نمونے کو پسند کر چکا ہو گا....." وہ خاموش سی ہو گئیں۔

"عالیان کتنا بھی انکار کرے میں جلد ہی اس کی شادی کر دوں گی..... وہ کہتا ہے کامیاب بزنس مین بن جاؤں گا تو سوچوں گا..... لیکن تب تک شاید میں دیکھ نہ سکوں..... مجھے انکار تو نہیں کرے گا لیکن میں زبردستی نہیں کرنا چاہتی....."

"آپ اس سے بہت پیار کرتی ہیں نا؟"

"نہیں..... وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے..... اس کی محبت مجھے حیران کر دیتی ہے..... میں نے ایک سال پہلے اسے منع کیا تھا کہ مجھ سے پوچھے بغیر وہ گھر نہ آیا کرے..... دیکھ لو، میری سالگرہ کے علاوہ وہ کبھی مجھ سے پوچھے بغیر گھر نہیں آتا..... وہ کچھ نہ کہے مجھ سے، میرے لیے کچھ خاص نہ کرے..... مجھے خبر ہو جاتی ہے کہ میرے دس بچوں میں سے سب سے زیادہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے..... دوسرے بچے احسان مند ہو کر عقیدت میں مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن پہلی بار جب میں نے اسے گود میں بٹھایا اور اس کی روتی ہوئی آنکھوں کو چوما تو وہ ایسے میرے سینے سے لگ گیا جسے مجھ میں سما جائے گا..... وہ مجھ سے بار بار پوچھتا۔ میں اسے چھوڑ کر تو نہیں جاؤں گی..... اس کی ماں کے بعد میں دوسری عورت ہوں جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے تیسری عورت اس کی بیوی ہو گی جس پر وہ قربان ہی ہو جائے گا..... عالیان بہت سمجھ دار ہے لیکن بعض معاملات میں وہ بہت شدت پسند بھی ہے۔"

"عالیان کے ماں باپ، خاندان....." اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ایک بار پہلے بھی اس نے یہ ہمت کی تھی اور لیڈی مہر نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے ماضی کے بارے میں ان کے علاوہ کسی اور سے بات کرنا نہیں چاہتیں، یہ بہت حساس معاملہ ہے۔

"تم عالیان کی دوست ہو امرحہ.....! لیکن یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ اس سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھنے کی..... ایک بار میں نے کوشش کی تھی۔ اس

نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس بارے میں کبھی بات نہ کروں۔۔۔ وہ تکلیف سے گزرنا نہیں چاہتا' اتنے سے ذکر پر ہی وہ کئی دن گم صم رہا تھا۔۔۔ ایک دن وہ ٹھیک ہو جائے گا میں جانتی ہوں۔۔۔ ہر دکھ اور صدمے کے بھرنے کا اپنا ایک الگ وقت اور انداز ہوتا ہے۔۔۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خوش باش ہے' بہت مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا تھا۔۔۔ جب تک وہ اور ٹھیک نہ ہو جائے میں کسی کو اسے تکلیف دینے نہیں دوں گی۔۔۔ وہ کوئی بھی ہو۔۔۔ خاندان کے نام پر اس کے پاس ایک ماں تھی جو جوانی میں ہی مر گئی۔۔۔ اب میں ہوں اس کا خاندان۔۔۔ اسی لیے مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ کسی ایشیائی لڑکی کو پسند نہ کرلے۔۔۔ ذات پات' خاندان' یہ سب ایشیائی لوگوں کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک سال پہلے یونیورسٹی میں عالیان کا ایک دوست بنا تھا' پاکستان سے تھا۔۔۔ اچھا دوست تھا اس کا' لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ عالیان کی ماں ایک عیسائی عورت تھی تو اس نے آہستہ آہستہ عالیان سے تعلق ہی ختم کرلیا۔ کہاں وہ عالیان کو اپنی زمینوں اور باغوں کی سیر کے لیے بلا رہا تھا۔۔۔ عالیان بہت آبدیدہ ہوا تھا اس لڑکے کے سلوک سے۔۔۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے جو مشرک تھے اور پھر وہ مسلمان ہو گئے لیکن ان میں سے بہت سوں کے گھر والے مسلمان نہیں ہوئے تھے تو کیا جو مسلمان ہو چکے تھے وہ اس لیے قابل نفرت رہے ہوں گے کہ ان کے خاندان کے لوگ ابھی بھی مشرک ہیں۔

جب عالیان چھوٹا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ اس کے کاغذات میں دو مذاہب لکھے گئے ہیں۔۔۔ اسلام' عیسائیت۔۔۔ اسے دونوں مذاہب کی تعلیم دی گئی۔۔۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ بالغ ہونے تک کوئی ایسا کام نہ کرے' جو اسلام کے منافی ہو اور اس نے میری درخواست مانی۔۔۔

میں نے عیسائی بچے بھی پالے ہیں امرحہ! لیکن میں نے کبھی ان کی مذہبی تعلیم میں اپنی خود غرضی کو آڑے آنے نہیں دیا۔۔۔ میں چاہتی تو سب بچوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے کہہ سکتی تھی' وہ مجھ سے اتنے متاثر تھے کہ فوراً" میری بات مان لیتے وہ مجھے خدا کے بعد کا درجہ دیتے تھے۔ لیکن میں اپنی ذات میں چھوٹی ہو جاتی۔۔۔ میرے دو بیٹے اسلام کی اسٹڈی کر رہے ہیں اللہ کو منظور ہوا تو وہ مسلمان ہو جائیں گے۔۔۔ شارلٹ۔۔۔ مورگن کبھی غیر مناسب لباس نہیں پہنتیں۔۔۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔۔۔ میری روایات میں سے انہوں نے کچھ کو اپنا لیا ہے۔ وہ مجھے وضو کرواتے رہے ہیں۔۔۔ میں قرآن پڑھا کرتی تھی تو میرے پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔۔۔ اذان پر خاموش ہو جاتے ہیں۔۔۔ انہیں یاد ہوتا ہے۔ رمضان کب آئے گا۔۔۔ عید کب ہوگی۔۔۔ جو احادیث' فرمان میں نے انہیں سنائے ہیں وہ انہیں یاد ہیں۔۔۔

دیکھو امرحہ! ہم سچی محبت سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ سب۔۔۔ لیکن خود غرضی تنگ دلی' تعصب کو دل سے ختم کرنا ہوتا ہے۔۔۔ دل کو صاف کرو۔۔۔ پاک کرو تو ہی محبت مقدس ہو کر اترتی ہے جسے مقدس ہستیوں پر خدائی پیغامات نازل ہوتے ہیں۔۔۔ محبت بھی خدائی پیغام ہی تو ہے۔۔۔ محبت' حساب کتاب سے بری ہوتی ہے۔۔۔ دل میں بال برابر بھی فرق ہو تو "محبت" اپنا رخ بدل لیتی ہے۔۔۔ منہ پھیر لیتی ہے۔۔۔ اس کے "ابدی" قیام کے لیے وجود کو پاکیزہ رکھنا پڑتا ہے۔"

امرحہ خاموش تھی اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

چند دنوں بعد اس نے ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو تیز آواز میں نشست گاہ میں بحث کرتے سنا۔۔۔ نشست گاہ کا دروازہ بند تھا پھر بھی اس آدمی کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

"کون ہے یہ۔۔۔؟" امرحہ نے سادھنا سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔۔۔ سال ڈیڑھ سال پہلے بھی یہ یہاں آیا تھا۔ کافی بحث کر کے گیا تھا۔ پولیس بلوانی پڑی

تھی بعد میں یہ گھر کے اطراف میں گھومتا پھرتا بھی دیکھا گیا تھا۔"

امرحہ نے رات کو لیڈی مہر سے پوچھا تو انہوں نے سختی کا ایسا تاثر دیا کہ امرحہ معذرت کر کے اٹھ آئی۔

"یعنی دور رہو اس معاملے سے"۔۔۔ اور امرحہ دور ہو گئی۔۔۔

رات کو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ اس نے عالیان کو دیکھا۔۔۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ اسے دیکھ کر اسے بہت برا لگا۔۔۔ اس کی سائیکل کے پیچھے ویرا بیٹھی تھی۔۔۔

شٹل کاک کے باہر اسے اتار کر وہ چلا گیا اور ویرا ذرا سی لنگڑاتی ہوئی اندر آ گئی۔۔۔

"کیا ہوا تمہارے پاؤں کو؟" امرحہ نے بڑی تنقیدی نظروں سے اس کے پیر کو دیکھا۔ اسے اس کے پیر کی قطعاً" کوئی فکر نہیں تھی۔۔۔

"سڑک پر گر گئی تھی۔ ہلکی سی چوٹ آئی ہے۔۔۔"

"تمہاری سائیکل کہاں ہے۔۔۔؟"

"آج تو میں سائیکل پر گئی ہی نہیں۔۔۔"

"تو تم واپس کیسے آئی ہو؟"

ویرا نے بڑے آرام سے اسے دیکھا "امرحہ! تم نے کھڑکی سے دیکھ تو لیا ہے کہ مجھے عالیان چھوڑ کر گیا ہے۔۔۔"

امرحہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔۔۔ یعنی اس کا پاؤں ٹوٹا تو اس نے عالیان سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔۔۔ رات کے اس وقت۔۔۔ اور وہ بھی آ گیا۔۔۔"

رات گہری سیاہ ہو گئی۔۔۔ اور نیند سے اڑان بھر لی۔۔۔ ساری رات آسمان سے سیاہی برستی رہی۔۔۔ سب کچھ اس سیاہی کے لبادے میں ملفوف ہو گیا۔۔۔

اس کے لیے اگلی کئی راتیں سونا دوبھر ہو گیا۔

اس نے پھر سے ہمت کی عالیان کے پاس جانے کی۔۔۔ دوبارہ گئی اور اس کی پشت دیکھ کر سہم کر پلٹ آئی۔

وہ آنکھیں جو اسے دیکھ کر جگمگایا کرتی تھیں اب اسے پہچاننے سے بھی انکاری ہو جاتیں تو وہ رو سی پڑتی۔۔۔ اور پھر ایک بار وہ اسے مخاطب کرنے کی جرات کر بیٹھی۔

"عالیان!" وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بات کر رہا تھا' دوست چلا گیا تو وہ اس کی طرف پلٹا۔۔۔ اتنی دیر لگی اسے پلٹنے میں۔۔۔

اس سے اگلی بات نہ ہو سکی اور گھبرا کر اس نے بیگ میں سے ایک عدد چاکلیٹ اس کے آگے کی۔۔۔

"یہ لو میری طرف سے ٹوئیٹ۔۔۔"

ایک لمحے کے لیے ہی سہی لیکن وہ حیران ہوا۔۔۔

"میں تمہارے لیے لائی ہوں۔۔۔" امرحہ نے مسکرانے کی کوشش کی جبکہ وہ رو دینے کو تھی۔

"میں ٹوئیٹ نہیں لیتا۔" اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔

"تو مجھے دے دو۔۔۔ میں ابھی بھی لیتی ہوں۔۔۔"

اس کی پشت سے وہ بولی۔۔۔ آواز کانپ رہی تھی اور وہ خود بھی۔۔۔

عالیان نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ لاجواب ہو چکا تھا۔۔۔ صرف ایک لحظے کے لیے وہ پرانا عالیان نظر آیا اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے کسی بھولے بھٹکے انسان نے اسے راستہ پوچھنے کے لیے روکا تھا۔

کتنا کچھ بدل گیا ہے۔۔۔ کتنا کچھ بدل رہا ہے۔۔۔

امرحہ نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔۔۔ اور جب وہ نظر آنا بند ہو گیا تو پلٹ گئی۔۔۔ جس وقت وہ پلٹی اس وقت عالیان نے اسے بہت دور سے خود کو مکمل چھپا کر جاتے دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نایاب جیلانی



رات کو چھاجوں مینہ برستا رہا تھا۔

طوفان اندر کا ہو یا باہر کا، ہمیشہ تباہ کاری ہی مچاتا ہے۔ رات بھر برسنے والی بارش نے صرف وجود سے باہر نہیں بلکہ اندر بھی اودھم مچا رکھا تھا۔ اور پھر بارش رکنے کے بعد بھی کہیں اندر بھیگ رہا تھا۔

اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر نیچے جھانکا تو ہر طرف کیچڑ اور گندگی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ گلیوں میں مٹی اور جگہ جگہ پڑے کوڑے کے ڈھیر کی وجہ سے بہت غلیظ بدبو اٹھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف نئے نئے تعمیر شدہ ڈبل اسٹوری گھر تھے۔ جیسے یہ گھر جدید طرز کے تعمیر ہوئے تھے ایسے ہی ان گھروں کے مکین بھی نئے نئے امیر ہوئے تھے۔

ایک ہی لائن میں بنے تین گھر توانس کے ان تین دوستوں کے تھے جو میٹرک اور ایف ایس سی کے بعد تعلیم کو خیرباد کر کے ملک سے باہر نکل گئے تھے۔ تنویر دبئی، عمار ملائیشیا اور محسن اپنی کزن پلس منکوحہ کے توسط سے امریکا سیٹلڈ ہو گیا تھا۔ اتفاق سے تنویر، عمار اور محسن آپس میں کزنز بھی تھے۔

اگرچہ کوکب کالونی کی اس اسٹریٹ پر بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر ہو گئی تھیں، تاہم ذہنی طور پر یہاں کے لوگ ابھی تک پسماندہ تھے۔ اکثریت ان لوگوں کی تھی جو دیہات سے اٹھ کر آئے تھے۔ ان ہی میں ایک انس کے والد تھے۔ جو اپنے مختصر سی زمین کو بیچ کر شہر میں آباد ہوئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے کریانے کی دکان کھول لی تھی۔ شاید وہ ایک اچھی خوش حال زندگی گزار پاتے، اگر انس کے والد کا انتقال نہ ہو جاتا۔ والد کی وفات کے بعد انس کی امی نے کیسے اتنا طویل اور مشکل وقت گزار کر انس کو اعلا تعلیم دلوائی تھی، ایک



مکمل ناول



الگ کہانی تھی۔ سلائی مشین چلا چلا کر ان کے کندھے جھک گئے تھے۔ نظر جاتی رہی تھی مگر انس کے اچھے مستقبل کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھیں۔ تعلیم مکمل کرکے کچھ عرصہ بے روزگاری کی اذیت سہنے کے بعد قسمت اچانک اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ نہ صرف بہت مناسب سیلری پیکج پر جاب مل گئی

بلکہ اچانک اس کا رشتہ بھی طے ہو گیا۔

ہوا کچھ اس طرح کہ جس کمپنی میں بطور مینیجر وہ نیا نیا اپائنٹ ہوا تھا' اسی کمپنی کے سینئر آفیسر نے انس کو بطور داماد پسند کرلیا تھا۔ وہ ایک مہربان اور جوہر شناس آدمی تھے۔ اور ایک ڈیپوٹیشن کے ہمراہ آئے تھے مختصر سی ملاقات کے بعد انہوں نے بصد اصرار انس سے فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ لے لیا تھا۔ پھر اگلے چار پانچ ماہ کے دوران وہ کئی مرتبہ پنڈی آتے رہے۔ ہر دفعہ انس سے ملاقات کے بعد ان کے مزاج میں اور بھی تبدیلی اور نرمی آجاتی۔

کچھ عرصہ بعد وہ انس کی امی سے ملنے ان کے گھر بھی آگئے۔

انہی دنوں میں اکرام صاحب کی علالت کا پتا چلا تب انس اور اس کی امی اچھے تعلقات اور اکرام صاحب کے بہترین برتاؤ کی وجہ سے ان کی عیادت کے لیے لاہور گئے تھے' وہیں امی نے شفا کو دیکھا اور پسند کرلیا۔

دیکھا جاتا تو شفا اور انس کا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ ان کے رہن سہن' اسٹیٹس' مزاج' رکھ رکھاؤ' برتاؤ سب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شفا کے بارے میں بھی سننے میں آیا تھا وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ بہت نخریلی اور نازک مزاج لڑکی ہے۔ ایسی باتیں سن کر انس نے دبے دبے لفظوں میں ماں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس وقت امی اکرام صاحب کے اخلاق اور شفا کے حسن سے اتنی متاثر تھیں کہ اس کی ایک نہ سنی پھر یہ بات تو انس کو بعد میں پتا چلی تھی کہ شفا کی ممی اور بڑی چار بہنوں سمیت کوئی بھی انس کے ساتھ اس رشتے پر خوش نہیں تھا مگر اکرام صاحب کے سامنے

کسی کی ایک نہیں چلی تھی اور محض چند مہینوں کے اندر اندر انس اور شفا کی شادی ہو گئی۔

انس شادی کے بعد بہت کم اپنے سسرال گیا تھا بس شفا سے اس کے والد آکر مل جاتے تھے یا پھر ساتھ بھی لے جاتے۔ مگر یہ سلسلہ اکرام صاحب کی اچانک وفات کے بعد رک سا گیا تھا۔ کچھ شہزادی اور مونس کی پیدائش کے بعد شفا خود بھی لوکل ٹرانسپورٹ سے سفر

کرنے اور آنے جانے سے گھبرانے لگی تھی۔

شفا کا مزاج عجیب تھا۔ وہ بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں روپ اپنا لیتی تھی۔ اس کے مزاج میں نخوت تھی۔ وہ انس کے گھر کی ایک ایک چیز کا موازنہ میکے والے گھر سے کیا کرتی تھی۔ اگرچہ اس نے زبان سے کبھی اظہار نہیں کیا تھا مگر انس جانتا تھا' وہ اس کے گھر میں آکر خوش نہیں ہے۔ وہ بہت کم گو تھی زیادہ تر سنجیدہ رہتی تھی۔

شفا کا رویہ صرف انس کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس کی دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سرد قسم کا تھا۔ اور امی کو تو شاید وہ کسی گنتی میں شمار ہی نہیں کرتی تھی۔ ان ساڑھے چھ سالوں میں انس نے کبھی بھی شفا کو اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتے یا ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی کم گوئی یا نخریلا پن اب سنجیدگی میں بدل چکا تھا۔

کبھی کبھی انس کے لیے شفا کی سنجیدگی کو برداشت کرنا ایک عذاب بن جاتا تھا اور اس کا دل چاہتا' وہ چیخ چیخ کر یا تو اس بت کے اندر جان ڈال دے یا پھر خود بھی کسی پتھر کے بے جان بت میں تبدیل ہو جائے۔

خاموشی اور سنجیدگی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔ اتنا تو وہ جانتا ہی تھا بس فرق اتنا تھا انس کی زندگی میں شامل ہو کر وہ گھٹ گھٹ کر جینے لگی تھی۔ شاید وہ خود بھی اس بوجھل' گھٹن زدہ زندگی سے تنگ آچکی تھی مگر واپسی کا چونکہ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سو مارے باندھے وقت گزارنا اس کی مجبوری کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

جو فاصلے اول روز سے ان کے درمیان در آئے تھے وہ آج تک قائم تھے۔ نہ تو شفا نے ان فاصلوں کو کم کرنا چاہا تھا اور نہ انس کو اپنے گرد بنائے حصار کے اندر داخل ہونے دیا تھا۔

انس کو اپنی ذات میں خوار کرنے کے لیے یہ احساس کیا کم تھا کہ وہ کسی کے لیے ان چاہا ہے، ناپسندیدہ ہے۔ وہ کسی بوجھ کی طرح شفا کے ضبط اور صبر کو آزماتا ہے۔

وہ جب بھی اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا، شفا کی اپنی خود ساختہ حدود، رویے اور گہری چپ اسے رک جانے پر مجبور کردیتی تھی۔ یہ گزشتہ رات کا ہی تو قصہ تھا۔ گزری ہوئی خاموش رات جب اچانک آسمان سے مینہ برسنے لگا تھا۔ آندھی و طوفان کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ گرد کے بگولے اڑنے لگے تھے۔ تب شفا نے بچوں کے بستر لگاتے ہوئے اسے بہت سرسری انداز میں بتایا تھا۔

"خیام کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔" اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح لاتعلق تھا۔ گویا خیام اس کا سگا بڑا بھائی نہ ہو بلکہ کوئی پڑوسی ہو۔

بہت دیر تک شفا کے مزید بولنے کا انتظار کرنے کے بعد بالآخر انس کو ہی زبان کھولنا پڑی تھی ورنہ وہ تو دو لفظ بول کر اب بھاگ کر لاؤنج، اسٹور، کچن وغیرہ کی کھڑکیاں، دروازے بند کررہی تھی۔

"خیام کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ یہ بات پچھلے دو ماہ سے میرے علم میں ہے۔ اس سے آگے کی خالی جگہ بھی پُر کردو۔ کیا ڈیٹ فکس ہو گئی؟"

نا چاہتے ہوئے بھی انس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ دراصل خیام کا رشتہ طے ہو جانے کے بعد شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کا مطلب تھا۔ ایک لمبا چوڑا خرچا۔ وہ دل ہی دل میں گہری پریشانی کو چھپائے تخمینے لگانے لگا تھا۔ اسے قوی یقین تھا پچھلے چار ماہ کی بچت شفا اور بچوں کے کپڑوں، جوتوں اور پھر خیام کے لیے گفٹ وغیرہ کی خریداری میں خاک دھول ہو جائے گی۔ انس کی پریشانی فطری تھی۔ ابھی تو اس کی پانچ سالہ بیٹی شہزادی کی ٹیوشن فیس کے ساتھ ساتھ مونس کو اسکول بھیجنا تھا۔ چھیالیس ہزار تنخواہ کے جیب میں آتے ضرور تھے۔ جاتے کہاں تھے اس کی خود سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

"آں... ہاں... میں یہ بتا رہی تھی، خیام کا رشتہ طے ہوا تھا اب وہاں سے بات ختم ہو گئی۔" شفا نے دھیمی آواز میں وضاحت کی تھی۔

"بات ختم ہو گئی مگر کیوں؟" وہ حیرت زدہ سا پوچھ رہا تھا۔ خیام میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اپنے سب بہن بھائیوں میں خیام اور شفا غیر معمولی خوبصورتی رکھتے تھے۔ اگرچہ باقی سب بھی خوش شکل تھے تاہم ان دونوں کی بات کچھ الگ تھی۔ خیام کی جاب بھی بہترین تھی۔

"وہ دراصل..." شفا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر واضح پریشانی کی چھاپ تھی۔ انس کو قدرے الجھن ہونے لگی۔

"تمہاری ممی جیسی ساس کو برداشت کرنا معمولی بات نہیں۔ یقیناً رشتہ ٹوٹنے کی یہی وجہ ہوگی۔" انس نے بڑے اطمینان سے اصل وجہ دریافت کرکے شفا کو لاجواب کردیا تھا اور اب اس کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل رہی تھی۔ گھنی پلکوں کی جھالر پر انس کو ننھے ننھے سے ستارے نظر آئے تھے مگر یہ پلک جھپکنے تک کا نظارہ تھا۔ شفا نے گردن موڑ کر کسمساتے مونس کو تھپکنا شروع کردیا تھا۔

"تمہاری ممی ویل آف لوگوں کو پسند کرتی ہیں۔ میری ناقص معلومات کے مطابق خیام کا رشتہ جہاں کیا گیا تھا، وہ لوگ خاصے غریب تھے۔"

شفا خاموش رہی تھی۔

"تمہارا مراقبہ تو شاید رات بھر پہ محیط ہوگا۔ مجھے صبح آفس جانا ہے۔ سو میں سونے لگا ہوں۔ برائے مہربانی لائٹ آف کردو۔" انس نے انتہائی غصے سے

تکیہ اٹھا کر سیدھا کیا اور اندرونی جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے سر پہ کمبل کھینچ لیا۔ اور جیسے اس کے پاس کہنے کو بھی کچھ نہیں تھا۔

"انس ..." شفا کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ انس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شفا کی منمناہٹ پر اچانک اُمڈ آنے والی نیند غالب آگئی تھی۔

"آپ سو گئے ہیں انس؟" گہری نیند میں جاتے انس کو محسوس ہوا تھا کہ شفا بہت آہستگی کے ساتھ اس کا کندھا ہلا کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔



سورج کی شفاف کرنوں کے بکھرتے ہی شفا کے پیروں میں پہیے لگ جاتے تھے۔ اگرچہ وہ انس کی پوری تیاری کر کے رات کو سوتی تھی تاہم پھر بھی عین وقت پر کچھ نہ کچھ ضرور رہ جاتا تھا جو بدمزگی کا سبب بنتا۔ اسی طرح شہزادی کی تیاری بھی بہت صبر آزما مرحلہ تھا۔ وہ بہت نخریلی بچی تھی۔ شفا کو اپنی بیٹی کا نخرہ سلویٰ آپی کی طرح لگتا تھا۔ اس کی بڑی تینوں بہنیں ہی خاصی نخریلی اور نازک مزاج تھیں اور شہزادی بھی شاید اپنی خالاؤں پر چلی گئی تھی۔ اس کا نام امی نے شہزادی رکھا تھا سو مزاج بھی شہزادیوں جیسا پایا تھا۔

شہزادی کو تیار کر کے وہ کچن میں فٹافٹ ناشتا بنا رہی تھی جب انس بھی تیار ہو کر آگیا۔ عموماً وہ اپنی تیاری کے دوران شفا کو بلاوجہ آوازیں دے کر بوکھلاتا ہرگز نہیں تھا۔ خاموشی کے ساتھ تیار ہو کر ناشتا کرتا اور آفس چلا جاتا۔ ناشتے کے نام پر بھی کچھ ہلکا پھلکا جیسا تیسا سامنے رکھ دو اگر کچھ پسند نہ آتا تو بغیر جتائے اور بغیر کھائے نکل جاتا۔ اگر کھانا اچھا ہوتا تو پھر رغبت سے کھا لیتا اور شفا چپ چاپ برتن سمیٹ لیتی۔

آج صبح انس کچن میں رکھے موڑھے پر بیٹھ گیا تھا۔ شفا نے پھرتی کے ساتھ میز پر ناشتے کے لوازمات چن دیے تھے۔ تب شہزادی بھی کچن میں داخل ہوئی۔

"پاپا! مجھے اسکوائر ایکسر سائز بک اور پرائم لینا ہے۔" اپنی عادت کے عین مطابق اسکول جاتے ہوئے اسے اپنی ضروری چیزیں یاد آرہی تھیں۔ اور اس کی فہرست سن کر انس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"کم از کم اس کا اسکول بیگ تو چیک کر لیا کرو ہر وقت مراقبے میں کھونا اور سوچوں میں گم رہنا۔ نکل آؤ ماضی کی بھول بھلیوں سے۔ حقیقت کو فیس کرو۔ یہی اصل زندگی ہے۔"

انس کی بے وقت جھاڑنے اور ماضی کی بھول بھلیوں والے طعنے نے شفا کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ بھلا کون سے ماضی کو سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو مونس کا ایڈمیشن چکرا رہا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح بات بڑھانے کے بجائے اس نے انس کو جواب دے کر منہ ماری کرنے سے پرہیز کیا تھا۔ اور انس جو اسے بولنے پر اکسا رہا تھا اپنی بات ضائع جاتے دیکھ کر اور بھی چڑ گیا۔

"منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جاتی ہو کوئی بے شک جتنا مرضی بھونکتا رہے۔" اسے ایک دم غصہ آگیا مگر شہزادی کی موجودگی میں اسے اپنے لہجے پر کنٹرول رکھنا پڑا تھا۔

"شہزادی کو ناشتا کروا دو۔ میں امی کے کمرے میں ہوں۔" انس چائے کا کپ اٹھا کر امی کی مزاج پرسی کرنے ان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ شفا نے سینے کی قید سے ایک تھکا تھکا سا سانس خارج کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جانتی تھی امی کے کمرے سے باہر آکر انس کا موڈ پہلے جیسا فریش ہرگز نہیں رہے گا۔ اور یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آرہا تھا۔ وہ دھندلی نظروں سے انس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا امی کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ امی ہمیشہ کی طرح گرم بستر میں دبکی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی تھی۔

"دفتر جا رہے ہو بیٹا!" انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کے ماتھے پر پیار کیا تھا۔ انس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ناشتا کر لیا ہے؟" ان کا دوسرا سوال بھی معمول کے مطابق تھا۔

"جی امی!" انس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب وہ پائنتی کی طرف بیٹھ کر دھیرے دھیرے امی کے پیر دبا رہا تھا۔

"تمہاری بیوی نے اب تک ناشتا نہیں بنایا۔ اتنے سال ہو گئے ہیں مگر اسے کھانا پکانا نہیں آسکا۔" ان کا تیسرا جملہ بھی معمول کے مطابق تھا۔ امی کو شفا سے انس کی طرح بہت سے گلے تھے جن میں سرفہرست یہی شکوہ تھا کہ شفا کو کھانا اچھا بنانا نہیں آتا۔

"بس امی! گزارا تو ہو ہی جاتا ہے۔" اس نے دبے دبے سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ صبح صبح شکوے شکایات کے دفتر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"گزارا ہی تو کر رہے ہیں۔" امی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "چینی کی مورت اٹھا لائے ہیں۔ نہ سینا پرونا آتا ہے نہ کھانا پکانا۔" یہ شکوہ بھی برسوں پرانا تھا جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی انس مسلسل یہی سنتا آرہا تھا۔ اور یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ شفا کو حقیقت میں بٹن ٹانکنا بھی نہیں آتا تھا۔

یہ شادی کے شروع دنوں کی بات تھی۔ جب روٹین لائف کے شروع ہوتے انس کو دفتر جانے کے لیے تیار ہونا پڑا تب وہ اپنی شرٹس کا ڈھیر اٹھائے آٹا گوندھنے میں الجھی شفا کے پاس لے آیا تھا۔

"ان کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ فارغ ہو جاؤ تو لگا دینا۔" اس نے وہ سارا ڈھیر تخت پر رکھ دیا تھا جسے دیکھ کر شفا کو ہول اٹھ رہے تھے۔ اپنے میکے میں وہ کچن سمیت دیگر ہر جھنجھٹ سے آزاد تھی مگر یہ آزادی تب سلب ہو گئی تھی جب شفا کے پاپا نے اچانک ایک مڈل کلاس فیملی میں اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔

انس کے پرپوزل کی تقریباً" گھر کے ہر فرد نے مخالفت کی تھی۔ اس کی ممی اور بہنیں انس کے ساتھ شادی پر راضی نہیں تھیں تاہم انس سے ملنے کے بعد اس کے بھائی ذیشان اور خیام کے خیالات بدل گئے تھے۔ انہیں انس بہت پسند آیا تھا۔ خصوصاً" خیام انس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا اور خیام نے ہی سب سے زیادہ اس رشتے کی حمایت کی تھی۔

اس نے ممی کو نجانے کیسے قائل کیا تھا حالانکہ ممی کسی بھی طرح شفا کی شادی مڈل کلاس فیملی میں نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر انس کو دیکھ کر وہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گئی تھیں۔ اپنے بڑے تینوں دامادوں کی نسبت انس کی وجاہت دیکھ کر انہیں خاموش ہونا پڑا تھا۔ سلویٰ، مادرا اور ریشا کے شوہر اگرچہ اعلا عہدوں پر فائز تھے اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے تاہم ان کی نازک اندام خوبصورت بیٹیوں کے ساتھ کا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ سو انس کے ایک پلس پوائنٹ کو مدنظر رکھ کر اس کی شادی انس سے کر دی گئی تھی۔

اسے یاد تھا، شادی سے دو دن پہلے سلویٰ آپی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"مڈل کلاس فیملی سے ہے 'خوب دبا کر رکھنا۔ اس کی ماں بہنوں کو بھی سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سلویٰ آپی کی یہ **نصیحتیں** سسرال میں آکر خود بخود خاک دھول ہو گئی تھیں جب ساس نے پہلی رات ہی سمجھا دیا۔

"بہو رانی! پورے خاندان کی لڑکیوں کو ایک طرف کر کے تمہیں بیاہ کر لائی ہوں۔ میرے اکلوتے بیٹے کو سنبھال کر مت بیٹھ جانا۔ اپنی عمر بھر کی کمائی تمہارے حوالے کر دی ہے۔ دیکھو لاج رکھ لینا ہماری۔"

انس کی امی نے جو پہلی رات اسے سبق پڑھایا تھا، وہ اس کے ذہن کی سلیٹ پر گویا جم گیا۔ رہی سہی کسر انس نے پوری کر دی۔ اس کا سیاق و سباق بھی تقریباً امی کی عزت، خدمت اور اس کی بہنوں کے ساتھ پیار سلوک کے گرد ہی گھومتا رہا تھا۔ شفا کو وہ کوئی لیکچرر معلوم ہو رہا تھا، تاہم ایک بات اسے اچھی طرح سے سمجھ میں آگئی تھی کہ آج کے بعد اس کی اپنی ذات کہیں دور بہت دور کھو گئی ہے۔ یہاں سب سے پہلے انس کی ماں بہنیں پھر خود انس اور بعد میں بچے۔ اس کی اپنی ذات تو کہیں بھی نہیں تھی۔ اتنے سارے لوگوں نے اس اکیلی سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں اور اسے ان کی توقعات پر پورا اترنا ہی تھا۔

اور انس کو لگتا تھا، وہ اس ماحول میں ابھی تک

اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ وہ یہاں خوش نہیں' ایک سمجھوتا بھری زندگی گزار رہی ہے۔ انس کی ان سوچوں پر امی کے تبصرے اکثر مہر کا کام دیتے تھے۔

"ارے عید کے عید بھی نہیں مسکراتی۔ جانے کس کا غم جان کو لگائے بیٹھی ہے۔" امی بغیر نتائج کی پروا کیے بے لاگ تبصرے کیے جاتی تھیں۔ اس بات کو جانے بغیر کہ انس پر ان کے الفاظ کس کس انداز میں اثر انداز ہوتے تھے۔ اور وہ کہاں کہاں اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کردیتی تھیں۔

"اتنے سالوں میں ایک روز بھی اسے خوش نہیں دیکھا۔" وہ مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملتی تھیں۔ اور کبھی اس کے سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیے کو دیکھ کر بولے بنا نہ رہتیں۔

"پیا چاہتا لگتی ہی نہیں۔ کبھی شوہر کے آنے سے پہلے سنگھار ہی کرلیا ہوتا۔" وہ جو مشین لگائے دھڑا دھڑ کپڑے دھو رہی ہوتی' ان کے مشورے سن کر دل مسوس کر رہ جاتی تاہم قریب ہی موجود انس کو کڑھنے کے لیے ایک اور پہلو نظر آجاتا۔

"کیا ضرورت ہے بننے سنورنے کی۔ یہاں کون سا داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے والے موجود ہیں۔" کبھی کبھی اس کی کڑھن زبان پر بھی آجاتی تھی تب وہ پیر پٹخ کر باہر نکل جاتا۔ تاہم شفا کے لیے اس کے دل میں گرہ ضرور پڑ جاتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت امی کے الفاظ اس کا موڈ بگاڑ رہے تھے۔ اس کا مزاج برہم ہو رہا تھا۔

"اپنے چاؤ چونچلوں سے ہی فرصت نہیں۔ بھائی کا رشتہ طے ہوگیا۔ ادھر نند کی کوئی فکر نہیں۔ میری جان سولی پر ٹنگی ہے۔" امی کو آبدیدہ دیکھ کر انس مدھم پڑ گیا تھا۔

"آپ رابی کے لیے کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ ابھی تو اس نے بی اے کیا ہے۔ کون سا عمر گزر رہی ہے۔" اس نے ماں کا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"اپنی نظروں کے سامنے رابی کو وداع کرنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش غلط تو نہیں۔" وہ قدرے برہم انداز میں بول رہی تھیں۔

"مگر امی! اچھے رشتے درختوں پر نہیں اُگتے۔ میں نے کچھ لوگوں کو کہہ رکھا ہے۔ اللہ جلد ہی کوئی بہتر سبیل نکالے گا۔" انس پر امید تھا مگر امی کی گھبراہٹ کم نہیں ہو رہی تھی۔ خیام کا رشتہ طے ہونے کا سن کر تو انہیں ہول اٹھ رہے تھے۔

"اتنا نہ ہوا کہ نند کی بات ہی چلا دیتی۔ اس کے تو ہاتھ میں تھا' ماں سے کہتی تو ہوجاتا۔ مگر کاہے کو کرتی۔" امی بڑبڑائیں۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں امی!" انس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا! ایسے ہی خیال آیا تھا۔"

"کیسا خیال؟" وہ ایسے ہی بات نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔ امی گویا پھنس کر رہ گئی تھیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ذرا دبے لہجے میں بولیں۔

"خیام کا رشتہ طے ہوگیا؟" انس نے گہرا سانس خارج کرکے کہا۔

"ہوا تھا اور اب ٹوٹ بھی گیا۔"

"ارے وہ کیوں؟" امی کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

"یہ تو نہیں پتا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کیسی گھنی ہے' بتایا ہی نہیں۔" امی نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ تب ہی شہزادی کمرے میں جھانک کر قدرے خفگی سے بولی تھی۔

"پاپا! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔" انس اپنی کھٹارا سی مہران کی چابی اٹھا کر امی کو اللہ حافظ کہتا باہر نکل آیا تھا۔ شہزادی اس کے برابر چل رہی تھی اور شفا اس کا لنچ باکس اور بیگ اٹھائے تقریباً بھاگتے ہوئے ان کے پیچھے آرہی تھی۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے پھولی سانسوں سمیت دھیمی آواز میں کہا۔

"انس! آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"تمہیں ہمیشہ گیٹ کے پاس پہنچ کر یا سونے کے وقت ہی ضروری باتیں یاد آتی ہیں۔" اس کے ہاتھ سے لنچ باکس اور اسکول بیگ پکڑ کر فرنٹ سیٹ

سنبھالتے ہوئے انس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا شفا خفت زدہ سی وہیں سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔



"شفا! آج ناشتہ دو گی یا نہیں۔ اب تو آنتیں بھی سکڑ گئی ہیں۔" امی کی آواز سن کر تقریباً بھاگتے ہوئے کچن تک پہنچی۔ جیسے تیسے جلدی جلدی ناشتہ ٹرے میں سجا کر واپس لاؤنج میں آئی تو امی ٹرے کو دیکھ کر بے زار صورت بنائے بولیں۔

"پھر دلیہ! ارے کب جان چھوڑو گی اس کی۔ مجھ سے یہ لئی اب نہیں کھائی جاتی۔" ان کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

وہ جتنی خوش خوراک تھیں اتنا ہی ڈاکٹر نے انہیں پرہیز بتا رکھا تھا۔ عموماً شفا کھانے میں امی کی پسند کو مدنظر رکھ کر مینو ترتیب دیتی تھی۔ اس کے باوجود امی کی بے زاری عروج پر ہوتی تھی۔ شاید بیماری نے انہیں چڑچڑا کر رکھا تھا۔ اور بیماری کی ہی وجہ سے ان کی زبان کا ذائقہ بگڑ گیا تھا کچھ بھی کیسا ہی کیوں نہ بنا کر پیش کیا جاتا انہیں اس میں کوئی ذائقہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"انس کہہ رہے تھے، صبح کے وقت آپ کو نرم غذا ہی دینا ہوگی۔ لنچ میں آپ جو کہیں گی بنا دوں گی۔" ٹرے تخت پر رکھ کے وہ دوبارہ مختصر سے کچن میں کھڑے ہو کر برتن دھونے لگی تھی تب رابی اور مونس بھی اٹھ کر کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ مونس کو نیند سے اٹھنے کے فوراً بعد ماں کی گود چاہیے ہوتی تھی سو شفا کام ادھورا چھوڑ کر مونس کی نازبرداریوں میں لگ گئی۔ رات کے طوفان کی وجہ سے دھول مٹی سے ہر چیز اٹی پڑی تھی۔ گندگی گرد اور ہر چیز بکھری دیکھ کر اس کی نفاست پسند طبیعت بگڑ رہی تھی مگر مونس کے لاڈ ختم نہیں ہو رہے تھے۔

"بھابھی! مجھے بس چائے دے دیں۔ رات سے فلو ہو رہا ہے۔" رابی کھانستے ہوئے ماں کے قریب ہی تخت پر لیٹ گئی تھی تب شفا سر ہلا کر پہلے رابی کو چائے دے کر آئی پھر مونس کو ہزار جتن کے بعد ناشتہ کروا کر کھیلنے میں لگایا اور پھر خود کمر کس کے گھر کی صفائی میں جت گئی۔ کچھ دیر بعد رابی بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ وہ عموماً صفائی وغیرہ کر دیا کرتی تھی۔ رات کا سالن بھی رابی بناتی تھی البتہ آٹا گوندھ کر روٹی پکانا شفا کے ذمے تھا۔ رابی بہت نرم خو، حلیم مزاج رکھتی تھی جبکہ رابی سے بڑی شازی کا مزاج خاصا روکھا تھا۔ شاید شادی کے بعد اس کا مزاج بھی بدل گیا تھا۔ گھریلو تلخیاں مزاج پر کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ شفا سے بہتر کون جانتا تھا۔

رابی جس قدر نرم طبع تھی، انس اور امی اسی قدر روکھا مزاج رکھتے تھے۔ شفا کے لیے ان دونوں کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ جہاں اس کے میکے والوں کا ذکر آتا وہیں انس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ انس شاذ و نادر ہی اس کے میکے جاتا تھا۔ اور جب چلا جاتا تو پھر اس کا کئی دن تک موڈ بحال نہیں ہوتا تھا۔ شادی کے شروع دن کے علاوہ تو کبھی وہ لاہور گیا ہی نہیں تھا اور اس وقت جو تھوڑی بہت بدمزگیاں ہوئی تھیں ان کو بھلانا انس جیسے بندے کے لیے قطعاً ناممکن تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا وہ جتائے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اس وقت ممی کا رویہ بھی انس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس وقت سے انس کے دل میں ممی کے خلاف جو گرہ پڑی تھی وہ آج تک کھل نہیں سکی تھی۔ البتہ ذیشان اور خیام کے متعلق انس کے خیالات کافی مختلف تھے۔

انس کے رویے کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ایسی محو ہو گئی تھی کہ اسے امی کے پکارنے کی آواز نہیں آئی۔ انہوں نے جب تیسری مرتبہ آواز لگائی تب وہ ہڑبڑا کر چونکی تھی۔

"آپ نے بلایا امی!" وہ خجل سی تیز تیز چلتی ان کے قریب آئی تھی تب امی نے اپنے ازلی بے زار لہجے میں کہا تھا۔

"ہاں بی بی! تمہیں بلانے کی غلطی کرلی ہے میں نے۔ نجانے کن خیالوں میں مگن رہتی ہو۔" ان کا

انداز ہمیشہ کی طرح جلا کٹا تھا۔ شفا نے تحمل سے پوچھا۔
"کچھ کام تھا کیا؟"
"کام کوئی نہیں مجھے۔ تمہیں بلایا تھا' بچے کو دیکھو۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے نہ چلا گیا ہو۔" امی پوتے کے لیے فکر مند تھیں۔ شفا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو مونس کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ گھبراہٹ میں بھاگتے ہوئے وہ نیچے آئی تو مونس کو کھلے گیٹ کے پاس کھڑے دیکھا۔ مونس کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ اس نے بے ساختہ اسے اٹھا کر چوما۔

لاؤنج میں داخل ہو کر اس نے مونس کو اتارا اور پھر دوبارہ کچن کے کاموں میں جت گئی تھی۔ مونس اب دادی کی گود میں چڑھ گیا تھا اور وہ شفا پر غصے ہو رہی تھیں۔
"تمہاری ماں کو پروا نہیں۔ نجانے کون سے مسئلے حل کرنے میں لگی رہتی ہے۔ نادان بچہ اگر گلی میں نکل جاتا۔ پڑوسیوں کی اتنی بڑی بڑی موٹریں ہیں۔ اندھا دھند چلاتے ہیں۔ اگر کوئی کچل ہی جاتا۔"
"اللہ نہ کرے۔" اس کا اپنا دل ابھی تک قابو میں نہیں تھا۔
"تمہارا باپ آتا ہے تو بتاتی ہوں۔ اب اگر گلی میں نکلے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔" امی اب مونس کو دھمکا رہی تھیں اور وہ باپ کے ڈراوے پر خوف زدہ سا دادی کے ساتھ چپک گیا تھا۔
"پاپا کو مت بتایئے گا دادی! مونس اب باہر نہیں نکلے گا۔"
"اب میں کچھ بولوں گی تو تمہیں اور تمہاری ماں دونوں کو برا لگے گا۔" وہ خفا خفا سی بولی تھیں۔
"تو آپ نہ ہی بولیں امی!" منہ پر دوپٹہ لیے رابی آہستہ آواز میں کہہ کر کروٹ لینے لگی تھی۔ اس کی طبیعت زکام کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بوجھل ہو رہی تھی۔
"لو اور سن لو! زبان کو تالا لگالوں؟" امی گویا صدمے سے بے حال ہو گئیں۔
"دادی! زبان کو تالا کیسے لگتا ہے؟" مونس حیران حیران سا ان کے گال پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا اور امی نے تپ کر جواب دیا۔
"اپنی ماں سے پوچھو' جس کی زبان کو تالا لگا ہوا ہے۔ مجال ہے جو ذرا سا منہ سے کچھ پھوٹ دے۔ بھائی کا رشتہ ٹوٹا' پر ہمیں ہوا تک لگنے نہیں دی۔" امی کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی تھی کہ کچن میں کام کرتی شفا نے باآسانی سن لی۔
"میں آپ کو ہوا دوں دادی!" مونس کو اس پورے جملے میں لفظ ہوا کے علاوہ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سو وہ فوراً چھلانگ لگا کر تخت سے اترا۔
وہ خوشی خوشی سوئچ بورڈ کی طرف بڑھنے لگا تھا جب امی نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے مونس کو روکا۔
"ماں بولتی نہیں اور بیٹے کی زبان رکتی نہیں۔" کیا الٹ پھیر ہے۔
"اے شفا! اسے دیکھو' بجلی کے بٹنوں کو ہاتھ لگا رہا ہے۔" امی کی پاٹ دار آواز سن کر شفا سبزی کی ٹوکری سلیب پر رکھ کر بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی۔ مونس اتنی سردی میں پنکھا چلائے خوشی سے چیخ رہا تھا۔
"امی! دادی نے کہا تھا ہوا دو۔" شفا کے ڈانٹنے پر وہ منہ بسور تا روہانسا ہو رہا تھا۔ شفا اس کی شرارتوں سے اکثر عاجز آجاتی تھی۔ اور اب تو وہ بہت سنجیدگی سے مونس کو اسکول میں داخل کروانے کا سوچ رہی تھی۔ اس نے کچھ دن پہلے بھی انس سے بات بھی کی تھی تب انس نے قدرے بے زاری سے کہا تھا۔
"شازی کا وقت نکل لینے دو۔" اس کا لہجہ خاصا دھیما اور روکھا سا تھا۔ اس کے ہاں پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی۔ اس مد میں امی نے پہلے ہی انس کو لمبے چوڑے خرچے کی فہرست پکڑا دی تھی' سو دو تین ماہ تک مزید کسی اضافی خرچ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔
"ہانڈی چڑھا دی ہے؟ انس کے آنے کا وقت ہو رہا

ہے۔" امی گھڑی کی طرف دیکھ کر بوکھلائے انداز میں بولی تھیں شاید انہیں خود بھی بھوک لگ رہی تھی۔ صبح صرف دلیہ لینے کی وجہ سے وہ دوپہر کا کھانا بارہ بجے تک کھا لیتی تھیں۔ اب تو پھر سوا ایک بج رہا تھا۔ طوفان اور بارش کی گندگی سمیٹتے آج وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گئی تھی۔ اوپر سے رابی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ گھر کے کاموں میں اس کا برابر ہاتھ بٹاتی تھی۔

نجانے کیوں شفا کو پچھلے ایک دو ماہ سے رابی قدرے بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کیا مسئلہ تھا؟ رابی اور شفا کی آپس میں دوستی تو بہت تھی تاہم جب سے اس کے بھائی خیام کا رشتہ طے ہوا تھا تب سے امی اور رابی تھوڑا کھنچی کھنچی سے رہنے لگی تھیں۔

"اے۔ پھر سوچوں میں گم ہو گئیں؟ میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" امی کی بے زار سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی امی! میں نے ہانڈی چڑھا دی ہے۔" شفا کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"اب آپ آرام کرلیں بھابھی! صبح سے لگی ہیں۔ میں روٹی پکا لیتی ہوں اور ساتھ چاول بھی ابال لیتی ہوں۔" رابی کچن میں آ گئی تھی۔ وہ ایسی ہی مخلص اور حلیم طبع تھی۔ رابی کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی روایتی نہیں رہے تھے۔

"پھر میں نہا لیتی ہوں۔ گرد دھول سے اٹی پڑی ہوں۔" شفا کچھ سوچ کر کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔ جب واپس آئی تو انس اور شہزادی کی آواز آ رہی تھی۔ انس شہزادی کو چھٹی کے وقت گھر چھوڑنے آتا تھا۔ پھر خود بھی لنچ کرنے کے بعد تھوڑا سا آرام کر کے دوبارہ آفس جاتا۔

اس نے جلدی جلدی بال بنا کر دوپٹہ اوڑھا اور باہر آئی تھی۔ لاؤنج سے امی کی اونچی اونچی آواز آ رہی تھی۔ شفا کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔

"نجانے کب سے آرام کررہی ہے۔ اتنا احساس نہیں شوہر اور بچے تھکے ہارے آئے ہیں۔ انہیں کھانا، پانی ہی پوچھ لے۔" وہ ہمیشہ کی طرح جلے کٹے لہجے میں بول رہی تھیں۔ انس کچھ خاموش سا تھا۔ امی کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تاہم اس کے تاثرات ذرا کٹیلے محسوس ہو رہے تھے۔ شفا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھی تو رابی کی آواز آئی۔

"صبح سے کام میں لگی ہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے نہانے کے لیے گئی ہیں۔ آپ بھی کبھی کبھی حد کردیتی ہیں امی!"

رابی کھانا ٹیبل پر لگا رہی تھی۔ اس کی آواز میں خفگی نمایاں تھی۔ انس سر جھٹک کر اٹھ گیا تھا۔ شفا کے دل پر بوجھ سا آگرا۔ ساری بھاگ دوڑ اکارت جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

کھانے کی میز پر انس، مونس اور شہزادی کے علاوہ بس رابی تھی۔ شفا، امی کو کھانا دینے ان کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ رابی سے خفا ہو گئی تھیں۔ شفا کی حمایت میں رابی کا بولنا انہیں پسند نہیں آیا تھا۔

بچوں کو کھانا دے کر وہ رابی کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ ایسے ہی بے دلی سے چاولوں میں چمچہ ہلا رہی تھی۔

"تم کھانا نہیں کھا رہیں؟" شفا کے کہنے پر انس نے بھی کچھ چونکتے ہوئے رابی کی طرف دیکھا۔

"بس ایسے ہی، دل نہیں چاہ رہا ہے۔" وہ زکام زدہ بھاری آواز میں بولی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو بتایا کیوں نہیں۔ میرے ساتھ آؤ، ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔" وہ اپنی ماں، بہنوں، بچوں سب کے لیے بہت ہی حلیم تھا بس شفا کی بات ان سے الگ تھی۔ اس کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی پھانس سی چبھی۔ سب کا خیال رکھنے والا اکثر ہی شفا کے بارے میں لاپروا ہو جاتا تھا۔

رابی اور انس کو ڈاکٹر کے پاس جاتے دیکھ کر شفا نے بے دلی کے ساتھ برتن سمیٹے پھر امی کو چائے دے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا ارادہ بچوں کو سلانے کا تھا۔ شہزادی بھی اسکول سے آکر گھنٹہ دو گھنٹہ آرام ضرور کرتی تھی۔

وہ بچوں کو دائیں بائیں لٹا کر سلانے کی کوشش کررہی تھی جب شہزادی کو نیند میں جانے سے پہلے کچھ خیال آیا تھا۔

"امی! میں نے ابو سے کہہ دیا ہے مجھے ڈیسک اور ایزی چیئر لے کر دیں۔ میری سب فرینڈز نے اسٹڈی ٹیبل لے لیے ہیں۔" شہزادی اس کے چہرے پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ رکھے سابقہ بے تابی سے بولی تھی۔

"تو پھر ابو نے کیا کہا ہے؟" وہ لاشعوری طور پر شہزادی کی فرمائش پر چونک گئی تھی۔

"ابو نے کہا رابی پھپھو کی شادی کے بعد لے کر دیں گے۔" شہزادی نے ذرا مدھم آواز میں بتایا تھا پھر قدرے تجسس بھرے لہجے میں بولی۔

"امی! رابی پھپھو کی شادی کب ہوگی؟" اس کی آنکھوں میں عجیب سی آس تھی۔ شفا کو اس کی آس توڑنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"آپ دعا کرو نا۔ جلدی رابی پھپھو کی شادی ہو۔ پھر آپ خوب مزا کرنا، ڈھولک بجانا۔" وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ باہر پہلے سے کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ شاید انس اور رابی واپس آگئے تھے۔ کچھ دیر بعد انس کمرے میں داخل ہوا۔ شفا نے ذرا گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر برہمی سی چھائی تھی تاہم اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ مونس کے برابر جگہ بنا کر لیٹ گیا تھا۔ باپ کی موجودگی محسوس کر کے شہزادی نے بھی جھٹ سے آنکھیں موند لی تھیں۔ پھر اس کے بازو پر سر رکھتے ہی تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند میں گم ہو گئی تھی۔

شہزادی کے گہری نیند میں جانے کی تسلی کر کے وہ محتاط انداز میں بیڈ سے اتر رہی تھی، جب اس کی سماعتوں سے انس کی مدہم آواز ٹکرائی۔

"تم رابی کی شادی کا ذکر کررہی تھیں۔ شہزادی سے دعائیں کروا رہی تھیں۔ کیا رابی مجھ پر بھاری ہے؟" انس کا لہجہ گہرا کاٹ دار تھا۔ وہ ایک دم سن سی ہو گئی۔

"رابی نے کب تمہیں تکلیف پہنچائی ہے جو تم اس سے اتنی بے زار ہو۔" انس ذرا سا اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اتنی کہ شفا بمشکل ہی سن پا رہی تھی۔

"تمہاری یہ بے زاری مجھ تک ہی محدود نہیں بلکہ گھر والے اور میرے بچے بھی اس کی لپیٹ میں آرہے ہیں۔ کیا اس سے ___ یہ بہتر نہیں کہ تم کوئی حتمی فیصلہ کرلو۔" اسے انس کا لہجہ عجیب آزردگی کی لپیٹ میں آیا بکھرا بکھرا سا محسوس ہو رہا تھا' تب شفا قدرے ہڑبڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیسے انس کی غلط فہمی دور کرے۔

"میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اب تم کوئی وضاحت مت دو۔" وہ عجیب بدگمانی بھرے لہجے میں بولا تھا۔ شفا کے اندر باہر بے چینیاں اتر آئی تھیں۔ آج شاید پہلی مرتبہ اتنے سالوں میں شفا نے قدرے سلیقے کے ساتھ انس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی ورنہ وہ تو ایسے مواقعوں پر چپ ہی ہو جاتی تھی ۔ پھر چاہے امی اور انس بول بول کر خود ہی ہانپ جاتے' اس نے پلٹ کر جواب نہیں دینا تھا۔ اس کے پاپا نے جو اسے وداع کرتے ہوئے ایک نصیحت کی تھی' اسے شفا نے آج تک پلو سے باندھ رکھا تھا۔

"بیٹی! ایک چپ میں ہزار سکھ ہیں۔ خاوند کچھ بھی کہے' پلٹ کر جواب مت دینا۔" پاپا کے ہر قول کو اس نے گرہ میں باندھ رکھا تھا۔ اس بات کو سمجھے بغیر کہ کبھی کبھی خاموشی بھی بڑے بڑے خسارے اٹھا لاتی ہے۔ عموماً" انس کے غصہ کرنے پر اسے بولنے پر اکسانے اور بات کو طول دینے پر بھی جب وہ خاموش رہتی' تب وہ بے انتہا تپ جایا کرتا تھا۔ پھر اسے بھڑکتے دیر نہیں لگتی تھی۔

وہ چاہتا تھا' شفا بولے' کبھی کھٹی میٹھی لڑائی کرلیا کرے۔ کم از کم اپنے اندر کی بھڑاس ہی نکال لے مگر شفا نے بھی نہ بولنے کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ مگر آج اس نے دھیمی آواز میں وضاحت دے دی۔ تب ہی انس قدرے مدھم پڑ گیا تھا۔ اس نے خود ہی موضوع بدلتے ہوئے اچانک خیال آنے پر پوچھا تھا۔

"غالباً" تم نے کوئی ضروری بات کرنی تھی۔" شکر ہے اسے شفا کی کوئی ایک بات تو یاد تھی ورنہ وہ تو سوچ رہی تھی انس جتنا اس کی طرف سے لاپروا تھا کسی دن اسے بھی بھول ہی نہ جاتا۔

"جی۔" اس نے قدرے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔ پھر گلا کھنکھار کر بولی۔

"وہ دراصل ممی آرہی ہیں۔"

"یہاں آرہی ہیں؟" اس کی توقع کے عین مطابق وہ چونک گیا تھا اور صرف چونکا ہی نہیں تھا بلکہ حد درجہ حیران بھی ہو رہا تھا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیریت سے آئیں گی نا۔" انس کا حیران ہونا فطری تھا ۔ وہ تو بیٹی کے ولیمے پر بھی دور کا سفر اور بلڈ پریشر کی تکلیف کا بہانہ کر کے نہیں آئی تھیں۔ پھر وہ کیوں نہ ان کی آمد پر چونکتا۔

"جی خیریت ہے۔" وہ بجھی سی آواز میں بولی۔

"تمہاری شکل دیکھ کر لگتا تو نہیں خیریت ہے۔" انس کھوجنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شفا نے اندرونی بے چینی چھپاتے ہوئے نگاہ چرائی۔

"وہ دراصل ذیشان نے امریکا میں شادی کرلی۔" شفا نے انکشاف کر ہی دیا تھا۔ انس دم بخود رہ گیا۔

"ذیشان کی اتنی جرات۔ ایسی خونخوار بہنوں اور جلاد ٹائپ والدہ کی اجازت کے بغیر۔ شادی کرلی؟ بڑی حیرت کی بات ہے۔" انس جتنا بھی حیران ہوتا کم تھا۔ وہ ذیشان کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ تو ماں کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا کجا کہ اپنی مرضی سے شادی کرلینا۔

"پتا نہیں اسے کیا ہوا۔ ممی بہت اپ سیٹ تھیں' پھر خیام کی منگنی بھی ٹوٹ گئی' بلکہ ممی نے خود توڑ دی تھی۔ دراصل خیام وہاں شادی کے لیے مان نہیں رہا تھا۔" شفا نے سابقہ بجھے بجھے لہجے میں تفصیل سے

بتایا۔ انس نے قدرے شکوہ کرتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے ہمیشہ اجنبی سمجھا ہے مجھے۔ اتنا کچھ ہو گیا اور بتایا بھی نہیں۔" انس کی آواز مدھم سی تھی۔ اسے شفا کے غیریت برتنے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایسے ہی اپنی ہر بات اس سے چھپاتی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی تکلیف کا بھی ذکر نہیں کرتی تھی۔ چاہے جتنی بھی بیمار ہوتی' چپ چاپ منہ سر لپیٹ کر سو جاتی۔ وہ اس کے اجنبیت بھرے رویوں پر اندر سے کتنا ڈسٹرب رہتا تھا اوپر سے یہ احساس کہ وہ اس پر مسلط ہے۔ وہ بھلا اپنے خساروں کا ذکر کس سے کرتا۔

"میں نے اتنی دفعہ سوچا کہ آپ سے ذکر کروں پھر ایسے ہی۔" وہ بولتے بولتے ایک دفعہ پھر رک گئی۔ انس کافی دیر تک اس کے مزید بولنے کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ ایک دفعہ پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ نجانے وہ اتنی کم گو شروع سے تھی یا اس کی زندگی میں شامل ہو کر ایسی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ انس کے لیے کبھی کبھی اس کی خاموشی کو برداشت کرنا عذاب ہو جاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کس کر شفا کے منہ پر تھپڑ مارے یہاں تک کہ شفا چیخ چیخ کر سارا گھر سر پہ اٹھا لے۔ پھر وہ اسے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے اور بعد میں انس اسے بہت پیار سے منا لے۔ مگر وائے ری قسمت۔ بھلا سب کچھ سوچ کے مطابق ہو سکتا ہے؟ اب اگر وہ اپنی کسی خواہش کے تحت شفا کو مارتا اور وہ سچ مچ ناراض ہو کر چلی جاتی تب وہ کیا کرتا؟ یہی سوچ اس کا دل بند کر دینے کے لیے کافی ہوتی۔

"خیام نے وہاں سے رشتہ کیوں ختم کیا ہے؟" بہت دیر تک اس کے مزید کچھ بولنے کا انتظار کرنے کے بعد انس نے بے دلی سے پوچھا۔ اس کا شفا سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا مگر شفا تھی کہ اپنے مراقبے سے باہر آنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"وہ دراصل۔" شفا ایک مرتبہ پھر بولتے بولتے رک سی گئی تھی مگر اب کے انس بھی خاصا چڑ گیا۔

"اب بول بھی چکو۔" وہ قدرے بے زاری سے بولتا ہوا گھڑی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے آرام کا ٹائم پورا ہو گیا تھا۔ اب اسے دفتر کے لیے نکلنا تھا۔

"آپ... آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" شفا ہکلاتے ہوئے خود بھی اس کے برابر کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں۔" وہ اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر پینٹ کی جیب میں رکھ رہا تھا۔

"وہ ممی آ رہی ہیں انس!" شفا کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کس طرح شروع کرے۔ انس بری طرح بھنا اٹھا۔

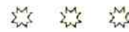
"ممی آ رہی ہیں تو کیا اکیس توپوں کی سلامی دوں۔ ان کو آ تو لینے دو۔ تمہاری ممی کے شان شایان خاطر مدارت ہو گی۔" وہ سمجھا شاید شفا اسی لیے گھبرا رہی ہے کہ یہاں اس کی ممی کو سہولت کے مطابق کچھ بھی میسر نہیں ہو گا۔ اب رہائش تو وہ اپنی بدل نہیں سکتا تھا تاہم ممی کی تواضع کے لیے راشن کا ڈھیر لگا سکتا تھا۔ بہرحال وہ شفا کی ماں تھیں اور پہلی مرتبہ اس کے گھر آ رہی تھیں۔ ایک داماد ہونے کے ناتے وہ ان کی تواضع کا ظرف رکھتا تھا۔ مگر بات شاید یہ نہیں تھی اور جو بات تھی اسے سن کر تو انس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"انس! ممی' رالی کے لیے آ رہی ہیں۔" شفا نے گھبراتے ہوئے راز اگل ہی دیا تھا۔ اس کے خیال میں تھا شاید انس کو بہت برا لگے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہ کچھ پل کے لیے گم صم ہو گیا تھا۔

"تمہاری ممی' رالی کے لیے آ رہی ہیں۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ اب رالی ایسی بھی بیمار نہیں' جو اس کی احوال پرسی کی جائے۔ موسمی زکام بخار ہی تو ہے۔" وہ حیران حیران سا بولے جا رہا تھا تب شفا نے اس کی تمام حیرتوں کا جواب دیا۔

"ممی رالی کا رشتہ لینے یہاں آ رہی ہیں۔ دراصل خیام کی خواہش پر۔" وہ رالی کو پسند کرتا ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے باقی ماندہ سچ بھی اگل دیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر انس کو قطعاً غصہ نہیں آیا تھا۔ اسے برا

نہیں لگا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔ وہاں ہلکی سی خوشی کی جھلک بھی نظر آرہی تھی۔ وہ حیران تھا اور وہ خوش بھی تھا۔ کم از کم شفا کے اطمینان کے لیے یہ کافی تھا۔



اگلے روز گھر کا ماحول یکسر تبدیل تھا۔ شفا نے امی کے بدلتے مزاج کے ساتھ رانی کے چہرے پر چمکتی خوشی کو بھی کھوج لیا تھا یعنی خیام کی پسندیدگی یک طرفہ نہیں تھی۔ نجانے خیام نے ادھر سے رشتہ توڑ کر ممی کو کیسے منایا تھا یا پھر ذیشان کی طرف سے ملنے والے دھچکے نے ممی کے سارے طنطنے کا خاتمہ کر دیا تھا۔

شفا تو خود ممی کے فون کرنے پر ابھی تک حیران تھی۔ ممی نے اس کی ساس سے فون پہ بات تو کرلی تھی تاہم اب باقاعدہ رسمی بات چیت کے لیے خود آرہی تھیں۔

یہاں ممی کے استقبال کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شفا نے انس کے رویے میں بھی واضح تبدیلی دیکھی تھی۔ امی تو خیر اتنی خوش تھیں کہ بار بار شفا کو اپنے ساتھ لپٹا لیتی تھیں۔

''تم نے تو میرے پریشانی دور کر دی ہے بیٹی!'' وہ بہت ممنون نظر آتی تھیں۔ حالانکہ شفا نے ان کی کوئی پریشانی دور نہیں کی تھی۔ یہ تو قطعاً'' خیام کی پسند سے ہو رہا تھا۔

مگر شفا نے ممی کے رویے میں بھی خاصا بدلاؤ دیکھا تھا۔ وہ پہلے جیسا غرور اور طنطنہ ان میں نہیں تھا۔ نہ ہی انہوں نے اس پسماندہ سی کالونی میں آکر اپنی توہین محسوس کی تھی۔ بلکہ وہ آس پاس کے مکانوں کو دیکھ کر خاصی حیران ہو رہی تھیں۔

''یہاں تو بہت خوبصورت رہائشی عمارتیں بن گئی ہیں۔ مگر مین روڈ پر کسی نے توجہ نہیں دی۔'' وہ بہت سادہ سے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''گھر تو کافی اچھا ہے۔ بس تھوڑی توجہ کی ضرورت ہے۔'' ممی کا مختصر تبصرہ شفا کو اندر تک نہال کر گیا تھا۔ ''ویسے میری بیٹی نے بہت سنوار کے رکھا ہے۔'' اب وہ بہت باریک بینی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے تعریفی جملوں نے شفا کا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔

''ہاں جی۔ گھر بار سب شفا کے حوالے ہے۔ سب کچھ یہی دیکھتی ہے۔'' امی نے بھی تعریف کرنے میں کنجوسی نہیں کی تھی۔ شاید اپنی بیٹی کا معاملہ تھا۔ ان کے مزاج میں بھی بہت واضح تبدیلی نظر آرہی تھی مگر اصل حیرت شفا کو اپنی ماں کے رویے پر تھی۔ شفا بہت عرصے سے میکے نہیں گئی تھی اور اسی بات کا شکوہ ممی، انس کے ساتھ کر رہی تھیں۔

''کبھی میری بیٹی کو گھر سے اور گھر کی مصروفیات کے جھنجھٹ سے آزاد کر دیا کرو، عرصہ ہوا یہ آئی نہیں اور تم نے بھی کبھی چکر نہیں لگایا۔'' ممی بہت پیار بھری نظروں سے انس کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا گویا وہ پہلی مرتبہ انس کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور شائستہ اطوار لگ رہا تھا انہیں۔ اور شفا چپکے چپکے انس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر کے رخ اور ہونٹوں کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ نے ممی کے دل کو پرسکون کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش اور سکھی تھی۔ بے حد خوبصورت شوہر، تمیزدار مہذب بچے، سادہ سا گھرانہ۔ ان کے بڑے دامادوں کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ہی تھوڑا وقت نکال لیتے مگر وہ انس کو دیکھ کر حیران تھیں۔ وہ دفتر سے اٹھ کر شہزادی کو گھر چھوڑنے آیا تھا۔ پھر بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر واپس چلا گیا تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد اس نے شہزادی کو ہوم ورک بھی کروایا تھا، پھر بچوں کو باہر گھمانے بھی لے گیا تھا۔ انہیں یہ سب دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور انہوں نے اس بات کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔

''میری بیٹی یہاں بہت خوش ہے۔ میرے دل کی تسلی کے لیے یہی کافی ہے۔'' انس کے اٹھتے ہی امی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے ممی نے نہایت شائستگی سے کہا تھا۔ اب امی قدرے شرمندہ ہو گئی تھیں۔

"بہن! ہمارا اس میں کوئی کمال نہیں۔ یہ تو آپ کی بیٹی کا ظرف اور اچھائی ہے۔ آج تک پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ زبان درازی نہیں کی، سچ پوچھیں تو کبھی ان کے کمرے سے میاں بیوی کے جھگڑے کی آواز تک نہیں آئی۔" امی کے سادگی بھرے لہجے میں بات کرنے پر ممی مسکرانے لگی تھیں۔ شفا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا گویا وہ ماں کے سامنے سرخرو ہوگئی ہے۔ سسرال کی باتیں، رنجشیں اور شوہر کی بے اعتنائی کے قصے میکے جاکر نہ سنانے کا یہ انعام کم تو نہیں تھا۔ وہ اپنی بہنوں کی طرح ذرا ذرا سے دکھڑے سنانے کے لیے ممی کو فون کبھی نہیں کھڑکاتی تھی۔ نہ کبھی انس کے رویے کا شکوہ کیا اور نہ کبھی ساس کی تلخ کلامی کو میکے تک پہنچایا۔ یہ اس کا ایثار اور صبر تھا جو اس کی ماں آج اس کی نند کا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ اس نے جب بھی ممی سے فون پر بات کی تھی ہمیشہ انس اور اپنی ساس کی تعریف کی۔ وہ اپنے بہنوئیوں سے کسی بھی طور پر انس کو کم یا ہلکا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

رات کو ممی اس سے کہہ رہی تھیں بلکہ خیام کی بے تابیوں کا بتا رہی تھیں۔

"بہت اتاؤلا ہو رہا تھا۔ ساتھ آنے کی ضد کر رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ اس کا ساتھ آنا مناسب جو نہیں تھا۔" ممی بہت خوشی سے بتا رہی تھیں تب اس نے خیام کی منگنی ٹوٹنے کی اصل وجہ پوچھی تھی۔

"بہت کمینے لوگ تھے۔ بلا کے تیز طرار... شادی سے پہلے الگ گھر کی ڈیمانڈ کر رہے تھے۔ میرا دل کھٹا ہو رہا تھا۔ ویسے بھی خیام خوش نہیں تھا۔ نجانے کب سے تمہاری نند کے بارے میں سوچ رکھا تھا، مگر جب میں نے رشتہ طے کر دیا، خاموش ہو گیا۔ یہ تو جب میں نے ان لوگوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بات ختم کی تو اس نے بھی رابی کا نام منہ سے پھوٹا۔ بہت نرم مزاج ___ میٹھی طبیعت ہے رابی کی۔ تمہاری بہنیں بھی رضامند ہیں۔" ممی خوشدلی سے بتا رہی تھیں۔ شفا کا دل ہلکا ہو گیا۔

"تم اور انس چکر لگاؤ نا، عرصہ ہو گیا تم کو آئے ہوئے۔ کیا انس نے اتنا میری بیٹی کو باندھ رکھا ہے۔" وہ بہت پیار سے شفا کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"بس ممی! بچوں اور گھر کی مصروفیت کی وجہ سے نکلنا نہیں ہوتا۔ اور پھر انس بھی کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ رات رکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر لاہور جاؤں تو چند دن تو لگ ہی جائیں گے۔ انس کے بغیر کہیں جانے کو دل نہیں کرتا اور ان کو چھٹی بھی بس عید کے عید ہی ملتی ہے۔" اس نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے میکے نہ جانے کی اصل وجہ بتادی تھی، جسے سن کر ممی اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"میری بیٹی اپنے گھر میں خوش رہے، اس سے بہتر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے مگر بیٹا! کبھی تو میکے کا چکر لگا لیا کرو۔ جب سے تمہارے پاپا گئے ہیں تم جیسے بھول ہی گئی ہو۔" ممی نے اس کی ___ روشن پیشانی چوم کر کہا تھا۔

"ممی! آپ کو بتایا ہے نا۔ انس کے بغیر میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے انس کے بغیر کہیں جاؤں گی تو کھو جاؤں گی۔ مجھے انس کے علاوہ، اور انس کے بغیر پوری دنیا بے رنگ لگتی ہے۔" شفا نے جانے کیسے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے دل کا حال ماں کے سامنے کہہ سنایا تھا۔ ورنہ یہ اس کے ایسے سچے جذبے تھے جن کو اس نے کبھی اپنے آپ کے سامنے بھی عیاں نہیں کیا تھا۔

دروازے پر جانے کب سے کھڑا انس اس کے آخری الفاظ پر ٹھٹک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا شفا میں انا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ ٹوٹ سکتی تھی مگر اپنا بھرم نہیں توڑ سکتی تھی۔ اسے شفا کی منافقت نے دل سے دماغ تک کڑوا کر دیا تھا۔ اسے شفا کے الفاظ نے عجیب سی تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنا بھرم قائم رکھتے ہوئے کیسے ماں کو مطمئن کر رہی تھی، کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ شفا اپنے میکے کیوں نہیں جاتی؟ وہ آج بھی اپنے گھر والوں سے ناراض تھی۔ یا شاید اپنے مرے ہوئے

باپ سے ناراض تھی، جس نے اسے اس جہنم میں پھینک دیا تھا۔ اور اسی پھانس، چبھن اور گھٹن کی بدولت وہ میکے جانا گوارا نہیں کرتی تھی۔ اپنی بہنوں کی خوشگوار زندگی اسے ڈسٹرب کرتی تھی۔ اور وہ ان کے سامنے خود کو جھکانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی زہریلی سوچوں میں کھویا انس زیرلب بڑبڑاتا پلٹ گیا تھا۔

"ہونہہ جھوٹی عورت! ایسے ڈھکوسلے اور فریب بھرے الفاظ مجھے متاثر نہیں کرسکتے۔" رات بھر شفا کے کہے گئے الفاظ کو سوچتا وہ عجیب سی ان دیکھی آگ میں جھلس رہا تھا۔



ممی جاتے جاتے شادی کی تاریخ طے کرگئی تھیں۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی شفا گھن چکر بن گئی تھی۔ انس اخراجات کی وجہ سے بوکھلا رہا تھا مگر امی نے جب خفیہ تجوریوں کے منہ کھولے تو تقریباً" سب کچھ آسانی کے ساتھ ہوتا چلا گیا تھا۔

خیام کے سختی سے انکار کے باوجود یہاں سے فرنیچر، الیکٹرونکس کا سامان اور بہترین کراکری بھجوائی گئی تھی۔ انس بہن کی کسی طور پر بھی سبکی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

رابی کی شادی ایسی دھوم دھام سے کی گئی کہ خاندان والوں نے دانتوں میں انگلیاں دبالی تھیں۔

رابی شادی کے بعد خیام کے ہمراہ دو تین مرتبہ چکر لگا گئی تھی اور امی بیٹی کو شاد اور خوش دیکھ دیکھ کر شفا کو دعائیں دیتی نہیں تھکتی تھیں۔

ادھر خیام جتنا خوش، جتنا مسرور اور شاد تھا اتنا ہی شکوے شکایات کے دفتر بھی پکڑ رکھے تھے۔ سب سے بڑا شکوہ تو یہ تھا کہ رابی کم کیوں بولتی ہے۔ کم بولنا اس کی فطرت اور عادت تھی۔ اس کو تو بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ ویسے وہ اتنا خوش تھی کہ اس کے گلابی دودھ جیسے گالوں میں ہمہ وقت گلاب کھلے نظر آتے تھے۔ اسی طرح خیام بھی بہت خوش تھا مگر اسے جو رابی کے کم بولنے پر شکوہ تھا، یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوسکا تھا۔

اکثر خیام کی صبح صبح فون کال آجاتی تھی۔

"تمہاری نند لگتا ہے زبان میکے بھول آئی ہے۔ دس سوال کرو تو جواب ایک ہی ملتا ہے۔" وہ خوشی سے کھلکھلاتے لہجے میں رابی کو چھیڑتے ہوئے شفا کے کان کھاتا تھا تب شفا گھبراتے ہوئے رابی کے کم بولنے پر وضاحت کرتی تھی۔

"تم اسے تنگ مت کرنا خیام! رابی کی عادت ہے۔ وہ گھر میں بھی کم ہی بولتی تھی۔"

شفا کی وضاحتوں پر خیام کی خوش مزاجی اور بھی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ وہ رابی کی سنگت میں بہت خوش تھا اور صرف خیام ہی نہیں بلکہ اس کی ممی اور بہنیں بھی رابی کو منتخب کرنے پر بہت خوش اور مطمئن تھیں۔

انس کا رویہ ہنوز لاتعلق سا تھا۔



ایسے ہی دھوپ چھاؤں جیسے دن گزر رہے تھے جب ان کی زندگیوں میں ہلکی سی ہلچل مچانے سامنے والی کوٹھی میں انس کا بچپن کا دوست محسن اپنی فیملی کے ہمراہ امریکا سے پاکستان چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ ہر طرف ہلچل سی مچ گئی تھی۔ نوکروں کا سارا دن آجانا لگا رہتا تھا۔

انس عرصہ دراز بعد اپنے دوست سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسی خوشی میں محسن کی فیملی کو کھانے پر مدعو کرلیا۔ وہ صبح آفس جانے سے پہلے اتنی لمبی چوڑی ہدایات دے کر گیا۔ تب امی نے کافی ناگواری سے انس کو ٹوکا تھا۔

"ارے کیا اس میں بجلی بھری ہے جو یہ اٹھارہ ہانڈیاں رات تک تیار کرلے گی۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ اس اکیلی جان سے اتنا سیاپا ہو گا۔" وہ بیٹے کی مینو لسٹ دیکھ کر بھنا رہی تھیں۔

"تو پھر کون کرے گا؟" اس کے ماتھے پر خواہ مخواہ بل پڑ گئے۔

"تمہارے باوا کے خانسامے آکر کریں گے۔" امی

نے گویا سر پیٹ لیا۔ "غضب خدا کا' خود سوچو! چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ شفا اکیلی کیسے اتنا کام کرپائے گی۔"

"تو اس کا حل آپ ہی بتادیں۔ لوگوں کی بیویاں ایک وقت میں سینکڑوں ڈشنز بنالیتی ہیں۔" انس کی ناگواری کا گراف بڑھتا جارہا تھا۔

"تو تم لوگوں کی بیویوں سے ہی سینکڑوں ہانڈیاں پکوالو۔ شفا سے اتنا کام نہیں ہو سکتا۔" امی نے ہاتھ جھاڑ کر کہا۔

"اب لوگوں کے دروازے کھٹکانے سے تو رہا۔" انس چڑ کر رہ گیا۔

"تمہاری بیوی سے جتنا کام ہوگا' اتنا ہی کر سکے گی نا۔" وہ بھی تو انس کی ماں تھیں کیسے خاموش رہتیں۔ کب سے یہ تکرار سنتی شفا کو مداخلت کرنا پڑی تھی۔

"امی! میں کرلوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔" انس کا غصہ بڑھتا دیکھ کر شفا کو بولنا ہی پڑا تھا۔

"تمہاری خاطر تو کہہ رہی ہوں۔ کیسے کرلو گی' مونس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اتنا چڑچڑا ہو رہا ہے۔ بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں۔ کرسکتی ہو تو کرلینا۔ مجھے کیا ضرورت ہے زبان گھسانے کی۔" امی خفا ہو کر تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر انھوں نے اون سلائیوں کو پکڑ کر قطعاً "لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔

"اب کچھ پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بازار سے لے آؤں گا۔" انس رکھائی سے بولتا باہر نکل گیا۔ انس کے چلے جانے کے بعد ۔ عجیب سی بے کلی تھی جس نے شفا کو بے انتہا بے چین رکھا تھا۔ وہ پورے گھر میں جلے پیر کی بلی بنی چکراتی پھر رہی تھی' پھر اس بے کار کی گھبراہٹ سے تنگ آکر اس نے انس کو فون کردیا تھا جب دوسری طرف بیل جانے لگی تب' ایک اور مشکل میں گرفتار ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بولے کیا۔

"اب بول بھی چکو۔" انس نے تنگ آکر کہا تو شفا نے بڑی مشکل سے کہا تھا۔

"انس آپ کھانا مت لائیے گا۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔"

"تم نے جو کچھ کرنا ہے' وہ میں آل ریڈی جانتا ہوں۔ اپنی تو خیر ہے' مہمانوں کے سامنے جو ملغوبے سجا سجا کر رکھو گی اس سے بہتر ہے میں باہر سے کھانا لے آؤں۔" صبح کی خفگی کا اثر تھا جو وہ ابھی تک کڑوے لہجے میں بول رہا تھا۔

"میں کھانا اچھا نہیں بناتی؟" شفا نے شاید اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ شکوہ کیا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا۔ آپ بہت اچھا کھانا بناتی ہیں مگر وہ بس میرے ہی کھانے کے لائق ہوتا ہے اوروں کے نہیں۔" انس کا سابقہ جلا کٹا لہجہ برقرار تھا۔ شفا کے دل کو ایک مرتبہ پھر دھکا سا لگا تھا۔

"آپ کو ابھی تک غصہ ہے؟" اس نے گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میری مجال ہے جو آپ پر غصہ کروں۔ اب برائے مہربانی مجھے کام کرنے دیں اور مزید مراقبہ فون بند کر کے فرمائیں۔" اس نے کھٹاک کے ساتھ فون بند کردیا تھا جبکہ شفا ہونٹ چباتی بمشکل آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہوتی کچن کی طرف آگئی تھی' پھر انس کے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے کھانا پکانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اسے انس کو خوش کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔



یہ ستاروں بھری گلابی سی شام تھی۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی کونپلوں پر شگوفے کھلنے لگے تھے۔ ہواؤں میں خنکی نہیں تھی۔ اب ہلکی ہلکی تپش سی محسوس ہوتی تھی۔ سورج سارا دن کی گرماہٹ کے بعد شام کے بعد ٹھنڈا سا تاثر بخش جاتا تھا۔

آج شفا بہت عرصے بعد نک سک سے تیار ہوئی تھی۔ یوں کہ انس بھی ٹھٹکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے شفا کی تیاری اچھی لگی تھی۔ یہ اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثر سے پتا چل گیا تھا۔ صبح والی بدمزگی کا شائبہ اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا۔ انس کے

موڈ کو بحال دیکھ کر شفا کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ نما روشنی پھیل گئی تھی۔

اگرچہ انس کی تمام تر خوش دلی کا اصل کریڈٹ محسن اور اس کی بیوی کو جاتا تھا، جن کی آمد نے انس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلادی تھی۔

مگر ہوا کچھ اس طرح کہ محسن اور مہک کے آنے سے دس منٹ پہلے انس کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں منظر سے ہٹنا پڑا تھا۔ اور انہی دس منٹ کے دورانیہ محسن اور مہک چلے آئے تھے۔

شفا کو اکیلے ہی مہمانوں کو ویلکم کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ امی موجود تھیں تاہم انس کے بغیر اسے نجانے کیوں ہر چیز میں خالی پن محسوس ہوتا تھا۔

اس نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں شفا کو بتایا تھا۔

"بھابھی! میں میٹرک میں تین بار اور انٹر میں لگ بھگ چار سال ضائع کرنے کے بعد امریکا بھاگا تھا۔ انس تو مجھ سے اور عمار سے بہت جونیئر تھا مگر جب یہ ہماری کلاس میں پہنچا تب محلے داری کی وجہ سے اور کلاس فیلو ہونے کے ناطے ہماری بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔"

بات بہ بات شگوفے چھوڑتا ہنستا کھلکھلاتا محسن امی کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا اور دل میں بات رکھنے والی تو وہ ہرگز نہیں تھیں، سو کچھ دیر تک تو محسن کی پھلجھڑیاں، امریکا کے قصے، ڈالرز کی چکا چوند کے بارے میں خاموشی سے سنتی رہیں مگر پھر ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔

"محسن بیٹا! تم پہلے تو ایسے چھچھورے نہ تھے۔"

اور وہ امی کی بات پر برا ماننے بغیر چھت پھاڑ قہقہے کے بعد بمشکل بولا۔

"آپ بھی کہاں بھولی ہیں خالہ! وہی ہر بات منہ پر دے مارنے والا آپ کا پرانا اسٹائل ابھی تک برقرار ہے۔" ہیجان آمیز قہقہے پر قابو پا کر وہ اپنی خاموش بیٹھی بیوی کو کوئی پرانا قصہ سنانے لگا تھا۔ اور بولتے ہوئے اس کی آنکھوں اور ٹھوڑی کے نیچے لٹکا سیاہ ماس مسلسل پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔

"خالہ کا ڈنڈا بڑا مشہور تھا۔ مجال ہے جو انس دوستوں کی محفل میں بیٹھ جاتا یا کبھی آوارہ گردی کرنے نکل جاتا۔" محسن اپنے سابقہ خوشگوار لہجے میں ماضی کی گرد جھاڑ رہا تھا اب امی نے کافی چمک کر کہا تھا۔

"دوست سارے اس کے عمر میں بڑے انس ان میں معصوم سا بچہ۔ وقت سے پہلے اسے بڑا کردیتے۔ کیا میں نہیں جانتی دوستوں کی محفلوں میں کیا ہوتا ہے۔" امی کا کرارا سا جواب سن کر محسن قدرے جھینپ گیا۔

"ویسے کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔ انس کو آپ نے خوب بچا بچا کر رکھا ہے۔"

امی سر جھٹک کر خاموش بیٹھی مہک سے مخاطب ہوئیں۔ امی کے ساتھ ساتھ شفا کو بھی مہک کی خاموشی خاصی کھٹک رہی تھی۔ وہ عجیب بے چین سی بیٹھی تھی۔ ادھر ادھر بے قراری سے دیکھتی ہوئی نجانے کی تلاش کررہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی! کوئی چیز کھو گئی ہے کیا؟" امی کے براہ راست سوال نے مہک کو بوکھلا دیا تھا۔ وہ محسن کے مقابلے میں بہت خوبصورت اور کم عمر تھی۔ کچھ اسے پہننے اوڑھنے کا بھی خوب سلیقہ تھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی۔

"شاید چیز تو کھو ہی گئی۔" اس کا جواب سب کو تعجب میں مبتلا کرنے والا تھا۔ مگر امی اور شفا کے علاوہ محسن چونکے بغیر خواہ مخواہ ہنسنے لگ گیا تھا۔ گویا اسے بات بے بات ہنسنے کی بیماری تھی۔

"کیا کھویا ہے بیٹی! کوئی لونگ، چھلا، یا بالی؟"

"بہت قیمتی چیز کھوگئی ہے آنٹی! آپ سمجھ نہیں سکیں گی۔" اس کے فلسفیانہ کلام نے امی کو خاصا الجھا دیا تھا۔ شفا کچھ دیر کے لیے اٹھ گئی تھی۔ جب کولڈ ڈرنکس لے کر واپس آئی تو امی بڑی کڑی نظروں سے

مہک کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کیوں نہ سمجھ سکے گی۔ یہ بال دھوپ میں سفید تھوڑی کیے ہیں۔" امی کی عقابی نگاہ سے بچنا محال تھا۔ مہک بری پھنسی تھی مگر اس وقت انس کی آمد ہوئی۔ اور انس کے آتے ہی گویا محفل کا رنگ بدل گیا تھا۔ محسن کے چٹکلوں اور مہک کی گنگناتی ہنسی کی آوازوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔

شفا تو حیران رہ گئی تھی۔ انس کی نہ صرف محسن کے ساتھ بلکہ مہک کے ساتھ بھی بے انتہا بے تکلفی تھی۔ وہ لوگ ایسے گفتگو کررہے تھے گویا صدیوں سے میل ملاقات ہو۔ اب محسن سے زیادہ مہک بول رہی تھی۔ اور گن گن کر پاکستان کے مسائل کو نشانہ بنارہی تھی۔

"پاکستان میں بندے کا کوئی فیوچر ہی نہیں۔" مہک نے اکتائے انداز میں کہا۔

"تو بیٹی! تم نے کون سا پاکستان میں رہنا ہے۔ تمہیں کا ہے کی فکر۔" امی سے پاکستان کی برائی برداشت نہیں ہوپائی تھی۔ شفا ان کی باتوں کے دوران کھانا لگانے کے لیے اٹھ آئی۔ اس کے پیچھے امی بھی بڑبڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر آگئیں۔

"پہلے گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہی تھی اب ایسے زبان فراٹے بھر رہی ہے کہ۔ فرنگن نہ ہو تو۔ پاکستان میں فیوچر نہیں، بجلی نہیں، پانی نہیں۔ تو پھر لینے کیا آئی ہو۔" وہ خاصی جلی ہوئی تھیں۔

"شفا بیٹی! میں اپنے کمرے میں ہوں۔ مونس کو میرے پاس لٹادو، اور شہزادی کو بھی ادھر بھیج دو۔ میں کھانا کھلا کر دونوں کو سلادیتی ہوں۔ یہ دیسی انگریز تو جانے کب جائیں گے۔ بچوں کی مت ماری جائے گی۔" امی بولتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ اس کو بھی ان کے مشورے میں سہولت نظر آئی۔

کھانے لگانے اور مہمانوں کو کھلانے کے دوران مسلسل گھن چکر بنی شفا کے لیے محسن کے تعریفی جملے بڑے انمول تھے۔ وہ کھانا کھانے کے دوران بہت کھلے دل سے اس کو سراہ رہا تھا۔

"بھابھی! یقین مانیے، پچھلے بارہ سال سے گھر کا بنا کھانا نہیں کھایا۔ جانے اگر پزا، برگر، سینڈوچ یا نوڈلز نہ ہوتے تو ہم جیسوں کا کیا بنتا۔" وہ چکن بریانی سے انصاف کرتے ہوئے کھلے دل سے کھانے کی تعریف کررہا تھا۔ آج کھانا واقعی بہت لذیذ بنا تھا یوں کہ امی نے بھی خاصی تعریف کردی تھی پھر مہمانوں کو بھی کھانا پسند آیا تھا سو شفا کی محنت وصول ہوگئی تھی۔ سب کے تعریفی جملوں پر مسکراتی شفا نے انس کی طرف غیر ارادی طور پر دیکھا تو قدرے چونک گئی۔ اسے انس کے تاثرات خاصے سنجیدہ لگے تھے۔ وہ کھانا تو کھا رہا تھا مگر انتہائی بے دلی کے ساتھ۔ شفا کھٹک سی گئی۔ جانے اسے کون سی بات بری لگی تھی۔ کھانے کے بعد چائے بنانے کے دوران بھی وہ فکر مندی سے انس کے رویے اور انداز پر غور و فکر کررہی تھی۔

چائے کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں آئی تو ایک دفعہ پھر انس کو سابقہ موڈ میں گفتگو کرتے دیکھ کر مطمئن ہوگی۔

"میں تو کہتا ہوں لعنت بھیجو جاب پر، ہمارے ساتھ نکل چلو یورپ، لائف کا مزا دوبالا ہوجائے گا۔ پانچ دس سال جم کر کماؤ اور پھر آرام سے کھاؤ۔" محسن اس کا کندھا تھپک کر ایک نئی اور بالکل الگ راہ دکھا کر انس کی آتش شوق کو ہوا دے رہا تھا۔ شفا کا دل لمحہ بھر کے لیے بند سا ہونے لگا۔

انس سے دوری کا خیال بھی عذاب تھا۔ کجا کہ اسے اتنی دور بھیج دینا۔ محسن کے اکسانے پر مہک بھی گویا بات کو طول دینے لگی تھی۔

"انس! محسن ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں تو کوئی فیوچر نہیں۔ تم چند ہی سالوں میں سیٹلڈ ہوجاؤ گے۔" مہک بے تکلفی سے انس کے کندھے پر ہاتھ رکھے بول رہی تھی۔ یہ بے تکلفی خاصی بے ضرر قسم کی تھی۔ تب ہی انس یا محسن نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر شفا کو اس کا بے تکلفانہ انداز اور منہ پھاڑ کر انس کا نام لینا کچھ بھایا نہیں تھا۔

"نہیں یار! میں کہاں باہر جاسکتا ہوں۔ امی کی

طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور پھر بچے چھوٹے ہیں۔ شفا اکیلے سب کچھ مینیج نہیں کرپائے گی۔" انس نے کچھ سوچ کر نفی میں سرہلادیا۔

"دو چار سال کی بات ہے۔ بعد میں تم بچوں اور بھابھی کو پاس بلالینا۔" محسن کے مخلصانہ مشورے کے ایک کے بعد ایک پھسل رہے تھے۔ مگر انس تذبذب کا شکار تھا۔

"اور ان دو چار سالوں میں ماں ہی نہ رہی تو.... وہ مجھے لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں اور پھر پردیس جاکر جانے کتنے سال لگ جائیں۔ واپس آنا ہو یا نہ ہو۔" انس حقیقت سے نظر نہیں چرا سکتا تھا۔ اس کے جواب نے محسن کو گویا قائل کرلیا تھا۔ مگر مہک قدرے بے چین ہوگئی۔

"اللہ تعالیٰ آنٹی کو سلامت رکھے۔ تم ان کی فکر کیوں کرتے ہو۔" مہک نے ایک مرتبہ پھر اپنا نازک سا قیمتی انگوٹھیوں سے سجا ہاتھ انس کے کندھے پر رکھا۔ وہ تینوں تھری سیٹر صوفے پر بیٹھے تھے۔ مہک کچھ دیر پہلے ہی اٹھ کر ان کے قریب بیٹھی تھی۔ شفا سے یہ چبھن دیتا منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔

"یہاں شفا تو ہوگی نا۔ آنٹی کو سنبھال لے گی۔ پھر جب کھلا پیسہ آئے گا تو سارے مسائل ایک فون کال پر حل ہوتے جائیں گے۔" مہک کا ارادہ اسے قائل کرنے کا تھا اور شاید پہلے بھی ان تینوں کے درمیان یہ موضوع زیر بحث رہ چکا تھا۔ شفا کی الجھن حد سے سوا ہوگئی تب اس نے بے قراری سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ لوگوں کی چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے اور لے آؤں؟" انہیں موضوع کے اصل متن سے ہٹانے کے لیے اس سے بہتر شفا کو کوئی حل نظر نہیں آیا تھا۔ سوٹرے اٹھائے خود بھی کھڑی ہوگئی تھی۔ مگر محسن نے اسے اچانک روک دیا۔

"چائے پھر کسی روز پی لیں گے بھابھی! اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ رات کافی ہوگئی ہے، اب چلتے ہیں۔ انس سے اس موضوع پر بعد میں بات ہوگی۔"

مہک کی خواہش کے برعکس جب محسن نے گھر چلنے کے لیے کہا تب شفا نے واضح طور پر مہک کے چہرے پر ناگواری دیکھی تھی۔ شاید وہ ابھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر یہاں رکنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ سو اسے دل مسوس کر جانا ہی پڑا تھا۔



رات بہت دیر تک کچن کا پھیلاوا سمیٹنے اور پھر انس اور شہزادی کے کپڑے پریس کرنے کے بعد شفا کمرے میں آئی تو انس کو جاگتا پاکر قدرے حیران ہوئی تھی۔ وہ دیر تک جاگ ہی نہیں سکتا تھا۔ چھٹی والے روز بھی جلدی سوتا اور جلدی اٹھتا تھا۔ مگر اس وقت اسے جاگتے دیکھ کر شفا کو خاصا تعجب ہوا تھا لیکن اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کمرے میں آکر بستر وغیرہ سیٹ کررہی تھی۔ جب انس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"محسن بہت بدل گیا ہے۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اب شفا بھلا اس بات پر کیا تبصرہ کرتی۔ محسن کو اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"پیسہ پاس ہو تو بندے میں کتنی تبدیلی آجاتی ہے۔" انس اپنے سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ محسن سے متاثر نہیں تھا۔ تاہم وقت کی بدلتی کروٹ پر حیران ضرور تھا۔

"اللہ بھی کیسے کیسے لوگوں پر مہربان ہوتا ہے۔ تم نے دیکھی محسن کی بیوی۔ کیسی گلیمرنگ پرسنالٹی ہے اس کی۔ سویلائزڈ، ایجوکیٹڈ، پولائٹ.... ورنہ تم کبھی محسن کی فیملی کو دیکھتیں اور اب اس کے آوارہ بھائی اپنا ریسٹورنٹ چلا رہے ہیں امریکا میں۔" انس کا انداز سراہنے والا تھا۔ مگر انس کی تعریفوں کا دائرہ مہک کے آس پاس ہی گھوم رہا تھا۔ "مہک نے محسن سے نہ جانے شادی کیسے کرلی ہے۔ بڑا نخرہ ہے اس میں، محسن بے چارہ تو شروع سے گائے ٹائپ تھا۔ اسے انس کے منہ سے مہک کی تعریفیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

"میں تو مہک سے مل کر خاصا حیران ہوا ہوں۔ بہت کانفیڈنٹ ہے اس میں۔ تم تو گلی کی نکڑ تک اکیلی

نہیں جا سکتیں اور وہ محترمہ نہ جانے ہر سال کس کس ملک کی خاک چھان آتی ہیں۔"

پھر اچانک کچھ خیال آنے پر وہ ذرا چونکا تھا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود ہی بولے جا رہا ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے۔

وہ اس وقت بھی اسے خاموش دیکھ کر چڑ گیا۔

"گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ذرا سا ہنس بول لیتیں تو کیا حرج تھا۔ کیا سوچتی ہوگی مہک کہ کتنی بد اخلاق ہو تم..... جتنی دیر وہ لوگ یہاں رہے ہیں، تم منہ بند کیے بیٹھی رہیں۔ کبھی مہک کے گھر جا کر دیکھنا اپنے اعلا اخلاق، خوش مزاجی اور ہنس مکھ طبیعت کے باعث کیسے محفل کے اندر جان ڈال دیتی ہے۔" انس کی توپوں کا رخ اچانک شفا کی طرف ہو گیا تھا اور وہ انس کو غصے میں دیکھ کر بوکھلا گئی۔

"میں بول تو رہی تھی۔" اس نے منمنا کر کہا تھا۔

"دیکھ رہا تھا میں۔ ایسے بیٹھی تھیں جیسے کسی نے گن پوائنٹ پر روک رکھا ہے۔" انس کا غصہ کسی طور پر کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں، میں آپ کی بے کار بحث سن رہی تھی۔" شفا نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔ انس بے کار بحث پر ایک دم چونکا۔

اس نے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کون سی بے کار بحث؟"

"وہ ہی امریکا کے ستارے دیکھنے والی۔" شفا نے ناگواری سے کہا۔

"او..... اچھا، کیسے بے کار بحث تھی؟" انس کی دلچسپی ایک دم دیکھنے کے لائق تھی۔ اس کی آنکھوں میں شوق کا جہان آباد ہو گیا تھا۔

"ہر لحاظ سے ہی بے کار تھی۔" شفا نے سابقہ روکھے انداز میں کہا۔

"محسن کے مشورے بہت درست تھے۔" جانے وہ شفا کے منہ سے کیا سننا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری پر غور کرتے وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

"کیا اچھے فیوچر کے لیے مجھے امریکا نہ سہی، اٹلی، فرانس، اسپین کے لیے اپلائی نہیں کرنا چاہیے؟" وہ بہت سوچ سوچ کر اور تول تول کر بول رہا تھا۔

"ضرور کرنا چاہیے۔ بلکہ آپ محسن اور مہک کے ساتھ ہی امریکا نکل جائیں۔ روپیہ پیسہ آئے گا۔ میں بھی کھلا خرچوں گی۔ لیاقت صاحب کے مقابلے پر گلی میں ہنڈا سوک کھڑی ہوگی، عالی شان محل بنائیں گے اور میں، میرے بچے، ہم سب جائیں بھاڑ میں۔" اس کے دماغ میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ مہک کی بے تکلفی کے منظر یاد کر کے اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ انس اسے خاموش دیکھ کر ایک دفعہ پھر چڑ رہا تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"میں کیا جواب دوں؟ پہلے بھی آپ اپنی مرضی کرتے ہیں۔ اب بھی اپنی ہی مرضی کریں گے۔" وہ جز بز سی ہو کر جواب دیتی اٹھ گئی تھی۔ ادھر اس کے جواب کو مکارانہ جواب سمجھ کر انس آگ بگولا ہو رہا تھا۔

"میسنی، گھنی..... صاف صاف نہیں کہہ سکی، میری نظر سے دور ہو جاؤ۔ کل کے جاتے آج ہی نکلو۔ چار، پانچ سال تو آنا ہی نہ..... میں وہاں دھکے کھاؤں..... اور یہ یہاں عیش و عشرت میں زندگی گزارے۔ ہونہہ، جانتا ہوں میں ساری چالاکی کو....." غصے میں بل کھاتا وہ مٹھیاں بھینچے ضبط کے کڑے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ شفا اس کی سوچوں سے بے نیاز اپنی پریشانی میں الجھی بیٹھی تھی۔

"یہ محسن اور مہک جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں۔ انس کا ذہن باہر جانے کے لیے بن گیا تو پھر بھلا کون روک پائے گا انہیں۔ وہ گیلی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ انس اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ دیکھ کر جل بھن رہا تھا۔

"ابھی سے خواب دیکھنے لگ گئی ہے۔ ہونہہ..... امریکا جاتی ہے میری جوتی۔ میں کیوں اپنی ماں اور بچوں کو چھوڑ کر پردیس میں دھکے کھاؤں۔ یہ تو میرے چلے جانے کے بعد شکرانے پڑھے گی۔" اس کا دل شفا سے

کچھ اور کھٹا ہو گیا تھا۔ ذہن میں عجیب آگ سی لگی تھی۔ اس کی آنکھ لگنے لگی مگر کچھ ہی دیر بعد اسے شفا کی آواز سنائی دی۔

"انس۔۔۔ انس۔۔۔" وہ اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔

"کیا ہے؟" انس گویا پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

"وہ بچوں کو تو اٹھا لائیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"رہنے دو ادھر ہی۔" انس نے غصے میں کروٹ بدل لی۔

"وہ امی کو تنگ کریں گے۔ مونس رات کو اٹھتا ہے۔" شفا نے لجاجت سے کہا۔ مگر انس ٹس سے مس نہ ہوا۔

"انس! آپ سن رہے ہیں۔" وہ منمنا رہی تھی۔

"نہیں، میں بہرہ ہو چکا ہوں۔" انس نے تنک کر کہا۔ "اور تم پلیز! پہلے کی طرح گونگی ہو جاؤ۔ میرے سونے کے وقت ہی تمہیں ساری ضروری کانفرنسیں یاد آتی ہیں۔" وہ جل بھن رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ سو جائیں۔" اپنی ناقدری پر ایسے ہی اس کا دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔

اس نے تکیہ بھی منہ پر رکھ لیا۔

شفا کی آنکھیں بہنے لگیں۔ "اس کا اخلاق، رکھ رکھاؤ، حلیم مزاجی کے گیت گائے جا رہے ہیں اور میں جو اتنے سال سے بے زبان جانور کی طرح جی حضوری میں لگی ہوں، میرے لیے تعریف کے دو لفظ نہیں۔۔۔ کیسے دہرے معیار ہیں۔۔۔ دو رخے چہرے، باتیں، لفظ۔" اس کا دل دکھ کی اتھاہ میں ڈوب رہا تھا۔ شاید جذبات کی شدت سے ایک آدھ سسکی نکل گئی تھی جو انس نے منہ پر سے چادر ہٹا کر شفا کی طرف دیکھا اور کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھا۔

"اب کس بات کا ماتم کر رہی ہو؟" وہ آگ بگولہ ہو کر بولا۔

شفا سوں سوں کرتی رہ گئی۔ انس اس کی خاموشی پر پھر چڑا۔

"کیا ہوا ہے۔ کیوں رونا مچا رکھا ہے؟"

"آنکھ میں کچھ لگ گیا ہے۔" جلدی جلدی منہ پر دوپٹہ رگڑتے ہوئے اس نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔

"کیا لگ گیا ہے؟" وہ کچھ فکرمند ہوا۔ "میری طرف منہ کرو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا تھا۔ سرخ آنکھیں، بھیگی پلکیں اور سرخ انار جیسے گال دیکھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

"کیوں روئی ہو؟" پہلے جیسی تندی لہجے میں نہیں تھی۔

"ایسے ہی۔" شفا بتا نہیں سکی تھی کہ اسے کس کس بات پر رونا آ رہا تھا۔ مہک کی تعریفوں پر، انس کی بے حسی پر، اس کے امریکا چلے جانے کے خوف سے، یا مہک کی چبھن دیتی اس بے تکلفی پر جو۔۔۔ مگر انس کے پوچھنے پر اس نے یکسر الگ بات کہی۔

"مجھے ممی یاد آ رہی ہیں۔" اسے پھر رونا آ گیا۔

"شاباش۔۔۔" وہ چڑ کر رہ گیا تھا۔ "رات کے اس پہر اتنی دور بیٹھی ممی کو سوچ رہی ہو، پاس بیٹھا چھ فٹ کا بندہ تمہیں نظر نہیں آتا۔ اچھا بھلا تمہارے آنسوؤں سے پگھل رہا تھا۔ خوامخواہ ممی کا ذکر چھیڑ کر موڈ خراب کر دیا۔" انس کا لہجہ اور انداز فوراً" بدل گئے تھے۔ اس کی گلابی آنکھیں، معصوم سا چہرہ۔۔۔ انس کو شادی کے اوائل دن یاد آ گئے تھے۔ تب بھی وہ ممی کی یاد میں ایسے ہی آنسو بہاتی تھی۔ انس تب بھی اس کے آنسوؤں پر بوکھلا جایا کرتا تھا۔

"تم ممی سے فون پر بات کر لو۔" انس کو فوری طور پر کوئی متبادل حل نظر نہیں آتا تھا اور اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنا بن سنور کر اسے بھلا ممی کو یاد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ اگر وہ ذرا سا غور کر لیتا تو اس کے سمجھ میں آ ہی جاتی۔ جو لڑکی اپنے سب بھائیوں، بہنوں سے لاڈ اٹھواتی اس کے گھر وداع ہو کر آ گئی تھی۔ جسے کچن کے کاموں کی سوجھ بوجھ ہی نہیں تھی۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کچن میں گھس کر اتنی محنت مشق کر کے اپنے میکے کے خانساماؤں کو فون کھڑکا کھڑکا کر کھانے کی ترکیبیں پوچھ کر اس کے لیے مزے مزے کے کھانے بناتی تھی۔ پھر تین، تین گھنٹے اپنی

تیاری میں ضائع کرتی اور اسے بدلے میں اک نظر ستائش نہ ملتی تو پھر اس نے ممی کی یاد کے بہانے رونا ہی تھانا۔

دراصل انس کے مزاج میں تبدیلی تب آئی تھی 'جب وہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ سسرال گیا تھا۔ چونکہ رشتہ بدل چکا تھا۔ سو ایک فطری سی جھجک محسوس ہو رہی تھی اسے۔ وہ جتنا زیادہ شفا کو پا کر خوش ہوا تھا۔ اتنا ہی زیادہ سسرال میں آکر بدمزا ہوا۔ شروع شروع میں اس کی ساس اور سالیوں کا رویہ اس کے ساتھ خاصا ہتک آمیز ہوتا تھا اور جو ولیمہ کے بعد اس کے کانوں میں "ہماری شفا بہت لاڈلی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔" انڈیلا گیا تھا' شفا کی بڑی بہن سلویٰ کی ہدایات سن سن کر انس کے کان پک گئے تھے۔

"شفا بہت لاڈلی ہے۔ بہت نخریلی ہے۔ (حالانکہ وہ نخریلی ہرگز نہیں تھی۔ یہ تو محض انس پر رعب ڈالنے کے لیے کہا جارہا تھا۔) شفا بہت الگ مزاج رکھتی ہے۔ تھوڑی سی پراؤڈی ہے۔ چوزی لوگوں سے بات چیت کرتی ہے۔ نازک مزاج ہے۔ اس کا خیال رکھنا' ابھی ناسمجھ ہے۔ گھر کے کاموں کی سوجھ بوجھ نہیں۔ کبھی ہل کر پانی نہیں پیا۔ شفا کو تو کچھ پکانا نہیں آتا۔ کام کاج کے لیے نوکرانی رکھ لینا۔ اگر ہو سکے تو کھانا پکانے کے لیے خانساماں بھی رکھ لینا۔ شفا کو بوڑھی عورتوں کو سنبھالنے کا بھی کوئی تجربہ نہیں۔ اپنی امی کے لیے کسی نرس کی خدمات حاصل کرنا۔"

اتنی لمبی چوڑی ہدایات کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے شفا کی شخصیت کے بارے میں جھوٹ' سچ مبالغہ آمیزی کی حد کرتے ہوئے بتایا تھا اسے سن کر تو انس کے سارے طبق روشن ہو گئے تھے۔ اسے سلویٰ پر بے حد غصہ آیا۔

"اپنی لاڈو رانی کے لیے پھر کسی ڈپٹی کمشنر کو ڈھونڈتا تھا۔ مجھ غریب پر ستم ڈھانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ میں اس پھولوں کے ٹوکرے کو کہاں کہاں اٹھاتا پھروں گا۔" وہ تو بھنا بھنا کر آدھا ہو گیا تھا۔ اس ساری صورت حال پر خوب غور و فکر کیا اس نے اتنی لاڈو رانی' جس نے ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا۔ وہ بھلا انس کے لاڈ پیار پر اور غیر ضروری توجہ پا کر اور کتنی بے کار ہو سکتی تھی۔ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

انس نے تمام مروت بالائے طاق رکھ کر سلویٰ آپا سے سیدھی اور صاف بات کی تھی۔

"عورت کو اسٹرونگ اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ چلے' بلکہ اسے ایک گھر کی بنیاد اٹھانے' اس پر عمارت کھڑی کرنے کے لیے مضبوط بنایا جاتا ہے۔ میں ہر کام کے لیے الگ الگ نوکر افورڈ نہیں کر سکتا اور نہ ہی مجھے بیڈ روم سجانے کے لیے بیوی چاہیے تھی۔ آپ یقیناً" سمجھ رہی ہیں میری بات۔ افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں شفا میرے معیار پر پورا نہیں اترتی۔"

انس کے دوٹوک 'کاٹ دار لفظ صرف سلویٰ کے ہی نہیں' بلکہ شفا کے دل میں بھی ترازو ہو گئے تھے۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سلویٰ آپا اور انس کے درمیان کون سی بحث چل رہی ہے۔ اسے بس یہ خبر ہوئی تھی کہ وہ انس کے معیار پر پورا نہیں اتر سکی۔ تب شفا کی خودداری' انا' وقار' عزت نفس کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ اسے اتنی زور کی ٹھوکر لگی تھی کہ آج چھ سال بیت جانے کے بعد بھی وہ درد' وہ تکلیف' وہ زخم ابھی تک ہرا تھا۔ وہ انس کے معیار پر پورا نہیں اتر سکی۔ جانے انس کا معیار کیا تھا؟ اس کی پسند کیا تھی؟ مگر انس کے ان لفظوں سے لہولہان شفا دوبارہ کبھی خود سے بھی نظر ملا کر کھڑی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی' سلیقہ' رکھ رکھاؤ سب اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ بہت اچھا کھانا نہیں بنا سکتی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے کچھ پکانا آتا ہی نہیں تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے نوکر تھے اور بڑی بہنوں کی موجودگی میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ مگر یہ بھی نہیں تھا کہ اسے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ اسی نے خود کو اتنا بدلا کہ خود بھی حیران رہ گئی۔

سلویٰ آپا کے طویل ہدایت نامے پر غور و فکر کے بعد جو انس دوبارہ شفا کے سامنے آیا تھا۔ وہ پہلی اور

دوسری رات سے قطعاً" مختلف انس تھا۔
شادی کے پانچویں روز اس نے شفا کو کچن کی راہ دکھادی۔
سلویٰ آپا نے انس کو شفا کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی لاڈلی بہن بہت سیدھا مزاج رکھتی ہے اور وہ بہت کم گو ہے۔ حالانکہ اس کی کم گوئی کے بارے میں انس کو سب سے پہلے بتانا چاہیے تھا مگر یہیں بھول ہو گئی۔ سو گزرتے وقت کے ساتھ انس کو شفا سے جو پہلا شکوہ ہوا تھا۔ وہ اس کی کم گوئی ہی تھی۔
انس نے کہا اسے گھر کی فضا پرامن چاہیے۔ وقت گواہ تھا کہ آج تک کسی نے شفا کی اونچی آواز نہیں سنی تھی۔
گھر کی خاموش فضاؤں میں شہزادی اور مونس کی چہکاروں نے ہلچل مچادی تھی۔ شفا' انس کے روکھے رویئے اور بے اعتنائیوں کو سہتے سہتے عادی ہو چلی تھی۔
شفا کو سدھارنے کے لیے جو انس نے اپنا مزاج بدلا تھا تو اب خود بخود اس کے مزاج کی تلخی شخصیت کا خاصہ بنتی چلی گئی تھی۔ حالانکہ رابی کو اس کے بھائی کے ساتھ بیاہ کر انس میں ایک دفعہ پھر تبدیلی آئی تھی مگر یہ تبدیلی اتنی غیرواضح تھی کہ کوئی اسے محسوس نہیں کر سکا تھا۔
انس کے دھوپ چھاؤں جیسے کبھی سخت' کبھی نرم رویوں میں وقت بہت سبک رفتاری سے گزر رہا تھا۔ مگر اس بہتی ندی جیسے رواں وقت میں فرق مہک اور محسن کی آمد سے پڑا تھا۔



خوب صورت سی نرم نرم سہ پہر کا وقت تھا۔ دیواروں سے لپٹی دھوپ ابھی تک لشک رہی تھی۔ اب دن جلدی نہیں ڈھلتا تھا۔ دھوپ بہت دیر تک آنگن میں چکراتی تھی۔ آج موسم کے مزاج میں بہت تلخی نہیں تھی۔ وہ بچوں کو سلا کر آنگن میں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ انس معمول سے کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں پریشان ہوتی وہ دو' تین مرتبہ گیٹ سے باہر بھی جھانک آئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ انس کو اگر آفس میں دیر ہو جاتی تھی وہ ضرور فون کر کے اطلاع دے دیتا تھا۔
اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی وہ ایک دفعہ پھر گیٹ تک آئی تھی۔ اسی وقت گیٹ پر اک نئی نکور چمکتی گاڑی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ مگر دوسرے ہی پل اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند جگمگانے لگا تھا۔ گاڑی سے اترنے والا اس کا بھائی خیام تھا اور اس کے ساتھ رابی کو دیکھ کر شفا مارے مسرت کے گنگ رہ گئی تھی۔
"امید نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر صدمے سے مجسمہ بن جاؤ گی۔" خیام کی کھلکھلاتی آواز نے شفا کو سنبھلنے کا موقع دیا تھا۔ پھر رابی اور خیام سے مل کر جب وہ اوپر آئی۔ تب ہی انس بھی اچانک گھر آگیا تھا۔ خیام اور رابی کے سرپرائز پر اس کے تاثرات بھی کم و بیش شفا جیسے ہی تھے۔ بہن کو خوش دیکھ کر وہ بھی بہت خوش تھا۔ رابی کی اچانک آمد نے گھر کا ماحول بدل دیا تھا۔
"بہت دل گھبراتا تھا بھابھی! حالانکہ وہاں ممی' بہت خیال رکھتی ہیں۔ مگر ماں کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ اگرچہ امی نے کرنا تو کچھ بھی نہیں۔ مجھے ہی ہولاتے رہنا ہے۔ پھر بھی سوچا' پہلی دفعہ امی کے پاس ہی چلی جاؤں۔ خیام تو مانتے نہیں تھے' بس میں نے منا ہی لیا۔" رابی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ شفا کو بتا رہی تھی۔ پھر —— خیام کی محبت اور سسرال والوں کی تعریفیں۔ وہ بہت خوش تھی اور اسے خوش دیکھ کر امی اور انس بہت خوش تھے۔ اسے رابی کو مسرور دیکھ کر اپنا آپ سرخرو محسوس ہو رہا تھا۔
"تو پھر تم نے خیام کو کیسے منایا۔ مجھے بھی کوئی ٹپ' کوئی گر سکھا دو۔" شفا نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اسی وقت اچانک انس نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔
"گر سیکھنے والی تمہاری عقل ہوتی تو اور کیا چاہیے تھا۔" اگرچہ اس نے سادہ انداز میں ہی بات کی تھی۔

تاہم شفا کو سراسر اس کا لہجہ تمسخر اڑاتا لگا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں، شفا بھابھی جیسا تو کوئی بھی نہیں۔" رابی نے فوراً اس کی طرف داری کی تھی۔ وہ شادی سے پہلے جتنی دبو سی کم گو تھی۔ اب ایسی نہیں رہی تھی۔ شاید یہ خیام کا بخشا ہوا اعتماد تھا، جو اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا۔

"تم تو شفا کی سائیڈ ہی لوگی۔ آخر تمہاری نند بھی تو ہے۔" انس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ "اگر خوشامد نہیں کروگی تو شفا اپنے بھائی سے کہہ کر تمہاری کٹ بھی لگوا سکتی ہے۔" وہ رابی کو چھیڑ رہا تھا اور شفا کو لگ رہا تھا۔ شاید وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔

"میرا بھائی ایسا کانوں کا کچا نہیں۔" جانے کیسے شفا کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔ تب انس نے گویا اس کا ریکارڈ لگا دیا۔

"تو کیا رابی کا بھائی کانوں کا کچا ہے؟" وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے شفا کا بولنا بہت اچھا لگا تھا۔ چلو کسی بھی بہانے سے سہی، وہ بولی تو تھی نا۔

"تم نے رابی سے کیا گر سیکھے ہیں؟ میں تو اس کا بھی استاد ہوں۔ مجھ سے سیکھ لو۔" انس کی شوخیاں عروج پر پہنچی تھیں۔ شاید خیام کی چونچالی اب انس میں منتقل ہو گئی تھی۔ کیونکہ خیام ہزار مرتبہ انس، شفا اور رابی کو جتا چکا تھا۔

"تم تینوں انتہائی بور شخصیات ہو۔"

"اور تم خود کیا ہو۔" انس نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

"یہ شعبدہ بازوں کی ساری خصوصیات رکھتے ہیں۔" رابی نے بھی ہنستے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ تب انس کو رابی کے دوبدو بولنے اور حاضر جوابی پر اچھو لگ گیا تھا۔

"ویسے رابی! تمہاری زبان کے تو سارے زنگ اتر گئے ہیں۔"

"یہ سراسر میرا کمال ہے۔" خیام نے مصنوعی کالر اکڑائے تھے۔ انس خاصا متاثر نظر آنے لگا تھا۔

"تمہاری بہن کو ہنسنا اور بولنا بھی سکھا دیا ہے۔ اب یہ ہر فن میں ماہر ہے۔ میری بڑی بہنوں کے ساتھ پورا پورا مقابلہ کر سکتی ہے۔" خیام کی شرارتی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تب رابی نے بے حد ناراضی سے کہا تھا۔

"میری مجال ہے جو میں بڑی آپیوں کے ساتھ مقابلے کرتی پھروں۔ کچھ ہوش کے ناخن لیا کریں۔" رابی کے خفگی دکھانے پر خیام بے ساختہ ہنس رہا تھا۔ شفا بھی ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"رابی میری سنگت میں تھوڑی مسخری ہو گئی ہے۔ جبکہ شفا تمہاری ہمراہی میں کچھ زیادہ ہی بردبار، سنجیدہ ٹائپ، جس بات پر قہقہہ لگانا ہوتا ہے اس پر یہ صرف مسکراتی ہے اور جس پر مسکرانا ہوتا ہے یہ بس منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔" خیام کے تجزیہ نے انس کو چونکا دیا تھا۔ وہ بے ساختہ ٹھنڈی آہ بھر کے بولا۔

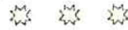
"میرے زخموں کو چھیڑ ڈالا ہے ظالم!"

"تو ان زخموں کا کچھ علاج کرو۔" خیام نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ وہ ان دونوں کے درمیان عجیب سی اجنبیت کی دیوار کھڑی محسوس کرکے قدرے متفکر تھا۔ تب ہی اس نے واپس آنے سے قبل موقع پا کر اپنے خدشے کا اظہار کر دیا تھا۔ شفا کچھ پل کے لیے خیام کے درست اندازے پر ساکت رہ گئی تھی۔ مگر پھر نہ جانے کس رو میں اس نے برسوں کے خوف اذیت اور دکھ کے ساتھ انس کے موجودہ رویّے کا بھی ذکر کر دیا تھا۔

"انس کی ناپسندیدگی کے باوجود ان کے ساتھ رہنا میری اپنی خواہش ہے۔ ان کی ہر تلخی کو سہنا، ہر تکلیف کو برداشت کرنا میرے صبر کی آزمائش ہے۔ پر اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں، مگر یہ نہیں۔" وہ لرزتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھے سسک رہی تھی۔ تب خیام نے عجیب سی گھبراہٹ کے ساتھ بہت عجلت میں پوچھا تھا۔

"مگر یہ کیا نہیں؟" اس بات کا جواب شفا نہیں دے سکی تھی۔ پھر پورے دو ماہ بعد اسے اپنی بہن کے

آنسوؤں اور تکلیف کا جواب مل ہی گیا تھا۔



ایک بہت پاکیزہ اور سہانی صبح رالی نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا اور لاہور سے تقریباً" شفا کا پورا میکہ بچے کو دیکھنے پنڈی پہنچ گیا تھا۔ اس کی تینوں بہنیں، ممی، خیام، اپنے سب رشتوں کو اتنے عرصے بعد اکٹھا دیکھ کر شفا پھول کی مانند کھلی جا رہی تھی۔

اس کی شادی کے اتنے سال بعد پہلی مرتبہ اس کی بڑی بہن یہاں آئی تھیں اور وہ سب ہی شفا کے کم آنے پر شکوہ کر رہی تھیں۔

امی نے ان کے شکوؤں کے جواب میں کہا تھا۔

"آپ نے تو شفا کو باندھ ہی لیا ہے۔ اب رالی گھر جاتی ہے تو شفا بھی رہنے کے لیے جائے گی۔" امی کا دو ٹوک فیصلہ سن کر انس قدرے ٹھٹھک گیا تھا۔ وہاں اتنے لوگوں کی موجودگی میں تو اس نے بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا مگر تنہائی پاتے ہی وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

"رالی کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ گی۔ وہ بھی رہنے کے لیے۔ پیچھے ہمارا کیا بنے گا۔" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شفا کے لاہور جا کر رہنے کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ اتنے سالوں میں وہ ایک مرتبہ بھی تو رہنے نہیں گئی تھی۔

"تو کیا میں اپنے میکے نہیں جا سکتی؟" وہ روکھی سی بولی انس کچھ دیر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے۔ جاؤ، شوق سے جاؤ۔" کچھ دیر بعد وہ خفگی سے بولا۔

"تو جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ میرا بھی دل نہیں کرتا ہے، اپنے بہن بھائی سے ملنے کو...." شفا نے رکھائی سے کہا۔

"بہن بھائی سب مل تو گئے ہیں۔" انس تڑخا۔ "ویسے ہی یہاں سے فرار کے بہانے ڈھونڈتی ہو۔" وہ فوراً" ہی بدگمان ہونے لگتا تھا مگر اب کی دفعہ شفا نے پروا نہیں کی تھی۔

"تم فکر مت کرو اچھا۔ میں کچھ دن تک تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ ابھی مت جاؤ۔"

"اس مہربانی کی کوئی ضرورت نہیں۔" شفا نے بھنا کر جواب دیا تھا۔



ان دنوں مہک کے پھیرے بہت بڑھ گئے تھے۔ صرف شفا نے ہی نہیں بلکہ امی اور شازی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ جب بھی آتی، شفا کو امریکا کے قصے سناتی۔ وہاں زندگی کتنی چمک دار ہے، سہولیات کا انبار ہے۔ بجلی، پانی سب کچھ وافر۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کے وظیفے الگ۔

"تم دل بڑا کر لو، انس کو باہر بھیج دو۔ دیکھنا آسائشات کا انبار لگ جائے گا۔ یہ گھٹیا ٹائپ کے کام تمہیں نہیں کرنے پڑیں گے۔"

وہ جواب دیے بغیر اپنے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ تب مہک بے زار ہو جاتی۔

"مجھے لگتا ہے، تم خود ہی ترقی نہیں کرنا چاہتیں۔" مہک مایوس سی ہو جاتی۔

شفا کچھ دنوں سے ایک بات بہت نوٹ کر رہی تھی کہ مہک ہمیشہ اسی وقت آتی تھی، جب انس کے آنے کا وقت قریب ہوتا۔ پھر انس کے ساتھ طویل بحث و مباحثہ چلتا۔ اس دوران وہ کئی کئی کپ چائے بنوا کر پی جاتی تھی۔ انس کے ساتھ اس کی بڑھتی بے تکلفی شفا کا فشار خون بلند کرنے کے لیے کافی تھی۔

خصوصاً" چھٹی والے روز تو مہک اور محسن دونوں ادھر ہی ڈیرا جما لیتے تھے پھر مہک کے فرمائشی پروگرام چلتے۔ کبھی کبھی تھوڑی بہت مدد بھی کروا دیا کرتی۔

امی اور شازی تک اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران تھیں۔

ایک صبح شازی نے آفس کے لیے تیار ہوتے انس کو پکڑ لیا۔

"یہ محسن اور مہک کا کیا معاملہ چل رہا ہے۔" شازی کا لہجہ بے انتہا سنجیدہ اور پراسرار قسم کا تھا۔ انس

کا ماتھا ٹھنکا۔
"کیا مطلب؟"
"ہر وقت تمہارے سر پہ سوار رہتے ہیں۔ آخر ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"
"کچھ ضروری معاملات ڈسکس کرنے ہوتے ہیں تب ہی بے چارے آجاتے ہیں ورنہ ان کے پاس بھلا وقت کہاں ہے۔" انس نے لاپروائی سے کہا۔ ابھی شازی نے مزید کچھ پوچھنا تھا۔ مگر انس کے موبائل بجنے پر خاموش ہوگئی کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی جب انس کے منہ سے مہک کا نام سن کر پھر ٹھنک گئی۔
"مہک کو سارے کام تم ہی سے ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا شوہر کہاں ہے۔" انس نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔
"اتنی پرانی محلے داری ہے' پھر دوست ہے میرا۔ اگر میں اس کے کسی کام آجاؤں گا تو اس میں حرج کیا ہے۔" انس کے چہرے پر ناگواری آگئی۔ شازی جزبز سی باہر نکل گئی تھی۔



مہک نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا جس میں زبردستی انس اور شفا کو بھی گھسیٹ لیا۔ شفا کا دل ہرگز بھی مہک کے تفریحی پروگرام میں شامل ہونے کا نہیں تھا۔ مگر انس اور بچے بہت خوش تھے۔ پھر شازی بھی چونکہ ساتھ تھی سو وہ کچھ مطمئن تھی۔
وہ سب اسلام آباد کے بغل میں موجود سید پور گاؤں کے پکنک پوائنٹ "دیس پردیس" میں آئے ہوئے تھے۔ مہک کی باچھیں کھلی پڑی تھیں۔
بڑا خوب صورت اور رومانوی قسم کا ماحول تھا۔ کہیں دور بانسری کی دھن ماحول کو سحر انگیزی بخش رہی تھی۔
گرما گرم سیخ کباب اور ہانڈی گوشت سے پیٹ بھر کے مہک نے پہاڑ پر چڑھائی کا شور مچا دیا تھا۔ مگر محسن نے فوراً" انکار کر دیا۔ وہ بھاری جسامت رکھتا تھا اور کچھ پیٹ بھر کے کھانا کھالینے کے بعد اس سے مزید چلنے اور پہاڑ پر چڑھنے کی ہمت نہیں تھی مگر مہک کی ضد پر محسن نے بہت عاجزی کے ساتھ انس کی منت کی تھی۔
"یار! تم اس کے ساتھ چلے جاؤ۔" وہ اونچے بلند و بالا پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جس کے بیچ سے پتھر کاٹ کر تنگ سی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔
"میں...." انس تھوڑی سی پس و پیش کے بعد مان گیا۔ انس نے ذرا دیر کو رک کے شفا سے کہا۔
"بچوں کا دھیان رکھنا' میں بس ابھی آتا ہوں۔" اس کے چہرے کے کھلے کھلے تاثرات ملاحظہ کرنے کے بعد بھی وہ رکا نہیں تھا۔ شفا خاموشی سے ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی جو برگد کے درخت کی اوٹ سے اوپر چڑھائی کی طرف جارہے تھے۔
شازی برساتی نالہ عبور کر کے دوسری طرف دوکانوں میں تانک جھانک رہی تھی۔ واپس آئی تو شفا کو تنہا بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
"باقی سب کدھر ہیں؟ انس' بچے اور وہ.... ننھی حسینہ۔"
شفا نے گردن موڑے بغیر رکھائی سے بتایا۔
"بچوں کو محسن بھائی مندر دکھانے لے گئے ہیں اور ننھی حسینہ تمہارے بھائی کی بغل میں.... وہ اوپر دیکھو ذرا۔" اس نے دور پہاڑ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تنگ سی سیڑھیوں پر آگے پیچھے انس اور مہک چل رہے تھے اور شاید کسی موضوع پر بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ پھر شاید مہک کا پیر ریپٹ کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ چیخ کر انس کو پکڑا۔ ادھر انس بھی شاید اسے سہارا دینے ہی گیا تھا۔ وہ مہک کا ہاتھ پکڑے سہج سہج اسے چلا رہا تھا۔ شازی سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ شفا پر الٹ پڑی تھی۔
"یہ سب کیا ہے؟ تم نے انس کو کیوں جانے دیا؟"
"وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں گئے۔" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔ انس اور مہک اب ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھے۔ شفا کا دل جیسے بند ہونے لگا۔
جب گھنٹہ بھر مزید گزر گیا تب محسن بھی قدرے بے چین ہوا۔

"ابھی تک واپس نہیں آئے۔" وہ گردن اچکا اچکا کر پہاڑ کی وسعتوں میں انہیں تلاش رہا تھا۔ شازی اس کی بے چینی ملاحظہ کرکے تلخی سے بولی۔

"بھائی صاحب! آپ خود بھی ساتھ چلے جاتے۔ اب وہ تو اپنی مرضی سے ہی آئیں گے۔" اس کی تلخی کے جواب میں محسن کی ہنسی اسے سخت بری لگی تھی۔

"مہک کو ایسے ایڈونچرز کا بہت شوق ہے۔" محسن ان کی معلومات میں اضافہ کررہا تھا۔

"بھاڑ میں گئے ایسے بے غیرت ایڈونچرز۔۔۔ بیوی کو دوست کے ہمراہ بھیج دیا۔ تف ہے ایسی امریکن بیوی اور لبرل ازم پر۔" شازی کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔ محسن ایک دفعہ پھر بچوں کو آس پاس کی مارکیٹیں گھمانے لے گیا تھا۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد مہک اور انس واپس آتے دکھائی دیے تھے۔ مہک ذرا تھکی تھکی تاہم پہلے سے بھی پرجوش دکھائی دینے کی کوشش کررہی تھی۔ حالانکہ اتنی چڑھائی نے اسے خاصا تھکا ڈالا تھا۔

مہک بہت پرجوش انداز میں محسن کو اپنے ایڈونچر کی تفصیل بتارہی تھی۔ انس کے تاثرات البتہ نارمل تھے۔ وہ موبائل کی طرف متوجہ تھا۔

"تم نے کچھ نہیں خریدنا۔" مہک کو شاپنگ بیگ کا ڈھیر اٹھائے دیکھ کر انس بھی شفا کی طرف متوجہ ہوا تھا تب شفا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مہک بول اٹھی تھی۔

"میں اتنا کچھ لے کر آئی ہوں۔ یہ بچوں اور شفا کے لیے ہی تو ہے۔" مہک کی خوش اخلاقیوں کی اور مہربانیوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ انس کی نظروں میں اچھا بننے کے لیے وہ نجانے کیا کیا پاپڑ بیل رہی تھی۔

شفا کے لیے یہ صورت حال خاصی متوحش کردینے والی تھی۔ مگر وہ اپنی ازلی کم گوئی کے باعث خاموش تھی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے اعتراض کو انس نے اہمیت نہیں دینی تھی۔



یہ اسی اتوار کی بات تھی جب صبح صبح مہک بن سنور کر ان کے گھر چلی آئی۔ چونکہ انس چھٹی والے روز بھی دیر تک نہیں سوتا تھا' سو اسے ناشتا کرتے دیکھ کر مہک کی باچھیں کھل گئیں۔

"شکر ہے' تم جاگ رہے ہو' ورنہ میں تو سوچ رہی تھی جانے کتنا انتظار کرنا پڑے۔" وہ اپنا چھوٹا سا کلچ گھماتی انس کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ناشتا کروگی؟" انس کو آداب میزبانی کا خیال آیا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" اس نے فوراً" مسکراہٹ سجا کر پراٹھا پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔ "ویسے تو میں بہت ڈائٹ کانشس ہوں تاہم تمہارے گھر پہ کچھ بھی کھانا اچھا لگتا ہے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"تم تیار ہونے میں کتنا ٹائم لگاؤ گے۔" شفا ان کے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ رہی تھی' جب مہک نے عجلت میں انس سے پوچھا۔

"بس پندرہ منٹ۔" انس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ وہ دونوں شاید کہیں جارہے تھے۔ شفا کو ایک دم بے انتہا غصہ آگیا۔

"انس! مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" اسے انس کو روکنے کا کوئی اور جواز نہیں ملا تھا۔

"مگر ڈاکٹر اتنی صبح نہیں ملے گا۔ گھنٹہ بھر کا کام ہے بس میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" انس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ مہک چونک گئی۔

"شفا کو ـــــ جانا ہے۔ انس! تم پہلے شفا کو لے جاؤ۔ ہم تو لنچ آورز میں بھی چلے جائیں گے۔" انس کے سامنے اپنے نمبر وہ کسی طور کم نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنی اچھائیوں کا گراف گرا سکتی تھی۔ شروع شروع میں شفا کو وہ خاصی نخریلی اور موڈی سی لگی تھی مگر اب تو گویا شہد میں نہائی لگتی تھی۔

"کیا ابھی چلوگی؟" انس بھی سوچ میں گم ہوگیا۔

"نہیں' میں پھر چلی جاؤں گی۔ آپ اپنا کام کرلیں۔" غصے کے گھونٹ بھرتی وہ برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی تھی۔ انس کچھ دیر تک رکا رہا تھا پھر وہ دونوں کسی موضوع پر بات کرتے نکل گئے تھے۔ جبکہ شفا کا مارے

غصے کے برا حال تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک منفی سوچوں کے داؤ میں الجھی رہتی کہ فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ شازی کا فون تھا اور اس نے چھوٹتے ہی مہک کے بارے میں پوچھا تھا۔

"ابھی ابھی انس کو ساتھ لے کر نجانے کہاں گئی ہے۔"

"اتنے سویرے کون سا ضروری کام تھا؟" اس کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا پھر اس نے قدرے جھجکتے ہوئے شفا کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"انس سے بات کرو' ہر وقت مہک کا دم چھلا بنا رہنا مناسب نہیں۔ جو بات ہمیں کھٹک رہی ہے۔ کل کو محلے والے بھی باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔" شفا دھک سے رہ گئی۔ یعنی بات پھیل رہی تھی۔ اس کا دل دکھ کی اتھاہ میں گر رہا تھا۔ جیسے مان اور اعتبار کی کرچیوں سے زخم زخم ہو رہا تھا اور یہ نوکیلے کانچ اسے شام سویرے نوکیں چبھوتے تھے۔

شفا کو رونا آگیا۔ وہ تو ویسے بھی بڑے کمزور اعصاب کی مالک تھی۔



رات خاصی بھیگ چکی تھی جب شفا ای کو دوا دے کر پورے گھر کی لائٹس آف کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے انس کو فون پر مصروف پایا تھا۔ آج کل تو اس کے کانوں سے فون ہٹتا ہی نہیں تھا۔

مگر فی الحال انس نے شفا کو دیکھ کر فون ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس کا شفا کے ساتھ باتیں کرنے کا ارادہ تھا ۔ سو اسے کپڑے اٹھا کر کونے میں رکھے آئرن اسٹینڈ کی طرف بڑھتا دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

"ہر وقت دھوبن' باورچن' سونپو بنی نظر آتی ہو۔ کسی ٹائم بیوی بھی بن جایا کرو۔ محبوبہ کی ڈیمانڈ کرنا تو سراسر فضول ہے۔" وہ تکیہ گود میں رکھے' کشن کو کراؤن کے ساتھ چپکائے نیم دراز سا تھا۔

"اب یقیناً" تم نے دو گھنٹے کی سوچ و بچار کے بعد جواب دینا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو' مجھے نیند ہی آجائے۔" اس کا انداز بھرپور شرارتی قسم کا تھا۔

"تو سو جائیں آپ۔" شفا تڑاخ کر بولی۔

"تم تو چاہتی ہی یہی ہو۔ میں جل بھن کر سو جاؤں اور تم مجھ پر جادو ٹونے کرتی رہو۔" انس نے ہمیشہ کی طرح اسے بولنے پر اکسانے کے لیے ایسی بات کہی تھی جو اس کے دل پر جا لگی۔

"میں آپ پر ٹونے کرتی ہوں؟" شفا کا منہ کھلا رہ گیا۔ پہلے تو مجھے کبھی جادوگرنی نہیں کہا۔ یہ سب مہک کی سکھائی پٹیاں ہیں۔ اسے بے طرح رونا آگیا۔

"تو اور کیا کرتی ہو' میں بھونکتا رہتا ہوں' تم منہ ہی منہ میں بدبداتی ہو۔ اونچا اسی لیے نہیں بولتیں کہ میں سن نہ لوں۔ نہ جانے کون سا اسم پڑھتی ہو کہ اتنی حسین حسین طرح دار قسم کی کولیگز ہیں۔ میں ان کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ تمہارے ٹونوں کا اثر جو ہوتا ہے۔ ہر خوب صورت لڑکی مجھے بھینگی نظر آتی ہے۔ گورے گورے چہرے مجھے سیاہ نظر آتے ہیں۔ نفاست سے کیے گئے میک اپ مجھے دھول اور مٹی نظر آتے ہیں۔" آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔ لہجے میں سنجیدگی تھی۔ شفا نے کون سا گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا جو اس کا مسکراتا چہرہ نظر آجاتا۔ وہ تو انس کے الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔

"میرا اعتقاد اتنا کمزور نہیں جو میں جادو ٹونے کرتی پھروں۔ ایسے حربے آزمانے کی مجھے ضرورت نہیں۔"

"تو پھر کوئی اور حربہ استعمال کر لیا کرو۔ دیکھو' میرا تو دل روز روز پھسلتا ہے اگر ہاتھ سے پورا نکل گیا تو میں کچھ نہ کر سکوں گا۔" انس مسکراتے ہوئے بول رہا تھا۔ شفا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر اس نے سوچا 'وہ کیوں اپنی کمزوری انس پر عیاں کرے۔ ایسے تو وہ اور شیر ہو جائے گا اس نے اپنی بھیگتی آنکھوں کو چپکے سے پونچھ لیا تھا پھر قدرے رکھائی سے بولی۔

"مجھے کوئی پروا نہیں ۔۔۔ آپ کا دل جہاں مرضی پھسلے۔"

"سچ ؟" انس نے مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ "تم

تم سے خفا تو نہیں ہو گی اگر میں کوئی چھوٹا موٹا افیئر چلا لوں۔"

"آپ کو کب میری خفگی کی پروا رہی ہے۔" اس کا انداز تیکھا تھا۔ انس نے فوراً" جواب دیا۔

"پروا ہے تب ہی تو اجازت لے رہا ہوں۔"

"ہونہہ مرضی ہے آپ کی۔" شفا کو پھر سے ڈھیروں رونا آ گیا۔

"یعنی تم مجھے اجازت دے رہی ہو؟" انس نے ایک دفعہ پھر جھوم کر پوچھا۔ اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔" شفا نے الماری میں کپڑے زور زور سے پٹخ پٹخ کر ٹھونسے۔ "بھاڑ میں جائے یہ گھر اور آپ۔" وہ سلگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور انس کی مسکراہٹ بھی ایک دم سمٹی۔

"بھاڑ میں جائے یہ گھر اور میں۔" انس گویا سن سا رہ گیا تھا۔ "یہ شفا بول کر گئی ہے؟" اسے گویا یقین نہیں آ رہا تھا اور اسے صبح تک بھی یقین نہیں آیا تھا۔

وہ معمول کے مطابق اٹھا تھا پھر تیار ہو کر کچن میں آیا تو شہزادی ٹھنک رہی تھی۔ انس کو دیکھ کر یہ خفگی کچھ اور بڑھ گئی۔

"خیریت تو ہے؟ شہزادی صاحبہ کا مزاج برہم نظر آتا ہے۔" وہ اس کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"میں آپ سے ناراض ہوں پاپا!" شہزادی نے توس کھاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"میری شہزادی کیوں ناراض ہے۔" انس نے اسے کرسی سے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔

"آپ۔" شہزادی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ شفا نے سخت لہجے میں ٹوکا۔"

"دھیان سے ناشتا کرو، تمہارے ابو کے پاس وقت نہیں۔" اس کا لہجہ انتہائی کھردرا تھا۔ شہزادی قدرے سہم گئی تھی۔ انس بھی شفا کے روکھے انداز پر چونک گیا تھا۔ پھر شفا کے برہم تاثرات ملاحظہ کر کے اس کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے تھے۔

"میرے پاس اپنے بچوں کے لیے بہت وقت ہے۔ سو تم ان کے ذہن آلودہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔" چائے کی پیالی میز پر کھسکا کر وہ برہمی سے کہتا اٹھ گیا تھا۔

"میرے بچے ہیں اور میں ان کی تربیت کرنا جانتی ہوں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں بچوں کے ذہن آلودہ کرنے کی۔" شفا کی بڑبڑاہٹ نے انس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"میں یہاں کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا چاہتا اور نہ تم سے ایسی توقع رکھتا ہوں۔ شہزادی کے سامنے اس قسم کے کھردرے بے زار لہجے میں میرے ساتھ بات مت کیا کرو۔" وہ تنبیہی انداز میں اسے ٹوکتا باہر کی طرف نکل گیا تھا جبکہ شفا نے بھی پہلی مرتبہ اپنا تمام تر غصہ برتنوں کو پٹخ پٹخ کر نکالا۔ لاؤنج میں بیٹھی امی دہل دہل کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

لنچ پر ابھی وہ آیا ہی تھا کہ مہک اور محسن بھی چلے آئے۔ شفا تپ کر رہ گئی۔

ان دونوں میاں بیوی کی اپنے گھر میں بڑھتی آمد و رفت دیکھ کر شفا کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ اوپر سے مہک کا بڑھتا التفات۔ بچوں اور انس پر گویا صدقے واری جاتی تھی۔

اس وقت بھی جلے پیر کی بلی بنے وہ نجانے کب سے خود کو تھکا رہی تھی، جب مہک نے آ کر اس کی سوچوں میں مداخلت کی۔

"شفا! سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ کیا چائے مل سکتی ہے۔" اسے تیسری مرتبہ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ شفا نے اس کی فرمائش سن کر اسے گھورا۔

"میری بھی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر آرام کروں گی، پھر بنا کر دوں گی۔" مہک پھیکا سا چہرہ لیے پلٹ گئی تھی۔ یقیناً" اس کی رکھائی اور تلخی کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔

شفا بھی جلتی کلستی اپنے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹ گئی تھی۔ اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں چلی جائے۔

ایک بے حیا عورت اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک دوسری عورت کے شوہر کو

پھانس رہی تھی۔ ہر وقت اس کے پہلو میں لٹکی رہتی تھی۔

رات کے انتہائی پہر بھی فون کھڑکا کر بلا لیتی تھی۔ جانے اس کا بے غیرت شوہر کہاں مرا ہوتا تھا۔

شفا جتنا سوچتی اتنی ہی اس کے اندر چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا گھر کی ایک ایک چیز کو آگ لگا دے۔ لمحہ لمحہ بہت بھاری تھا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ نیند تو آئی ہی نہیں اسے۔ وہ لوگ کب گئے اسے پتا نہیں چلا۔ انس نے بھی جھانک کر نہیں دیکھا۔



انس مارے اہانت کے ابھی تک سلگ رہا تھا۔ شفا کے وہ الفاظ اسے بھول نہیں پا رہے تھے۔ وہ اپنی کھٹارا سی گاڑی کو بے مقصد ہی سڑکوں پر بھگا رہا تھا۔ سوچیں منتشر تھیں۔ غصے کا گراف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے موبائل پر بار بار محسن کی کال آرہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد مہک کے نمبر سے کال آنے لگی۔ انس کا کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے موبائل بند کر کے ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا۔

چار پانچ گھنٹوں کی خواری کے بعد جب وہ واپس گھر آیا تو راستے میں ہی اپنے گیٹ پر کھڑی مہک کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ شاید اپنے ہی خساروں میں گم مہک کو دیکھ کر چونکتا نہیں مگر مہک نے خود ہی اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

ذرا غور کرنے پر انس نے دیکھا تو پتا چلا مہک رو رہی ہے۔ اس کا نازک سا وجود لرز رہا تھا۔ چہرے کی رنگت زردی مائل ہو رہی تھی۔ انس کو اپنی پریشانی بھول گئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اسے شفا بھی بھول گئی تھی۔

''مہک! تم ٹھیک ہو کیا ہوا؟ محسن کہاں ہے؟'' وہ فکرمندی سے بولتا ہوا مہک کے ہمراہ اس کی عالیشان کوٹھی کے لاؤنج میں آگیا تھا۔ مہک کے گرتے آنسو ابھی تھمے نہیں تھے۔ وہ پوری شدت کے ساتھ رو رہی تھی۔

''انس' انس..... میرا بھرم ٹوٹ گیا۔ میں برباد ہو گئی۔'' مہک کے آنسوؤں میں اور شدت آگئی تھی۔ انس کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔

''آخر ہوا کیا ہے۔ محسن کہاں ہے؟'' انس نے روتی ہوئی مہک کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔'' مہک نے سسکیوں کے درمیان بتایا۔ ''محسن سب جان گئے ہیں انس! اب کیا ہو گا؟ وہ سہ نہیں پائیں گے۔'' مہک روتے روتے اس کے کندھے سے آلگی تھی۔ انس گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مہک کو تسلی دلاسے دے رہا تھا۔ وہ اس کے بازو سے سر ٹکائے ابھی تک سسک رہی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی ہدایت پر عمل نہیں کر رہی تھی۔ انس گویا بے بس ہو گیا تھا۔ تب ہی ایک دم لاؤنج کا دروازہ کھلا۔ انس نے گردن گھما کر دیکھا تھا اور پھر لمحہ بھر کے لیے اس کا چلتا سانس رک سا گیا۔ مہک کے گرد پھیلا اس کا بازو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پہلو میں آگرا تھا۔ اس کے آنسو پونچھتا انس کا ہاتھ وہیں فضا میں منجمد ہو گیا تھا۔ گرد کا طوفان اڑا تھا۔ تیز تیز چلتے بگولے' ہر طرف دھول ہی دھول مٹی ہی مٹی۔

وہ بے یقینی کے عالم میں اپنی ماں اور بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہروں پر ایسی حیرت' ایسا دکھ اور ایسی بے یقینی تحریر تھی کہ انس کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ کر زمین کے اندر گویا گڑ گیا تھا۔

''انس! یہ سب کیا ہے؟ تو ایسا تو نہیں تھا میرے بیٹے!'' امی بھربھری ریت کی طرح بکھر بکھر جا رہی تھیں۔ کہنے سننے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ جب تک مہک یا انس اس غیر فطری صورت حال کو سمجھتے تب تک شفا لڑکھڑاتی گرتی پڑتی امی کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی تھی۔ انس کے معطل ہوتے حواس شفا کو جاتے دیکھ کر دھیرے دھیرے کام کرنے لگے تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' انس زیر لب بڑبڑاتا باہر کی طرف لپکا جبکہ مہک کسی آندھی سے اکھڑے درخت کی مانند کارپٹ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔



شفا کو گھر چھوڑے آج چوتھا روز تھا۔ ممی' بہنوں اور خیام کے ہزار مرتبہ پوچھنے پر بھی اس نے منہ سے ایک حرف تک نہیں نکالا تھا۔ وہ لوگ پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے۔ دوسری طرف انس سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس صورت حال نے گھر کے ہر فرد کو پریشان کر رکھا تھا۔ شفا کی بس ایک ہی رٹ تھی۔

"مجھے اس گھر میں واپس نہیں جانا۔" اس کی ضد نے ممی کو حواس باختہ کر رکھا تھا۔

سلویٰ آپا سمیت اس کی دوسری بہنیں بھی بہت متفکر تھیں۔ سب سے بڑی بات وہ بچوں کو بھی چھوڑ آئی تھی۔

ممی اور سلویٰ آپا کو ہول اٹھ رہے تھے۔ انس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ خیام کو پنڈی بھیجا جائے۔ رالی کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ خیام کے تیور بھی بگڑے بگڑے محسوس ہوتے تھے تاہم وہ شفا سے حتمی بات کرنے کے بعد ہی پنڈی جانا چاہتا تھا۔ مگر شفا کی ازلی چپ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

اس کی یہ چپ تب ٹوٹی جب ایک سہ پہر مہک اور محسن اس کے میکے چلے آئے۔ رات بارہ بجے کی فلائٹ سے ان کی واپسی تھی اور جانے سے پہلے وہ شفا سے بات کرنا چاہتے تھے۔

سلوی آپا کی ہزار منتوں کے بعد شفا نے مہک سے بات کرنے کا ارادہ کیا تھا ورنہ وہ تو اس گھناؤنے کردار والی عورت سے کلام کرنا نہیں چاہتی تھی۔

مگر جب مہک سے دل پر چکی کے پاٹ رکھ کر شفا کو ملنا پڑا اور اس کی کچھ باتیں سننا پڑیں تو مارے خوف اور دہشت کے شفا کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔ اس کا وجود برف کی طرف سن ہو گیا تھا۔ اس کے حواس معطل ہونے لگے تھے۔



اس دن دوپہر کی ہلکی پھلکی نیند لے کر وہ باہر آئی تو لیاقت صاحب کی بیوی کو امی کے پاس بیٹھے دیکھ کر رک گئی۔ لیاقت صاحب کی بیوی گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ کر آئی تھیں۔

"بہن! اپنے بیٹے کو سنبھالو' اس گلی محلے میں عزت دار شریف لوگ رہتے ہیں اور تمہارا بیٹا..... توبہ توبہ ..... اللہ جھوٹ نہ بلوائے..... رات کے دوسرے پہر جانے کس کس نے اسے محسن کے گھر جاتے دیکھا ہے اور صرف ایک مرتبہ نہیں' کئی مرتبہ اور پھر محسن کے بارے میں کون نہیں جانتا' وہ تو نامرد ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے۔ ماں نے بات چھپائے رکھی۔ پھر بیرون ملک بہن کی بیمار بیٹی سے بیاہ دیا۔ بھلا ہو اس لڑکی کا جس نے اسے امریکا بلایا۔ پیسہ ہاتھ آیا تو عزت بھی مل گئی۔ مگر اب جوان' خوب صورت بیوی کو بغل میں دبائے پھر رہا ہے۔ بہو' بیٹیوں والی ہوں' بات کچھ زیب نہیں دیتی۔ پر ایک بات سن لو' تمہارے بیٹے کا چلن درست نہیں۔ اس امریکی عورت نے تمہارے بیٹے کو اپنے دام میں الجھا لیا ہے۔ لوگ تھو تھو کر رہے ہیں کچھ تو آنکھیں کھول کر دیکھو۔" اس عورت کے شعلے برساتے لفظوں نے شفا کے ساتھ ساتھ امی کے وجود کو بھی سوکھا بالن بنا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسے نظر چرانے لگیں کہ ذرا سی بھی زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتیں۔ امی کو اپنے بیٹے پر اتنا یقین تھا کہ پہاڑ بھی ٹوٹ پڑتے مگر ان کا یقین ہلکا نہ ہوتا۔

ادھر شفا کا اعتبار' یقین' اعتماد' محبت سب ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

اسے لگتا تھا وہ کبھی سر اٹھا کر جی ہی نہیں پائے گی۔

وہ اپنے واہموں کو بے بنیاد سمجھتی رہی' اپنے خدشوں کو جھٹلاتی رہی۔ مگر حقیقت تب اپنی کریہہ صورت لے کر نمودار ہوئی جب اس شام انس اپنے وقت پر گھر نہیں آیا تھا۔

امی کے ساتھ ساتھ شفا کے دل کو بھی پتنگے لگے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہزار دفعہ گیٹ سے باہر جھانک آئی تھیں۔ ان کی کئی گھنٹوں سے انتظار میں جمی آنکھوں کو قرار تب آیا جب انس کی کار گیٹ پر رکی۔

وہ دونوں ساس بہو دروازے پر آئی تھیں مگر ان کے آنے سے پہلے ہی انس سامنے والے گھر کے گیٹ کو عبور کر گیا تھا۔

نجانے کون سی ایسی قوت تھی جو امی کو کھینچ گھسیٹ کر محسن کے گھر لے آئی تھی۔ شفا تو امی کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی مگر اندر جا کر ان دونوں کے سروں پر آتش فشاں پہاڑ آ پھٹا تھا۔

نظر کو چبھن دیتا وہ منظر جس میں مہک انس کے کندھے سے سر ٹکائے آنسو بہا رہی تھی اور اس کے وہ الفاظ۔

"محسن سب جان گئے ہیں انس! اب کیا ہو گا۔ وہ سہہ نہیں پائیں گے۔"

مہک کی روتی آواز، انس کے نرم سے دلاسے۔ امی اور شفا کی آنکھیں اور دل پھٹتا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ دونوں چیخ چیخ کر پورے جہاں کو اکٹھا کر لیتیں مگر عزت کی ماری ان دونوں عورتوں کو رسوائی گوارہ نہیں تھی۔ وہ محض انس کو آلودہ نظروں سے دیکھ کر پلٹ آئی تھیں۔ ان نظروں کی اذیت کو صرف انس ہی محسوس کر سکتا تھا۔

پھر شفا بغیر کچھ کہے، سنے، جھگڑے، شکوہ کیے اسی خاموشی کے ساتھ اس کا گھر چھوڑ گئی تھی جس خاموشی کے ساتھ دلہن بن کر اس کے گھر آئی تھی۔

انس کے روکنے، اس کے منت کرنے، سمجھانے، وضاحت دینے کے باوجود وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ حالانکہ انس کی ماں بھی اسے روکتی رہیں، التجائیں کرتی رہیں۔

"بیٹی! ایک دفعہ اس کی بات تو سن لو۔" وہ دروازے تک اس کے پیچھے آئی تھیں۔ کم از کم ایک موقع تو دو۔ اسے وضاحت کرنے کی مہلت تو دو۔ جلد بازی میں اپنا آشیانہ مت بکھیرو۔"

"وضاحتوں کا وقت گزر گیا ہے۔ میرے ضبط اور صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔ اگر میں یہاں مزید رکی تو خود کو ختم کر لوں گی۔"

پچھلے چھ سال کی تمام ریاضتوں کو کیسے انس نے مٹی کر دیا تھا، وہ بھلا اس کی نگاہ میں دوبارہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے پاپا کے فیصلے پر بری طرح رونا آیا۔



"میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ اس کی آواز بہت بوجھل تھی۔ مہک نے آج بھی گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ آج بھی مہنگی ترین خوشبوؤں میں بسی تھی۔ اس کا لباس بھی ہمیشہ کی طرح قیمتی تھا۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ اس نے اپنی شخصیت کو بہت خوب صورت لبادے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ شفا نے اک زہریلی نگاہ سے اس کا جائزہ لے کر سر جھکا لیا تھا۔ وہ مزید اس کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں..... مگر تمہیں بتانا تو ہے اور جب تک کچھ بتاؤں گی نہیں تم سچائی کو کیسے جان پاؤ گی۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئی کسی سخت اذیت کا شکار تھی۔ شفا کو اس کی آواز بھیگی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر سے کہنا شروع کیا تھا۔

"ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ ہمارے سیدھے سادے دیہاتی والدین تھے۔ پاپا کی خوش نصیبی انہیں چالیس سال پہلے امریکا لے گئی تھی تب امریکا کے ویزے ملنا بہت مشکل نہیں تھا۔ ماما سے شادی پاپا کے امریکا چلے جانے کے دس سال بعد ہوئی تھی۔ یہ خالصتاً "کزن میرج" تھی۔

ہمارے سیدھے سادے والدین کے بچے بہت تیز طرار، زمانہ ساز قسم کے تھے۔ پڑھائی میں تو کوئی بھی نہ چل سکا۔ مگر آزاد معاشرے میں پروان چڑھنے کے باعث دنیا داری بہت سیکھ لی۔ ہمارے رنگ ڈھنگ، رہن سہن اور امریکی معاشرے کی گہری چھاپ ہمارے باپ کو بڑی جلدی دل چھوڑنے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ اتنے سیدھے تھے کہ اپنے بچوں کو کنٹرول ہی نہ کر سکے۔"

مہک کی ٹوٹتی آواز میں تھکن کی کرچیاں چبھ رہی

تھیں۔ شفا کو بھلا اس کے قصے کہانیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر ہمیشہ کی طرح وہ لب سیے مہک داستان سن رہی تھی۔

"قصہ مختصر میرے سب بہن بھائی اپنے ہی گھر میں اپنی من پسند زندگی گزار رہے تھے۔ کھلے عام محفلیں سجتیں۔ دونوں بہنوں نے ہندو لڑکوں سے شادی کر لی' بھائی بھی بدمست لڑکیوں کو بیاہ لائے۔ امی کونے میں بیٹھی سسکتی رہتیں۔ میں خود کو اپنے بہن بھائیوں سے مختلف نہیں سمجھتی تھی مگر میرے اندر ان کو برائی کرتے دیکھ کر کبھی گناہ کرنے یا برائی کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ میں شروع سے بہت خوب صورت اور کم گو قسم کی لڑکی تھی۔ بچپن میں میری خوب صورتی سے لوگ بہت متاثر رہا کرتے تھے مگر جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی میرا وجود ہلکا پھلکا ہوتا گیا۔ یعنی میری صحت بگڑتی گئی۔ مگر گھر میں کسی کے پاس فرصت نہیں تھی جو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ ماں میں اتنے کَس ہی نہیں تھے۔ انہیں تو عمر بھر بولنا ہی نہیں آیا تھا۔ ساری زندگی ایک چپ کے ساتھ گزار دی۔ بہت سال گزر جانے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ میری ماں کی خاموشی میں چھپے درد کی آخر وجہ کیا تھی۔

میری بیماری گھر کی چار دیواری تک محدود تھی' مجھے کوئی ڈاکٹر علاج کے لیے نہ ملا۔ نہ میں نے علاج کی طرف توجہ دی۔ بس مجھے کھانے کی عادت تھی اور میں ٹوکریاں بھر بھر کے فروٹ کھاتی تھی۔ جوس پیتی تھی سو میری صحت خود بخود بحال ہونے لگی۔

ان ہی دنوں ماں نے میرا رشتہ اپنے بھانجے سے طے کر دیا۔ ہمارا نکاح ہو گیا' پھر محسن امریکا آگیا۔ محسن کے امریکا آنے سے دو دن پہلے میں اچانک بے ہوش ہو گئی۔ مجھے ایمبولینس بلوا کر ہسپتال پہنچایا گیا اور پھر میری زندگی کے ایک اور تاریک دور کا آغاز ہوا۔

میرے اندر ایڈز کے جراثیم پائے گئے تھے۔ میں زندہ ہونے سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ میری بیماری کا میرے بہن بھائیوں کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے چھوت کا مریض سمجھ کر ایک کونے سے چپکا دیا۔ میرا اپنے ہی گھر میں ایک کمرے کے علاوہ کسی دوسری جگہ داخلہ منع ہو گیا۔ میری بھابھیاں مجھے کچن میں گھسنے نہیں دیتی تھیں۔ میرے ساتھ کسی کتے کی طرح سلوک کیا جاتا۔

میرے گھر والے مجھے گھر سے نکالنے کے پروگرام بنا رہے تھے مگر انہی دنوں میری ماں مر گئیں۔ ماں کو دفنا کر بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ مجھے کسی ہسپتال میں پہنچا دینا چاہیے۔ مگر یہ معاملہ التوا میں تب پڑا جب محسن امریکا آگیا۔

وہ ایک کم صورت اور شریف نوجوان تھا۔ مجھے محسن اپنے باپ جیسا سیدھا اور معصوم لگا۔ وہ ایک محنتی جوان تھا۔ جو پاکستان سے اپنے گھر والوں کو بہترین زندگی دینے کے خواب لے کر دنیا کے اس کونے میں آیا تھا۔

محسن نے بتایا وہ نارمل نہیں ہے اور وہ صرف اپنے ماں باپ کے مجبور کرنے پر نیشنلٹی کے لالچ میں امریکا آیا ہے۔ وہ چاہتا تھا' مجھے آزاد کر دے تاکہ میں اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کروں مگر میری خواہش پر وہ ہمیشہ خاموش ہو جاتا تھا۔

میرے بھائیوں نے مجھے باپ کی جائیداد یعنی اکلوتے مکان سے بے دخل کر دیا تھا اور یہ محسن ہی تھا جس کی بدولت میں نے پھر سے جینا شروع کیا۔ وہ بہت محنتی تھا' اس نے بہت محنت کی' پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بلا کر سیٹ کیا۔ اپنا سپر اسٹور خریدا۔ پاکستان میں گھر بنایا۔

مگر جب ہم سب کچھ حاصل کر چکے تب میرے بھائیوں اور محسن کے بھائیوں نے ہم پر اپنی کمینگی کے باعث زندگی تنگ کر دی تھی۔ انہوں نے ہمارا فلیٹ ہتھیا لیا اور اسٹور پر قبضہ کر لیا۔ محسن اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ پولیس کو اطلاع کیے بغیر پاکستان آ گئے۔ بقول محسن کے انہیں مادی چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ بعد میں بھی تو محسن کے بھائیوں نے ہی استعمال کرنا تھا' سب انہوں نے ابھی لے لیا... کیا حرج ہے۔

میں پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی۔ مجھے رشتوں سے

عجیب سی نفرت ہو گئی تھی۔ محسن سے ضد بھی کی، لڑائی بھی کی۔ پاکستان کو اور پاکستانیوں کو برا بھلا کہا، مگر محسن اپنی بات سے نہ ہٹے۔

یہاں پاکستان میں آکر جب میں انس سے ملی۔ انس کی فیملی سے ملی تو میرے اندر ایک مکمل گھر کی تشنگی کم ہونے لگی۔ تمہارے بچوں کو پیار کرنا، چھونا، ان کے لیے تحفے لانا میرا معمول بن گیا۔

جب میں پہلی مرتبہ تمہارے گھر آئی تو میرا رویہ بڑا تلخ تھا۔ شاید تم مجھے مغرور سمجھی تھیں، مگر ایسا نہیں تھا۔ میں رشتہ داروں کی خوشامد اور چاپلوسی سے عاجز تھی، پھر تمہارا الیا دیا رویہ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ مجھے تم اپنے رشتہ داروں سے مختلف لگی تھیں۔ پھر انس اور تمہاری بھرپور فیملی کو دیکھ کر مجھے لگتا، میرا کچھ کھو گیا ہے۔ میرا وہ قیمتی وقت جو میں نے امریکا میں گزار کر ضائع کیا۔ کاش میں پہلے پاکستان آجاتی۔ تم لوگوں سے ملتی۔ ایک بھرپور فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کا لطف لیتی۔

اور انس جو مجھے بھائیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ جانے کیسے وہ میرے اتنے قریب آگیا۔ اس کی ہمدردی اور خلوص، جس کا مول ہی کوئی نہیں تھا۔ یہ انس کی محبت اور خلوص تھا جو میں اور محسن اس کی بہتر زندگی کے لیے اسے امریکا جانے پر فورس کرتے رہے تھے۔ محسن کی خواہش تھی انس امریکا ہمارے ساتھ جائے۔ پھر وہ اپنے بھائیوں پر کیس کر کے پراپرٹی واپس لے لیں مگر انس تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

پھر میرے مشورے پر انس نے اور محسن نے مشترکہ فیصلہ کر کے ہماری کوٹھی کو ایک جامعہ کی شکل دینے پر بہت محنت کی۔ یہ میری سب سے بڑی خوشی اور خواہش تھی کہ ہمارے گھر میں قرآن پڑھا جائے۔

ہمارے چلے جانے کے بعد اس گھر نے پھر سے بند ہو جانا تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا یہاں اللہ کا صبح شام ذکر ہوتا۔ میرے اور محسن کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ہماری روحیں قرآن کی تلاوت سنتیں۔

اس ضمن میں انس نے تمام بھاگ دوڑ کی تھی۔ مدرسے کے لیے سامان منگوایا۔ بچیوں کو سبق دینے والی قاریہ اور ان کے شوہر مفتی امین کو یہاں لے کر آیا۔ مفتی امین کو مدرسہ کا منتظم اعلا بنایا۔

جس روز وہ بھیانک واقعہ پیش آیا تھا اس سے اگلے دن مدرسہ کی افتتاحی تقریب تھی جو کل بخیر و عافیت انجام کو پہنچی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تمہارے ذہن میں گرہ کیسے پڑی؟

دراصل ہوا کچھ یوں کہ محسن کو اچانک وفاق المدارس ملتان جانا پڑ گیا تھا۔ اس دوران میری کئی مرتبہ طبیعت خراب ہوئی۔ ہر دفعہ محسن کے کہنے پر انس مجھے ہسپتال لے کر جاتا رہا تھا اور وہیں اسے میری بیماری کا پتا چل گیا۔ میرا بھرم نجانے کیسے ٹوٹ گیا۔ یہ ایسی شرمناک بیماری تھی کہ میں نے اتنے سال محسن سے بھی چھپائے رکھی مگر انس کو خبر ہونے کا مطلب تھا محسن کو بھی پتا چل جاتا مگر انس نے میرا بھرم ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس نے محسن کو کچھ نہیں بتایا۔

پھر ایک رات مجھے پھر سے شدید تکلیف ہوئی۔ محسن میری تکلیف پر گھبرا گئے۔ اسی گھبراہٹ میں انہوں نے انس کو فون کر کے بلوا لیا تھا۔ مجھے ہسپتال لے جایا گیا۔ ایک دفعہ پھر ٹیسٹ، دوائیاں، ڈاکٹر، رپورٹس اور محسن کو بھی خبر ہو گئی۔ یہ بیماری معمولی نہیں تھی کہ میں اسے چھپائے رکھتی۔ مجھے شدید صدمہ تھا، اسی صدمے کی کیفیت میں انس کو گھر لے آئی۔ دراصل میں انس سے جب تک کچھ شیئر نہ کر لیتی مجھے صبر نہیں آتا تھا۔

تب وہ سب کچھ ہو گیا جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ غلط فہمی ایسی تھی کہ فوری طور پر اس کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر محسن کو بھی تمہارے اور انس کے جھگڑے کی خبر ہو گئی۔ وہ جو میری بیماری پر پریشان تھے، مزید پریشان ہو گئے۔ میں جو اتنے سالوں سے اپنی بیماری محسن سے اپنے تئیں چھپائے ہوئے تھی، اس انکشاف پر دنگ رہ گئی کہ محسن شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی میری بیماری کو جان گئے تھے اور یہ محسن کی اعلا

ظرفی تھی' جو انہوں نے کبھی مجھے جتایا نہیں تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی کمزوری کے ساتھ بہت بھرپور زندگی جی رہے تھے۔ ہماری زندگی میں کوئی خلا نہیں تھا۔ کوئی کمی نہیں تھی اور جو کمیاں قدرت کی طرف سے ہمارے نصیب میں لکھی جاچکی تھیں' ان پر ہم دونوں نے صبر کرلیا تھا۔

بس مجھے تم سے مزید کچھ نہیں کہنا' صرف اتنی التجا ہے' بدگمانی کی گرد جھاڑ کر دیکھو' ہر منظر صاف و شفاف نظر آئے گا۔ انس کی محبت اور اس کا کردار تمہارے سامنے ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری ساتھ مخلص ہے۔" اس کے میک اپ زدہ چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ شفا کا دل گویا شرمندگی' خفت کے احساس سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

"مدرسہ کا افتتاح ہوگیا ہے جس میں پورے محلے نے شرکت کی تھی۔ لوگ جو میرے کردار کے بارے میں مشکوک تھے۔ سب کی زبانیں بند ہوگئی ہیں۔ ہم لوگ آج واپس جارہے ہیں۔ دراصل محسن میرے علاج سے کبھی بھی مطمئن نہیں رہے۔ اب ہم ہر سال آتے رہیں گے۔ کم از کم جب تک وجود میں زندگی باقی ہے تب تک۔ جو مشعل ہم نے روشن کی ہے اس کو مزید روشنی دینا۔ تم اور انس ہی اب اس جامعہ کے اصل سربراہ ہو۔ انس کی زیر نگرانی ہمارا مدرسہ دینی علم کا سب سے بڑا مرکز بنے گا۔ ان شاءاللہ۔"

وہ اپنے آنسو پونچھ کر اٹھ گئی تھی تب شفا نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مہک کے گلے سے لگی بے تحاشا رو رہی تھی۔

"مجھے معاف کردو مہک! میں نے تمہارے بارے میں اتنا غلط سوچا۔" وہ بری طرح سے سسک رہی تھی۔ یہ ندامت کے آنسو تھے جن کا بہہ جانا ہی بہتر تھا۔ تب مہک کے چپکے سے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"گھر چلی جاؤ۔ وہ تمہارا منتظر ہوگا۔ میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں تھی۔ البتہ انس تم سے بہت ناراض ہے۔" مہک کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اپنی خوشبو ہمیشہ کے لیے اس کے آس پاس چھوڑ کر وہ جلد واپس آنے کے لیے چلی گئی تھی۔



گیٹ کھلا تھا اور صحن میں پتوں کا ڈھیر بکھرا پڑا تھا۔ اس نے ذرا سا پلٹ کر خیام کی طرف دیکھا' وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شفا نے اسے واپس چلے جانا کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اندر آنے کے بجائے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اک اطمینان بھری گہری سانس خارج کرتی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ اندر سے عجیب شور کی آواز آرہی تھی۔ اس کے آگے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

"میں اسے لے کر نہیں آؤں گا۔ جیسے گئی ہے' خود ہی آئے۔" انس غصے میں گرج رہا تھا۔ امی کی منمناتی آواز انس کے غصے تلے دب گئی تھی۔

"بچے رل گئے ہیں۔ سارا دن ماں کے لیے بلکتے ہیں۔" امی آبدیدہ ہورہی تھیں۔ انس نجانے کیا اٹھا پٹخ کررہا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ شفا نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ انس کچن میں کھڑا کچھ پکانے کی کوشش کررہا تھا۔ امی کی بات سن کر کچن سے نکل آیا۔

"تین وقت پکا پکا کر ٹھونستا ہوں انہیں' پھر بھی رل رہے ہیں۔"

"ماں کی بات اور ہوتی ہے۔" امی نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"تو میں نے اسے روکا ہے۔ یا گھر سے نکالا ہے؟ خود گئی ہے' خود ہی آئے۔ میں اب دوبارہ بارات لے کر تو جانے سے رہا۔" وہ ایک دفعہ پھر کچن کی طرف جارہا تھا۔

"مجھ پر ایسے گھٹیا الزام لگائے تھے اس نے۔" انس زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

"کب الزام لگائے تھے وہ تو بے چاری چپ چاپ چلی گئی۔" امی شفا کی حمایت میں بولتی ایک دم دانتوں تلے زبان داب گئی تھیں۔

"منہ سے کچھ نہیں پھوٹا' پر آنکھیں ساری حقیقت بیان کردیتی ہیں۔" وہ آگ بگولا ہوا تھا۔

"بندے کا ظرف اعلیٰ ہونا چاہیے اور پھر معاف کرنے میں بڑائی ہے۔ غلط فہمی تو کسی کو بھی لاحق ہو سکتی ہے۔" امی برابر شفا کی وکالت کررہی تھیں۔

"میرے سامنے کون ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کھڑا ہوا ہے جسے میں نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف نہیں کیا۔" اصل غصے کی وجہ کھل کر سامنے آگئی تھی۔ شفا نے گہرا سانس کھینچ کر قدم اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔ محترم کو شفا سے معافی منگوانے کا ارمان تھا۔

"آپ اس کی ڈھٹائی ملاحظہ نہیں کرتیں۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ بچوں کی پروا نہیں کی۔ ایک فون تک نہیں کیا۔ مہک اور محسن خوامخواہ صفائیاں پیش کرنے لاہور بھاگے۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ یہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دن بھی خوش نظر نہیں آئی۔ جب بھی دیکھا' منہ پر بارہ بجتے ہی دیکھے۔ ماں باپ نے زبردستی جو میرے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اچھا ہے' اپنی من پسند زندگی گزارے۔ مجھے کسی پر مزید مسلط نہیں ہونا۔ اپنے بچوں کو میں خود پال لوں گا۔ عمر بھر بچوں کی شکل دیکھنے نہیں دوں گا اسے۔" وہ غصے سے بڑبڑاتا اچانک آنے والی آندھی پر بوکھلا گیا تھا۔ ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے کھڑکیاں دروازے بند کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف آیا تھا۔

"یہ طوفان کہاں سے آگیا۔" وہ کھڑکیاں دروازے بند کررہا تھا جب ایک دم سرما کی پہلی بارش خوب جوش و خروش سے برسنے لگی۔ تب انس کے تیز تیز چلتے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔ وہ کھڑکی کے پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ بلا ارادہ ہی شفا یاد آنے لگی تھی۔

"کوئی ایسے بھی بدگمان ہوتا ہے؟" انس کو لگا' بارش کی کوئی بوند اس کی آنکھ میں اتر آئی ہے۔ اس نے پلکوں کو مسلا۔

"اس نے سوچا بھی کیسے میں مہک کے ساتھ.... کیا میں اتنا بے غیرت اور بے ضمیر انسان ہوں۔ کیا ان چھ سالوں میں اس نے مجھے بس اتنا ہی جانچا اور پھر رستہ ہی بدل لیا۔" بارش کی بوندیں اس کی آنکھوں میں جمنے لگی تھیں۔ تب ہی باہر بچوں کا شور سنائی دیا۔ شہزادی اور مونس کے چیخنے کی آواز آرہی تھی۔

"امی آگئیں.... امی آگئیں۔" وہ خوشی سے چلا رہے تھے۔ انس نے سر جھٹک کر کسی یاد سے دامن چھڑا لیا۔

انس کو اپنا وہم سا لگا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد انس کا وہم حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے مجسم آکھڑا ہوا تھا۔

وہ بے یقینی سے کبھی باہر برستی بارش کو دیکھتا کبھی شفا کے چہرے کو۔

"میں معافی کی طلبگار ہوں اور ہاتھ اس شرط پر جوڑوں گی کہ بغیر باز پرس کیے معافی مل جائے۔" اس کے ہاتھ انس کے شانے پر پھسل رہے تھے۔

"بچوں کو عمر بھر مجھ سے نہ ملاتے۔ کتنے خطرناک عزائم تھے آپ کے۔ حالانکہ جرم اتنا بڑا تو نہیں تھا۔" شفا کی آواز بھیگ رہی تھی۔ انس دم بخود کھڑا تھا۔

"جو شخص شادی کے چوتھے روز اپنی بیوی کے میکے میں کھڑا اس کی بہن سے کہے "معذرت کے ساتھ شفا میرے معیار پر پورا نہیں اترتی۔" بھلا خود بتایئے اس چار دن کی دلہن پر کون سی قیامت بیت سکتی تھی اس وقت۔" آج شفا بول رہی تھی مگر انس خاموش تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ یہ الزام اسے تڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔

"تم نے میری بات سن لی۔ اپنی بہن کے ارشادات نہیں سنے تھے۔" وہ سابقہ انداز میں کلس کر بولا تھا۔ پھر شفا سے شکوے' وہ گلے جو اس کے اندر دبے تھے۔ شفا کا روٹھنا' اس کا منانا۔ مگر اب تو وہ روٹھا ہوا تھا اور شفا اسے منا رہی تھی۔ اس کی گنہ گار آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھنا تھا۔ مارے خوشی کے وہ بے حال ہو رہا تھا۔ کون سی ناراضی اور کیسی ناراضی۔ اسے شفا کا بولنا اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا۔ شفا بولتی رہے اور وہ

سنتا رہے۔ مگر خاموشی سے سننا بھی اس کے لیے محال تھا۔
"کون سے ارشادات؟" شفا چونکی۔
"یہی کہ ہماری شفا بہت لاڈلی ہے۔ ہل کر پانی نہیں پی سکتی۔ منہ میں نوالہ بھی خود ہی دینا پڑتا ہے۔ تین چار نوکر اپائنٹ کرلو' کھانا خود پکالینا ورنہ باہر سے لے آنا۔ گھر کے کام کاج آتے نہیں۔ تمہیں شوہر کے ساتھ ساتھ سوپر بھی بننا ہوگا۔" وہ آنکھوں میں شرارت بھرے مصنوعی غصے سے بول رہا تھا تب شفا کا مارے حیرت کے منہ کھل گیا۔
شادی کی چوتھی رات سے بدلے بدلے رویے کی اصل وجہ سمجھ آگئی تھی۔ وہ کیئرنگ شوہر سے ہٹلر شوہر کیسے بنا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے دکھ ہونے کے بجائے ہنسی آرہی تھی۔
"تمہاری سلویٰ آپا نے بہت دفعہ میرے اٹھارہ اٹھارہ طبق روشن کیے ہیں۔" وہ اسے مزید بھی تفصیل بتا رہا تھا تب شفا نے بے ساختہ اسے ٹوک کر حالیہ مسئلہ کی طرف موڑا۔
"تو آپ نے مجھے معاف کردیا ہے؟" وہ انس سے تصدیق چاہ رہی تھی۔
"معافی تو تمہیں مل ہی چکی ہے۔ میرے ہزار واٹ کے روشن چہرے کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آرہا تمہیں۔"
انس نے مسکراتے ہوئے شفا کے گلابی چہرے کو دیکھا۔ اگرچہ وہ پہلے سے کافی کمزور لگ رہی تھی۔ انس کو دل ہی دل میں بہت پشیمانی ہوئی۔
"میں آپ سے بدگمان نہیں تھی بس صدمے کا شکار تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ آپ اور مہک....."
وہ دھیرے دھیرے اعتراف جرم کررہی تھی۔
"کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری کیفیات سمجھتا ہوں۔ بس اس ساری بے ترتیبی میں ایک چیز تو بالآخر واضح ہوگئی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا ہوا آخر میں تھوڑا شرارتی ہوگیا تھا۔ تب شفا بھی قدرے ہلکے پھلکے انداز میں مسکرادی تھی۔ اس کے وجود پر چھایا غبار ہٹ گیا تھا۔

"اور اس بے ترتیبی' ہلکی سی بدگمانی اور میرے آپ کے خاموش جھگڑے میں مجھ پر بھی ایک انکشاف ہوا کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اور میں آپ پر مسلط بھی نہیں' نہ آپ مجھ پر مسلط کیے گئے ہیں۔ آپ کی محبت تو یوں ظاہر ہوگئی تھی کہ ہر روز خیام کو فون کرکے میری خیریت پوچھتے تھے۔ سلویٰ اور ماورا آپا کے الگ سے کان کھا رکھے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی انا آپ کو لاہور جانے نہیں دیتی تھی مگر آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ میرے لیے محسن بھائی اور مہک کی اتنی پرکشش امریکا جانے کی آفر تک کو ٹھکرا دیا۔ آپ مجھے اور بچوں کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایسے ہی اتنے سال سسکتے ہوئے گزار دیے کہ آپ کو میری پروا نہیں۔"
شفا بھی جواباً انس کے کچھ بول کھولتی اس کی محبت پر شاداں سی شہزادی اور مونس کی پکار پر باہر کی طرف لپک رہی تھی' جو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پہ اٹھائے ہوئے تھے۔
"امی! پلیز' پلیز بریانی بنا کر کھلائیں۔ ورنہ ابو تو ہر روز پاپے' سوکھے توس' دلیہ اور دہی کھلا کھلا کر ہمیں مارنے والے تھے۔" پھول سے کملائے بچے ماں کو دیکھ کر خوشی سے چلا رہے تھے۔
ادھر انس خیام اور سلویٰ آپا کی غداری پر مصنوعی تاؤ کھا رہا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے خیام کو کال کرکے چھیڑنے لگا۔
"میرے راز لیک آؤٹ کیے ہیں بیٹا! کبھی تمہاری باری بھی آجائے گی۔" جواباً خیام کا قہقہہ سنائی دے رہا تھا۔ انس نے مسکراتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

بارش تو آج بھی چھاجوں برس رہی تھی تاہم انس اور شفا کے دل پر جمی گرد اور خود ساختہ نقصان' شکووں' گلوں کی گرد اتر گئی تھی۔ دھول' مٹی اور گرد کے پار روشن سویرا ابھر رہا تھا۔



معصومہ اقبال

ایک تھی عمرانہ ایک تھی کلثوم

"ارے کیا بات ہے عمرانہ! گھر میں سب خیریت تو ہے؟" میں نے اس کو پریشان دیکھا تو کہے بنا نہ رہ سکی۔

"بس کیا بتاؤں آپا! اس کلثوم بہن کی بچی کے رشتے نہیں آرہے' مجھ سے بھی کہہ رہی تھی دعا کرنا۔ ایک دو رشتے لے کر بھی گئی' مگر بس بچی اپنے دبتے رنگ کی وجہ سے مات کھا گئی۔" مجھے تو وہ کلثوم سے زیادہ غم زدہ لگ رہی تھی۔

"ارے اس کی مالی حیثیت کم تھوڑا ہے' بڑا اچھا کماتا ہے اس کا میاں۔ اس کو ذرا اچھے ہی رشتے دکھانے تھے۔ ایسے ہی ایرے غیرے نتھو خیرے کو اٹھا کر چلی گئی تم۔ وہ مجھ سے ذکر کر رہی تھی۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ مجھے کلثوم ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اتنے میں وہ خود ہی ٹپک پڑی۔

"شیطان کا نام لیا۔" میں منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

"السلام علیکم آپا۔" مجھے رسمی سا سلام کرکے وہ عمرانہ سے مخاطب ہوئی۔

"عمرانہ! ذرا اپنی سلائی مشین تو دینا۔ بانو نے قمیص پوری کرنی ہے اپنی۔" اور خیر سے عمرانہ بی تو اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔

"ہاں ہاں ابھی بھجواتی ہوں گڈو کے ہاتھ۔" پڑوس میں ہی تینوں گھر تھے۔ ادھر وہ نکلی' ادھر کلثوم نے گاؤ تکیہ سنبھال لیا۔ میں ترکاری بنا رہی تھی۔

"اے لو بہن! اگر میرے گھر آہی گئی تھیں تو مجھ ہی سے ادھار لے لیتیں سلائی مشین۔" میں نے جل کر شکوہ کیا۔ "اور مانا کہ عمرانہ سے بچپن کا یارانہ ہے۔ وہ سہیلی کم بہن ہے تمہاری مگر اس سے ذرا ہوشیار رہو۔ ابھی ہنس کر کہہ رہی تھی' کلثوم کو تو منگتے تانگنے کی عادت ہے۔"

"ارے نجمہ آپا۔" وہ کچھ کہہ ہی رہی تھی کہ عمرانہ چلی آئی۔

"رکھوا دی گڈو کے ہاتھ تمہارے گھر مشین۔ بس اس میں ذرا دھاگہ بار بار ٹوٹتا ہے' اس کا دھیان کر لینا ہاں۔۔۔"

"ہاں اللہ تم کو جزائے خیر دے' دھاگے کا مسئلہ نہیں' وہ تو تمہارے بھائی بھی دیکھ لیں گے۔ اصل مسئلہ تو بیٹری کا تھا۔ میری تو بیٹری ہی جل گئی تھی۔" وہ دونوں اپنی باتوں میں لگ گئیں۔ وہ دونوں جہاں کہیں ہوتیں بس وہ دو ہی ہوتیں' عمرانہ اور کلثوم۔ آپس میں لگی رہتیں۔ مجھے یہ عادت بڑی چبھی۔

"اے لو' ہمارے گھر میں بیٹھے ہیں اور ہم ہی کو مہمان بنا دیا۔"

"ذرا میں ہنڈیا چڑھا لوں۔ تمہارے بھائی غصے کے بڑے تیز ہیں۔ کہتے ہیں مغرب کے وقت کھانا تیار ہو' کام دھام اور سارے بکھیڑے سمٹے ہوں اور ویسے بھی لائٹ جانے والی ہے۔ ان اونچے نیچے گھروں میں تو ہاتھ کو ہاتھ مشکل سے سجھائی دے پر خیر تم لوگ باتیں کرو۔" میں نے گیس لیمپ کو دیا سلائی دکھائی تو ان کو گھر جانے کا خیال آہی گیا۔

"ارے نہیں آپا! میں بھی چلوں گی' بانو اکیلی ہو گی۔" کلثوم نکلی تو عمرانہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔ ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا پھر کسی نے کھٹکھٹا دیا۔ پڑوسن یاسمین کی نئی نویلی بہو تھی۔

"اماں آپ کے ہاں تو نہیں آئیں؟" وہ بڑی معصومیت اور پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

"اے۔۔۔ بیٹا! مجھے تو تمہاری اماں کی شکل بھی یاد



نہیں۔ تم کلثوم یا عمرانہ کے گھر معلوم کرو' ان دو کے گھر پہ ہی ہوں گی۔"

"ان کے گھر بھی نہیں ہیں۔" وہ بے چاری روہانسی ہو گئی۔

"نکل گئی ہوں گی تینوں سیر سپاٹے کو۔ لو بھلا بتاؤ' بچی کو اکیلے گھر میں چھوڑ رکھا ہے۔" میں نے اس کو اندر بلالیا۔ گھر میں تھا ہی کون۔ ایک میاں ایک بیٹا' ساتھ دکان جاتے اور واپس آتے' ان کے آنے میں خاصا وقت تھا۔ ایک بیٹی تھی خیر سے شادی شدہ اپنے گھر میں تھی۔

"آئندہ اگر ساس کہیں جائیں تو تم بھی ان کے سر ہو جانا' مجھے بھی لے کر چلو۔" اس کو میں فرصت سے لے کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"اور دیکھو' ساس سے جاکر نہ کہہ دینا۔ میں نے ورغلایا ہے تم کو۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"جی جی۔۔۔" وہ بوکھلائی۔

"اور کیا کرتی ہو سارا دن؟" میں اس کا تفصیلی انٹرویو لینے لگی۔



"ارے اماں! یہ کیسی سلائی مشین اٹھا لائی ہو۔" بانو کی چڑی ہوئی آواز کان میں پڑی۔ ایک دیوار کا فاصلہ تھا بس' میں صحن میں ہوتی اور ان کا بھی کوئی صحن میں ہوتا تو گفتگو ہوا کے دوش پر آسانی سے سنی جاتی۔ اسی احتیاط کے پیش نظر میں' میاں اور بیٹے کو کمروں میں لے کر بیٹھنے لگی۔ ہاں یہ اور بات ہے' ان کے جانے کے بعد میرا زیادہ وقت یہیں گزرتا۔ ابھی بھی صحن میں تخت پر لیٹی تھی۔

"اے کیا ہوا۔ ٹھیک نہیں چل رہی کیا سلائی مشین؟" کلثوم کی آواز تھی۔

"نہیں اماں فراٹے ٹرین کی طرح چل رہی ہے۔" بانو کی کوفت بھری آواز۔

"اے ہاں عمرانہ کہہ تو رہی تھی' دھاگہ ٹوٹے گا بس کا بار بار۔ دیکھو تمہارے ابا سے اس کی بیٹری نکلوانا یاد نہ رہی۔"

"رہنے دو اماں ایک بار بیٹری نکل جائے تو لگانا مسئلہ ہو جائے گا۔" ایک بار پھر گھرر گھرر کی ناپسند آواز آئی اور پھر۔۔۔ اب کے دھاگہ مشین کے کسی پرزے میں ہی اٹک گیا۔

"لو اماں! چھٹی ہوئی جو ذرا ذرا سا کام کر رہی تھی اس سے بھی گئی۔" میں تخت پر بیٹھی بیٹھی اس صورت حال سے مزہ لینے لگی۔

"ارے اماں واپس بھجوا دو اس کھٹارا کو۔" اس نے مشین پر ڈھکن زور سے رکھا۔

"اے زیادہ شور نہ مچا۔ میں نجمہ آپا سے لے لیتی ہوں' وہ کہہ بھی رہی تھیں۔" چوکی زمین پر گھسیٹنے کی آواز آنے لگی یعنی اس پر چڑھ کر۔۔۔ میں غڑاپ سے باورچی خانہ میں گھس گئی اور خواہ مخواہ برتن دھونے لگی۔

"نجمہ آپا آ آ۔۔۔ نجمہ آپا آ آ۔۔۔" حسب توقع آواز آنے لگی تو میں ہاتھ پونچھتی باہر نکلی۔

"کیا؟"

"ارے آپا! لو وہ ذرا اپنی سلائی مشین تو دے دو۔ وہ عمرانہ کی مشین چل نہیں رہی۔"

"ارے بس رہنے دو کلثوم۔" میں نے غصہ دکھایا۔

"اس وقت تو تم خاطر میں نہ لائی تھیں عمرانہ کے آگے۔ ایسا میرا جی برا ہوا۔ مانا اس سے تمہاری مجھ سے زیادہ شناسائی اور محبت ہے' مگر مروت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں۔ لو بھلا بتاؤ' سامنے بیٹھی تھی میں تمہارے پر وہی عمرانہ عمرانہ کی رٹ۔" میں نے ہاتھ ہلائے ہوا میں۔

"ارے کبھی جاکر دیکھو کیا کیا نہیں سناتی عمرانہ تمہارے پیچھے تم کو ہنس ہنس کے۔"

کلثوم چپ سی ہو گئی۔ پھر بولی۔

"دیکھو آپا! تم نے دینی ہے تو دو ورنہ رہنے دو۔"

"بچہ بھیج کر منگوا لو۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"مگر میرے گھر میں کوئی بچہ کہاں ہے۔"

"جب آئے تب بھیج دینا۔ میری جان کو لگے سو کام ہیں ابھی۔" میں واپس باورچی خانے میں چلی آئی اور وہ بڑبڑ کرتی چوکی سے اتر گئی۔ میں جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی ابھی تو عمرانہ کے ہاں جاکر کلثوم کی ایک کی سو لگا کر بتانی تھیں۔ تھوڑا معرکہ گرم کرنا تھا۔



بیچ میں' میں بہن کے ہاں سیالکوٹ چلی گئی۔ واپس آکر کئی دن گزر گئے نہ کلثوم نے کچھ مانگا' نہ عمرانہ ملنے آئی۔ کچھ دن تو میں نے شکر کا کلمہ پڑھا' مگر پھر دل آپ ہی آپ الجھنے لگا۔ گھر قید خانہ معلوم ہونے لگا۔ سر پر چادر ڈالی اور عمرانہ کے گھر ہولی۔ وہ سر پر پٹی باندھے بیٹھی تھی۔

"کیا ہے' خیریت تو ہے۔"

"ہاں ہاں آپا! آؤ بیٹھو۔" اس نے صوفے پر دھرے دھلے ہوئے کپڑے بیڈ پر منتقل کیے۔ اس کے گھر میں بس یہ ہی ہوتا رہتا۔ کسی نے صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو کپڑے اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیتا۔ بیڈ پر لیٹنا ہوتا تو گھر صوفے پر منتقل ہو جاتا۔ بچے کو بلوا کر میرے لیے پانی منگوایا۔

"اے یہ پٹی کیوں باندھ رکھی ہے۔"

"بس کیا بتاؤں آپا۔ ڈاکٹرنی کہتی ہے، مجھے ڈپریشن ہو گیا ہے اکیلا پن کے مارے۔ ابھی تو تم ملنے آئی ہو ورنہ تو ہفتوں سے کسی نے نہ جھانکا۔"

"ہائیں اور وہ تمہاری کلثوم۔ تم تو یکجان دو قلب تھیں۔"

"ارے آپا! وہ تو بس.... میری تو کلثوم سے بات چیت ہی ختم ہو گئی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ "اے لو مجھے کیا بتا رہی ہو میں تو پہلے سے ہی جانتی ہوں اس موٹی کلثوم کو.... منافق، مطلب پرست نہ ہو تو۔ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" دفعتاً میں بولتے ہوئے رک گئی۔ عمرانہ سر پر پٹی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے کہہ رہی تھی، عمرانہ نے تو مجھے اپنی کباڑ مشین دے دی۔ معلوم تھا نا دیور کی شادی ہے۔ کہیں بانو کو کوئی پسند نہ کر لے میں نے توبہ کی بھلا بتاؤ، منہ پر بہن کہتے کہتے نہیں تھکتی تم کو...."

"بس کرو آپا! آپ کیوں خون جلاؤ پر چغلی کرنا کیسا بڑا گناہ ہے کیا اس کو نہیں معلوم، ارے چغل خور جنت میں نہ جائے گا۔" وہ غصے سے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے دبانے لگی۔

"ارے بڑی وعیدیں ہیں۔ چغل خور دوزخ میں...."

"اچھا میں چلوں۔" مجھے خلجان قلب ہونے لگا۔

"ارے نہیں آپا! شربت پی کر جانا۔" اس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑا۔ اتنے میں کلثوم چلی آئی۔ مٹھائی کا ڈبہ لے کر۔ مجھے بڑی بے زاری ہوئی۔ منہ بنا کر سلام کا جواب دیا۔ زبردستی مٹھائی منہ میں ڈال کر وہ عمرانہ کی طرف مڑی۔

"لو منہ میٹھا کرو، بانو کی بات پکی ہو گئی ہے۔"

"ارے مجھے تو خبر ہی نہ کی تم نے۔" عمرانہ سخت خفگی سے بولی۔

"بس کیا بتاؤں۔ مجھے تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ مل رہی تھی بچی اور تم بھی تو ملنے نہ آئیں عمرانہ بہن...." کلثوم نے بھی خفگی سے جواب دیا۔

"میں ملنے نہ آئی تو تم نے بھی نہ جھانکا۔ تمہیں پتا ہے مجھے ڈپریشن ہو گیا تم سے خفا رہ کر، مگر تم کو کیا پروا۔" کلثوم ہکا بکا کھڑی رہ گئی، مٹھائی کا ڈبہ تھامے۔

"میں چلوں اب۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر میرا ہاتھ موٹی عمرانہ نے بے دھیانی میں جو گرم جوشی سے تھاما تھا نہ چھوڑا۔

"اوئی میرا ہاتھ تو چھوڑ دو، درد ہو رہا ہے، ایسے زور سے پکڑتے ہیں کیا۔ ہائے ایسا لگ رہا ہے ہڈیاں چیخ گئیں۔" مگر میری وہاں سن کون رہا تھا اب تو وہاں دونوں کی غلط فہمیاں دھل رہی تھیں، معافیاں تلافیاں چل رہی تھیں، شرمندگی میں بدل رہی تھیں۔ شکر ہے میرا نام بیچ میں نہ آیا۔

آخر عمرانہ کلثوم کے گلے لگ کر پھپک پھپک کر رو دی۔ بدگمانیوں کی دوریاں چھٹیں تو آسمان صاف ہو گیا اور دوستی کا سورج پہلے سے بڑھ کر چمکنے لگا۔ عمرانہ کا ڈپریشن کہیں پیچھے رہ گیا۔ اب پہلے کی طرح عمرانہ تھی اور کلثوم اور پہلے کی طرح ان کی باتیں تھیں، میں دونوں پر دو حروف بھیج کر گھر کو چل دی ویسے بھی میاں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

بھرے گھر میں ہے میرا آشنا کون
بھلا مجھ سا ہے کوئی بے گھرا کون

جب اُس کو جیتنا بھی ہار ٹھہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جُوا کون

گزرتی رات نے چُپ سادھ لی ہے
نہ جانے آتے آتے رُک گیا کون

سو ہم دونوں ہوئے ہیں ریزہ ریزہ
اسی خواہش میں پہلے ٹوٹتا کون

وصال و ہجر سے تھا ماورا عشق
مگر اس زاویے سے دیکھتا کون

منڈیروں پر اُتر آئے پرندے
یہ دروازے پہ دستک دے گیا کون

تنِ تنہا تھا اور لمبی سڑک تھی
مرے ہمراہ، پر چلتا رہا کون

جمال احسانی

امن عشائیہ

بیسیوں ممالک کے
امن کے سفیروں کا
اجتماع تھا کل شب
جس میں امنِ عالم کی حالت دگرگوں پر
سوچ میں تھے غلطاں سب

قیمتی دماغوں کے مشورے سے دُنیا میں
امن کی بحالی کا
حل نکل ہی آیا تھا
متفق تھے جس سے سب
مسئلے کے اس حل پر
مطمئن تھے سب کے سب

اور یہ سُنا ہے کہ
رات کو ڈنر میں جو
مختلف غذائیں تھیں
ان میں اک خصوصی ڈش
روسٹ فاختائیں تھیں

عظمیٰ جون

اب کے پیڑوں نے کچھ کہا ہی نہیں
کیسا موسم ہے بولتا ہی نہیں

یوں کھلے ہیں گھروں کے دروازے
جیسے گلیوں میں کچھ ہوا ہی نہیں

وہ ڈراتے ہیں یوں خدا سے مجھے
جیسے میرا کوئی خدا ہی نہیں

تم بدن میں ہے عمر کے باعث
ورنہ یہ سر کبھی جھکا ہی نہیں

تیری باہوں میں وقت اونگھتا ہے
میری باہوں میں ٹھہرتا ہی نہیں

ہم تو رستوں سے دل لگا بیٹھے
منزلوں کا تو کچھ پتا ہی نہیں

لفظ اندھے کبھی نہیں ہوتے
بولنے والا دیکھتا ہی نہیں

محمود شام

روتے روتے تھک جاتے ہیں، ہنسنے کو دل کرتا ہے
درد کا یہ سامان کہیں پر دھرنے کو دل کرتا ہے

وہ کہتا ہے کھو کر تم کو میں بھی جی نہ پاؤں گا
ایسے لالچ دیتا ہے اب مرنے کو دل کرتا ہے

خود کو ساری عمر رکھا ہے تخ بستہ تنہائی میں
اس کی قربت آگ کے جیسی جلنے کو دل کرتا ہے

ریشم جیسی اُس کی باتیں ہوش اُڑائے رکھتی ہیں
اُس کی چاہت جون کے جیسی تپنے کو دل کرتا ہے

اُس کے ساتھ چلوں تو من میں خواب سے جگنے لگتے ہیں
گجرے، پائل، چوڑیاں، مہندی رچنے کو دل کرتا ہے

آج تلک سوچا ہی کب تھا اپنے بارے میں عذرا
اُس نے ایسے خواب دیے اب سجنے کو دل کرتا ہے

سیدہ عذرا بخاری

صباساحر

اس ماہ کی مسکراہٹیں

حکمت عملی

ایک آدمی اونچے درخت پر چڑھ گیا، مگر اس سے نیچے نہیں اترا جا رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ مختلف طریقے آزمائے گئے۔ اسے مختلف مشورے دیے گئے مگر وہ شخص ڈر کے مارے اترنے پر کسی طور پر راضی نہیں ہوا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ علاقے کے بزرگ حکیم کو بلایا جائے۔ ہو سکتا ہے یہ شخص احتراماً ان کی بات مان لے یا وہ کوئی کارگر طریقہ بتا دیں۔ حکیم صاحب آئے۔ ان کے مشورے پر ایک موٹا رسا اوپر چڑھے شخص کو اچھال کر فراہم کیا گیا۔

"اسے اپنی کمر کے گرد کس کر باندھ لو۔" حکیم صاحب نے مشورہ دیا۔ اس شخص نے باندھ لیا تو حکیم صاحب نے نیچے کھڑے تین قدرے سمجھ دار آدمیوں سے کہا۔

"رسا پکڑ کر زور سے کھینچو۔" آدمیوں نے رسا پکڑ کر کھینچا۔ وہ آدمی دھڑام سے نیچے آگرا اور گرتے ہی مر گیا۔ لوگ گھبرا گئے۔ کسی نے شکوہ کیا۔ "حکیم صاحب...! آپ نے ایک بے گناہ آدمی کو مار دیا۔"

حکیم صاحب سٹپٹا گئے۔ سوچتے ہوئے بولے۔

"یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ ورنہ میں نے بہت سے لوگوں کو ایسے ہی کنوؤں سے نکالا ہے۔"

شگفتہ فیاض..... امریکہ

بہکی بہکی باتیں

"ڈارلنگ! آخر یہ کیا ہو گیا ہے۔" لڑکے نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہماری محبت کی دنیا کیوں اجڑ گئی۔ ہماری محبت کی حسین چاندنی رات اتنی جلدی کیسے ڈھل گئی۔ اب ہم خواب، کلیوں اور چاند کی باتیں کیسے کریں گے۔"

لڑکے نے ایک ہچکی لی اور دوبارہ کہنے لگا۔ "آؤ۔ آؤ! ہم اپنی محبت کی ہر نشانی... اپنے تحائف، اپنے خطوط آخری بار جی بھر کر دیکھ لیں کہ کسی حاسد کی بددعا و بدنظری کی وجہ سے یہ دن اب ہماری زندگی میں کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے... آؤ!

"ڈارلنگ..." لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ تھام کر پریشانی سے کہا۔

"ہوش میں آؤ... یہ شادی کے پہلے ہی دن تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟"

رشیدہ بتول..... کراچی

دوست ہوں تو ایسے

ایک محفل میں عطاء الحق قاسمی نے صرف آدھے گھنٹے میں جب چھٹا سگریٹ سلگایا تو بیرون ملک سے آئے ان کے دوست نے قدرے پریشانی سے کہا۔

"عطا... یار! تم بہت سگریٹ پینے لگے ہو۔ اچھی بات نہیں ہے یہ۔"

اب کم کر دوں گا۔" عطاء الحق قاسمی نے جواب دیا۔

"کم کر دوں گا نہیں۔ ابھی کم کرو۔" دوست نے فوراً کہا۔ "لاؤ۔ ایک سگریٹ مجھے دے دو۔"

نزہت ایاز..... ایبٹ آباد

فائدہ

ایک بیوٹیشن کو اپنی کسٹمر کے شوہر کہیں مل گئے۔ سلام دعا کر کے بیوٹیشن نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"میں نے آپ کی وائف کو ملتانی مٹی کا ماسک

لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ کیا اس سے ان کا چہرہ بہتر ہوا؟"
"جی ہاں بالکل۔" شوہر نے فوراً جواب دیا۔
"جب تک ماسک لگا رہتا ہے چہرہ بہتر لگتا ہے۔"
الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ

عقل کی بات

ایک لڑکے نے اپنی گرل فرینڈ سے کہا۔
"میرے پاس اپنے دوست جیسی کار تو نہیں مگر میں تمہیں اپنی پلکوں پہ بٹھا کر گھماؤں گا۔ میرے پاس اس جیسا بنگلہ تو نہیں مگر میں تمہیں اپنے دل میں جگہ دوں گا۔ میرے پاس اس کے جتنا پیسہ تو نہیں مگر میں محنت مزدوری کر کے کماؤں گا اور۔۔۔"
"تمہیں اتنی محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔" گرل فرینڈ نے کہا۔ "تم بس اتنا کرو۔ اپنے دوست کا نمبر دے دو۔"
ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

آرام اور تفریح

اطلاعی گھنٹی پر ملازم نے دروازہ کھولا۔ سامنے صاحب کے دوست کھڑے تھے۔
"صاحب گھر پر ہیں تمہارے؟"
"جی نہیں۔ وہ سفر پر گئے ہوئے ہیں۔" ملازم نے جواب دیا۔
"اوہ اچھا!" دوست نے کہا۔ "کیا آرام اور تفریح کی غرض سے گئے ہیں؟"
"میرے خیال میں نہیں۔" ملازم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیونکہ بیگم صاحبہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔"
شمسہ شاہد۔۔۔ گوجرانوالہ

ارادہ

☆ ایک بار میں نے اور میرے دوست نے اس بات کا ارادہ کر لیا کہ ایک دوسرے کو اس کے عیبوں سے آگاہ کرتے رہیں گے۔
☆ پھر اس کا کیا نتیجہ نکلا؟
☆ نو سال سے ہماری بات چیت بند ہے۔
فائزہ صلاح الدین۔۔۔ کراچی

آئندہ

آدھے درجن چھوٹے بچوں کی ماں نے تیسری شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ نکاح سے کچھ دیر قبل بچوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ ماں نے گھونگھٹ میں سے انہیں جھڑکتے ہوئے کہا۔
"چپ ہو جاؤ بدتمیزو! ورنہ آئندہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لاؤں گی۔"
خنسا۔۔۔ اٹک ضلع کیمبل پور

غور سے دیکھو!

شوہر رات کو دیر سے گھر پہنچا۔ بیوی کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور بغیر آہٹ کیے کمرے میں پہنچا اور تیزی سے جھولے میں سوتے بچے کے پاس جا کر جھولا جھولانے لگ گیا۔ ساتھ ہی ہلکی آواز میں لوری بھی دینے لگا۔ اتنے میں بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ شوہر نے فوراً کہا۔
"کتنی گہری نیند سوتی ہو تم۔ حد ہے۔ گھنٹے بھر سے چپ کروا رہا ہوں اسے۔ اب سویا ہے۔"
بیوی نے خشمگیں نظروں سے شوہر کو گھورتے ہوئے کہا۔
"جوتے نکالو بغل سے اور غور سے دیکھو! بچہ جھولے میں ہے یا میرے پاس سو رہا ہے۔"
شمائلہ زاہد۔ اسلام آباد





رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں اور باتوں کا تارک ہو۔

(معارف الحدیث' ابن ماجہ' ترمذی)

تعلیم یافتہ لڑکا،

اعلان نبوت کے بعد دعوت اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ رحمت دو عالم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ معظمہ سے باہر جنگل میں تشریف لے گئے۔ پھرتے پھرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی تلاش کیا لیکن نہ مل سکا۔

قریب ہی ایک نوجوان لڑکا بکریاں چرا رہا تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی نے پوچھا۔

"لڑکے! کیا تم اپنی کسی بکری کا دودھ دے کر ہماری پیاس بجھا سکتے ہو؟"

چھوٹے سے قد اور گندمی رنگت کے مالک اس لڑکے نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"یہ بکریاں میری نہیں ہیں' یہ عرب کے مشہور سردار عقبہ بن ابی معیط (جو کہ ایک مشرک تھا) کی ہیں اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی کو دودھ دینا خیانت ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔

"اچھا کوئی ایسی بکری ہے جس کا دودھ نہ اترتا ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہے تو سہی لیکن اس کا آپ کیا کریں گے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم لے تو آؤ۔"

وہ لڑکا ایک بکری لے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیر کر اللہ سے دعا کی۔ اللہ نے اس کے تھنوں کو دودھ سے بھر دیا۔ اب سیدنا ابوبکر صدیق رضی دودھ پینے بیٹھے تو اتنا دودھ نکلا کہ اللہ کے نبی، ابوبکر صدیق رضی اور اس لڑکے نے سیر ہو کر پیا۔ اس کے بعد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بکری کے تھن خشک ہو کر اپنی اصلی حالت میں آگئے۔

لڑکا یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس کا دل آپ کی محبت سے بھر گیا۔

پھر ایک دن وہی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے بھی اپنی جماعت میں داخل فرمالیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی درخواست منظور فرمائی اور اس کے سر پر شفقت و محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔"

یہ خوش بخت نوجوان جسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم یافتہ لڑکے کا خطاب دیا ان کا نام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ جو بعد میں ایک بہت بڑے محدث اور فقیہ بنے۔

(از تیس پروانے شمع رسالت کے۔ طالب ہاشمی)

قلم عکس ہے قلم رکھنے کا،

☆ آدمی کی زندگی پر عقل کی نہیں تقدیر کی حکمرانی ہے۔

☆ جس کے پاس مضبوط قوت ارادی ہے' دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بنا لیتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں اگر پتھریلے راستے

لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔

- جو شخص وعدہ کرنے سے جتنا زیادہ گریز کرتا ہے وہ وعدے کا اتنا ہی زیادہ پابند ہوتا ہے۔
- یقین لہجے میں بولتا ہے، کردار میں نظر آتا ہے اور اندھیرے کو روشنی میں بدلتا ہے۔
- ہم چاہے موسموں کے ساتھ بدلتے رہیں لیکن موسم ہمیں نہیں بدل سکتے۔
- جو چیزیں پُراسرار ہوتی ہیں، وہ پُرکشش بھی ہوتی ہیں۔
- محبتوں کی ضرورت میں کیا جانے والا ضبط بہت کڑا ہوتا ہے۔
- خواہشات کو دبانے اور مشکلات پر قابو پانے سے انسان کا کردار مضبوط ہوتا ہے۔

- اگر بازی بااصول طریقے سے جیتی جائے تو ہارنے والا بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔
- جو اچھے کو اچھا نہ جانے، وہ بُرے کو بھی بُرا نہیں سمجھتا۔
- آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔
- اپنے کام کے صلے کی واجب سے زیادہ امید نہ رکھو۔
- جس سے مل کر خوشی نہ ہو، اس سے بچھڑ کر غم نہیں ہوتا۔
- انسان کا کردار اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس شے سے خوش ہوتا ہے۔

آمنہ امتیاز مغل۔ بھکر

صبر و سکوت

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے ایک خوبصورت اور خوشنما پرندہ خریدا۔ اسے جب پنجرے میں ڈالا تو ایک اور پرندہ اڑتا ہوا اس پنجرے کے اوپر آیا اور اپنی زبان میں کچھ بول کر چل دیا۔ اس کے بعد اس قیدی پرندے نے پنجرے میں بولنا بند کر دیا اور بالکل چپ سادھ لی۔ مالک نے یہ دیکھا تو سلیمان علیہ السلام کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پنجرہ منگوایا اور پرندے سے پوچھا۔

"تمہارے مالک نے تمہیں قیمت دے کر خریدا ہے اس کا تم پر حق ہے۔ تم نے بولنا کیوں بند کیا؟"

پرندے نے جواب دیا۔ "حضور! اس سے کہہ دیجیے کہ میرا خیال چھوڑ دے۔ میں جب تک پنجرے میں بند ہوں، کبھی نہ بولوں گا۔"

فرمایا۔ "کیوں؟"

اس نے کہا۔ "حضور! میں وطن اور اولاد کی محبت میں روتا تھا کہ میرے ایک بھائی نے مجھ سے آ کر کہا۔

"نادان! رونے دھونے کو چھوڑ۔ ورنہ عمر بھر پنجرے ہی میں قید رہے گا۔ صبر و سکوت اختیار کر لو دیکھو تو آزاد ہوتا ہے کہ نہیں۔"

سلیمان علیہ السلام نے اس شخص سے پرندے کا جواب بیان کیا تو اس نے کہا۔

"پھر اسے آزاد کر دیجیے۔ میں نے تو اسے خوش نوائی کے لیے خریدا تھا۔"

چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی گرہ سے قیمت دے کر پرندے کو آزاد کر دیا۔

امید کرم

ایک مرتبہ ایک جنازے میں حضرت حسن بصریؒ اور مشہور شاعر فرزوق دونوں حاضر تھے۔ کسی نے کہا کہ آج کے جنازے میں بہترین اور بدترین دونوں قسم کے لوگ جمع ہیں۔ بہترین سے حسن بصریؒ اور بدترین سے فرزوق کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرزدق سے کہا۔

"میں بہترین ہوں، نہ آپ بدترین، لیکن یہ بتاؤ کہ آخرت کے لیے آپ نے کیا تیاری کی ہے؟"

کہنے لگا۔ "شہادۃ ان لاالٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ۔"

وفات کے بعد خواب میں کسی نے اس سے پوچھا۔

"کیا معاملہ ہوا؟"

فرزوق نے کہا۔

"اللہ نے مغفرت کر دی۔

پوچھا۔ "کس وجہ سے؟"

فرمایا۔"اس کلمے کی وجہ سے جس کا میں نے حسن بصریؒ کے ساتھ گفتگو میں حوالہ دیا تھا۔"

علم کی عزت

حضرت امام مالکؒ مدینہ منورہ میں حسب معمول درس حدیث دے رہے تھے کہ اتنے میں خلیفہ ہارون الرشید کا قاصد آپ کے پاس آیا اور خلیفہ کا پیغام دیا۔

"وہ آپ کے درس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

آپ نے اجازت دے دی۔ اگلے دن خلیفہ اپنے چند وزراء کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ مدینے میں ایک جگہ قیام کیا اور قاصد کو امام صاحب کے پاس بھیجا۔

"یہاں تشریف لائیں اور ہمیں حدیث سنائیں۔"

قاصد وہاں پہنچا اور پیغام دیا تو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا۔

"خلیفہ سے کہہ دو، لوگ علم کے پاس آتے ہیں علم لوگوں کے پاس نہیں آتا۔"

قاصد نے پیغام دیا تو خلیفہ پر اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ چناں چہ وہ مجلس درس میں اپنے وزراء کے ساتھ حاضر ہوا اور درخواست کی کہ آپ انہیں یہاں سے اٹھا دیں اور صرف ہمیں ہی درس دیں کہ ہمارا ان غریبوں کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔"

امام صاحب نے جواب دیا۔"میں آپ کے فائدے کے لیے مسلمانوں کا خون نہیں کر سکتا۔"

خلیفہ بے حد متاثر ہوئے۔

چناں چہ درس حدیث شروع ہوا اور خلیفہ کو عام مسلمانوں کے ساتھ حدیث سننی پڑی۔

بے لوث ہمدردی کا صلہ

ایک چھوٹے سے شہر میں ایک غریب لڑکا اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اسکول سے واپسی پر گھر گھر جاکر چیزیں فروخت کرتا تھا۔ ایک دن اس کی کوئی بھی چیز فروخت نہیں ہوئی۔

بھوک کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی، لیکن وہ کسی سے کھانے کے لیے کچھ مانگنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

ایک گھر پر اس نے دستک دی تو دروازہ ایک نوجوان عورت نے کھولا۔ اس نے لڑکے کی شکل دیکھ کر بھانپ لیا کہ وہ بھوکا ہے۔ خاموشی سے بغیر کوئی سوال کیے لڑکے کو دودھ کا گلاس تھما دیا۔ دودھ پی کر لڑکے نے اس کی قیمت دریافت کی تو عورت نے کہا۔

"ہمدردی اور مہربانی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

لڑکا شکریہ ادا کرکے چلا گیا۔

اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

وہ عورت ایک شدید اور خطرناک قسم کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور ایک نظر میں پہچان لیا۔ اس نے پوری توجہ سے اس کا علاج کیا۔ عورت کی جان بچ گئی۔

ڈاکٹر نے اسپتال والوں سے کہا کہ اس عورت کا بل اسے بھجوا دیا جائے۔ اسپتال والوں نے بل بھجوا دیا۔ ڈاکٹر نے بل کے ایک کونے پر کچھ لکھا اور واپس اس عورت کو بھیج دیا۔

جب بل کا لفافہ اس عورت کو ملا تو اس نے ڈرتے ڈرتے لفافہ کھولا، اس کا خیال تھا کہ اس بھاری بل کی ادائیگی کے لیے اسے اپنے اثاثے فروخت کرنا ہوں گے۔

بل پر ایک جملہ لکھا تھا۔"مکمل ادائیگی۔ ایک گلاس دودھ۔"

زندگی میں بے لوثی سے کیا گیا کوئی بھی کام کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتا۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ اچھا یا برا، اس کا بدل جلد یا بدیر ہمیں ضرور ملتا ہے لیکن شرط یہ ہے، بغیر کسی صلے کی توقع یا تمنا کے کسی کی خوشی کے لیے کسی کی ہمدردی کے لیے کام کیا جائے۔



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

نوال افضل گھمن ______ گجرات

یہ عجب صورت حال ہوتی جاتی ہے
رات کے بعد یہاں رات ہوتی جاتی ہے
وہ تو اب بھی مکمل ہے کسی پتھر کی طرح
ریزہ ریزہ میری ذات ہوتی جاتی ہے

ثنا عبدالقیوم ______ نامعلوم شہر

تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے
کبھی جھانکا تیری آنکھوں میں تو ہم ہی ہم تھے
میری لو بجھی میرے اپنے ہی لہو کی تھی کشید
زندگی بھر کی کمائی میرے اپنے ہی غم تھے

صفیہ عباس ______ کروڑلعل عیسن

تمہیں یاد بھی نہ ہوگا وہ جو کہہ کے دل لیا تھا
میرے بس میں کاش ہوتا جو سنا تھا بھول جاتا
نہیں تم سے کوئی شکوہ مگر ایک التجا ہے
جو بنا رہے ہو حالت کبھی آ کے دیکھ لینا

مینا بخاری، صبا نوشاہی ______ ڈوگہ گجرات

آنے والی رتوں کے آنچل میں
کوئی ساعت عید کیا ہو گی
گل نہ ہو گا تو جشن خوشبو کیا
تم نہ ہو گے تو عید کیا ہو گی

آمنہ اجالا ______ ڈہرکی

انسان کی آنکھ خشک تھی انسان کے ظلم پر
اب جو پہاڑ روئے تو سیلاب آ گیا
پھر آج دشمنوں کی تمنا ہوئی عدیم
پھر سے خیال حلقۂ احباب آ گیا

عنوی اکرم ______ کراچی

ان کی طرف سے گزر ہو تو کہہ دینا اے نسیم
کرتا ہے کوئی یاد آج سوگوارِ عید

نعیمہ گل ______ گوجرانوالہ

شام ہوتے ہی نگاہوں میں اتر آتے ہو
دل کی دھڑکن ترے پیروں کی دھمک لگتی ہے

سلطانہ فرید ______ کبیر والا

اسے معلوم کیا، ہم اس کی خاطر
چراغوں کی طرح شب بھر جلے تھے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

ستم گروں کی صفوں میں ہے نظم و ضبط وہی
ستم گروں کے نگر محوِ خواب ہیں اب تک

فرحانہ کیانی ______ سکھر

زندگی کے شور میں سمٹے رہے ذرے مرے
اک ذرا تنہا ہوا تو کس طرح بکھرا ہوں میں

حمیرا کریم ______ میانوالی

دیے جلا کے سب اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں
کوئی تو آئے ہواؤں کے سامنے اے دل

ثانیہ عرفان ______ فیصل آباد

جھوٹے وعدوں کی لذتیں مت پوچھ
آنکھ در سے لگی ہی رہتی ہے

تبسم شاہین ______ سمبڑیال

لطف صبح نشاط مجھ سے پوچھ
میں نے شامِ الم گزاری ہے

شازیہ فرقان ______ شکارپور

جی رہا ہوں میں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

ثمینہ اکرم ______ کراچی

ہوتی نصیب میں گر تیری دید کی خوشی
کس دھوم سے مناتے ہم اس عید کی خوشی
تیرے بغیر عید کی وہ رونقیں کہاں
بے کار سا ہے میرے لیے عید کا سماں

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم سب کو' ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔

پہلا خط حسن ابدال کے نواحی گاؤں نکو سے سعدی گل کا ہے' لکھتی ہیں

خط لکھنے کی اصل وجہ "یارم" کا ایک جملہ۔
"اور یہ محبت کا ہی کمال ہے۔ وہ مردے کو زندہ کر ڈالتی ہے۔ زوال کو کمال.... اور کمال کو باکمال۔ اور اس زوال سے کمال اور کمال سے باکمال ہونے تک کے سفر میں انسان جن وحشتوں' جس جنوں' جس کرب اور جس اذیت سے گزرتا ہے اسے صرف وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس نے محبت سے کمال پایا ہو اور کمال سے باکمال ہوا ہو۔"
بقر عید کے سروے کے سوال ذرا پسند نہیں آئے۔ نظم و غزل میں غزل بہت پسند آئی۔ "ایک تھی مثال" پڑھا۔ کم آن رخسانہ نگار اپنی اسپیڈ بڑھائیں۔ کہانی میں تھوڑا سا اضطراب اور ہلچل لائیں۔

ج :۔ پیاری سعدی! سمیرا حمید بہت خوب صورت جملے لکھتی ہیں یہ جملہ واقعی بہت خوب صورت ہے۔ آپ کے حسن نظر کی داد دیتے ہیں۔ رخسانہ نگار کی کہانی ایک بہت حساس کہانی ہے۔ انہوں نے معاشرے کے ایک المیہ کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں ڈرامائی عنصر کم ہے۔ بقر عید کے سروے کے سوالات آپ کو پسند نہیں آئے۔ ایک بات بتائیں سوالات کیسے بھی ہوں۔ قارئین کے جوابات ہوتے ہیں جو کسی بھی سروے کو دلچسپ بناتے ہیں۔ آپ ہماری قارئین کے جوابات پڑھیے گا آپ کو پسند آئیں گے۔

موناشاہ قریشی نے کبیر والا سے لکھا ہے

تمام رائٹر ہی اچھا لکھتی ہیں۔ مگر نمرہ احمد' کنیز نبوی' سائرہ رضا اور سمیرا حمید سرفہرست ہیں۔ سمیرا حمید بہت تھوڑے وقت میں بہت زیادہ تعداد میں تعریفی اسناد پا چکی ہیں۔ کنیز نبوی آپ کا ناول صنم سے صمد تک زبردست ہے۔ کیا یہ کتابی شکل میں بھی آئے گا؟ نمرہ احمد کی تو میں ویسے ہی دل و جان سے مداح ہوں۔





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

ج :۔ پیاری مونا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ "شعاع کے ساتھ ہمارا تعلق جڑا ہے تو ان شاء اللہ جڑا ہی رہے گا۔" آپ کے یہ جملے دل خوش کر گئے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرزانہ کوثر نے کوٹلی آزاد کشمیر سے لکھا ہے

جب اگست کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو ذہن الگ کشمکش کا شکار ہوا کہ کس کو پڑھیں اور کس کو نہیں۔ پھر "یارم" سے شروع کیا اور "یارم" پر ہی ختم۔ سمیرا آپی میرے پاس نہ تو الفاظ کا ذخیرہ ہے اور نہ ہی اظہار کا سلیقہ.... بس اتنا کہوں گی کہ میں آپ کو شہرت اور علم کی بلندیوں پر دیکھ رہی ہوں' ان شاء اللہ۔ سنیعہ عمیر نئی ہیں شاید' مگر قلم کی نوک نے واقعی شاہکار لکھا اور قدرت نے سنیعہ عمیر سے وہ شاہکار لکھوایا۔

ج :۔ پیاری فرزانہ! آپ کی تعریف سمیرا حمید اور سنیعہ عمیر تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نائلہ زاہد نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ میری بیٹی ہے۔ ان دنوں یونیورسٹی سے چھٹیوں کی وجہ سے وہ فری ہے۔ اس نے ایک ناول لکھا ہے۔ جس کا نام "روشنی کی تلاش" ہے۔ ماشاءاللہ مجھے تو بہت پسند آیا اور میں وہ آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ مجھے بتادیں کہ میں کس طرح اور کیسے آپ تک بھیجوں۔

ج :۔ پیاری نائلہ! ہم متعدد بار تحریریں بھجوانے کا طریقہ بتا چکے ہیں۔ ہر ماہ خطوں کے سلسلے میں ۔ بڑی تفصیل سے تحریریں بھجوانے کا طریقہ شائع ہوتا ہے۔ پتا نہیں آپ کی نظر سے کیوں نہیں گزرا۔ جبکہ پچھلے 28 سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں آپ ایک لفافے میں ناول رکھیں۔ لفافے پر ایڈریس لکھیں "ماہنامہ شعاع 37 اردو بازار کراچی۔" اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوادیں۔ ناول پر اپنا فون نمبر ضرور لکھیں۔

فوزیہ ملک پنجرہ کوٹلی آزاد کشمیر سے لکھتی ہیں

"پارم" ایک نئی تحریر، نیا موضوع، نئے کردار، نئے الفاظ، مگر قلم وہی پرانا، سحر پھونکنے والا، سحر زدہ کردینے والا۔

"شعاع" ایک صاف ستھرا ماہنامہ جس نے زندگی گزارنے کے بہت سے ڈھنگ سکھائے۔

ج :۔ پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

آبرو ملک شادی مبارک ہو۔ آئندہ خط لکھ کر بتانا پہلی عید کیسی رہی۔ رہی ہماری عید ہم نے کبھی ہوش سنبھالنے کے بعد عید نہیں منائی۔ بچپن کا اتنا یاد ہے کہ عید کا چاند شوق سے دیکھتے۔ سب بچے محلے کے سب گھروں میں جاکر سلام کرتے اور شور مچاتے، ایک کہتا، کل کی اے.... سب بولتے، عید اے.... گلی میں چوڑیوں والی تھی تو ساری عیدی چوڑیاں خریدنے میں لگا دیتے اور ہم عمر سہیلی کے ساتھ کھیلنے میں گر گر کر توڑتے رہتے۔ جس کی شادی 50 سال کی عمر میں حال ہی میں میرے بیٹے کے برابر ہوئی اور وہ بھی باہر ملک۔

شادی کے بعد عید کچھ یوں تھی کہ جٹھانی، نند اور ساس تیار ہو کر عورتوں میں عید پڑھنے جاتیں اور ہم کھلارا سمیٹنے میں لگے ہوتے، میاں صاحب نے کہا۔ "کیا تم نوکر ہو ان کی؟"

تو ہم نے کہا کہ آپ عید پڑھ کر آئیں گے تو ہم کپڑے پہن لیں گے۔ صرف چند سال ہم نے نئے کپڑے پہنے پھر تکلف بھی چھوڑ دیا۔ مہندی میں صرف ہاتھ پہ کوثر خالد لکھ لیتی ہوں۔ "نایاب ہیں ہم" پہلے تو عنوان نے دل موہ لیا۔ پھر مصنفہ کے نام نے.... اور پھر کہانی کے اختتام نے ہماری سہاگ رات بے نقاب کردی۔ کچھ کچھ ایسے ہی سین چلے تھے۔ "محبتوں میں انا" رمشا خالد.... تو اتنا عرصہ انتظار کروا کے آپ آہی گئیں۔ آپ نے بھی ہمارا ہی حال بیان کردیا ہے تو ہم کیا کہیں۔ چونکہ سہاگ رات ہم نے گاڑھا عہد لیا تھا کہ آپ کو مجھ سے کبھی غصہ نہیں ہونا۔ بدلے میں ہم سب کریں گے تو تمام بچوں تک ہمارے درمیان خطرناک مکالمہ نہ چلا۔ چونکہ میری بیٹی صبا پندرہ سال بیڈ مریض رہ کر جدا ہوئی تو ایک دن ہم اسے کھانا کھلاتے ہوئے یوں سو گئے کہ نوالہ ہاتھ میں.... بیٹی کا منہ کھلا ہوا خالد نے کام سے آکر آواز دی، نہ سنی ہوگی۔

ہوش آیا تو بولے۔ "یہ تمہارا حال ہے۔ ایک وہ رابعہ بصری تھیں اور ایک تم ہو۔"

ہم نے برجستہ کہا کہ "وہ اندر کمرے میں دیکھیے۔ آپ کی امی رابعہ بصری جیسی۔" (ساس صاحبہ شوہر کو دبا رہی تھیں۔) پھر ہم کام کرتے، مگر نو دن کلام نہ کیا اور پھر وہی ہوا جو رمشا نے لکھا۔ مگر ساس سے لڑائی جاری ہے۔ کیونکہ رابعہ بصری اور کسی گناہ گار کا جوڑ کیسے ممکن ہے۔ دیکھ لیجئے پھر بھی رہ رہے ہیں۔ اب تو یہ اپنے ہاتھوں دوزخ میں ڈالیں گی، کیونکہ ہاں میں ہاں ملانے والے جرا تیم اللہ تعالیٰ جی مجھ میں ڈالنا بالکل ہی بھول گئے ہیں۔ بھلا سوچیے جس نے کبھی ماں کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہو۔ وہ کسی دوسرے کی بات بلا چون و چرا کیسے مان سکتا ہے۔ ہاں البتہ خدمت کرنا الگ بات ہے۔ مگر اس میں بھی انداز اپنا جدا ہی ہے۔

افسانے.... سچی خوشی مل ہی جاتی ہے الحمدللہ۔ شکریہ بھی تو اکثر گھروں کا المیہ ہے۔ واقعی اگر بڑی بہن کی شادی نہ ہو رہی ہو تو چھوٹی کی کردینی چاہیے۔ بڑی کو اپنے نصیب کا انتظار کرلینا چاہیے، کیونکہ اس المیے نے میری سہیلی کی بھی جان لے لی۔ باپ نے بڑی کی شادی پہلے کرنے کی شرط برقرار رکھی اور چھوٹی بدحال سال گزار کر اگلے جہان گئی۔

بڑی کی شادی پھر بھی نہ ہوئی۔

ج :۔ پیاری کوثر! آپ کا خط پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے آپ سامنے بیٹھی باتیں کررہی ہیں۔ آپ کا ایک علیحدہ اور منفرد انداز ہے جو ہمیں بے حد پسند ہے اور یقین کریں ہمیں آپ کے خط کا انتظار رہتا ہے۔ جہاں تک شائع ہونے کی بات ہے تو آپ جانتی ہیں کہ ہرماہ ہمیں بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں اور محدود صفحات میں ان تمام خطوط کی اشاعت ممکن نہیں ہے۔

صبا علی چنیوٹ سے لکھتی ہیں

جس نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ سمیرا حمید کا ناول "یارم" ہے۔ نعیمہ ناز کی "روپ نگر کی رام کہانی" ناول بہت ہی اچھا تھا۔ صدف ریحان گیلانی کا ناولٹ "وفا کے وعدے" بھی زبردست تھا۔ باقی سارے افسانے اور ناولٹ اچھے لگے "اریج فاطمہ سے ملاقات زبردست رہی۔ پلیز عائزہ خان اور دانش تیمور کا بندھن انٹرویو شائع کیجئے پلیز پلیز۔

ج :۔ پیاری صبا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید، سمیرا حمید کے "یارم" نے آپ کی خاموشی کو توڑا، بہت اچھی بات ہے "اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

سحرش شاہین نے بیول سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں بھی کوئی افسانہ یا کوئی کہانی لکھنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ لکھ کر آپ کو ارسال کردوں۔

ج :۔ پیاری سحرش! غزل کے لیے معذرت، کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ کہانی بھجوا دیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

صبا عنایت اللہ جٹ نے بھریا روڈ سندھ سے لکھا

"شعاع" میں شائع ہونے والی تمام تحریریں ہماری پسندیدہ ہیں اور تمام مصنفین بہترین لکھ رہی ہیں۔ جیسا کہ نبیلہ عزیز کا "رقص بسمل" بہت اچھا جارہا ہے۔ مجھے ہر مہینے انتظار رہتا ہے اور سمیرا حمید کی تحریر بھی بہترین ہے۔

ج :۔ پیاری صبا! بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

حرمت ردا اکرم ڈلوال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

"پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" سے بہرہ ور ہوتے ہوئے اریج فاطمہ سے پلو چھڑاتے سیدھے "یارم" کی طرف بھاگے۔ اچھا لکھا ہے، بلکہ بہت اچھا لکھا ہے، مگر ہم کہ جو کبھی نبیہہ نقوی کے سادہ طرز تحریر اور اب سائرہ رضا کے منفرد مگر سمجھ میں ایک دم سے آجانے والے لفظوں کے عادی ہیں، دیوانے ہیں، شیدائی ہیں، سو سمیرا کو سمجھنا مجھے تھوڑا مشکل لگتا ہے۔ یہ وہ واحد رائٹر ہیں جن کی کہانی میں دو دفعہ پڑھوں تب ان کی تشبیہات اور استعاروں کو سمجھ پاتی ہوں۔ امرحہ مجھے تو تھوڑا ابنارمل کیس لگتی ہے، کبھی سمجھ بوجھ والی، دانا و عقل مند اور کبھی اک دم ڈیفرنٹ ٹائپ! انتہائی معذرت کے ساتھ کہ سمیرا حمید نے "یارم" کی پہلی اور دوسری قسط میں جو تحریر کیا، وہ تھوڑا حقیقت سے دور لگا۔ خاص طور پر فیملی کا امرحہ کے ساتھ رویہ۔ ساتھ ہی ساتھ تمام رائٹرز سے گزارش ہے کہ پاکستان کا جو طبقہ یہ ڈائجسٹ پڑھتا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ لوئر مڈل اور مڈل کلاس ہوگا۔ جن کی تفریح یہ رسالے ہیں اور میڈیا جو کچھ دکھا رہا ہے، خدا کی پناہ! سو آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ ہماری تحریر لکھیں جو یہاں بستے ہیں، دوسری تہذیبوں کو جاننا بھی اچھی بات ہے، مگر اس قدر بھی نہیں۔ صدف ریحان کا "وفا کے وعدے" بھی بہت اچھا لگا مجھے۔ رِدا سمیت پانچوں بہنوں کا بھائی کے لیے تڑپنا بے اختیار رلا گیا۔ شاہ داد کے ہاتھ تلے پوری کائنات کا سمٹ کر موہل کے سر پر ٹھہر جانا مجھے اپنی زندگی کا خوب صورت ترین سین لگا۔ آنکھوں سے ہٹتا ہی نہیں۔ اریج فاطمہ اور دستک کے سب ہی لوگوں سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ "شعاع کے ساتھ میں نور سحر کا تعارف سب سے زیادہ اچھا لگا۔ آہ یہ زندگی! اللہ پاک ان کی مشکلات میں کمی فرمائے۔ (آمین)

ج :۔ پیاری حرمت! سمیرا نے امرحہ کے ساتھ اس کی فیملی کا جو رویہ دکھایا ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ اکثر گھرانوں میں لڑکیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا رویہ رکھا جاتا ہے اور یہ لوئر مڈل اور مڈل کلاس میں زیادہ ہوتا ہے۔ شعاع میں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں "ان کا تعلق زیادہ تر مڈل کلاس سے ہی ہوتا ہے نور سحر کا تعارف پڑھ کر ہماری بہت سی قارئین نے دکھ کا اظہار کیا ہے اور ان کے لیے دعا بھی کی ہے، ہمیں یقین ہے کہ ان شاء اللہ ان دعاؤں سے ان کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آئے گی۔

میر پور آزاد کشمیر سے ام دعا نے لکھا ہے

اس ماہ کا شعاع اور شعاع کا تاج "یارم" لفظ لفظ محبت.... امرحہ اور عالیان کا سحر "یارم" سے پہلے "جنت کے پتے" تھا۔ جس نے مجھے مسحور کیا تھا اور اب "یارم" چودہ سال کے اس سفر میں (رسالوں کے ساتھ) یہ دو واحد تحاریر جنھوں نے مبہوت کردیا۔ لیڈی مہر کا کردار بہت متاثر کن ہے! دوسری قسط میں ذکر تھا۔ وہ کیسے بچوں کو ڈیل کرتی ہیں' سستی سے دور رکھنا' "ایکٹو" رکھنا' ان کی یہ عادت' سب ماؤں کے لیے بشمول میرے ایک اچھی ٹپ ہے۔ سوال یہ ہے کہ لیڈی مہر مسلم ہے یا نان مسلم' بس یوں ہی دماغ میں آیا یہ سوال؟

ج :۔ ام دعا! "یارم" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ کارل کے متعلق آپ کا اندازہ درست ہے۔ وہ عالیان کا دوست ہی ہے' لیڈی مہر مسلم ہیں۔

صائمہ مشتاق نے حافظ آباد سے لکھا ہے

اس بار سرورق بہت خوب صورت تھا۔ اس سے محظوظ ہو کر "یارم" پڑھا اور پھر کچھ اور پڑھنے کے قابل نہ رہی۔ "امرحہ! کیا' کیا تم نے؟ ایسے کرتا ہے کوئی؟" دل دہائی دیتا رہا سارا وقت اور عالیان.... اس کی حالت پڑھ کے تو میرے دل کا زخم ہرا ہو گیا۔ میں نے "یارم" کی پہلی قسط تین بار پڑھی۔ اتنا مزہ آیا مجھے اور دوسری قسط دوبار' مگر تیسری قسط.... وہ پھر سے پڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔ اندر کہیں کھب گئی ہے۔ ہم خوشیاں بار بار جینا چاہتے ہیں۔ مگر دکھ.... وہ تو ایک بار ہی سہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بار بار کون سہے۔ سمیرا! آپ سے بس ایک گزارش ہے۔ حقیقی دنیا میں تو ہم تقدیر کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کہانی کی خالق آپ ہیں۔ خدارا عالیان سے اس کی محبت' اس کی خوشی الگ نہ کیجیے گا۔

نعیمہ ناز کا ناول پڑھا۔ موضوع پرانا' مگر انداز نیا تھا۔ صدف ریحان کی کہانی بہت اچھی تھی۔ نگہت سیما کو کافی عرصہ بعد دیکھ کر اچھا لگا۔ ثمرہ بخاری سے کہنا تھا رمضان میں ٹی وی پہ نشر ہونے والا آپ کا ڈرامہ "میں نہ مانوں ہار" میں نے بہت ذوق و شوق سے دیکھا۔ پلیز شعاع کو نہ چھوڑیں۔ میں سعدیہ عزیز آفریدی کو بہت زیادہ یاد کرتی ہوں۔ ان سے کہیں کہ وہ جلد سے جلد کسی ناول کے ساتھ تشریف لائیں۔ شکیب جلالی کی "آس" بے حد پسند آئی۔ "باتوں سے خوشبو آئے" کی تو کیا ہی بات ہے۔ دل ہر بار خوش ہو جاتا ہے۔ میں پرانے دور کو بھی بہت یاد کرتی ہوں۔ جب ہر موسم کے بدلتے ہی کہانیاں بھی نئے موسموں کے رنگوں سے ڈھل جاتی تھیں۔ بہار میں کہانیاں بھی پھولوں سے بھری ہوتیں۔ گرمیوں میں آم اور درخت پر جھولے' سردیوں میں مونگ پھلی اور پروان چڑھتی نرم گرم محبتیں' کس قدر خوب صورت دور تھا۔ شعاع اور خواتین کی کہانیاں پڑھ کے بند کمرے میں بھی موسم کی خبر ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب.... یکسانیت آنے لگی ہے۔ مگر سمیرا حمید اور سائرہ رضا جیسی خوب صورت رائٹرز اس جمود کو توڑ دیتی ہیں اور خوش گوار جھونکا ثابت ہوتی ہیں۔

ج : صائمہ! بے حد خوب صورت خط لکھا آپ نے آپ کو افسانہ نگاری کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ جس دور کی کہانیوں کا آپ نے ذکر کیا۔ وہ دور بہت پرسکون تھا۔ 1985ء کے بعد کراچی بدلا اور 1999ء میں مشرف کے بعد پورا ملک ہی بدل گیا اور 2007ء میں لال مسجد کے بعد تو خود کش دھماکوں اور دہشت گردی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو آج تک رک نہیں پایا ہے۔ لکھنے والے اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی کہانیاں اخذ کرتے ہیں۔ بے چینی' بے اطمینانی عدم تحفظ کا احساس ہو تو پھولوں خوشبوؤں کی رنگوں کی باتوں میں وہ اثر پذیری نظر نہیں آتی اور کچھ یہ بھی ہے کہ ایک خاص عمر میں ہمیں جو چیزیں متاثر کرتی ہیں' وقت آگے بڑھنے پر ہمیں اتنی اچھی نہیں لگتیں ورنہ آج بھی بہت سی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

عروج یوسف

"خط آپ کے" میں پہنچی تو آپ نے مدیحہ عارف کو جو جواب دیا' یقین کریں پڑھ کر اتنی زبردست گدگدی ہوئی کہ کیا بتاؤں؟ میں پچھلے اٹھارہ' بیس سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں' مگر کل پہلی دفعہ آپ کا جواب پڑھ کر ایسا لگا کہ "مدیرہ" صاحبہ بھی ہمارے جیسی انسان' بلکہ خاتون ہیں۔ اب ایک اعتراض' بینا صدف نے "یارم" کے جس جملے کی تعریف کی ہے۔ "وقت تمہیں زندہ رکھے" وہ مجھے کہانی پڑھتے وقت تو ذرا کھٹکا تھا۔ مگر جب اس کی تعریف ہوئی تو

سوچا آپ سے پوچھوں کہ بہ حیثیت مسلم ہمیں یہ جملہ استعمال کرنا چاہیے؟ کیا وقت کسی کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ ایک غیر مسلم معاشرے میں تو جو چاہو سو کرو' مگر ہمیں ہر قدم اور ہر لفظ پر سوچنے سمجھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے' کیونکہ ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ "انسان کا کوئی ایک عمل اسے جنت میں لے جاسکتا ہے یا جہنم میں پہنچا سکتا ہے۔" آخر میں آپ سے اور تمام لوگوں سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں پاکستان کا نام لازمی شامل کریں۔ اللہ تعالیٰ میرے وطن پر اپنا خصوصی کرم فرمائے۔ کیونکہ اس میں ایسے ناعاقبت اندیش لوگ ہیں جو دوسروں کو ڈبونے کے چکر میں اپنے ہاتھوں' اپنی کشتی میں سوراخ کررہے ہیں۔

ج:۔ پیاری عروج! سب سے پہلے تو دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہ آپ نے اتنی توجہ اور غور سے پڑھا اور ہماری غلطی کی نشان دہی کی۔ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے۔ سہواً" انبیاء علیہ السلام کے ساتھ لکھا گیا۔ اس سہو کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں اور اللہ کے حضور معافی کے خواست گار۔

"وقت زندہ رکھے" استعارے کے طور پر وقت استعمال ہوا ہے' کیونکہ وقت ہمیشہ رہنے والا ہے انسان ختم ہوجائے گا۔ جس طرح سورہ عصر میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے۔

نازیہ خالد نے ڈھوک چراغ دین راولپنڈی سے لکھا ہے

ستمبر کے شعاع کے ٹائٹل نے تو موسم کے لحاظ سے خوش کردیا۔ خاص طور پر شاہدہ طلعت کا ناولٹ اور اگر کمال کا تھا۔ رمزی کی ضد پہ ہنسی آرہی تھی "رقص بسمل" ہر دفعہ کی طرح انٹرسٹنگ تھا۔ صدف ریحان گیلانی نے بہت ہی اچھا لکھا۔ "وفا کے وعدے" میں اتنی طوالت نہیں تھی۔ لیکن بیسٹ تھا۔ اس کے علاوہ "گرہستن" اور مصباح علی کا "آنکھ کا پانی" اچھا لگا۔ "خوب صورت بنیے" میں بڑھتی عمر کے اثرات چھپانے کے اتنے ڈھیر طریقے پڑھ کے اچھا لگا۔ ہنی چکن بہت آسان ترکیب تھی۔ میں نے ٹرائی کی بہت اچھی بنی۔ "یارم پڑھا" لیکن خاص نہیں لگا۔"

ج :۔ پیاری نازیہ! بہت شکریہ! آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ صدف ریحان گیلانی نے کافی عرصہ بعد لکھا ہے' ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قارئین نے اسے پسند کیا ہے۔

سائرہ داؤد نے چوک چورہٹہ ڈی جی خان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اس ماہ کا شعاع بھی پہلے کی طرح پرفیکٹ لگا۔ سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول "یارم" کی طرف دوڑ لگادی۔ سمیرا آپی آپ سے ایک درخواست ہے کہ پلیز عالیان کو مت ماریے گا۔ مجھے بہت رونا آئے گا۔ پلیز رحم کیجئے گا۔ افسانے سارے ہی بہترین تھے۔ اور دوسری بات آپ سے یہ پوچھنا تھی کہ اگر میں شعاع کے پتے پر نمرہ احمد کے نام خط لکھوں تو کیا ان تک میرا خط پہنچ جائے گا۔ آپی کیا ہر وقت فنکاروں کو پکڑ رکھا ہے؟ کبھی رائٹرز اور کرکٹرز کے بھی انٹرویو شائع کریں۔ خاص طور پر نمرہ احمد' شاہد آفریدی اور فرحت اشتیاق کے انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج: سائرہ! رائٹرز کے انٹرویو کی ہماری کافی قارئین سے فرمائش کی ہے۔ ان شاء اللہ جلد یہ سلسلہ شروع کریں گے۔ کرکٹرز کے انٹرویو شائع ہوتے رہے ہیں۔ تقریباً" تمام مشہور کرکٹر کے انٹرویو شائع ہوچکے ہیں۔ کرکٹرز کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر پاکستان سے باہر ہوتے ہیں اور اگر ان سے رابطہ ہو بھی جائے تو وہ انٹرویو دینے پر راضی نہیں ہوتے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مقدس' حنا صدف لکھنوال کلاں گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ٹائٹل بہت خوبصورت تھا' سب سے پہلے رقص بسمل پڑھی ہمیشہ کی طرح دل کو چھونے والے انداز میں تھی "ایک تھی مثال" کہانی زبردست انداز میں بڑھ رہی ہے۔ "یارم" پورے رسالے کی جان ہے۔ سمیرا حمید کا انداز تحریر نمرہ احمد سے ملتا جلتا ہے' افسانے بھی سب بہت اچھے لگے۔ خواتین و شعاع سے ہمیشہ ہمیں کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔

ج: مقدس اور حنا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اس میں شک نہیں کہ خواتین اور شعاع میں شائع ہونے والی تحریریں بامقصد ہوتی ہیں لیکن اگر آپ ان سے کچھ سیکھتی

ہیں تو اس میں آپ کی اپنی صلاحیتوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ اچھی بات کا اثر وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو فہم، سمجھ اور شعور رکھتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سمیرا حمید اور نمرہ احمد کا انداز تحریر بہت مختلف ہے۔ انہیں ملانا ہمارے خیال میں بالکل درست نہیں۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور مشترک ہے کہ دونوں بہت اچھا لکھتی ہیں اور دونوں ہی قارئین میں بے حد مقبول ہیں۔

ثوبیہ نور بھاول نگر کشن گڑھ سے اپنے گاؤں کے تعارف کے ساتھ شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

شعاع ہاتھوں میں آیا تو گویا آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آئی۔

"خط آپ کے" میں اکثر بہنیں اپنے گاؤں یا شہر کا تعارف کرواتی ہیں تو یاد آیا کہ ایک "شہر لازوال" کو ہم نے بھی رونق بخشی بلکہ بے مثال گاؤں بھاول نگر سے ہارون آباد کی طرف جاتے ہوئے آپ میرے گاؤں سے ہرگز نہیں گزر سکیں گے کیونکہ یہ سڑک میرے گاؤں سے ہرگز نہیں گزرتی بلکہ سرے سے کوئی بھی سڑک نہیں گزرتی۔ راستے میں جو اسٹاپ آئے گا۔ وہاں پر ہی سڑک کو الوداع کہہ دیا جاتا ہے وہاں سے کشن گڑھ تک اگر "پیاں پیاں" آیا جائے تو بندہ بہت انجوائے کرتا ہے "گاڑی پر آئے تو اور زیادہ انجوائے کرتا ہے جیسے۔

"جھولا جھولیں میں اور سیاں... ک بار اوپر اک بار نیچے"

اور اگر بائیک پر آئیں تو ... سوری' آپ نہیں آسکتے' اس کے لیے خاص پریکٹس کی ضرورت ہے۔ ہاں البتہ اڑھائی تین کلو میٹر کے اس راستے پر توجہ نہ دی جائے تو تاحد نگاہ پھیلا ہوا سبزہ' رنگ برنگی لہراتی' صحت مند فصلیں آنکھوں کو تراوٹ بخشتی ہیں راستے میں آتے ننھے منے باغ سے امرود بھی توڑ کر کھائے جاسکتے ہیں مگر اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کتنے اچھے "چور" ہیں۔ تھوڑا آگے لمبے سرکنڈوں کے جھرمٹ میں تھوڑی جدوجہد کے بعد ایک کنواں بھی دیکھا جاسکتا ہے "کافی سال پہلے گاؤں کی الھڑ مٹیاریں سر پر مٹی کے گھڑے رکھے ہاتھ میں لمبی رسی والی ڈولی پکڑے ایک دوسرے کو ماہیے ٹپے سناتی۔ پانی بھرنے آیا کرتی تھیں' خوب ٹھنڈا اور خوب میٹھا پانی' پھر وقت گزرنے کے ساتھ گاؤں نے ترقی کی اور واٹر سپلائی سسٹم کے تحت گھر گھر پانی کے نل لگ گئے ٹنکیاں بن گئیں اور کنویں کی رونق اپنی موت آپ مرگئی اب چند سال پہلے کچھ اور ترقی ہوئی اور یہ پانی خراب ہوگیا' پئیں تو پیٹ خراب' چائے پکائیں تو دودھ خراب۔ اب لوگ بیٹھ کر کنویں کے پانی کو یاد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہیں کہ نئی واٹر سپلائی کی منظوری ہوچکی ہے' اب بس چند دن۔

اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایک بوائز ایلیمنٹری اسکول ہے اور گرلز پرائمری اسکول اکلوتے کمرے والا' جب ہم لوگ یہاں پڑھا کرتے تھے تو یہ کمرہ ہمیشہ حالت رکوع میں رہا کرتا تھا' بعد میں غالباً" اس کے سجدہ ریز ہونے کے خوف سے اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اب کہ ایک عدد واش روم اور ایک ٹنکی اس کا اکلوتا پن بانٹنے وجود میں آچکے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے باہر سے کوئی لیڈی ٹیچر یہاں نہیں آتی گاؤں کی "ذاتی" ٹیچر کی وجہ سے "کام" چل رہا ہے بس۔

اتنے خراب راستے کے باوجود' ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے اور زیادہ نہیں تو اتنے کہ لوگ تعلیم یافتہ بھی ہیں کہ محکمہ تعلیم' پولیس' ٹریفک پولیس اور ایئر فورس وغیرہ میں خدمات سر انجام دے رہے ہیں اب چند ایک انجینئرنگ بھی کررہے ہیں۔

ثوبیہ! سب سے پہلے تو آپ کو مبارک باد' اتنی کم سہولیات کے باوجود آپ بی اے کرچکی ہیں اور اب ماسٹرز کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے ارادوں میں کامیاب کرے۔ (آمین)

گاؤں کے بارے میں جان کر جہاں اس بات پر دکھ ہوا کہ پینے کے لیے صاف پانی مہیا نہیں ہے "گاؤں تک پہنچنے کے لیے پختہ سڑک نہیں ہے۔ اسکول خستہ حالت میں ہے خوش آئند کی بات یہ ہے اس کے باوجود گاؤں کے لوگ تعلیم حاصل کرکے مختلف محکموں میں کام کررہے ہیں۔

شعاع کی پسندگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

حافظہ نور آمنہ رحیم یار خان سے تشریف لائی ہیں

ٹائٹل خوبصورت تھا۔ سب سے پہلے رقص بسمل پڑھا ابھی تک کہانی کی سمجھ نہیں آئی۔ ایک تھی مثال میں مثال کے حالات پڑھ کے بہت دکھ ہوتا ہے روپ نگر کی

رام کہانی بھی اچھی تھی۔ اس بار شعاع کی جان عورت کا دل تھی۔ ویل ڈن نگہت جی۔ اریج فاطمہ سے ملاقات بہت پسند آئی۔ اب آتی ہوں اپنے شہر کے تعارف کی طرف ہمارا شہر بہت خوبصورت اور پرامن ہے۔ رحیم یار خان کا دل گلشن اقبال ہے کشادہ سڑکیں اتنی کہ کرین بھی آسانی سے گزر جاتی ہے۔ پارک، مسجدیں، بڑی مارکیٹیں جس میں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہے۔ 72 ہائی اسٹینڈرڈ انگلش میڈیم اسکول کالج ہوٹلز، بینک ہر چیز موجود ہے اس کی نمایاں بات یہ ہے اس میں جو بھی آئے جانے کو نہیں کرتا اور لوگ بہت ویل ایجو کیٹڈ ہیں۔ ڈاکٹرز بینکرز، ٹیچر ہر طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔

ج: آمنہ! آپ کے شہر کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ سب سے زیادہ یہ کہ آپ کا شہر پرامن ہے اور وہاں کے لوگ علم حاصل کر رہے ہیں۔

وردہ بٹ نے ڈسکہ سے لکھا ہے

کافی عرصہ سے شعاع کو پڑھنا بند کیا ہوا تھا، وجہ شاید کہ ہماری پسندیدہ مصنفین کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ لیکن ایک دن شعاع پکڑا تو سمیرا حمید کا ناول "یارم" اور رقص بسمل نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یار ابھی بھی شعاع میں دم ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے پھر سے اس سے ٹوٹا رشتہ جوڑ لیا۔

ج: وردہ! شعاع میں نئی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن پرانی مصنفین کی تحریریں بھی شائع ہو رہی ہیں رخسانہ نگار ناول لکھ رہی ہیں، پچھلے ماہ ثمرہ بخاری کی تحریر بھی شامل تھی، فاخرہ جبیں نے بھی مکمل ناول لکھا، وقت کے ساتھ ساتھ نئے لوگ شامل ہوتے رہتے ہیں لیکن پرانی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہم نے شعاع کے معیار میں کمی نہیں آنے دی۔ ہماری نئی مصنفین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

گل افشین بیول سے لکھتی ہیں

نمرہ احمد کا میں شعاع کے ذریعے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ان کے ناول "جنت کے پتے" کی بدولت مجھے پردہ کرنے کی توفیق ملی ہے۔ برائے مہربانی کبھی احسن خان اور صبا قمر کا انٹرویو بھی شامل کریں۔

ج: گل افشین! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اچھائی کی توفیق دی آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔



قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

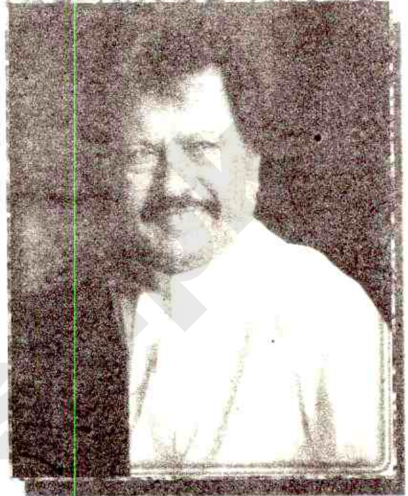
گواصفہ سہیل

دستک سے آئینہ

پر بھی غور کرنا چاہیے۔)

ادرک سے کینسر کا بچاؤ

ادرک کے روزانہ استعمال سے ہم کئی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ادرک میں ایک جزو جنجرین ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں تازہ تحقیق ہوئی ہے کہ کینسر سے بچاؤ کے لیے یہ ایک بہترین دوا ہے۔ ادرک کا ایک کام یہ ہے کہ جسم میں انزائم کی پیداوار بڑھادیتی ہے۔ جب ہم کوئی مرغن غذا کھاتے ہیں تو جسم کو اضافی انزائمز چاہیے ہوتے ہیں' یہ ضرورت ادرک سے پوری ہوتی ہے۔ اسی لیے ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ مرغن کھانوں پر ادرک چھڑک کر کھاؤ۔



پہچان

مشہور گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں کہ "میری دعا ہے کہ اللہ پاکستان کو ہمیشہ سلامت رکھے اور اس کی طرف بری نظر اٹھانے والوں کو اتنی مہلت نہ دے کہ وہ اس کے خلاف کچھ کر سکیں (آمین)" وہ کہتے ہیں کہ اگر پاکستان ہے تو عطاءاللہ ہے' ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہمیں نام' کام' عزت' شہرت سب پاکستان کی بدولت ہی ملا ہے۔ ہم سب کو اس کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے (کاش! آپ کی یہ بات اور لوگ بھی سمجھ جائیں) انہوں نے مزید کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان نے ہمیں کیا دیا' تو میں کہتا ہوں کہ پاکستان نے ہمیں پہچان دی ہے۔ (ہم نے کیا دیا پاکستان کو کبھی اس



علامت

ہماری اداکارائیں بھی کیا کیا خواہشات رکھتی ہیں کہ سن کر حیرت ہی ہوتی ہے۔ اب ذرا یہ اداکارہ ثنا کو ہی دیکھ لیں بجائے اس بات پر شکر کرتیں کہ ان کی شادی ہو گئی (ورنہ میرا کی طرح ۔۔۔؟) ایسی انوکھی خواہش کی ہے کہ ۔۔۔ چلیں ذرا آپ بھی سنیں۔ ثنا کہتی ہیں کہ "میری خواہش ہے کہ میرے شوہر فخر امام میرے لیے تاج محل جیسی کوئی عمارت بنائیں جو آج کے دور میں لوگوں کے لیے (کن لوگوں کے لیے؟) ایک مثال ہو تاج محل صرف ایک ملکہ کی قبر نہیں بلکہ وہ ایک انمول محبت کی داستان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جس کو آج بھی دنیا میں محبت کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔" ثنا! خواہش وہ کریں جو پوری ہو جائے۔ رہی بات محبت کی علامت تاج محل کی تو اگر آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہوتی تو آپ جان جاتیں کہ وہ محبت کی نہیں فن تعمیر کی علامت ہے کیوں کہ شاہ جہاں کو عمارتیں بنوانے کا شوق تھا اور یہ کریڈٹ اس کے مزدوروں کو جاتا ہے جنہوں نے یہ عمارت بنائی تھی (ویسے اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو یہ تو یاد ہو گا ناکہ شاہ جہاں نے تاج محل ممتاز کے مرنے کے بعد بنوایا تھا؟)

پیغام

سہیل اصغر ہمارے ملک کے ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں ٹی وی ڈراموں نے جو معیار اپنایا اس کے اثرات آج بھی نظر آرہے ہیں لیکن ان میں مزید بہتری کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کا ٹی وی ڈرامادور جدید کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر بنایا جارہا ہے۔ اچھے موضوعات کی تلاش نے ڈرامے کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے (جی اس کی مثال یہ ہے کہ پڑوسی ملک ہمارے ڈرامے خرید کر اپنے ایک چینل پر دکھا رہا ہے۔) ملک کی موجودہ صورت حال میں ایسی کہانیوں اور موضوعات



کی ضرورت ہے، جو دیکھنے والوں پر مثبت اثرات مرتب کر سکے۔ (لیکن موجودہ صورت حال تو ناچتا پاکستان ۔۔۔ اوہ سوری !نیا پاکستان ہے کیسے دکھایا جاسکتا ہے) معاشرے کی اصلاح میں ٹی وی ڈراموں کے توسط سے اچھا پیغام عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ (محترم سہیل اصغر صاحب! آپ کی بات بجا سہی لیکن کیا واقعی ہمارے آج کے ڈرامے عوام تک اچھا پیغام پہنچا رہے ہیں یا ۔۔۔؟)

سمجھو تو ....!

سننے میں آیا ہے کہ آسکر ایوارڈ کی بہترین فارن فلم کیٹگری کے لیے فلم "وار" ہی ہے جو کسی نہ کسی حد تک ان کے معیار کو چھوتی نظر آتی ہے۔ لیکن اگر فلم کی کہانی پر غور کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے معیار پر پوری نہ اترے کیوں کہ اس میں محب وطن پاکستانیوں کو دہشت گردی کے خلاف لڑتا دکھایا گیا ہے۔ اس میں پاکستانیوں کا مثبت رویہ نظر آیا ہے جب کہ آسکر والوں کو ایسی چیزیں پسند نہیں (مطلب انہیں ہمارا محب وطن ہونا۔) کیوں کہ پاکستان کی جس ڈاکومنٹری کو آسکر ایوارڈ ملا تھا اس میں شرمین چنائے نے ہمارے ملک کا کمزور پہلو دکھایا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر پاکستانی مرد کیسے اپنی عورتوں کو تیزاب سے جلا کر مار دیتے ہیں یا نشان عبرت بنا دیتے ہیں۔ آسکر یا

اکیڈمی ایوارڈ والے یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی نظر میں پاکستان کا ایسا امیج دکھایا جائے جو ان کے مفادات سے وابستہ ہو۔ (کاش! ہم یہ بات سمجھ سکیں۔)

تاریخ

سلمان پیرزادہ کی بیٹی زارا پیرزادہ کہتی ہیں کہ میں ایک پڑھاکو لڑکی تھی (پڑھاکو لڑکیوں کے والدین چوکنا ہو جائیں!) اور ماڈلنگ کے شعبے سے متعلق الٹی سیدھی باتیں سن رکھی تھیں۔ (پھر کیا پتا چلا کہ سیدھی الٹی، اور الٹی سیدھی ہے؟) تو میں کبھی ماڈل بننے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ (تو اب ایسا کیا دیکھ لیا کہ....) میں نہیں چاہتی تھی کہ ماڈل بننے کے بعد لوگ مجھے صرف ایک شوپیس کے طور پر ٹریٹ کریں۔ میں شوبز میں اس سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتی تھی۔ (شوپیس سے آگے کیا؟) میں نے فیشن کی تاریخ پڑھی تھی (کاش! اسلامی تاریخ یا پاکستان کی تاریخ پڑھ لیتیں۔) مجھے پتا تھا کہ اس انڈسٹری نے دنیا کی بڑی بڑی تحریکوں میں سیاسی اور ثقافتی سطح پر کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ (اوہو! تو یہ جو اسلام آباد کا سیاسی ثقافتی شو چل رہا ہے وہ۔؟)



کچھ اِدھر اُدھر سے

شیخ رشید تو ہمارے نزدیک اسی وقت غیر معتبر ہو گئے تھے، جب ایک آمر پرویز مشرف کے دور میں ڈمہ ڈولا پر امریکی میزائل حملے پر انہوں نے فرمایا کہ کچھ لوگ اپنے گھر میں بم بنا رہے تھے، جو پھٹ گیا، امریکہ نے کچھ نہیں کیا۔ جب ایک نوجوان صحافی نے امریکی میزائل کے ٹکڑے دکھا دیے تو اسے لاپتا کر دیا گیا، پھر اس کی لاش ہی ملی۔

(اطہر ہاشمی۔ بین السطور)

شمالی وزیرستان سے انسانوں کا سمندر آرہا ہے۔ لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں، ہوش آئے تو پوچھتے ہیں اور کتنی دور....؟

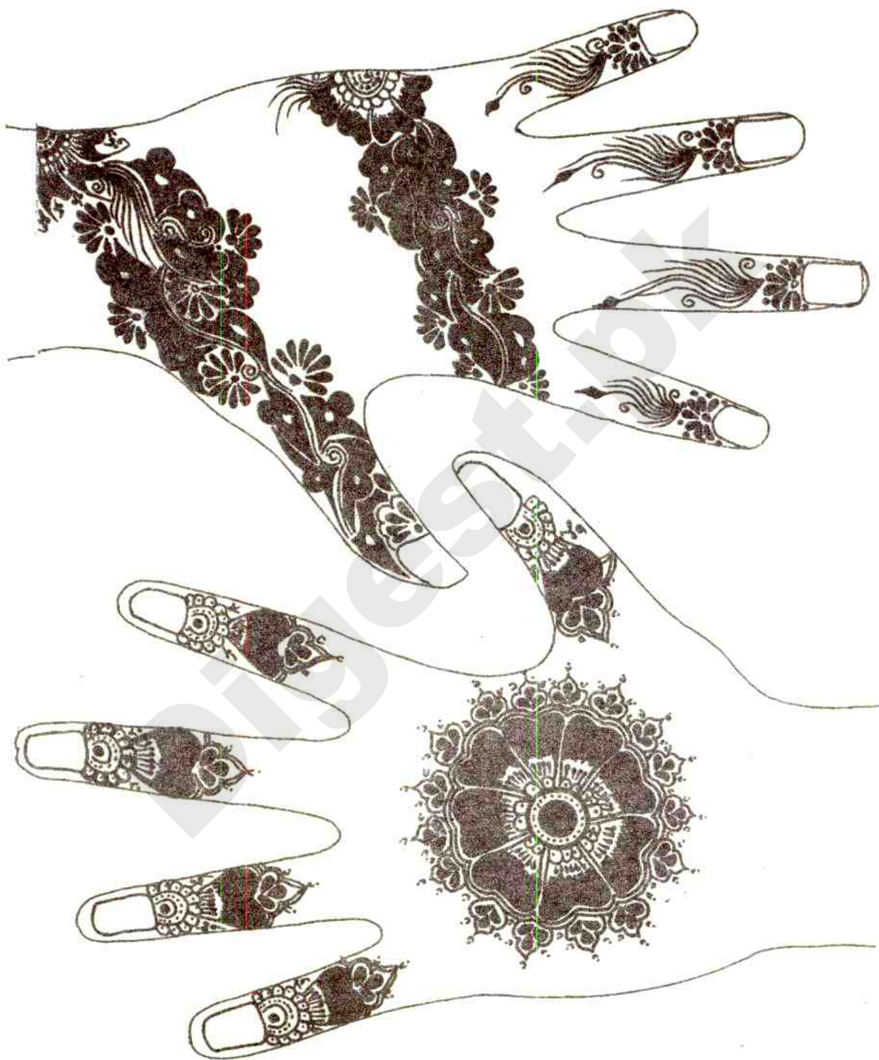
(فرزانہ چیمہ)





مہندی کے ڈیزائن

ادارہ





امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

حکومت کے لیے

عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ جعفر نے مسند نشین ہوتے ہی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کی اور علماء حدیث یعنی محدثین کی مدد کی اور تمام ممالک کے محدثین جمع کیے۔ ابو بکر بن ابی شیبہ کو جامع رصافہ میں مقرر کیا اور ان کے بھائی عثمان کو جامع منصور میں مقرر کیا۔ ان کے وعظ میں روزانہ تقریباً" تیس، تیس ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اس کام سے لوگ متوکل سے بہت خوش ہوئے اور اس کے لیے دعائیں کی گئیں۔

یہ عباسی خلیفہ تھا، لیکن دو سال بعد اس نے ایسے کام کیے کہ لوگوں نے اس کو ناصبی (خارجی) کا لقب دے دیا۔ اس نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر مبارک اور اس کے اردگرد جو قبریں تھیں، انہیں کھدوا کر برابر کروادیا اور لوگوں کو اس کی زیارت سے منع کردیا۔ لوگوں کو اس حرکت سے بہت صدمہ پہنچا اور اہل بغداد نے اس کے خلاف دیواروں اور مسجدوں پر گالیاں لکھ کر چسپاں کیں۔ شاعروں نے اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں۔

اس کی حکومت کے چار سال بعد آسمانی آفات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اہل حلاط نے آسمان سے ایک چیخ کی آواز سنی، جس سے ہزاروں آدمی مر گئے۔ عراق میں مرغی کے انڈے کے برابر اولے پڑے۔ مصر کے علاقے میں آسمان سے پتھر برسے، جن کا وزن دس، دس رطل تھا۔ یمن میں پہاڑوں نے اتنی حرکت کی کہ لوگوں کے کھیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ حلب میں ایک سفید جانور رمضان شریف میں ظاہر ہوا۔ لوگوں نے سنا، وہ کہتا تھا۔ "لوگو! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔" اس طرح چالیس آوازلگائیں اور اڑ گیا۔ دوسرے روز پھر نمودار ہوا اور اسی طرح آوازیں لگائیں۔ اس عجیب و غریب بات کو لوگوں نے تحریر کرکے اس پر پانچ سو افراد کی شہادت دلوائی اور دارالحکومت میں یہ تحریر بھیجی، تاکہ دارالحکومت میں اس کو جھوٹ اور مذاق نہ سمجھ لیا جائے۔

آسمانی آفات کا یہ سلسلہ بھی متوکل کو اس کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکا۔ لوگوں نے اس کو لعنت ملامت کی کہ وہ عباسی خلیفہ ہے۔ اس کے باوجود اس طرح کے مظالم ڈھا رہا ہے۔ لیکن لوگوں کی لعنت ملامت کا اس پر اثر نہ ہوا۔ متوکل نے یعقوب بن سکیت امام عربیہ کو جو اس کے بیٹوں کا استاد تھا مروا دیا۔

اس کی خطا یہ تھی کہ ایک روز متوکل نے اپنے بیٹوں معتز اور موید کو دیکھ کر ابن سکیت سے دریافت کیا کہ.....

"تمہارے نزدیک یہ اچھے اور پسندیدہ ہیں یا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ؟"

یعقوب بن سکیت نے جواب دیا کہ معتز اور موید سے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کا غلام قنبر بھی بہتر ہے۔ چہ جائیکہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کیا جائے۔

یہ سن کر اس نے چند ترکوں کو حکم دیا کہ اسے چت لٹا کر اس کے پیٹ پر تب تک کودو جب تک اس میں جان باقی رہے ورنہ کہتے ہیں کہ اس نے ان کی زبان تالو سے کھنچوالی اور وہ مر گئے۔ ان کی اولاد کو دیت یعنی خون بہا بھیج دیا۔

متوکل کا وزیر فتح بن خاقان کہتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ متوکل کو بہت فکر مند اور سرنگوں دیکھا تو میں نے عرض کیا۔

"اے امیر المومنین! آپ کو کیا فکر ہے۔ اللہ کی قسم روئے زمین پر آپ سے زیادہ کسی کو آرام و آسائش میسر نہیں ہے۔"

متوکل نے کہا۔ "فتح مجھ سے زیادہ سکون اور آرام میں وہ شخص ہے، جس کا ایک کشادہ گھر ہو' ایک نیک اور صالح بیوی ہو اور اس کے ساتھ اس کو روزی کے تمام اسباب بھی میسر ہوں تو کسی کی کیا مجال کہ ایسے شخص کو کوئی آواز بھی دے سکے۔"

علی بن جہم نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے متوکل کو ایک کنیز محبوبہ نامی ہدیہ میں دی تھی۔ جس نے طائف میں پرورش پائی تھی اور وہیں علم و ادب حاصل کیا تھا اور اشعار بھی کہا کرتی تھی۔ متوکل اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے کسی امر پر اس سے رنجیدہ ہو گیا اور محل کی تمام عورتوں کو حکم دے دیا کہ اس سے بات نہ کریں۔

ایک دن میں متوکل کے پاس گیا تو مجھ سے کہنے لگا۔

"میں نے آج محبوبہ کو خواب میں دیکھا ہے کہ اس سے میری صلح ہو گئی ہے۔ آؤ چلیں دیکھیں محبوبہ کیا کر رہی ہے۔" ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ سارنگی بجا کر یہ گا رہی تھی۔

"میں سارے محل میں پھرتی ہوں' لیکن کوئی ایسا نہیں کہ میں اس سے اپنی شکایت کروں اور نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا ہے۔

کیا کوئی شخص ہے جو بادشاہ سے میری سفارش کر سکے' کیونکہ اس نے خواب میں مجھ سے صلح کر لی ہے۔"

یہ سن کر متوکل نے اس کو آواز دی تو اس نے کہا۔ "کہ رات میں خواب دیکھا تھا کہ آپ نے مجھ سے صلح کر لی ہے۔"

متوکل نے کہا۔ "اللہ کی قسم میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے۔"

اس کے بعد اس کو پہلے والے مرتبہ پر بحال کر دیا۔

متوکل بہت سخی تھا۔ اس نے شعرا کو جتنا انعام دیا کسی عباسی خلیفہ نے نہیں دیا۔

متوکل کا قتل

متوکل کی چار ہزار کنیزیں تھیں۔ وہ عیش و عشرت میں منہمک رہتا تھا۔ علی بن جہم کہتے ہیں کہ متوکل کو اپنے بیٹے معتز کی ماں سے، جو ایک کنیز تھی بہت محبت تھی اور اس کو اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

اس نے اپنے بیٹے **منتصر** کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ **منتصر** کے بعد اس نے معتز اور موید کے لیے ولی عہدی پر بیعت لی تھی' لیکن اسے معتز کی ماں سے بہت محبت تھی۔ اس وجہ سے اس نے ارادہ کیا کہ **منتصر** کے بجائے اپنے بیٹے معتز کو ولی عہد بنا دے۔ اس نے **منتصر** سے کہا' لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ متوکل نے ایک مجلس میں **منتصر** کو معزول کر کے معتز کو ولی عہد بنا دیا۔ جس سے **منتصر** کی بے عزتی اور اس کے ساتھ عہد شکنی ہوئی۔ ترک تو پہلے ہی متوکل سے ناراض تھے۔ وہ **منتصر** کے ساتھ متوکل کے قتل کی سازش میں شریک ہو گئے۔

ایک رات متوکل عیش و عشرت کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ اچانک پانچ آدمی اندر گھس گئے اور متوکل کو اس کے وزیر فتح محمد خاقان کے ساتھ قتل کر دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ متوکل اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے فتح بن خاقان سے بہت محبت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ مجھ سے جدا ہو گیا تو میری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی ہوئی کہ دونوں کو بیک وقت قتل کر دیا گیا۔

متوکل کے قتل کی رات

عمر بن شیبان کہتے ہیں جس رات متوکل قتل ہوا' میں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اشعار پڑھ رہا ہے۔

''کیا تو نہیں جانتا ان کم بختوں نے خلیفہ ہاشمی اور فتح بن خاقان کے ساتھ کیا کیا۔

اور وہ اللہ تعالیٰ سے مظلومی کی حالت میں ملا ہے' اس لیے اہل آسمان نے بھی شور کیا ہے۔''

پھر دو ماہ بعد میں نے متوکل کو خواب میں دیکھا' میں نے دریافت کیا۔

''اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا سلوک کیا؟''

اس نے جواب دیا ''کچھ دنوں جو میں نے احیاء سنت کیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔''

میں نے دریافت کیا۔ ''آپ کے قاتلوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہوگا؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہوں' جب وہ یہاں آجائے گا' تب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے فریاد کروں گا۔''

قاتلوں کا انجام

اپنے باپ کو قتل کرانے کے بعد **المنتصر باللہ** مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس کی ماں رومی کنیز تھی۔ **منتصر** بہت خوب صورت ہنس مکھ اور نیکیوں کی طرف رغبت رکھنے والا تھا۔ اس نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی زیارت کی اجازت دے دی اور علویوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

اس نے اپنے بھائیوں معتز اور موید کو ولی عہدی سے معزول کردیا۔ ساتھ ہی اس نے ترکوں کو برا بھلا کہنا شروع کردیا اور اپنے باپ کے قتل کا الزام ان پر لگایا۔ حالانکہ ان کے ساتھ شریک تھا۔ اس نے ترکوں کو سخت سزائیں دیں۔ ترک اس سے عاجز آگئے۔ چونکہ یہ بہت عقل مند تھا۔ اس بنا پر ترکوں نے اس کے طبیب کو تیس ہزار دینار رشوت کے بھیجے۔ طبیب نے زہر آلود نشتر سے اس کی فصد کھول دی۔ پھر طبیب بھی مرگیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اسے امرود میں زہر دیا گیا۔

منتصر پر جب نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو اپنی ماں سے کہنے لگا۔ ''اے میری ماں مجھ سے دین و دنیا دونوں جاتے رہے۔ میں اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا اور میں بھی جانے میں جلدی کر رہا ہوں۔''

منتصر چھ ماہ سے بھی کم خلافت کرکے انتقال کرگیا۔ اس وقت اس کی عمر چھبیس سال تھی۔

کہتے ہیں ایک دن اس نے اپنے باپ کے خزانہ میں سے ایک قالین نکلوا کر مجلس میں بچھوایا۔ اس قالین کے درمیان میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک سوار کی صورت بنی ہوئی تھی اور اس کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا اور اس دائرے کے گرد فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس نے ایک فارسی جاننے والے کو بلا کر اس کا مطلب دریافت کیا۔ فارسی خواں اسے پڑھ کر چپ ہوگیا۔

منتصر نے پوچھا ''یہ کیا لکھا ہے؟''

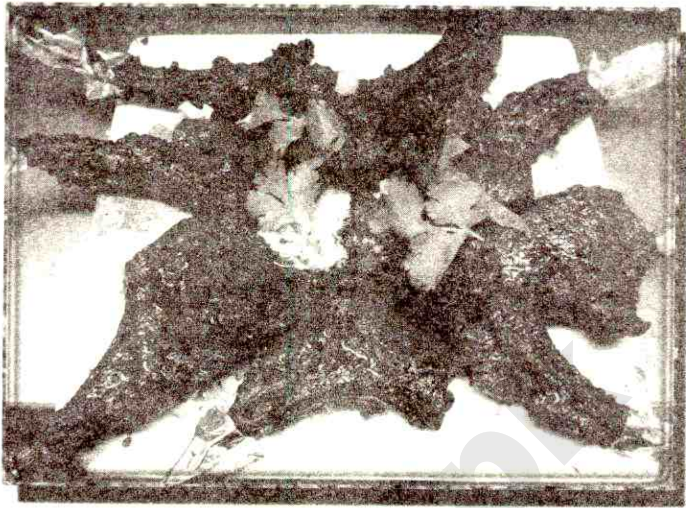
اس نے جواب دیا۔ ''یہ لکھا ہے کہ میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ مگر مجھے چھ مہینے سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔''

یہ سن کر **منتصر** کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے اسی وقت اس قالین کو جلا دینے کا حکم دیا۔

کہتے ہیں کس قدر حیرت کی بات ہے کہ خاندان کسریٰ میں جو قابض بادشاہ شیرویہ گزرا ہے' اس نے اپنے باپ کو قتل کیا اور چھ ماہ تک زندہ رہ سکا' اسی طرح بنو عباس میں **منتصر** خالص خلیفہ ہوا ہے۔ اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کردیا اور چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔

(ماخذ تاریخ خلفاء حضرت علامہ جلال الدین)





گوشت کے پکوان

خالدہ جیلانی

توا مٹن چانپ

اجزا :

چانپ	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	حسب ذائقہ
دہی	آدھا کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

چانپوں کو توے پر پانی ڈال کر ابال لیں۔ اس دوران دو مرتبہ پانی تبدیل کریں۔ خیال رکھیں کہ آنچ ہلکی ہو اور چانپیں بالکل ہی نہ گل جائیں۔ چانپیں نرم ہو جائیں تو اس میں باریک کٹے ٹماٹر، لہسن ادرک پیسٹ، نمک اور مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کریں اور مسالے میں لپٹی چانپوں کو تلیں۔ دہی ڈال کر تھوڑی دیر تک بھونیں۔ جب چانپیں تیل چھوڑ دیں تو سمجھ لیں کہ توا مٹن چانپ تیار ہے۔ ایک بڑی پلیٹ میں ہرا دھنیا، کٹی ہوئی ادرک اور لیموں کے ساتھ سجا کر پیش کریں۔

مسالے دار بریانی

اجزا :

چاول	ایک کلو
گوشت	ایک کلو
دہی	ایک کپ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز، ٹماٹر	چار، چار عدد
پسا گرم مسالا	آدھا کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہلدی، مرچ	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

نیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چاول کو تھوڑے سے ثابت گرم مسالے کے ساتھ ابال کر رکھ لیں۔ الگ پتیلی میں پیاز براؤن کر کے نکال لیں، پھر اسی تیل میں باقی ثابت گرم مسالا، ہلدی، سرخ مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں، پھر گوشت بھی شامل دیں۔ گوشت گل جائے تو براؤن پیاز چورا کر کے دہی میں پھینٹیں اور گوشت میں ملا دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں۔ ٹماٹر نرم ہونے لگیں تو ہلکے ہاتھ سے بھون لیں۔ الگ دیگچی میں چاول اور گوشت کی تہ لگائیں۔ درمیانی تہ پر جائفل اور جاوتری پیس کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی ہری مرچ، ہرا دھنیا اور پودینہ بھی باریک کتر کر ڈال دیں۔ سب سے اوپر چاول کی تہ لگا کر اس پر کیوڑے میں زرد رنگ گھول کر چھڑکیں اور بیس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

کالی مرچ کی کڑاہی

اجزا :

گوشت	آدھا کلو
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے گوشت ڈالیں۔ ساتھ ہی ادرک لہسن کا پیسٹ بھی شامل کر دیں۔ دس سے پندرہ منٹ تک فرائی کریں۔ پھر اس میں نمک، کالی مرچ، ایک چمچہ زیرہ اور دہی شامل کر کے ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائیں اور پانی بھی خشک ہو جائے۔ آنچ تیز کر کے خوب بھونیں، پھر تھوڑا سا پانی چھڑک کر آنچ ہلکی کر دیں۔ ثابت ہری مرچ، لیموں کا رس اور کترا ہوا دھنیا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

دھواں کباب

اجزا :

قیمہ	ایک کلو
پیاز	دو عدد
ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
زیرہ، دھنیا	ایک ایک کھانے کا چمچہ
کٹی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
بیسن	تین کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمہ مشین سے باریک نکال لیں۔ زیرہ اور دھنیا کوٹ کر، بیسن بھون کر، پیاز تیل میں نرم سی فرائی کر کے قیمہ میں ملا دیں۔ نمک، کٹی سرخ مرچ، لہسن ادرک پیسٹ اور چھ سات ہری مرچ بھی کوٹ کر قیمے میں اچھی طرح مکس کر لیں۔ قیمے پر کوئلہ دہکا کر رکھیں اور ڈھکن بند کر دیں۔ بیس منٹ بعد اس کے کباب بنائیں۔ (قدرے کوفتے کی شکل میں) اور فرائی کر لیں۔ رائتے یا املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

الائچی پسندے

اجزا :

پسندے	ایک کلو
سبز الائچی	دس عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
بادام پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
جائفل، جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
دہی	ایک کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کر کے الائچی کڑکڑائیں۔ پھر پسندے، نمک، لال مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہو جائے تو پانی ڈال کر گوشت گل جانے تک پکائیں۔ دہی میں پسی ہوئی پیاز، بادام کا پیسٹ، جائفل جاوتری اور گرم مسالا ملا کر گوشت میں شامل کر دیں۔ تیل الگ ہو جائے تو ایک کپ پانی ڈالیں۔ ایک ابال آجائے تو ایک

چائے کا چمچہ کیوڑہ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ تندوری روٹی یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

گولا کباب گریوی

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
کٹی مرچ، زیرہ	ایک ایک چائے کا چمچہ
دہی، براؤن پیاز	آدھا آدھا کپ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمہ میں نمک، ہری مرچیں، زیرہ، کٹی مرچیں، براؤن پیاز ملا کر باریک پیس لیں، پھر ہرا دھنیا کتر کر ملائیں اور مناسب سائز کے کباب بنائیں اور ہلکے فرائی کرلیں۔ الگ پتیلی میں ایک پیاز فرائی کریں، سنہری ہوجائے تو پلیٹ میں نکال کر چورا کرلیں اور دہی میں ملا دیں۔ پھر اسی تیل میں دوبارہ ڈال کر بھون لیں، پھر اس میں نمک، لال مرچ، ہلدی، دھنیا اور ادرک لہسن پیسٹ ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ تیل اوپر آجائے تو گاڑھی سی گریوی رکھ لیں پھر تیار شدہ کباب اور گرم مسالا ڈال کر مکس کریں۔

ہریانہ کی یخنی بریانی

اجزا :

گوشت	ڈیڑھ کلو
چاول	ایک کلو
ثابت گرم مسالا	تین کھانے کے چمچے
سونف اور زیرہ	دو، دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
بریانی مسالا	چار کھانے کے چمچے
ٹماٹر، پیاز	چار، چار عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ململ کے کپڑے میں دو پیاز، دس لہسن کے جوے اور ایک ادرک کے ٹکڑے کے ساتھ تمام ثابت مسالے ڈال کر پوٹلی بنائیں۔ پتیلی میں گوشت، پوٹلی اور نمک ڈال کر اتنے پانی میں چڑھائیں کہ گوشت گل جائے اور چار گلاس یخنی بھی بچ جائے۔ بعد میں گوشت اور یخنی الگ کرلیں۔ دوسری پتیلی میں تیل گرم کرکے دو پیاز سلائس میں کاٹ کر سنہری کریں۔ ساتھ ہی کڑی پتا بھی ڈال کر کڑکڑائیں، پھر گوشت اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر کچھ دیر بھونیں، اس کے بعد باریک کٹے ہوئے ٹماٹر، دہی، بریانی مسالا اور ہری مرچ ڈال کر بھونیں۔ یخنی ڈال کر بھیگے ہوئے چاول شامل کریں۔ درمیانی آنچ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ دم پر رکھ کر زردہ رنگ ڈال دیں۔ چاہیں تو بریانی ایسنس کے چند قطرے بھی ڈال سکتی ہیں۔

سفید مغلئی زردہ

اجزا :

چاول	ایک کلو
چینی	تین کپ
گھی	ایک کپ
سبز الائچی	آٹھ عدد
کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
بادام، پستے	حسب ضرورت
چم چم، گلاب جامن	حسب ضرورت
کھویا	ایک کپ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

چاول ابال لیں۔ ایک کنی باقی رہ جائے تو چھلنی میں چھان کر پانی میں نتھار لیں۔ گھی گرم کرکے الائچی کڑکڑائیں۔ آدھے چاول ڈال کر مکس کریں۔ دو منٹ بعد چینی اور بقیہ آدھے چاول ڈال کر مکس کریں۔ آنچ درمیانی رکھیں۔ چینی کا پانی خشک ہوجائے تو آنچ ہلکی کردیں۔ بادام، پستے، چم چم، گلاب جامن، کھویا اور کیوڑہ ڈال کر مکس کریں اور دم پر رکھ دیں۔





عید پر حسین اور خوب صورت لگیے

ادارہ

عید قربان کا دن مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے بھی شدید مصروفیت کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس دن کے لیے پہلے سے کچھ تیاری کرلی جائے۔ تاکہ آپ خود پر بھی توجہ دے سکیں۔

☆ میک اپ کرنے سے پہلے اپنی جلد کو تیار کریں۔

کلینزنگ کے لیے تازہ دودھ یا مصنوعی کلینزر جو بھی دستیاب ہو' چہرے اور گردن پر لگائیں۔ آہستگی سے دائروں کی شکل میں انگلیوں کی مدد سے مساج کریں۔ یہاں تک کہ جلد کا تمام میل کچیل صاف ہوجائے۔ اس کے بعد صاف پانی سے چہرہ دھولیں۔ چہرے کو کھلی فضا میں خشک ہونے دیں۔

☆ کلینزنگ کا عمل مکمل ہوجائے تو اسکربنگ پر (رگڑنے کی طرف) آجائیں۔ آپ گھر میں ہی اسکرب کرکے اپنی جلد کو خوب صورت' نرم اور صحت مند بنا سکتی ہیں۔ اس کے لیے بیکنگ سوڈا میں ایلو ویرا کا جیل شامل کرکے پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر مساج کریں۔ بعد میں سادہ پانی سے صاف کرلیں اور جلد کو تھپتھپا کر خشک کریں۔

☆ جب آپ یہ تسلی کرلیں کہ آپ نے اپنے چہرے کی خوب اچھی طرح صفائی کرلی ہے تو پھر میک اپ بیس کی طرف آجائیں۔ میک اپ بیس کا انحصار آپ کی جلد کی رنگت پر ہے۔ فاؤنڈیشن کی تھوڑی سی مقدار لے کر اسفنج یا ہاتھوں کی مدد سے پورے چہرے پر لگائیں۔

☆ اب ایک بڑا اور گھنے ریشوں والا برش لے کر اس کی مدد سے چہرے پر لوز پاؤڈر لگائیں۔ خاص طور پر ناک کی ہڈی' آنکھوں کے نیچے اور تھوڑی پر اچھی طرح لگائیں تاکہ آپ کا فاؤنڈیشن تسلی بخش انداز میں سیٹ ہوجائے اور تادیر چہرے پر برقرار رہے۔

☆ اس کے بعد بھنوؤں کی دلکشی نمایاں کرنے کے لیے آئی برو پنسل منتخب کریں۔ جس کا شیڈ آپ کی بھنوؤں کے رنگ سے قدرے ہلکا ہوا۔ اب پپوٹوں کے اوپر پیچ کلر پر مشتمل کریمی آئی شیڈو لگائیں۔ یہ آئی شیڈ ان تمام شکنوں پر لگائیں جو آنکھیں کھولنے کے بعد نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ اب ہلکے ہاتھ سے پلکوں کی لائن کے ساتھ ساتھ ایک ہی بار میں مہارت کے ساتھ آئی لائنر لگائیں ـــ آخر میں لائنر کو آنکھوں کے بیرونی گوشوں پر ذرا اٹھا کر لگائیں' تاکہ آپ کی آنکھوں کی خوب صورتی اور نمایاں ہوجائے۔

☆ آنکھوں کے میک اپ کے بعد گلابی بلش آن رخسار کی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ لگائیں اور اسے رخساروں کے ابھار پر نمایاں کرنے کے بجائے کنپٹیوں کی جانب لے جائیں۔

☆ اب کسی موزوں شیڈ کی پنسل سے ہونٹوں کی آؤٹ لائن بنائیں۔ اگر آپ کے ہونٹ پتلے ہیں تو آؤٹ لائن بناتے ہوئے پنسل کو ذرا سا باہر کی جانب رکھتے ہوئے آگے بڑھا کر لائن بنائیں۔ اب پنسل کا ہم رنگ لائنر لے کر آؤٹ لائن کے ساتھ ساتھ ایک اور لائن بنائیں' تاکہ آپ کے ہونٹوں کی خوب صورتی نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیں۔ برش کے بغیر بھی لپ اسٹک لگا سکتے ہیں۔ ایک بار لگانے کے بعد ٹشو پیپر کو ہونٹوں کے درمیان رکھ کر دبائیں اور دوبارہ لپ اسٹک لگائیں۔ آخر میں لپ گلوس لگا کر میک اپ کا اختتام کریں۔